Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

شیرنی

انوار علیگی

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

شیرنی

انوار علیگ

اشاعت:-
مکتبہ القریش سرکلر روڈ
اُردو بازار، لاہور-۲

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

اُس کے نام

جو نہ کسی کا باپ ہے

اور نہ کسی کا بیٹا۔

جملہ حقوق محفوظ ہیں

محمد علی قریشی

2002ء

1100

نیر اسد پریس لاہور

ذاکر

-/225روپے

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

فہرست

ترتیب		صفحہ نمبر
آدھی زندگی	.....	11
رُوح کا جھگڑا	.....	41
آٹھویں محبت	.....	55
توبہ	.....	94
عامل کامل	.....	130
شیرنی	.....	169
بے خبر	.....	225
وہ دن	.....	264
آخری قتل	.....	301
ظالم لمحے	.....	345
لپ اسٹک	.....	382

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

پیش لفظ

پراسرار ناولوں کے ممتاز مصنف انوار علیگی کی کہانیوں کا مجموعہ ''شیرنی'' حاضر ہے۔ یہ کہانیاں پراسرار بھی ہیں اور انوکھی بھی..... اس مجموعہ میں گیارہ کہانیاں شامل ہیں۔

''شیرنی''..... یہ ایک انتہائی سفاک اور اذیت پسند شخص کی رُوداد ہے۔ اس کے شوق بڑے عجیب تھے۔ ایک طرف اُس نے شیرنی پال رکھی تھی تو دوسری طرف نت نئی بیویاں رکھنے کا شوق تھا..... ایسے شخص کا انجام کیا ہوا؟

''رُوح کا جھگڑا''..... ایک ایسے مظلوم مسلمان باپ کی کہانی ہے جس کے معصوم بچے کا ایک شاطر ہندو دعوے دار بن گیا۔ مقدمہ عدالت میں پہنچا۔ دنیا کے سب سے انوکھے مقدمے کا کیا فیصلہ ہوا؟..... مسلمان لڑکے پر کیا گزری؟ اس کا اندازہ آپ کو کہانی پڑھ کر ہوگا۔ اس انوکھی کہانی کی تہہ میں آپ محسوس کریں گے کہ یہ کسی ایک تہذیب کی کہانی نہیں یہ سارے مسلمانوں کی تہذیب کی روداد ہے جس پر ہندوانہ ذہنیت قبضہ کر لینا چاہتی ہے۔

''لپ اسٹک''..... میں آپ کو ایک انتہائی سادہ دل لڑکی کی پکار سنائی دے گی جو اپنی خودکشی کرنے والی بھابھی کے انتقام کا نشانہ بن گئی..... آخر کیسے؟

اس مجموعے میں شامل ساری کہانیاں انوکھے واقعات پر مبنی ہیں۔ ایسے واقعات جو آپ کو حیرت میں ڈال دیں گے..... اپنی گرفت میں لے لیں گے۔ اور آپ کو ایسی دُنیا میں لے جائیں گے جہاں سے واپس آنے کو آپ کا دل نہ چاہے گا۔

محمد علی قریشی

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

آدھی زندگی

ان کی گاڑی کافی دیر سے اس سجی سجائی کار کے تعاقب میں تھی اور انہیں کچھ معلوم نہ تھا کہ کون ان کے تعاقب میں ہے۔

سجی سجائی کار میں تیز تیز میوزک بج رہا تھا۔ شادی بیاہ کے گیتوں کا کیسٹ لگا ہوا تھا۔ اس تیز موسیقی کی لہروں میں ہر شخص بہا جا رہا تھا۔ کار سپیڈ میں جا رہی تھی۔ دلہا کا دوست اکبر گاڑی چلا رہا تھا۔ یہ کار اسی کی تھی۔ اکبر کے برابر دلہا کا چھوٹا بھائی مجید بیٹھا تھا۔ کار کی پچھلی سیٹ پر دلہا روشن، دلہن لتی اور دلہن کی ممانی بیٹھی تھیں۔

ان گانوں سے ممانی کو بڑی الجھن ہو رہی تھی۔ پچھلے چار پانچ دنوں میں شادی بیاہ کے گیت اس تواتر سے سنے اور گائے تھے کہ اب یہ گیت کانوں میں پگھلے سیسے کی طرح گھس رہے تھے۔ ان کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ دلہا کے بھائی سے کہہ کر یہ کیسٹ نکلوا دیں۔ ایک بار وہ آگے کی طرف جھکیں بھی مگر پھر کچھ سوچ کر رک گئیں۔ کہیں لتی کے سسرال والے اس بات کا برا نہ مان جائیں۔ یہ لوگ اس وقت اس کیسٹ کو سننا چاہ رہے ہیں تو سننے دو۔ جیسی ان لڑکوں کی خوشی۔ اس خوشی کے موقع پر روک ٹوک مناسب بات نہ تھی۔ یہ سوچ کر انہوں نے صبر کر لیا اور اپنا دھیان گانوں سے ہٹانے کی کوشش کی۔ یہ کوئی سنسان سڑک تھی۔ سڑک کے دونوں طرف اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔

یہی وہ موقع تھا، جس کی تلاش میں وہ اب تک صبر کیے بیٹھے تھے۔

ان کی گاڑی نے شادی ہال سے ہی تعاقب شروع کیا تھا۔ دلہن کی کار کسی طرح ہال سے نکل کر ہی نہیں دے رہی تھی۔ رخصتی میں خاصی تاخیر ہو گئی تھی۔ تاخیر کیوں نہ ہوتی۔ ایک تو بارات خاصی دیر سے پہنچی۔ بارات پہنچی تو دلہن کا انتظار شروع ہوا۔ خدا خدا کر کے اس کا میک اپ مکمل ہوا اور اس نے شادی ہال میں قدم رنجہ فرمایا۔ یہ تو اچھا تھا کہ نکاح صبح ہی گھر پر ہو گیا تھا، ورنہ مزید تاخیر ہوتی۔ دلہن کے آتے ہی فوراً کھانا دے دیا گیا۔ کھانے سے فارغ ہو کر لوگوں نے رخصت ہونا شروع کر دیا۔ آخر میں دلہا اور دلہن کے نزدیکی رشتے دار رہ گئے۔ پھر ایک ایک کے ساتھ دلہن کو بٹھا کر وڈیو فلم بنوائی گئی۔ اس فلمبندی میں دو ڈھائی گھنٹے ضائع ہو گئے۔

اور جب دلہن اور دلہا کی کار شادی ہال سے نکلی تو رات کا ایک بجا تھا۔ سجی سجائی کار کے

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

باہر نکلتے ہی انہوں نے اپنی گاڑی پیچھے لگا دی۔ تعاقب کرنے والوں کو معلوم تھا کہ گاڑی کن راستوں سے گزرے گی اور کہاں جائے گی۔

شادی ہال سے چار پانچ میل کا سفر تھا۔ انہی چار پانچ میل کے درمیان آدھے میل کا ٹکڑا ایسا تھا جو بالکل سنسان اور اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔

سجی سجائی کار ابھی اس سنسان علاقے میں داخل ہوئی ہی تھی کہ تعاقب کرنے والی گاڑی کے ڈرائیور نے اچانک رفتار تیز کر دی اور اپنی گاڑی سجی سجائی کار کو کراس کر کے اس طرح سامنے لے آیا کہ اگر اکبر فوراً بریک نہ لگاتا تو دونوں گاڑیوں کی زوردار ٹکر ہو جاتی۔

ابھی یہ لوگ معاملے کی نوعیت سمجھ بھی نہ پائے تھے کہ وہ چاروں اپنی گاڑی سے اتر کر تیزی سے کار کی طرف بڑھے اور کھلی کھڑکیوں سے رائفلوں کی نالیں اکبر' مجید اور روشن کے سروں سے لگ گئیں۔ ممانی کی طرف کا شیشہ چڑھا ہوا تھا۔ چوتھے نے ریوالور کا دستہ مار کر شیشہ توڑ دیا اور اپنا ہاتھ اندر گھسا کر ریوالور ممانی کی کھوپڑی سے لگا دیا۔

"گاڑی سے نیچے اترو' جلدی کرو۔" ایک تحکمانہ آواز آئی۔

اکبر نے کوئی مزاحمت نہ کی' یہ مزاحمت کا وقت بھی نہ تھا۔ وہ خاموشی سے نیچے اتر آیا۔

اس کے بعد ایک ایک کر کے سب کو یہ حکم ملا اور وہ چاروں نیچے اتر آئے' کار میں صرف دلہن رہ گئی۔ ممانی نے کچھ شور مچانے کی کوشش کی تو ان کے کندھے پر ایک زوردار ہاتھ پڑا۔ وہ وہیں کراہ کر ڈھیر ہو گئیں۔

پھر انہوں نے تینوں مردوں کی جلدی جلدی تلاشی لی۔ ان سے گھڑی' انگوٹھی اور نقدی چھین لی۔ روشن کی جیب میں خاصے پیسے تھے۔ اسے ان سے محروم کر دیا گیا۔

"چلو۔" پھر ان میں سے ایک بولا۔

ایک رائفل بردار' دلہن کے پاس بیٹھ گیا۔ ایک نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور گاڑی آندھی طوفان کی طرح آگے بڑھائی۔

کار کے نکلتے ہی ریوالور بردار شخص نے اپنے دوسرے ساتھی سے کہا۔ "تو گاڑی میں چل۔"

یہ سن کر اس کا ساتھی گاڑی کی طرف بڑھا۔

"اگر تم لوگوں کو جان عزیز ہے تو خاموشی سے زمین پر بیٹھ جاؤ۔"

ان میں جان کس کو عزیز نہ تھی۔ وہ حکم پاتے ہی سڑک پر بیٹھ گئے۔ اتنی دیر میں اس کا ساتھی گاڑی بیک کر کے اس کے نزدیک لا چکا تھا۔ وہ تیزی سے پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا اور اس نے منہ باہر نکال کر ان چاروں سے کہا۔ "ہم جا رہے ہیں' ٹاٹا۔"

پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ گاڑی ان کی آنکھوں سے اوجھل ہو گئی۔

☆.....☆.....☆

لتی کے والد' ڈاکٹر عرفان جب اپنے کمرے میں آئے تو ٹیلی فون کی گھنٹی بج رہی تھی۔ وہ تیزی سے ٹیلی فون کی طرف بڑھے۔ انہوں نے اپنی گھڑی پر نظر ڈالی۔ ڈھائی بج رہے تھے۔ وہ ڈاکٹر تھے اس لیے رات گئے مریضوں کے ٹیلی فون آتے رہتے تھے۔ اس ٹیلی فون کو بھی انہوں نے کسی مریض کا ٹیلی فون تصور کر لیا' لیکن جب انہوں نے ریسیور کان سے لگا کر 'ہیلو' کہا تو ان کے چھکے چھوٹ گئے۔ سردی کے باوجود انہیں پسینے آ گئے۔ وہ کال ہی ایسی تھی۔

"آخر تم نہیں مانے' تم نے ہماری تنبیہ کو محض ایک مذاق سمجھ لیا۔ اب تمہاری بیٹی ہمارے پاس آ چکی ہے۔ اس کی طرف سے فکرمند کرنا۔ ہم بڑے قدر دان لوگ ہیں۔ اچھی چیزوں کو بہت سنبھال کر رکھتے ہیں۔" یہ کہہ کر کہنے والا ہلکا سا ہنسا' پھر بولا "ہاں' اپنے داماد کی تو خبر لو' وہ بے چارہ ابھی سڑک پر ہی کھڑا ہو گا۔"

اور اس سے پہلے کہ ڈاکٹر عرفان کوئی سوال کرتے' ادھر سے سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔

ڈاکٹر عرفان بڑے مضبوط اعصاب کے مالک تھے۔ ڈاکٹر تھے' ڈاکٹروں کے اعصاب ویسے بھی خاصے مضبوط ہوتے ہیں' لیکن ڈاکٹر عرفان کچھ زیادہ ہی قوی اعصاب رکھتے تھے مگر اس وقت ٹیلی فون کی کال سن کر ان کے اعصاب جیسے جواب دے گئے تھے۔ ان کی ٹانگیں لرز رہی تھیں اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا تھا۔ اگر وہ فوراً بیڈ پر بیٹھ نہ جاتے تو اس بات کے امکانات تھے کہ وہ چکرا کر زمین پر گر جاتے۔

وہ ٹیلی فون کی کال ہی اس قدر خوفناک تھی۔ اسے کوئی بھی باپ سنتا' اس کا یہی حال ہوتا۔ پھر لتی تو ان کی اکلوتی بیٹی تھی۔ بہت پیاری اور بہت چہیتی۔

سیڑھیاں چڑھتے ہوئے ڈاکٹر عرفان لتی کے بارے میں ہی سوچتے آ رہے تھے۔ لتی کی بہت سی تصویریں ان کی نگاہوں میں گھوم رہی تھیں۔ بچپن سے جوانی تک کے واقعات ان کی آنکھوں میں جاگ رہے تھے۔ وہ ایک ڈیڑھ گھنٹہ پہلے ہی تو اسے رخصت کر کے آئے تھے۔ گھر آنے کے بعد' مہمانوں کی موجودگی کے باوجود انہیں اپنا گھر سونا سونا لگا تھا۔ اس گھر کی مینا اب پرائی ہو گئی تھی۔ اس کی میٹھی باتیں اب کسی اور آنگن میں چہچہائیں گی۔ لتی کے پرائی ہونے کا غم سبھی کو تھا اس لیے اس کی رخصتی کے بعد ہر شخص چپ چاپ سا تھا۔ گھر آنے کے بعد کچھ دیر مہمانوں اور گھر والوں نے ادھر ادھر کی بات کی۔ پھر ایک ایک کر کے سب اپنے اپنے ٹھکانوں کی طرف چلے گئے۔ لتی کی امی' بکھری ہوئی چیزوں کو سمیٹ رہی تھیں۔ ڈاکٹر عرفان' انہیں منتظر نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ انتظار کرتے دیکھ کر لتی کی امی فریدہ نے کہا "آپ اوپر چلئے' میں تھوڑا سا کام سمیٹ کر آ رہی ہوں۔"

"جی بہتر۔" ڈاکٹر عرفان یہ کہتے ہوئے سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ ان کا بیڈ روم اوپر تھا۔

اب وہ سر پکڑے بیٹھے تھے۔ یہ اچانک کیا ہو گیا تھا۔ انہیں نہیں معلوم تھا کہ وہ ایسا بھی کر گزرے گا۔ وہ تو اس کی باتوں کو محض ایک بے ہودہ مذاق سمجھ کر ٹال دیا کرتے تھے' لیکن اب اگر

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

اس نے انتہائی قدم اٹھالیا ہے' اور وہ کر گزرا ہے جس کی اس نے تنبیہہ کی تھی' تو یہ بہت برا ہوا۔

انہوں نے خود کو سنبھالا' اٹھ کر ایک گلاس پانی پیا اور پھر لیٹی کے سسرال ٹیلی فون کرنے لگے۔

ادھر گھنٹی بج رہی تھی' لیکن اٹھا کوئی نہیں رہا تھا۔

ڈاکٹر عرفان کا ہر گھنٹی پر غصہ بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ جلد از جلد اس' بکواس' کی جو ابھی ٹیلی فون پر کی گئی تھی' تصدیق چاہتے تھے۔

خدا خدا کر کے ادھر سے کسی نے ٹیلی فون اٹھایا۔ "ہیلو" کوئی لڑکی بول رہی تھی۔

"بیٹا' کیا دلہن گھر پہنچ گئی ہے؟"

"جی ابھی تو نہیں پہنچی۔ ہم سب انتظار کر رہے ہیں۔"

"ابھی تک نہیں پہنچے وہ لوگ؟" ڈاکٹر عرفان کے دل میں ٹھیس سی اٹھی۔ "بیٹا' زاہد صاحب کو بلاؤ۔"

"جی اچھا۔" بڑے مودبانہ انداز میں کہا گیا۔ "آپ کون صاحب بول رہے ہیں؟"

"بیٹا میں ڈاکٹر عرفان ہوں' جلدی سے زاہد صاحب کو بلاؤ۔" ان کی آواز میں لرزش تھی۔

"جی بلاتی ہوں۔"

چند لمحوں بعد ریسیور میں ایک مردانہ گونج دار آواز سنائی دی۔ "ہیلو!"

"لیٹی ابھی تک گھر نہیں پہنچی کیا؟" ڈاکٹر عرفان نے بے قراری سے سوال کیا۔

"نہیں' ابھی تک تو وہ لوگ نہیں پہنچے' ہم خود انتظار کر رہے ہیں۔"

"کیا روشن بھی ابھی تک گھر نہیں پہنچے؟"

"نہیں۔" زاہد نے جواب دیا۔ پھر اچانک انہیں خیال آیا کہ کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے۔

"ڈاکٹر صاحب! کیا ہوا؟ صاف صاف بتائیں۔" ان کے لہجے میں خوف تھا۔

"لیٹی کو کسی نے اغوا کر لیا ہے۔" ڈاکٹر عرفان نے لرزتی آواز میں کہا۔

"ارے نہیں!" زاہد کا سر گھوم گیا۔ لیٹی کو اغوا کیا گیا ہے تو ان کے بیٹے روشن پر جانے کیا گزر رہی ہو گی۔

"میں آ رہا ہوں۔ آپ گھر پر رہیں' وہاں آ کر ساری تفصیل بتاتا ہوں۔" ڈاکٹر عرفان نے کہا اور ان کا جواب سنے بغیر ہی ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔ پھر وہ تیزی سے سیڑھیاں اترتے نیچے پہنچے۔ پہلے انہوں نے سوچا کہ فریدہ کو اصل واقعے سے روشناس کر دیں' لیکن پھر کچھ سوچ کر رک گئے۔ انہیں کچھ بتانا مناسب نہ تھا۔ انہوں نے اپنے بڑے بیٹے رازق کو ساتھ لیا اور گاڑی نکال کر اس راستے پر چل دیئے' جس راہ سے ان کی بیٹی کو اٹھا لیا گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

جو کچھ ہوا تھا بس آناً فاناً ہی ہوا تھا۔ روشن کے تو چودہ طبق اس وقت روشن ہوئے جب وہ لوگ لیٹی کو لے کر غائب ہو گئے۔ اب اسے واقعہ کی سنگینی کا احساس ہوا۔ وہ تو خوابوں کی وادی کی سیر کر رہا تھا۔ لیٹی کا نرم و ملائم ہاتھ اس کے ہاتھ میں تھا اور آنکھوں میں کہکشاں بھری ہوئی تھی۔ کانوں میں تیز موسیقی رس گھول رہی تھی کہ اچانک ہی کسی نے قسمت کا ورق الٹ دیا۔

اب اس کی آنکھوں میں مرچیں بھری ہوئی تھیں' دل اندھیروں کی وادی میں ڈوبا ہوا تھا' کانوں میں خونخوار بھیڑیوں کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ لیٹی کے نرم و ملائم ہاتھ کا لمس اس کے ہاتھ میں جاگ رہا تھا۔ وہ خوشی' وہ سرشاری جو کچھ دیر پہلے محسوس ہو رہی تھی ایک دم غائب ہو گئی تھی۔

وہ اندھیرے میں کھڑے ایک دوسرے کا منہ دیکھ رہے تھے۔ ممانی سڑک پر لیٹی ہوئی تھیں۔ ان کے کندھے پر کرائے کا ہاتھ پڑا تھا یا پھر وہ اس سانحے کی تاب نہ لا کر بے ہوش ہو گئی تھیں۔ روشن نے اکبر سے کہا۔ "ذرا ممانی کو دیکھو۔"

اکبر اور مجید نے مل کر انہیں اٹھانے کی کوشش کی تو انہوں نے کراہ کر آنکھیں کھول دیں۔ "وہ لوگ چلے گئے۔ لیٹی کہاں ہے؟" انہوں نے کانپتے ہوئے سوال کیا۔

"ممانی' وہ لوگ لیٹی کو بھی اپنے ساتھ لے گئے۔" اکبر نے انہیں بتایا۔

"ہائے' میرے اللہ اب کیا ہو گا۔" ممانی جو اکبر اور مجید کا سہارا پا کر اٹھ گئی تھیں' دل پکڑ کر پھر لیٹ گئیں۔

اب کیا ہو گا؟ یہ کسی کو نہیں معلوم تھا۔ ان لوگوں کا گھر تک پہنچنا کوئی ایسا مشکل مسئلہ نہ تھا۔ رات زیادہ گہری ہونے پر اگرچہ اس سڑک سے کسی ٹیکسی' رکشا کا ملنا بہت مشکل تھا' رکشہ ٹیکسی نہ سہی کسی پرائیویٹ گاڑی سے لفٹ لے لیں گے' اگر کوئی گاڑی نہ بھی ملے تو پیدل بھی گھر پہنچا جا سکتا تھا۔

کچھ دیر انتظار کر کے آخر انہوں نے پیدل چلنا شروع کر دیا۔ اکبر اور مجید' ممانی کو سہارا دے کر چلا رہے تھے۔ ان کی حالت خراب تھی' وہ نیم بے ہوشی کی کیفیت میں تھیں۔

حالت تو روشن کی بھی خراب تھی۔ اگرچہ وہ بے ہوش نہ ہوا تھا لیکن صدمے سے اس کا ذہن ماؤف ہو چکا تھا۔ لیٹی کے اس طرح چھن جانے کا صدمہ اس کی روح کو کرچی کرچی کیے دے رہا تھا۔

لیٹی صرف اس کی بیوی نہ تھی' اس کی محبت تھی۔ روشن سوچ سوچ کر پاگل ہوا جا رہا تھا۔ مسئلہ یہ نہ تھا کہ اب کیا ہو گا؟ مسئلہ یہ تھا کہ یہ کیا ہو گیا تھا اور یہی سوچ سوچ کر روشن کا دماغ پگھلا جا رہا تھا۔ وہ قدم رکھتا کہیں تھا' پڑتا کہیں تھا۔

وہ چاروں گرتے پڑتے' اٹھتے' بیٹھتے چلے جا رہے تھے۔

اچانک ان کے عقب میں ایک گاڑی رکی۔ گاڑی میں ڈاکٹر عرفان اور ان کا بیٹا رازق تھے۔

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

ڈاکٹر عرفان کا چہرہ دیکھ کر روشن نے سکون کا سانس لیا۔ اس گھپ اندھیرے میں کہیں کوئی جگنو چمکا۔ کہیں کوئی امید کی کرن دکھائی دی۔

"ارے سعدیہ کو کیا ہوا؟" ڈاکٹر عرفان نے اپنے سالے کی بیوی پر نظر پڑتے ہی کہا۔ ممانی سعدیہ' اکبر اور مجید کے کندھوں پر جھول رہی تھیں۔

ڈاکٹر عرفان نے انہیں گاڑی کی پچھلی نشست پر لٹا کر نبض کا معائنہ کیا۔ آلے سے سینہ چیک کیا اور پھر اپنا بیگ کھول کر جو ہمیشہ گاڑی میں رہتا تھا' ایک انجکشن نکال کر انہیں لگایا۔ یہ کام انہوں نے مشکل سے دو تین منٹ میں کیا۔ اس دوران وہ روشن سے سوالات کرتے رہے۔

انجکشن لگا کر ڈاکٹر عرفان نے سب کو گاڑی میں بیٹھ جانے کو کہا۔ گاڑی میں سب ٹھنسا کر بیٹھ گئے۔ تب ڈاکٹر عرفان نے رازق سے گاڑی سٹارٹ کرنے کو کہا۔ "چلو جلدی کرو۔"

اب اس گاڑی کا رخ روشن کے گھر کی طرف تھا۔

☆.....☆.....☆

وہاں سب دلہا کی کار کا انتظار کر رہے تھے اور دلہا کی گاڑی پنکچر ٹرین بن گئی تھی' آ کر ہی نہیں دے رہی تھی۔ روشن کی بہنیں بار بار دروازے پر آ کر جھانک رہی تھیں۔ انہیں بھابی کی آمد کا شدید انتظار تھا۔ بھابی آئے تو دروازہ روکیں' بھابی سے دررکائی لیں۔ بقول روشن کی بہن عالیہ' کہ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے بھائی صاحب دررکائی سے بچنے کے لیے' بھابی کو کسی ہوٹل میں لے گئے ہیں۔

شروع میں کچھ دیر اسی طرح کا ہنسی مذاق چلتا رہا' لیکن وقت گزرنے کے ساتھ چہروں پر ہنسی کی جگہ فکر نے لے لی۔ اب خاصا وقت گزر چکا تھا۔ شادی ہال سے گھر تک کا فاصلہ چار پانچ میل سے زیادہ نہ تھا۔ دیر ہونے کی صورت میں بھی انہیں اب تک گھر پہنچ جانا چاہئے تھا۔

روشن کے گھر والے اور روشن تقریباً ساتھ ساتھ ہی شادی ہال سے نکلے تھے۔ زیادہ سے زیادہ چار پانچ منٹ کا فرق رہا ہوگا۔ چلتے چلتے وڈیو فلم بننے لگی تھی۔ تو مجید نے کہا تھا۔ "ابو آپ گھر والوں کو لے کر چلیں' میں روشن بھائی اور بھابی کو لے کر آتا ہوں۔"

اس طرح یہ لوگ ان سے پہلے نکل گئے تھے۔ اگر ساتھ ساتھ بھی نکلتے تو دلہن کو اغوا کرنے والوں کو کوئی فرق نہ پڑتا۔ زاہد یا گھر والے لبنیٰ کو جانے سے نہیں روک سکتے تھے۔ جان سب کو پیاری ہوتی ہے۔ شعلے اگلتی نالوں کے سامنے کوئی نہیں ٹھہرتا۔

اب انتظار جان لیوا ثابت ہو گیا تھا۔ سب لوگ گھر کے دروازے میں کھڑے چہ میگوئیاں کر رہے تھے کہ اتنے میں ڈاکٹر عرفان کا ٹیلی فون پہنچ گیا۔ اس ٹیلی فون کال نے تو گھر والوں پر بجلی گرا دی۔

ڈاکٹر عرفان کا جملہ اگرچہ بہت واضح تھا انہوں نے لبنیٰ کے اغوا ہونے کی خبر سنائی تھی۔ اس واضح خبر کے باوجود بہت سے سوالات روشن کے گھر والوں کے ذہن میں سر ابھار رہے تھے۔

زاہد چاہ رہے تھے کہ فوراً گھر سے نکلیں اور باہر نکل کر صورتحال معلوم کریں' لیکن ڈاکٹر عرفان نے انہیں گھر سے نکلنے سے روک دیا تھا۔

لبنیٰ کے اغوا کی خبر نے ہنستے بستے گھر کو سوگوار کر دیا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے کمینوں کو سانپ سونگھ گیا ہو۔ روشن کی والدہ زبیدہ کی حالت بڑی خراب تھی۔ وہ اپنا دل دبائے بیٹھی تھیں۔ ایک بیٹی ان کی پیٹھ سہلا رہی تھی۔ زاہد مٹھیاں بھینچے ادھر سے ادھر ٹہل رہے تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ اچانک ہوا کیسے؟ انہیں رہ رہ کر اس بات کا افسوس ہو رہا تھا کہ ہم سب کو ایک ساتھ نکلنا چاہئے تھا۔ اگر سب ساتھ نکلتے تو شاید یہ واردات نہ ہوتی۔

ابھی وہ یہ سوچ ہی رہے تھے کہ اچانک اطلاعی گھنٹی چیخی اور ساتھ ہی کسی گاڑی کا انجن بند ہونے کی آواز آئی۔ سب لوگ دروازے کی طرف بھاگے۔ عالیہ سب سے آگے تھی' اس نے گھر کا دروازہ کھولا تو سب سے آگے روشن تھا۔ عالیہ اپنے بھائی سے لپٹ گئی۔

"بھائی جان' یہ سب کیا ہو گیا؟" وہ رو رہی تھی۔

"عالیہ' ہمت سے کام لو' ان لوگوں کو اندر تو آنے دو۔" پیچھے سے زاہد نے کہا۔

تب عالیہ نے روشن کو چھوڑ دیا۔ روشن گھر میں داخل ہوا' اسے باپ نے لپٹایا' اسے ماں نے چوما' اسے دیگر بہنوں نے گلے سے لگایا۔ روشن کو محسوس ہوا جیسے اس کے گھر والے اسے صحیح سلامت دیکھ کر خوشی محسوس کر رہے ہیں' کسی کو اس بات کا اندازہ نہیں کہ اس پر کیا بیت رہی ہے۔ وہ اس گھر میں لبنیٰ کے بغیر داخل ہوا ہے۔ لبنیٰ جو اس کی آدھی زندگی تھی' لبنیٰ کے بغیر وہ ادھورا تھا' آدھا زندہ تھا۔

روشن گھر کے ایک کمرے میں جا کر بیڈ پر گر پڑا۔

باقی لوگوں کو ڈرائنگ روم میں بٹھایا جا چکا تھا۔ ممانی کی حالت اب کچھ سنبھل گئی تھی۔ وہ گھر کی خواتین کیساتھ اندر چلی گئی تھیں۔ گھر کی عورتوں نے ان پر سوالات کی بوچھاڑ کر دی تھی۔ وہ سب کو اس واردات کی تفصیلات بتا رہی تھیں۔

ڈرائنگ روم میں گھر کے مرد اکٹھا تھے اور اس واردات کی جزئیات پر مکالمہ ہو رہا تھا۔ لبنیٰ کے چلے جانے پر دونوں گھرانے بے حد فکرمند تھے' رنجیدہ تھے۔ ایک کی بیٹی گئی تھی تو ایک کی دلہن گئی تھی۔

"ان کمینوں کو جو کچھ لوٹنا تھا لے جاتے' پر میری بیٹی کو چھوڑ جاتے۔" ڈاکٹر عرفان ہاتھ مل رہے تھے۔

"کاش' ایسا ہوتا تو ہم میں سے کسی کو افسوس نہ ہوتا۔ زیورات روپیہ پیسہ تو آنی جانی چیزیں ہیں۔ لڑکی کے مقدر میں ہوتیں تو پھر اسے حاصل ہو جاتیں۔" زاہد نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔

"وہ کس طرح کے لوگ تھے؟" ڈاکٹر عرفان نے اکبر سے سوال کیا۔

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

"وہ چار تھے اور چاروں نوجوان تھے' ہماری ہی عمروں کے رہے ہوں گے۔ قد کاٹھ بھی ان کے ہمارے جیسے تھے۔ لمبے تڑنگے نہ تھے' پستہ قد بھی نہ تھے۔ مناسب قد تھے ان لوگوں کے۔

"چہروں پر نقاب تھا؟" زاہد نے پوچھا۔

"نہیں ابو' ان کے چہرے کھلے ہوئے تھے۔" اس مرتبہ مجید نے جواب دیا۔

اگر وہ دوبارہ نظر آئیں تو کیا تم لوگ انہیں پہچان لو گے؟"

"جہاں یہ واردات ہوئی ہے وہاں اندھیرا تھا۔ پھر سب کچھ اتنا آناً فاناً ہوا کہ سب کے ذہن ماؤف سے ہو گئے۔ ہم میں سے کسی نے ان کے چہروں پر غور نہیں کیا۔ اگر غور کرتے بھی تو شاید ان کے چہروں کے نقوش یاد رکھنا مشکل ہوتا کیونکہ اندھیرا ہونے کی وجہ سے ان کے چہرے واضح طور پر دکھائی نہیں دے رہے تھے۔" اکبر نے کہا۔

"کیا وہ لوگ پہلے سے سڑک پر کھڑے تھے؟" سوال ہوا۔

"نہیں' وہ پیچھے سے آئے اور انہوں نے گاڑی اس طرح آگے لا کر روکی کہ اگر مجھ سے ذرا بھی غفلت ہو جاتی تو دونوں گاڑیاں آپس میں ٹکرا جاتیں۔"

"تم لوگوں کو تعاقب کیے جانے کا احساس نہیں ہوا؟"

"نہیں' اس طرف کسی نے دھیان ہی نہیں دیا۔ گاڑی میں تیز آواز میں کیسٹ بج رہا تھا۔ ہم سب کا دھیان موسیقی کی طرف تھا۔ اگر کسی طرح ہمیں یہ احساس ہو جاتا کہ کوئی گاڑی ہمارے تعاقب میں ہے تو پھر میں گاڑی کو تیز بھگا لاتا۔" اکبر نے کہا۔

"وہ تم لوگوں سے بھی گھڑیاں' انگوٹھیاں اور نقدی چھین کر لے گئے۔ بظاہر یہ ڈکیتی کی واردات لگتی ہے۔" زاہد نے قیاس آرائی کی۔

نہیں زاہد صاحب۔ یہ محض ڈکیتی کی واردات نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ نقدی اور زیورات لوٹ کر چلے جاتے۔ لیٹی کو اپنے ساتھ نہ لے جاتے۔" ڈاکٹر عرفان نے کہا پھر کچھ توقف کر کے بولے۔

"یہ سب اسی کی کارستانی ہے' جسے میں اب تک محض مذاق سمجھتا رہا۔"

"کس کی کارستانی؟ کون ہے وہ؟" ایک دم سب چونک پڑے۔

"وہ مجھے اکثر فون کرتا تھا۔" ڈاکٹر عرفان نے کہا۔

"کون؟" پوچھا گیا۔

"یہ مجھے نہیں معلوم کہ وہ کون ہے؟" جواب ملا۔

"فون پر کیا کہتا تھا؟" پھر پوچھا گیا۔

"وہ مجھے لیٹی کی شادی کرنے سے روکتا تھا۔" پھر جواب ملا

"وہ کیا کہتا تھا!" سوال پر سوال۔

"وہ کہتا تھا کہ آپ لیٹی کی شادی ہرگز نہ کریں۔" جواب پر جواب۔

"کیا وہ خود لیٹی سے شادی کرنا چاہتا تھا؟" زاہد نے پوچھا۔

"نہیں' اس بات کا ذکر اس نے کبھی نہیں کیا' لیکن وہ جو کوئی بھی ہے' ہے بڑا باخبر۔ اسے ایک ایک بات کی فوراً خبر ہو جاتی تھی۔

جب روشن اور لیٹی کی منگنی ہو گئی تو دوسرے دن اس کا فون آیا۔ اس نے منگنی کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ میں لیٹی کی شادی ہرگز روشن سے نہ کروں۔ اس نے روشن کے دفتر میں کئی لڑکیوں سے فلرٹ کرنے کے واقعات سنائے۔ میں نے لیٹی کو بتایا تو وہ یہ سن کر دیر تک ہنستی رہی۔ اس نے کہا' ڈیڈی میں اور روشن ایک ہی فرم میں کام کرتے ہیں۔ وہ جتنا فلرٹ ہے میں اچھی طرح جانتی ہوں' یہ محض آپ کا ذہن خراب کرنے کی کوشش ہے اور کچھ نہیں۔ لیٹی کی بات سن کر میں مطمئن ہو گیا' پھر میں نے ان ٹیلی فون کالوں کو کوئی اہمیت نہ دی۔ محض ایک بے ہودہ مذاق سمجھتا رہا' لیکن اب معلوم ہوا کہ وہ سب مذاق نہ تھا۔ وہ انتہائی سنجیدگی سے مجھے تنبیہ کر رہا تھا۔"

"کیا شادی سے پہلے بھی اس نے تنبیہ کی تھی؟" سوال ہوا۔

"شادی سے ایک دن پہلے تک وہ مجھے مسلسل تنبیہ کرتا رہا تھا اور میں اسے جواب میں گالیاں دیتا رہا تھا۔" جواب ملا۔

"یہ تو کوئی خطرناک چکر معلوم ہوتا ہے۔ ہمیں فوراً چل کر تھانے میں رپورٹ لکھوانا چاہیے۔" زاہد نے کہا۔

"ظاہر ہے' رپورٹ تو ہر صورت میں لکھوانا ہو گی۔ روشن کہاں ہے' اسے بلائیں تاکہ ساتھ لے چلیں"۔ ڈاکٹر عرفان نے اٹھتے ہوئے زاہد سے کہا۔

بھائی کو میں لاتا ہوں بلا کر' آپ لوگ باہر چلیں۔" مجید نے کہا۔ پھر وہ اندر چلا گیا۔

ابھی یہ لوگ تھانے جانے کے لیے گاڑی میں بیٹھ ہی رہے تھے کہ عالیہ بھاگتی ہوئی باہر آئی۔

"ابو' ابو آپ کا فون ہے۔"

"میرا!" زاہد نے حیرت سے کہا۔ "اس وقت کس کا فون آ گیا؟ تم نے نام پوچھا؟"

"میں نے نام پوچھا تھا' لیکن انہوں نے بتایا نہیں۔ کہنے لگے' وہ میرے نام سے واقف نہیں' لیکن بات بہت ضروری ہے' فوراً بلائیں۔ عالیہ نے ان کے ساتھ چلتے ہوئے بتایا۔

یہ سن کر زاہد کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ وہ تیز تیز چلتے ٹیلی فون کے پاس پہنچے۔ انہوں نے ریسیور اٹھا کر تذبذب کے عالم میں 'ہیلو' کہا

"زاہد صاحب بول رہے ہیں؟ ادھر سے تصدیق چاہی گئی۔

"جی جناب' میرا نام زاہد ہے' فرمائیے۔"

"مجھے فرمانا نہیں' عرض کرنا ہے اور عرض یہ ہے کہ آپ کی بہو ہمارے پاس بحفاظت پہنچا دی گئی ہے۔ آپ اس کی واپسی کے لیے پریشان ہوں گے....."

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

ادھر سے ابھی بات جاری تھی کہ زاہد نے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر عالیہ سے ڈاکٹر کو بلانے کو کہا۔ وہ فوراً دوڑی چلی گئی۔

"ہیلو!"

"جی فرمائیے' میں آپ کی بات سن رہا ہوں۔"

"مجھے جانے کیوں ایسا لگا کہ آپ میری بات سن نہیں رہے۔ آپ نے ماؤتھ پیس پر بھی غالباً ہاتھ رکھا تھا۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟ خیر' میں یہ عرض کر رہا تھا ویسے میں لمبی چوڑی بات کرنے کا عادی نہیں صاف اور دوٹوک بات کرنے کا عادی ہوں' آپ اپنی بہو کے سلسلے میں فکرمند نہ ہوں۔ ذرا حوصلے سے کام لیں آپ کی بہو آپ کو صبح دس بجے تک مل جائے گی۔"

ابھی یہ بات جاری تھی کہ ڈاکٹر عرفان پریشان سے کمرے میں داخل ہوئے۔ زاہد نے انہیں دیکھ کر فوراً ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ لیا۔ "کون ہے؟" ڈاکٹر عرفان نے پوچھا۔

"وہی ہے۔" زاہد نے آہستہ سے کہا۔

"لائیں' مجھے دیں فون۔" ڈاکٹر عرفان نے ان سے ریسیور لینا چاہا' لیکن زاہد نے ہاتھ کے اشارے سے ٹھہرنے کو کہا۔

"بھئی زاہد صاحب' کیا بات ہے۔ آپ بار بار کہاں غائب ہو جاتے ہیں۔ میرے خیال سے آپ کو اپنی بہو سے زیادہ دلچسپی نہیں' ٹھیک ہے' میں بند کرتا ہوں فون۔"

"نہیں' نہیں یہ بات نہیں ہے۔" زاہد نے گھبرا کر کہا "دراصل ہم لوگ اتنے پریشان ہیں کہ ذہن کام نہیں کر رہا ہے۔"

"آپ کے بیٹے کو تو ڈاکٹر عرفان نے اب تک گھر پہنچا دیا ہوگا؟"

"جی ہاں' روشن گھر پہنچ گیا۔ ڈاکٹر عرفان اس وقت میرے پاس کھڑے ہیں' کیا....."

"زاہد صاحب' میں آپ کے علاوہ اب کسی سے بات نہیں کروں گا۔" ادھر سے زاہد کی بات کاٹ کر فوراً کہا گیا۔ "میں ڈاکٹر عرفان سے بہت بات کر چکا ہوں۔ انہوں نے میری بات نہیں مانی' نتیجہ سامنے ہے۔ میں بہت ضدی آدمی ہوں۔ ایک بار جو سوچ لوں' اسے کر کے چھوڑتا ہوں۔ اب آپ کو پہلی اور آخری بار سمجھائے دیتا ہوں آپ کو آپ کی بہو مل جائے گی' لیکن اس سلسلے میں پولیس سے کسی قسم کی مدد لی گئی تو..... بہو آپ کو اس صورت میں بھی ملے گی' لیکن وہ زندہ نہ ہوگی۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ لوگ اس واقعے کو کسی خواب کی طرح بھلا دیجئے' ویسے بھی اس واقعے سے ابھی کوئی واقف نہیں' کسی کو بتانے کی بھی ضرورت نہیں' میں وعدہ کرتا ہوں کہ نہ صرف آپ کی بہو مل جائے گی بلکہ گاڑی اور لوٹی ہوئی دیگر اشیاء بھی واپس مل جائیں گی۔ اب آپ پتا نوٹ کر لیجئے۔"

"کاغذ۔" زاہد نے عالیہ سے کہا۔

عالیہ نے جلدی سے کسی کاپی میں سے ایک سادہ ورق پھاڑا اور اپنے والد کے سامنے

رکھ دیا۔

"جی فرمائیے۔" زاہد نے کاغذ اور بال پین سنبھالتے ہوئے کہا۔

جواب میں ادھر سے پتا لکھوایا گیا اور کہا گیا۔ "ٹھیک دس بجے آپ بتائے ہوئے پتے پر پہنچ جائیں' آپ کی بہو آپ کو گاڑی میں مع سامان بیٹھی ہوئی مل جائے گی۔ آخر میں ایک بار پھر یاد دلا دوں کہ پولیس کو اس سلسلے میں کسی قسم کی زحمت دینے کی ضرورت نہیں' ورنہ نتیجے کے خود ذمے دار ہوں گے۔" یہ کہہ کر ادھر سے ریسیور رکھ دیا گیا۔

ادھر سے گفتگو ختم ہونے پر زاہد نے ایک گہرا اور ٹھنڈا سانس لیا۔ "اللہ رحم!"

"کیا ہوا؟ کیا کہہ رہا تھا وہ؟" ڈاکٹر عرفان نے بے قرار ہو کر پوچھا۔

"ڈاکٹر صاحب! ہمیں لٹی بیٹی مل جائے گی۔ زاہد نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر تسلی دی۔

"آپ نے مجھے ریسیور کیوں نہیں دیا! میں اس سے بات کرتا۔" ڈاکٹر عرفان نے کہا۔

"اب اس سے بات کرنے کا کیا فائدہ تھا۔ بات تو اس نے ختم کر دی۔ اس نے کہا کہ صبح دس بجے ہمیں اس پتے سے لٹی مل جائے گی۔ نہ صرف لٹی مل جائے گی بلکہ لوٹی ہوئی اشیاء اور گاڑی بھی مل جائے گی۔" وہ کتے کا بچہ ہے کون! میں اس کا خون پی جاؤں گا۔" روشن نے غصے سے کہا۔

"بیٹا' اس وقت غصے سے کام نہیں چلے گا۔ اس وقت ہمیں اس کی ہدایت پر عمل کرنا ہو گا۔"

"کیا کہا ہے اس نے؟" روشن نے پوچھا۔

"بس اس نے ایک بات کہی ہے کہ اس سلسلے میں پولیس سے مدد نہ لی جائے۔"

"ورنہ.....؟" روشن نے پوچھا۔

"ورنہ لٹی ہم تک زندہ نہ پہنچے گی۔" زاہد نے ٹھنڈا سانس لیتے ہوئے کہا۔

"خدا کا شکر ہے کہ اس نے لٹی کے عوض ہم سے کوئی مطالبہ نہیں کیا۔" اس مرتبہ روشن کا دوست اکبر بولا۔ اسے اب اپنی گاڑی ملنے کی آس ہو گئی تھی۔ "ہمیں کیا ضرورت ہے کہ پولیس سے رجوع کریں۔"

"ہاں' اب پولیس میں رپورٹ کرنے کا ارادہ ملتوی کر دینا چاہئے' کیونکہ اس سے فائدہ پہنچنے کے بجائے نقصان ہونے کا احتمال ہے۔" زاہد نے ڈاکٹر عرفان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہ ہے کون شخص؟" روشن کو رہ رہ کر غصہ آ رہا تھا۔ "اس نے یہ سب کیوں کیا؟"

یہ ایک ایسا سوال تھا جس کا جواب کسی کے پاس نہ تھا۔

اگر لٹی کو تاوان وصول کرنے کے لیے اغوا کیا گیا تھا تو وہ بغیر تاوان وصول کیے اسے

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

آزاد کیوں کر رہا تھا۔ اگر یہ محض ڈکیتی کی واردات تھی تو ڈاکو لوٹا ہوا مال کب واپس کرتے ہیں۔ اس نے تو لوٹ کے مال کی واپسی کا بھی یقین دلا دیا تھا۔ سوال یہ تھا کہ اگر لوٹ کا مال واپس ہی کرنا تھا تو اسے لوٹا کیوں گیا۔ ہو سکتا ہے اس کے گرگوں نے یہ کام غلطی سے کیا ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پہلے اس نے سوچا ہو کہ اس واردات کو ڈکیتی کی واردات بنا دیا جائے تاکہ پولیس میں رپورٹ ہونے کی صورت میں پولیس محض اسے ڈکیتی کی واردات سمجھے' لیکن بعد میں جب اسے اندازہ ہو گیا کہ ابھی پولیس میں رپورٹ نہیں کی گئی ہے تو اس نے ارادہ بدل دیا اور اس واردات کو شریفانہ واردات بنا دیا۔

بہرحال یہ ایک گورکھ دھندا تھا۔ ایک معما تھا' سمجھنے کا نہ سمجھانے کا۔ وہ کون تھا کیا چاہتا تھا' اس نے لبنیٰ کو کیوں اغوا کیا' اغوا کیا تو چھوڑنے کا ارادہ کیوں کیا۔ وہ لبنیٰ کی روشن سے شادی کیوں نہیں ہونے دینا چاہتا تھا؟ یہ وہ سوالات تھے جن کا جواب کسی کے پاس نہ تھا۔۔

یہ بات تو لبنیٰ کو بھی معلوم نہ تھی۔

اس پر یہ افتاد اچانک پڑی تھی۔ اس واردات کے وقت اس پر لرزہ طاری ہو گیا تھا۔ خوف کے مارے چیخ اس کے حلق میں گھٹ گئی تھی۔ پھر بھی جب وہ لوگ اس کے اپنوں کو اتار کر اسے اغوا کر کے لے چلے تو اس نے مزاحمت کی ناکام کوشش کی۔ ساتھ بیٹھے شخص نے اچانک اپنی جیب سے رومال نکال کر اس کے منہ پر رکھ دیا۔

اس رومال کے رکھتے ہی آناً فاناً اس کی دنیا اندھیر ہو گئی۔ وہ ہوش گنوا بیٹھی۔

ہوش آنے کے بعد پہلے تو اس کی سمجھ میں ہی نہ آیا کہ وہ کہاں ہے۔ اس نے اپنے گرد اندھیرا پایا۔ پھر اسے خوشبو محسوس ہوئی۔ اس کے بعد اس نے گردن اٹھا کر چاروں طرف نظر ڈالی تو خوابناک اندھیرے میں اس نے خود کو کسی بیڈ روم میں پایا۔

وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کے اٹھتے ہی کمرے میں لگی بتیاں روشن ہو گئیں۔ اسے لگا جیسے بتیاں اس کے اٹھنے سے روشن ہو گئی ہوں' لیکن ایسا نہیں تھا' کوئی کمرے میں تھا جو اس کے ہوش میں آنے کا انتظار کر رہا تھا اور جیسے ہی وہ اٹھ کر بیٹھی' منتظر شخص نے کمرے کی بتیاں روشن کر دیں۔

لبنیٰ نے اسے پلٹ کر دیکھا' وہ کوئی خوش لباس نوجوان تھا۔ ریوالور اس کے ہاتھ میں تھا اور ہونٹوں پر مسکراہٹ۔ وہ بیڈ کے نزدک آ کر رک گیا۔ اس نے کوئی بات نہ کی جیسے وہ لبنیٰ کے بولنے کا منتظر ہو۔

"کون ہو تم؟ مجھے یہاں کیوں لائے ہو؟" لبنیٰ نے سوال کیا۔

"سوالات کر کے اپنے آپ کو ہلکان نہ کریں۔ یہ بتائیں آپ کو کسی چیز کی ضرورت تو نہیں۔"

"نہیں' مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ مجھے یہ بتاؤ' میں کہاں ہوں۔" لبنیٰ نے پوچھا۔

"آپ اسی شہر میں ہیں۔" اس نوجوان نے جواب دیا۔

"خدا کے واسطے مجھے جانے دو' تم نے مجھ سے کس وقت کی دشمنی نکالی ہے۔ میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے۔ میں تو تمہیں جانتی بھی نہیں ہوں۔" لبنیٰ نے شکوہ کیا۔

"آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ آپ واقعی مجھ سے واقف نہیں۔" جواب ملا۔

"پھر یہ سب کیا ہے' مجھے کیوں اغوا کیا گیا ہے۔ مجھ سے میری خوشیاں کیوں چھینی گئی ہیں؟"

'یہ سب میں نہیں جانتا' اوپر والا جانتا ہے۔ میں تو اس کا ایک ادنیٰ پیروکار ہوں۔"

"اوپر والا کون' تمہارا مطلب اللہ؟"

"جی نہیں' اللہ تو بہت اوپر ہے' سب سے اوپر' میں تو اس چھت کی بات کر رہا تھا۔ اس چھت کے اوپر ایک کمرا ہے' وہاں ہمارے باس موجود ہیں۔ وہی اس اغوا کی وجہ جانتے ہیں۔" اس نوجوان نے بتایا۔

"کون ہیں تمہارے باس؟"

"یہ میں آپ کو کیسے بتا سکتا ہوں؟"

"تم مجھے کوئی اچھے آدمی دکھائی دیتے ہو۔ خدا کے واسطے بتاؤ' یہ سب کیا ہے۔"

"نہیں' یہ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے کہ میں کوئی اچھا آدمی ہوں۔ اچھے آدمی کسی کی نئی نویلی دلہن کو اغوا نہیں کرتے۔ لہٰذا مجھ سے کسی بھلائی کی توقع نہ رکھیں۔ ہمارے باس اوپر کسی کو ضروری ٹیلی فون کرنے گئے ہیں۔ وہ اوپر سے آنے ہی والے ہوں گے۔"

ابھی وہ نوجوان یہ بات کر ہی رہا تھا کہ ایک مکروہ صورت آدمی اندر داخل ہوا۔

اس کے ہاتھ میں کچھ تھا' اسے دیکھ کر لبنیٰ گھبرا گئی۔

"خدا کے واسطے' مجھے انجکشن نہ لگاؤ۔" اس نے فریاد کی۔

لیکن اس کی فریاد سننے والا کوئی نہ تھا۔ وہ لوگ اندھے اور بہرے تھے۔ انہوں نے کچھ دیکھا نہ سنا۔ لبنیٰ کو پکڑ کر اس کے بازو میں سرنج گھونپ دی۔

انجکشن لگتے ہی اس کی آنکھوں میں اندھیرا پھیل گیا۔ اسے لگا جیسے وہ روئی کے گالوں میں دھنستی چلی جا رہی ہے۔ پھر اس پر گہری نیند طاری ہو گئی۔

جب دوبارہ اس کی آنکھ کھلی تو اس نے خود کو اسی گاڑی میں میں پایا جس میں اسے اغوا کیا گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

جب وہ لوگ بتائے ہوئے پتے پر ٹھیک دس بجے پہنچے تو ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ گاڑی اس میدان میں کھڑی تھی۔

اکبر اپنی گاڑی دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ اکبر کے ساتھ روشن تھا۔ اس نے دور ہی سے لبنیٰ کو

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

دیکھنے کی کوشش کی' لیکن گاڑی میں لبنیٰ کی کوئی جھلک دکھائی نہیں دی۔ اس کے چہرے پر مردنی چھا گئی۔ روشن نے مڑ کر ڈاکٹر عرفان پر نظر ڈالی۔ انہوں نے بھی گاڑی کو خالی محسوس کرلیا تھا۔ وہ بھی پریشان ہو گئے تھے۔

بس یہ تینوں ہی یہاں آئے تھے۔ زاہد کو روشن اور اکبر نے آنے سے منع کر دیا تھا۔ وہ تو ڈاکٹر عرفان کو بھی ساتھ نہیں لانا چاہتے تھے کہ وہاں جا کر جانے کیا صورت حال سامنے آئے' لیکن ڈاکٹر عرفان نہیں مانے۔ وہ اپنی بیٹی کے لیے ہر خطرے سے گزرنے کے لیے تیار تھے۔

ساڑھے نو بجے کے قریب اس میدان میں دو گاڑیاں داخل ہوئیں تھیں۔ درمیان میں پہنچ کر دونوں گاڑیاں ایک دوسرے کے برابر رک گئیں۔ لبنیٰ والی گاڑی سے دو آدمی تیزی سے باہر نکلے اور جلدی سے دوسری گاڑی میں بیٹھ گئے۔ پھر وہ گاڑی لبنیٰ والی گاڑی کو پیچھے چھوڑ کر برق رفتاری سے میدان سے نکل گئی۔ اگر یہ لوگ دس بجے سے پہلے آئے ہوتے تو اس برق رفتار گاڑی کو ضرور دیکھ لیتے۔ ویسے ان کے دیکھنے کا کوئی فائدہ نہ ہوتا۔ وہ لوگ مسلح تھے اور ہر خطرے سے نبٹنے کے ماہر۔ ان کا کچھ بگاڑنا ممکن نہ تھا۔ یہ لوگ تو ویسے ہی ڈرے سہمے تھے۔ کسی جارحانہ قدم کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ وہ کسی معمول کی طرح ٹیلی فون پر ملنے والی ہدایت پر عمل کر رہے تھے۔ وہ وعدہ خلافی کر کے اس نادیدہ شخص کو ناراض کرنا نہیں چاہتے تھے۔

اس گاڑی کو میدان میں کھڑے آدھا گھنٹا ہو گیا تھا' لیکن اس علاقے کے کسی آدمی نے اس طرف توجہ نہ دی تھی۔ اول تو میدان سے دو چار آدمی ہی گزرے تھے۔ یہ عام گزرگاہ نہ تھی' لیکن ان دو چار آدمیوں نے بھی اس طرف توجہ نہ دی تھی۔ یہ تو خیر گاڑی تھی' اگر اس گاڑی کی جگہ کوئی لاش پڑی ہوتی تب بھی لوگوں کا رویہ یہی ہوتا۔ وہ اسے دور سے ہی دیکھ کر گزر جاتے۔ ویسے اس میں لوگوں کا بھی قصور نہ تھا۔ اصل میں ہمارے معاشرے نے جو رخ اختیار کر لیا ہے اس میں ہر شخص ہمدردی کرتے ہوئے گھبراتا ہے' کیونکہ یہ ہمدردی بسا اوقات بڑی مہنگی پڑتی ہے۔

ڈاکٹر عرفان اور روشن کو جب گاڑی خالی محسوس ہوئی تو انہوں نے اپنے چلنے کی رفتار تیز کر دی۔ پھر انہوں نے دوڑنا شروع کر دیا۔

گاڑی کے نزدیک پہنچ کر انہیں سرخ کپڑے نظر آئے۔ سرخ کپڑے دیکھ کر ڈاکٹر عرفان کے چہرے پر ایک لمحے کو سکون کی لہر آئی پھر یہ سکون کی لہر خوف میں تبدیل ہو گئی۔ لبنیٰ گاڑی میں جس طرح پڑی تھی' اس سے اس کا زندہ ہونا ثابت نہ تھا۔ لبنیٰ کی بس اسی لمحے آنکھ کھلی تھی جب اسے مسلح نوجوان نے اسے جھٹکے سے سیٹ پر لٹایا تھا اور خود تیزی سے گاڑی سے اتر گیا تھا۔ اسی وقت لبنیٰ کو ہوش آیا تھا۔ اس نے خود کو رات والی کار میں پایا تھا اور پھر کوشش کے باوجود اس کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہو کر بند ہو گئی تھیں۔ اب وہ اس طرح گاڑی میں لبنیٰ تھی' جیسے زندگی اس سے روٹھ گئی ہو۔

کیا اس شخص نے ہمیں دھوکا دے دیا۔ ہم نے تو اس کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے

پولیس سے بھی رجوع نہیں کیا۔ پھر اس نے ایسا کیوں کیا۔ اس نے لبنیٰ کی زندگی کیوں لے لی؟ سوچ کی ایک لہر ڈاکٹر عرفان کے دماغ میں آ کر تیزی سے نکل گئی۔

ڈاکٹر عرفان نے گھبرا کر دروازہ کھولنے کے لیے ہاتھ بڑھایا' لیکن دروازہ اندر سے بند تھا۔ روشن نے گاڑی کے دوسری طرف کا دروازہ کھولنا چاہا' لیکن وہ بھی بند تھا۔ گاڑی کے چاروں دروازے اندر سے بند تھے۔ کھڑکیوں کے شیشے چڑھے ہوئے تھے اور گاڑی کی چابی اگنیشن میں لگی ہوئی تھی۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ چابی گاڑی میں موجود تھی۔

روشن نے پتھر مار کر گاڑی کا شیشہ توڑا۔ پھر اس نے گاڑی کے اندر جا کر تمام دروازے کھول دیے۔ ڈاکٹر عرفان نے لپک کر لبنیٰ کو ہلایا' جلایا' اٹھا کر بٹھانے کی کوشش کی' لیکن اس کی لٹکی ہوئی گردن دیکھ کر اسے پھر سے سیٹ پر لٹا دیا' اس کی نبض دیکھی' آنکھیں کھول کر چیک کیں۔

"روشن جلدی کرو' اسے گھر لے چلو۔ اس پر غشی طاری ہے۔"

ڈاکٹر عرفان نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

اتنی دیر میں اکبر ڈرائیونگ سیٹ سنبھال چکا تھا۔ اس نے ڈاکٹر عرفان کے کہتے ہی گاڑی سٹارٹ کر دی۔ مجید گاڑی میں نہیں بیٹھا تھا۔ وہ ڈاکٹر عرفان کی دور کھڑی گاڑی کی طرف بڑھا تاکہ اسے گھر لے جا سکے۔

☆.....☆.....☆

لبنیٰ کی آنکھ کھلی تو اس نے اپنے سامنے اپنی امی فریدہ کو بیٹھے پایا۔ وہ خالی خالی نگاہوں سے انہیں دیکھتی رہی۔ انہوں نے لبنیٰ کی آنکھیں کھلی دیکھ کر' اسے بہت محبت سے دیکھا۔ پھر جھک کر اس کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں لیا اور محبت سے پوچھا۔ "میری چندا' کیسی ہو؟"

لبنیٰ نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے ماں کی طرف خالی خالی نگاہوں سے دیکھ کر آنکھیں جھپکائیں' جس کا مطلب فریدہ نے یہ نکالا کہ لبنیٰ کہہ رہی ہے' میں ٹھیک ہوں۔

بس ایسا ہی ہو رہا تھا۔ لبنیٰ پر مستقل غشی طاری تھی۔ کبھی کبھی وہ آنکھیں کھولتی' آنکھیں کھول کر چاروں طرف دیکھتی اور پھر بند کر لیتی۔ کبھی اس پر بے ہوشی طاری ہو جاتی اور کبھی وہ اپنے آپ ہی آنکھیں بند کر لیتی۔

ڈاکٹر عرفان نے گھر کے ہر فرد کو منع کیا تھا کہ وہ لبنیٰ کو زبردستی بولنے پر مجبور نہ کرے اور نہ ہی اس کے سامنے کوئی ایسی بات کی جائے کہ اس کے دل کو ٹھیس پہنچے۔ لبنیٰ کی خوش قسمتی تھی کہ اس کا باپ ڈاکٹر تھا اور اس کا شمار اچھے ڈاکٹروں میں ہوتا تھا۔ اگر وہ نہ ہوتے تو اسے ہسپتال میں داخل کرانا پڑتا اور وہاں اس بے ہوشی کی وجہ بھی بتانا پڑتی۔ پھر بات یقیناً پولیس تک پہنچتی۔ پولیس اس سلسلے میں کیا کرتی' یہ سب جانتے تھے' ان کی پریشانیوں میں مزید اضافہ ہو جاتا۔ پھر یہ بھی ممکن تھا کہ اس شخص سے بدعہدی کی صورت میں لبنیٰ کی زندگی خطرے میں پڑ جاتی۔

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

ڈاکٹر عرفان' لبنیٰ کا گھر پر ہی علاج کر رہے تھے۔ خاندان والوں کو کچھ معلوم نہ تھا' بس یہی معلوم تھا کہ وہ بیمار ہے۔ کیوں بیمار ہے' اس سلسلے میں کسی کو کچھ معلوم نہ تھا۔

لبنیٰ نے تھوڑی دیر بعد پھر آنکھیں کھولیں۔ امی پھر سامنے تھیں۔ انہوں نے پوچھا۔

"بیٹا' جوس پیو گی۔"

لبنیٰ نے گردن کے خفیف سے اشارے سے انکار کیا۔

"بیٹا' تم دن بھر لیٹی رہتی ہو' کچھ دیر اٹھ کر بیٹھ جاؤ۔ تمہیں اٹھا کر بٹھاؤں؟ انہوں نے پوچھا۔

لبنیٰ نے آنکھ کے اشارے سے 'ہاں' کہا۔

فریدہ کو لبنیٰ کی یہ بات بہت اچھی لگی۔ انہوں نے سہارا دے کر اسے بٹھایا اور اس کی پشت سے تکیے لگا دیئے' لیکن مشکل سے وہ چند منٹ بیٹھی ہوگی کہ اس پر غشی طاری ہونے لگی۔ فریدہ نے جلدی سے اسے لٹا دیا۔

پھر دو تین گھنٹے بعد اسے ہوش آیا تو اس وقت کمرے میں کوئی نہ تھا۔ ابھی وہ گردن اٹھا کر دیکھ ہی رہی تھی کہ فریدہ کمرے میں داخل ہوئیں۔

"جاگ گیا' میرا بیٹا۔" انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اب تو بھوک لگ رہی ہوگی؟"

لبنیٰ نے گردن اثبات میں ہلائی۔

فریدہ نے اس کی گردن ذرا سی اٹھا کر جوس کا گلاس اس کے منہ سے لگا دیا۔ لبنیٰ نے تھوڑا سا جوس پیا' پھر گلاس سے منہ ہٹا لیا۔ فریدہ نے گلاس سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر' تولیے سے اس کا منہ صاف کیا اور اس کا سر تکیے پر ٹکا دیا۔

پھر وہ جا کر گرم پانی لے آئیں۔ انہوں نے تولیہ گرم پانی میں بھگو کر اس کے چہرے پر پھیرا۔ اس کے ہاتھ بھی صاف کیے۔ اس اثنا میں لبنیٰ آنکھیں بند کیے لیٹی رہی۔ انہیں نہیں معلوم تھا کہ وہ بے ہوش ہے یا اس نے خود ہی آنکھیں بند کر رکھی ہیں۔

جب فریدہ نے اس کے بالوں میں برش پھیرنے کے لیے سر ایک طرف کیا اور اس کے خوبصورت ریشمی بالوں میں برش پھیرا تو لبنیٰ نے آنکھیں کھول دیں۔ فریدہ کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا آئینہ تھا۔ وہ جب بھی اس کے بالوں کو برش کرتی تھیں تو لبنیٰ ان سے آئینہ دیکھنے کو ضرور مانگتی تھی۔ اب بھی اس نے آنکھ کے اشارے سے آئینہ مانگا۔ فریدہ نے وہ چھوٹا سا خوبصورت آئینہ جسے نیچے سے پکڑا جا سکتا تھا' لبنیٰ کے ہاتھ میں دے دیا۔

لبنیٰ نے اپنی صورت آئینے میں دیکھی۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ اس نے اپنی آنکھوں کے آنسو چھپانے کے لیے آئینہ منہ پر رکھ لیا۔

فریدہ جانتی تھیں کہ لبنیٰ نے اپنے آنسو چھپانے کے لیے آئینہ منہ پر رکھ لیا ہے۔ وہ جاننا چاہتی تھیں کہ لبنیٰ آئینہ دیکھ کر کیوں روتی ہے۔ اسے کیا صدمہ پہنچا ہے۔ فریدہ اس سے بہت سے

سوالات کرنا چاہتی تھیں' لیکن ڈاکٹر عرفان نے انہیں سختی سے منع کر دیا تھا کہ وہ اس سے کوئی ایسا سوال نہیں کریں گی جس سے اس کی پریشانی میں اضافہ ہو۔ یا دل دکھے۔ ڈاکٹر عرفان کی نظر میں ابھی اس کی حالت ایسی نہیں تھی کہ اس سے کچھ پوچھا جائے۔ ابھی تو محض اس کی دلجوئی کی ضرورت تھی۔ صحت یاب ہونے کے بعد ہی اس سے کچھ پوچھا جا سکتا تھا۔

وہ آئینہ دیکھتی تو اسے اپنی صورت نظر آتی۔ وہ بہت حسین لڑکی تھی۔ پرکشش چمکتی آنکھیں' سرخ و سفید رنگت بہت گھنے اور لمبے بال۔ وہ اکثر بالوں کا جوڑا بناتی۔ وہ ہنستی تو اس کے سفید موتیوں جیسے دانت جھلکنے لگتے۔ نازک' ترشے ہوئے' گلابی ہونٹ' سانچے میں ڈھلا بدن اس کا حسین ہونا ہی اسے لے ڈوبا تھا۔ اگر وہ ایک معمولی شکل و صورت کی لڑکی ہوتی تو یہ سب کا ہے کو ہوتا۔ شادی سے پہلے وہ آئینہ دیکھتی تو اپنی صورت پر ناز کرتی تھی اور اب اسے آئینے میں اپنی صورت نظر آتی تو دل میں ایک ٹیس سی اٹھتی اور آنکھوں میں آنسو بھر آتے۔

یہ حسین صورت ہی تھی جس نے اسے روشن سے ملوا دیا تھا۔ روشن نے جب پہلی بار اسے دفتر میں دیکھا تو وہ اسے دیکھتا ہی رہ گیا تھا۔ وہ تھی ہی ایسی کہ جو اسے دیکھے' بس دیکھتا ہی رہ جائے۔ اس کے چہرے سے نظر ہٹانا مشکل ہو جائے۔ روشن اس فرم میں پہلے سے ملازم تھا۔ وہ ایگزیکٹو تھا۔ لبنیٰ بھی اس فرم میں براہ راست ایک اچھی پوسٹ پر ملازم ہوئی تھی۔ اس کی حیثیت بھی کسی ایگزیکٹو سے کم نہ تھی۔

جب روشن نے لبنیٰ کو دیکھا اور لبنیٰ کی نظر روشن پر پڑی تو وہ دونوں' پہلی نظر کے شکار ہو گئے تھے۔ وہ پہلی نظر میں ہی ایک دوسرے کو بھا گئے تھے' اچھے لگے تھے' لیکن ان دونوں کے درمیان بات چیت کافی عرصے کے بعد شروع ہوئی۔

وہ روز ہی ایک دوسرے کو دیکھتے تھے' لیکن معاملہ 'ہیلو' 'ہیلو' سے آگے نہ بڑھتا۔

وہ دونوں ہی ایک دوسرے کے دائرے میں آنا چاہتے تھے' لیکن پیش قدمی کرتے ہوئے ڈرتے تھے۔ پھر خود بخود ہی ان دونوں کے درمیان بات چیت شروع ہو گئی۔ دونوں میں سے جس کے پاس بھی وقت ہوتا' وہ اٹھ کر دوسرے کے کیبن میں پہنچ جاتا۔ انہیں نہیں معلوم تھا کہ وہ ایک دوسرے کے قریب کیوں آ رہے ہیں۔ یا شاید معلوم تھا۔

جب یوں ہونے لگا کہ انہیں ایک دوسرے کو دیکھے بغیر قرار نہ آتا تو انہیں یقین ہو گیا کہ وہ ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہو گئے ہیں۔ ابھی تک' ان دونوں میں سے کسی نے اپنی زبان سے لفظ محبت ادا نہ کیا تھا۔

ایک دن جب لبنیٰ' روشن کے کیبن میں بیٹھی چائے پی رہی تھی تو روشن نے اس کی خوبصورت آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "لبنیٰ!"

"جی" لبنیٰ نے پلکوں کی جھالر اٹھائی۔

"ہم کب تک خاموش رہیں گے؟"

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

"ہم خاموش کہاں ہیں۔" لبنیٰ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "خیر آپ اپنے بارے میں تو کہہ سکتے ہیں کیونکہ بولنے کے معاملے میں خاصے کنجوس واقع ہوئے ہیں' لیکن میں تو خوب پٹر پٹر بولتی ہوں' خوب آپ کے کان کھاتی ہوں۔ میرے بارے میں تو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ میں خاموش رہتی ہوں۔"

"میں نے جو بات کہی ہے' اس پر غور کرو۔"

"کیا کہلوانا چاہتے ہیں مجھ سے۔" لبنیٰ نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

"میں صرف تم سے ہی کہلوانا نہیں چاہتا بلکہ خود بھی کہنا چاہتا ہوں۔ یوں تو ہماری آنکھیں ایک دوسرے کو اچھی طرح پہچاننے لگی ہیں' لیکن میں چاہتا ہوں کہ ہمارے درمیان جو کچھ بھی ہے' وہ لفظوں میں بیان ہو جائے۔"

"حلفیہ بیان چاہئے؟" لبنیٰ نے مذاق کیا۔

"میں اس وقت مذاق کے موڈ میں نہیں ہوں' بالکل سنجیدہ ہوں۔" روشن بولا"

"اچھا بابا ٹھیک ہے' فرمائیے گے' کیا کہنا چاہتے ہیں؟"

"میں کاغذ پر ایک جملہ لکھتا ہوں' تم اس جملے کے نیچے اس کی تصدیق یا تردید کرو گی۔"

"چلیں' ٹھیک ہے۔" لبنیٰ فوراً تیار ہو گئی۔

روشن نے ایک کاغذ پر بڑے خوشخط لفظوں میں لکھا۔ "آئی لو یو۔"

یہ لکھ کر اس نے کاغذ لبنیٰ کے سامنے رکھ دیا۔ لبنیٰ نے بڑی بے قراری سے اس کاغذ پر نظر ڈالی۔ پھر ایک رنگ حیا اس کے چہرے پر آیا۔ لبنیٰ نے بڑی مخمور نگاہوں سے روشن کو دیکھا اور قلم لینے کے لیے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

قلم لیتے ہوئے لبنیٰ کی انگلیاں اس کے ہاتھ سے مس ہو گئیں۔ اس کے جسم میں کرنٹ سا دوڑ گیا۔ ایک خوشگوار جھٹکا سا لگا۔ لبنیٰ نے قلم سنبھال کر ایک نظر روشن کے لکھے کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر پھر حیا کی سرخی دوڑی۔ پھر اس نے تیزی سے روشن کے جملے کے نیچے کچھ لکھ دیا۔

"لاؤ' دکھاؤ۔" روشن نے بے تابی سے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"ایک شرط پر دکھاؤں گی یہ کاغذ۔"

"وہ کیا؟"

"آپ اس کاغذ کو دیکھنے کے بعد فوراً پھاڑ دیں گے۔" لبنیٰ نے کہا۔

"مجھ پر اعتبار نہیں؟" روشن نے پوچھا۔

"اعتبار نہ ہوتا تو اس پر یہ جملہ کیوں لکھتی۔ مجھے آپ پر بہت بھروسا ہے۔ میں جانتی ہوں آپ اپنی زبان سے کبھی کوئی لفظ نہیں نکالیں گے جس سے میری عزت مٹی میں ملے۔ میں یہ سب جانتی ہوں پھر بھی میری خواہش ہے کہ اس کاغذ کو فوراً تلف کر دیا جائے۔ احتیاط اچھی چیز ہے۔"

"اچھا' ٹھیک ہے۔ مجھے کاغذ تو دو۔" روشن نے بے قراری سے کہا۔

لبنیٰ نے خاموشی سے' کاغذ اس کی طرف بڑھایا اور اپنی گردن جھکا لی۔

روشن نے اضطرابی کیفیت میں کاغذ پر نظر ڈالی۔ اس نے اس کے جواب میں لکھا تھا۔

"آئی لو یو ٹو"

یہ جملہ پڑھ کر روشن جھوم اٹھا۔ اس نے کاغذ اٹھا کر لبنیٰ کی تحریر کو چوم لیا۔ روشن کو کاغذ چومتے دیکھ کر لبنیٰ اندر ہی اندر سمٹ سکڑ گئی۔

"اس تحریر کو پھاڑنے کو جی نہیں چاہتا۔" روشن نے بڑی محبت سے کہا۔

"پھر اس کا تعویذ بنا کر اپنے گلے میں ڈال لیں۔" لبنیٰ ہنس کر بولی۔

"ہاں' یہ ہو سکتا ہے۔" روشن نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

کوئی تین چار دن کے بعد لبنیٰ نے روشن کے گلے میں دل کی شکل کا ایک لاکٹ پڑا ہوا تھا۔ اس لاکٹ پر 'لو' لکھا ہوا تھا۔

"یہ گلے میں کیا ہے؟" لبنیٰ نے لاکٹ کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"محبت کا تعویز۔" روشن نے اسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیا مطلب؟" لبنیٰ کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔

"اس لاکٹ کے اندر وہ کاغذ محفوظ ہے جس کے بارے میں تم نے پھاڑنے کا حکم دیا تھا۔"

"واقعی!" لبنیٰ نے بے یقینی سے کہا۔

"یقین نہیں آ رہا۔ ٹھہرو' میں تمہیں دکھاتا ہوں۔"

روشن نے گلے سے لاکٹ اتارا' لاکٹ کا لاک کھولا اور اسے لبنیٰ کی طرف بڑھا دیا۔

لبنیٰ نے دیکھا کہ اس میں ایک کاغذ تہ کیا ہوا رکھا تھا۔ وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئی۔ اس نے تو وہ بات محض مذاق میں کہی تھی۔

"کمال کرتے ہیں آپ بھی۔" لبنیٰ نے محبت بھرے لہجے میں کہا۔ "میں نے تو مذاق کیا تھا۔"

"محبت میں مذاق جائز نہیں۔" روشن نے مسکرا کر اسے دیکھا۔ "باقی سب جائز ہے۔"

"اچھا' اس لاکٹ کو آپ نہیں پہنیں گے' مجھے لاکٹ پہنے ہوئے مرد زہر لگتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے' نہیں پہنوں گا۔ ویسے بھی تم نے کبھی مجھے گلے میں لاکٹ یا زنجیر پہنے ہوئے نہیں دیکھا ہوگا۔ مجھے خود پسند نہیں' لیکن یہ تمہارے حکم کی تعمیل میں تھا۔ تم نے کہا اور میں نے اس تحریر کو تعویذ بنا کر گلے میں ڈال لیا۔" روشن' لبنیٰ پر اپنی محبت روز روشن کی طرح عیاں کرنا چاہتا تھا۔

"بہت محبت ہے مجھ سے؟" وہ بولی۔

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

"اس میں کیا شبہ ہے۔" روشن نے دل پر ہاتھ رکھا۔

"اللہ ہماری اس محبت کو نظر بد سے بچائے۔" لبنیٰ نے آنکھیں بند کر کے دعا مانگی۔

"آمین۔" روشن نے دل کی گہرائیوں سے کہا۔

محبت کو نظر بد سے بچانا کوئی آسان کام نہیں۔ جہاں محبت ہوتی ہے، وہاں نظر بد کا ہونا لازم ہے۔ دو انسانوں کو ایک دوسرے کا اسیر دیکھ کر لوگ خواہ مخواہ حسد کرنے لگتے ہیں۔ یہ محبت کی تاثیر ہے۔ محبت اور حسد ساتھ ساتھ جنم لیتے ہیں۔

ان دونوں کے ساتھ بھی یہی ہوا۔

لبنیٰ اور روشن کی محبت کی خوشبو جلد ہی دفتر میں پھیل گئی۔ لوگوں نے اپنی زبانیں کندھوں پر ڈال لیں۔ جس کے جو منہ میں آیا، اس نے کہا۔ یہ باتیں کسی نہ کسی طرح اڑتی اڑتی لبنیٰ اور روشن کے کانوں میں بھی پڑ جاتیں۔ اس دفتر میں لبنیٰ کے علاوہ پانچ چھ لڑکیاں اور بھی ملازم تھیں۔ روشن کے دوست بھی کافی تھے۔ اس دفتر میں ہر شخص بطور ہمدردی، دوسروں کے کہے گئے جملے انہیں ضرور سنا جاتا۔ بعض وقت تو یہ ہوتا کہ وہ اپنے کہے ہوئے جملے دوسروں کے نام سے سنا جاتا۔ اس طرح کے معاملات میں ایسا ہی ہوتا ہے۔

لبنیٰ کو بدنامی سے بہت ڈر لگتا تھا۔ وہ ایک نیک نام لڑکی تھی۔ وہ کسی قیمت پر یہ نہیں چاہتی تھی کہ دفتر کا ہر شخص اس کے بارے میں الٹی سیدھی باتیں کرنا شروع کر دے۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" لبنیٰ نے ایک دن پریشان ہو کر کہا۔

"اس طرح کے کاموں میں ایسا ہی ہوتا ہے۔" روشن نے ہنس کر ٹالنا چاہا۔

"روشن، پلیز!" لبنیٰ نے التجا آمیز لہجہ اختیار کیا۔ "یہ مذاق کا وقت نہیں ہے۔"

"کیا ہوا؟" روشن کو بالآخر سنجیدہ ہونا پڑا۔

"لوگ ہمارے بارے میں الٹی سیدھی باتیں کر رہے ہیں۔" لبنیٰ نے پریشان ہو کر کہا۔ "ایسی باتیں جو ہم سے ابھی تک سرزد نہیں ہوئیں۔ یہ دفتر کے لوگ ہمارے پیچھے کیوں پڑے ہوئے ہیں۔"

"کرنے دو، ہمارا کیا لیتے ہیں۔ ہمارا ضمیر تو مطمئن ہے۔"

"ہاں، ہمارا ضمیر تو مطمئن ہے، لیکن میں بدنامی سے بہت ڈرتی ہوں۔"

"تمہارا کیا خیال ہے، شوکت کو بلا کر ڈانٹ ڈپٹ کر دوں۔ اس کی زبان کچھ زیادہ چل رہی ہے۔"

"نہیں، کسی سے لڑائی جھگڑا نہیں کرنا ہے۔" لبنیٰ نے اسے سمجھایا۔

"ارے اس کی حیثیت کیا ہے۔ وہ اس دفتر میں معمولی کلرک ہے۔ میں اسے کھڑے کھڑے ملازمت سے الگ کر سکتا ہوں۔ اتنا اختیار ہے مجھے۔" روشن نے اپنے اختیارات کی دھمکی دی۔

"میں جانتی ہوں۔" لبنیٰ نے کہا۔ "لیکن ایسا ہرگز نہیں کرنا ہے۔ اس طرح لوگ ہماری جان کے دشمن ہو جائیں گے۔"

"پھر کیا کرنا ہے؟"

"میری امی تمہیں چائے پر کیوں نہ بلا لیں؟" لبنیٰ نے اسے ترچھی نظروں سے دیکھا۔

"ایسا ہو جائے تو پھر فساد کی جڑ ہی ختم ہو جائے۔" روشن خوش ہوتا ہوا بولا۔ "پھر میں کب آؤں تمہارے گھر؟" اس نے لبنیٰ کی بات سمجھتے ہوئے پوچھا۔

"میں اکثر گھر پر تمہارا ذکر کرتی رہتی ہوں۔ اس ذکر سے انہوں نے کچھ اندازہ ضرور لگا لیا ہوگا۔ میرے ابو امی بہت اچھے ہیں۔ انہوں نے مجھے اپنے بارے میں فیصلے کا اختیار دے رکھا ہے، اب وقت آ گیا ہے کہ میں انہیں اپنے فیصلے سے آگاہ کر دوں۔" لبنیٰ نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ "ویسے آپ کی طرف کیا پوزیشن ہے؟"

دونوں ہی گھروں میں، دونوں کی پوزیشن، اچھی تھی۔ دونوں کے والدین نے سماج کی دیوار بننے کی کوشش نہیں کی۔ اس طرح دونوں کے ہاتھوں میں ایک ایک عدد انگوٹھی آ گئی۔

لیکن کسی کو ان کا یہ بندھن پسند نہ آیا۔ اس نے ڈاکٹر عرفان کو ٹیلی فون کر کے روشن کے بارے میں رائے خراب کرنے کی کوشش کی، لیکن بات بنی نہیں۔

وہ کون تھا یا وہ کون لوگ تھے جو روشن اور لبنیٰ کو ایک ہوتا ہوا نہیں دیکھ سکتا یا دیکھ سکتے تھے، اس کے بارے میں روشن اور لبنیٰ اندازہ نہ لگا سکے۔ انہیں یہ اندازہ تو تھا کہ دفتر کے لوگوں میں سے ہی کسی کی حرکت ہے، لیکن یہ مذموم حرکت کس کی ہے، باوجود کوشش کے کچھ معلوم نہ ہو سکا۔

بہرحال وہ جو بھی تھا، بڑا باخبر آدمی تھا۔ لبنیٰ اور روشن کو اب اس سے خوف آنے لگا تھا۔

یہ ٹھیک تھا کہ وہ دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔ ایک دوسرے کے مزاج سے اچھی طرح واقف تھے، لیکن کب کوئی غلط فہمی ان کے دلوں میں گھر کر جائے۔ اس کا دھڑکا ہر وقت لگا رہتا تھا۔

لبنیٰ کے کہنے پر روشن نے اس فرم کے مالک راؤ حمید سے بھی بات کی تھی۔

راؤ حمید نے روشن کی تمام باتیں سن کر ایک زوردار قہقہہ لگایا تھا اور کہا تھا۔ "دنیا اسی کا نام ہے روشن۔ یہاں کوئی شخص سامنے والے کو خوش نہیں دیکھ سکتا۔ اب تم مجھے ہی دیکھ لو، میں اپنے کام سے کام رکھتا ہوں، لیکن پھر بھی لوگ میرے کاروبار کے پیچھے پڑے رہتے ہیں۔ کچھ اور نہیں ملتا تو الزامات ہی لگا دیتے ہیں۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ میرا تعلق ڈرگ مافیا سے ہے۔ اب اگر میں ان کاروباری حاسدوں کی باتوں کا اثر لینے لگوں تو دفتر کے بجائے ہسپتال میں نظر آؤں۔ اس لیے تمہارے لیے میرا مشورہ ہے کہ پریشان ہونا چھوڑ دو۔ تمہیں جو کرنا ہے کرو، تمہاری منگنی ہو گئی ہے، بس اب شادی بھی کر ڈالو تاکہ جلنے والے جل کر کباب بن جائیں۔"

راؤ حمید کے بارے میں دفتر والوں کی بڑی متضاد آراء تھیں۔ کچھ لوگ انہیں بڑا نیک نفس، شریف اور ہمدرد قسم کا آدمی سمجھتے تھے تو کچھ لوگ انہیں شہر کا ایک بڑا اسمگلر اور منشیات فروش

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

جانتے تھے۔

راؤ حمید پچاس کے پیٹے میں تھے۔ بڑھاپا ان کے چہرے سے ظاہر ہونے لگا تھا۔ ان کی صورت ایک غیر ملکی اداکار سے ملتی تھی' لیکن ان کا اداکاری کے پیشے سے کوئی تعلق نہ تھا۔ وہ ایک کامیاب بزنس مین تھے' لیکن اداکاری صرف کیمرے کے سامنے ہی تو نہیں ہوتی۔ بعض لوگ دنیا کے سٹیج پر بھی اداکاری کرتے ہیں۔ راؤ حمید بھی انہی اداکاروں میں سے ایک تھے۔

لیٹی نے ان کا نام 'مسٹر ہیرڈ' رکھ چھوڑا تھا۔ جوان رہے ہوں گے تو یقیناً کسی ہیرو سے کم نہ ہوں گے۔ اس بڑھاپے میں بھی وہ اپنے لباس کا خاص خیال رکھتے تھے۔ ان کا اٹھنا بیٹھنا' چلنا پھرنا' بات کرنا' کوئی ایسی چیز نہ تھی جس سے ان کی ایکٹنگ ظاہر نہ ہوتی ہو۔ وہ پکے ایکٹر تھے۔

راؤ حمید نے لیٹی کو ایک تقریب میں دیکھا تھا۔ جب دیکھا تھا' اس وقت طے کر لیا تھا کہ اسے اپنے دفتر میں سجا کر رہیں گے۔ جب انہیں یہ معلوم ہو گیا کہ لیٹی کس کی بیٹی ہے تو پھر اس تک پہنچنا اتنا مشکل نہ رہا۔ لیٹی ان دنوں خود جاب کی تلاش میں تھی۔ ڈاکٹر عرفان اسے ڈاکٹر بنانے کے خواہش مند تھے' لیکن لیٹی کا اس طرف رجحان نہ تھا۔ رجحان نہ دیکھ کر ڈاکٹر عرفان نے اسے آزاد چھوڑ دیا۔ لیٹی نے انگریزی میں ایم اے کر لیا اور اب وہ کسی مناسب روزگار کی تلاش میں تھی کہ ڈاکٹر عرفان کے ایک دوست' لیٹی کے لیے ایک پرکشش ملازمت لے آئے۔ لیٹی نے فوراً ہاں کر دی اور اس طرح وہ راؤ حمید کی فرم میں' راؤ حمید کی پرائیویٹ سیکرٹری کی حیثیت سے کام کرنے لگی۔

راؤ حمید پہلی نظر میں لیٹی کو اچھے آدمی لگے۔ راؤ حمید کے مہذب ہونے میں کوئی کلام نہ تھا۔ وہ سامنے والے کو بہت عزت دینے والے آدمی تھے' اس لیے لیٹی کا پہلا تاثر ان کے بارے میں اچھا قائم ہو گیا۔

دفتر میں کچھ دن گزرے اور وہاں کام کرنے والی لڑکیوں سے کچھ بے تکلفی پیدا ہوئی تو راؤ حمید کے بارے میں لیٹی کو بڑی عجیب عجیب باتیں معلوم ہوئیں۔ کچھ کا خیال تھا کہ راؤ حمید بڑے حسن پرست آدمی ہیں' اس لیے ان کے دفتر میں ہر طرف خوبصورت لڑکیاں نظر آتی ہیں۔ یہ اتفاق تھا کہ دفتر میں جتنی بھی لڑکیاں تھیں' چاہے وہ ٹائپسٹ ہوں یا افسر' کسی نہ کسی لحاظ سے پرکشش تھیں۔ کچھ لڑکیاں انہیں بڑا دل پھینک بتاتی تھیں' لیکن یہ باتیں لڑکیاں اپنے حوالے سے نہیں کرتی تھیں' اس لیے لیٹی نے ان باتوں پر سنجیدگی سے کان نہ دھرے۔

ذاتی طور پر لیٹی کو راؤ حمید ایک شریف آدمی نظر آئے۔ اس کا خیال تھا کہ وہ ان مردوں میں سے تھے جو خود کبھی پہل نہیں کرتے' لیکن اگر لڑکی خود ہی بے تکلف ہونے کی کوشش کرے تو اسے ہاتھوں سے نہیں نکلنے دیتے۔

لیٹی کو ان سے کوئی خطرہ نہ تھا' کیونکہ وہ خود سے بے تکلف ہونے والی لڑکیوں میں سے نہ تھی۔ وہ تو یونیورسٹی سے بھی بغیر انگیج کے نکل آئی تھی۔ اس نے یونیورسٹی میں کئی انگیج چلتے دیکھے تھے' کئی محبتیں پروان چڑھتی دیکھی تھیں۔ ان محبت کرنے والوں کو اچھے اچھے مشورے بھی دیئے تھے'

لیکن خود اس کا دامن محبت سے خالی رہا تھا۔ وہ بہت خوبصورت لڑکی تھی۔ اس کے حسن سے متاثر ہو کر کئی لڑکوں نے اس کے قریب آنے کی کوشش کی تھی' لیکن لیٹی نے انہیں توجہ کے قابل نہ سمجھا۔ لیٹی' مردوں میں ظاہری حسن دیکھنے کی عادی نہ تھی' وہ ظاہری حسن کے بجائے ذہن کی خوبصورتی پسند کرتی تھی۔ اسے حسین مردوں کے مقابلے میں ذہین مرد زیادہ پسند تھے۔ یونیورسٹی سطح پر اسے جو لڑکے ملے' ان میں ایک آدھ سمارٹ تو تھا' لیکن اس کی ذہنی سطح بلند نہ تھی۔ یہی وجہ تھی کہ یہ ملاقاتیں' ابتدائی ملاقاتوں سے آگے نہ بڑھ سکیں اور لیٹی پورے اطمینان سے اپنی کوئی چیز کھوئے بغیر یونیورسٹی کو خیرباد کہہ آئی۔

یہ اتفاق ہی تھا کہ روشن میں اسے اپنے آئیڈیل کی جھلک نظر آ گئی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اس کی طرف مقناطیس کی طرح کھنچتی گئی۔ روشن خوبصورت تو تھا ہی' ساتھ میں ذہین بھی تھا۔ شائستہ اطوار اور مہذبانہ رویے کا حامل تھا۔ وہ کیوں کر اسے پسند نہ آتا۔

راؤ حمید کو دیکھ کر' اس کے بارے میں مختلف لوگوں کی رائے سن کر اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ بے ضرر آدمی ہے۔ وہ آدمی کو اس وقت تک نہیں کاٹتا جب تک کوئی اس کی دم پر پیر نہ رکھ دے۔ لیٹی کو بھلا کیا ضرورت تھی کہ سوئے ہوئے کتے کی دم پر خواہ مخواہ پیر رکھ کر گزرتی۔

شروع شروع میں تو معاملات ٹھیک رہے۔ راؤ حمید اسے اپنے کمرے میں کم سے کم بلواتے اور جب بلواتے تو لیٹی محسوس کرتی کہ وہ کام کی بات کر کے جلد از جلد اسے فارغ کرنے کے لیے کوشاں رہتے۔ ان کی آنکھوں میں بھی کسی قسم کی کوئی چمک نظر نہ آتی۔

لیکن آہستہ آہستہ اس رویے میں تبدیلی آنے لگی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ اسے دیر تک اپنے کمرے میں بٹھانے لگے۔ اب لیٹی محسوس کرتی کہ جیسے انہیں کام کی بات کرنے کی زیادہ جلدی نہیں ہے۔ انہیں بولنے کی کم عادت تھی' لیکن جو بولتے اچھا بولتے تھے۔ آدمی کا جی چاہتا کہ وہ ان کی باتیں دلچسپی سے سنے' لیکن لیٹی کو ان کی دلچسپ باتوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ اپنے کام سے کام رکھنا چاہتی تھی' لیکن ساتھ ہی اسے یہ بھی اندازہ تھا کہ وہ راؤ حمید کی ملازم ہے اور ملازم' ملازم ہی ہوتا ہے' مالک نہیں ہوتا۔ لہٰذا وہ خاموشی سے ان کی باتیں سنتی رہتی۔

پھر لیٹی کو یہ اندازہ کرتے دیر نہ لگی کہ راؤ حمید کی آنکھوں کا زاویہ بدل رہا ہے۔ لیٹر لکھواتے ہوئے یا کاغذات پر دستخط کرتے ہوئے اچانک وہ لیٹی کو غور سے دیکھنے لگتے۔ اس دیکھنے میں ایک خاص دلچسپی کا عنصر ہوتا۔ آنکھوں میں وہی چمک ہوتی جو ایک مرد کی نگاہوں میں ایک عورت کے لیے ہوتی ہے۔

اب راؤ حمید اس کے لباس پر تبصرے کرنے لگے تھے۔ پھر وہ اس کے حسن کی تعریف میں ایک آدھ جملہ بولنے لگے۔ لیٹی ان باتوں کو سنجیدگی سے نہ لیتی' بس سرسری سا شکریہ ادا کر کے انہیں کام کی طرف متوجہ کر دیتی۔ اب وہ لیٹی کو دفتر کا وقت ختم ہونے کے بعد بھی بٹھانے لگے تھے جو کاغذات یا خطوط وہ دن میں نمٹا کر اسے فارغ کر سکتے تھے' وہ کاغذات یا خطوط اب شام کے وقت

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

لے کر بیٹھنے لگے تھے۔ لبنیٰ دفتر میں رکنے پر مجبور ہوتی' کیونکہ کام پھر کام تھا۔

وقت گزرنے کے ساتھ' دفتر میں دیر تک بیٹھنے کا سلسلہ بڑھتا ہی گیا۔ اب وہ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ اسے اپنے کمرے میں بٹھانے لگے تھے' دفتر سے وہ باہر نکلتی تو سناٹا چھایا ہوا ہوتا۔ سب لوگ جا چکے ہوتے' بس ایک چپراسی موجود ہوتا جو ان لوگوں کے اٹھنے کے بعد دفتر بند کرتا۔

دفتر سے نکلنے کے بعد راؤ حمید اسے گھر پر چھوڑتے پھر اپنے گھر جاتے۔ شروع شروع میں اس نے تکلف کیا تھا اور راؤ حمید کی پیشکش کے باوجود اس نے رکشا سے جانا مناسب سمجھا تھا' لیکن یہ ایک دن کی بات نہ رہی تھی۔ روز کا معمول ہو گیا تھا اور دیر اتنی ہو جاتی کہ کسی کنوینس کا ملنا بھی آسان نہ رہتا۔ وہ رات کے وقت کسی کنوینس کی تلاش میں سڑک پر نہیں کھڑی ہو سکتی تھی' اس لیے وہ راؤ حمید کے ساتھ ہی چلی جاتی تھی۔

دفتر میں دیر تک رکنے کی وجہ سے لبنیٰ کو سخت ذہنی کوفت ہونے لگی تھی۔ وہ بار بار روشن سے اپنی الجھن کا ذکر کرتی۔ کئی مرتبہ اس نے سوچا کہ استعفیٰ دے کر بیٹھ جائے' لیکن روشن اسے ہمیشہ سمجھاتا اور اسے کوئی انتہائی اقدام اٹھانے سے باز رکھتا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ لبنیٰ ملازمت چھوڑ کر جائے۔ ابھی وہ ایک دوسرے کی آنکھوں میں بسنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اگر وہ چلی جاتی تو روشن کے خواب بکھر جاتے۔ اس نے لبنیٰ سے شادی کرنے کا ارادہ کر لیا تھا اور یہ خواہش اسی صورت پوری ہو سکتی تھی کہ لبنیٰ ملازمت کرتی رہے۔ روشن کو راؤ حمید کی طرف سے کوئی خطرہ نہ تھا' وہ ان کو بے ضرر جانتا تھا اور ایک شریف آدمی مانتا تھا۔ اس بات کی تصدیق لبنیٰ نے بھی کی تھی۔ اگر ان کے ذہن میں کوئی فتور ہوتا تو اب تک سامنے آ چکا ہوتا۔

راؤ حمید کی لڑکیوں کے بارے میں ایک خاص تکنیک تھی۔ وہ ایک ماہر کھلاڑی تھے۔ وہ ہر لڑکی کے مزاج کے مطابق پیش قدمی کرنے کے عادی تھے۔ حسین لڑکیاں ان کی کمزوری تھیں اور ان 'کمزوریوں' سے فائدہ اٹھانے کی صلاحیت ان میں بدرجہ اتم موجود تھی۔

وہ بے ضرر آدمی نہ تھے' لیکن بظاہر بے ضرر دکھائی دیتے تھے۔ لبنیٰ پر ان کی خاص نظر تھی۔ اس کے بارے میں انہوں نے ایک فیصلہ کر لیا تھا۔ انہوں نے طے کیا تھا کہ پہلے اسے باتوں سے رام کرنے کی کوشش کریں گے۔ اگر باتوں سے رام نہ ہوئی تو پھر اس پر جال ڈالیں گے۔ ابھی وہ جنگل کی مورنی کو دانہ کھلا رہے تھے اور اس انتظار میں تھے کہ وہ غافل ہو تو جال پھینکیں۔

پھر انہیں جلد ہی احساس ہو گیا کہ ان کا دانہ بے کار جا رہا ہے۔ وہ دام میں آنے والی نہیں۔ ایک ایک کر کے انہوں نے اپنے تمام حربے آزما ڈالے تھے' لیکن لبنیٰ کی شخصیت کو گہنا نہ سکے تھے۔ ان کے ہر حملے پر لبنیٰ نے شیرنی کی طرح پنجے نکال لیے تھے۔ ان کی تمام پیش قدمیوں کو لبنیٰ نے بڑی ہوشیاری سے روک دیا تھا۔

شاید ان کی کوشش کبھی کارآمد بھی ہو جاتی' لیکن درمیان میں روشن آ گیا۔ جلد ہی انہیں

معلوم ہو گیا کہ لبنیٰ روشن میں اور روشن لبنیٰ میں دلچسپی لے رہا ہے۔

روشن اپنے کیبن میں سے جو بات کرتا' وہ حرف بہ حرف راؤ حمید کے کانوں تک پہنچ جاتی۔ لبنیٰ جیسے ہی روشن کے کیبن میں داخل ہوتی تو راؤ حمید کا مخبر فوراً اس کے کمرے میں جا کر اطلاع دیتا۔ ''سر وہ روشن صاحب کے پاس پہنچ گئی ہیں۔''

اس اطلاع پر' وہ اپنے مخبر کی شکل دیکھتے ہوئے معنی خیز انداز میں گردن ہلاتے اور کہتے۔

''تم جاؤ۔ اور دیکھو' اندر کوئی نہ آنے پائے۔''

مخبر جو اس فرم کا سب سے پرانا چپراسی تھا' وہ بڑے مؤدبانہ انداز میں گردن ہلاتا ہوا کمرے سے نکل جاتا۔ اس کے جانے کے بعد وہ میز کی دراز سے ٹرانسسٹر جیسی چیز نکالتے' سوئی گھما کر سیٹ کرتے اور پھر بڑے اطمینان سے روشن کے کیبن میں ہونے والی گفتگو سنتے رہتے۔

اس طرح وہ باتیں جو صرف وہ دونوں جانتے تھے' ٹیلی فون پر ڈاکٹر عرفان کو بتا دی جاتیں تو وہ بڑے حیران ہوتے۔ منگنی کی خبر ان دونوں نے بڑی سیکرٹ رکھی تھی' لیکن وہ اطلاع بھی ڈاکٹر عرفان کو مشورے کی شکل میں پہنچا دی گئی۔

وہ دونوں بہت حیران ہوتے۔ آخر وہ کون شخص ہے جو ان دونوں کی سانسوں کے درمیان بیٹھا رہتا ہے۔ وہ اگر کھانستے بھی ہیں تو اسے معلوم ہو جاتا ہے۔

اب راؤ حمید کی زیادتیاں بڑھتی ہی جا رہی تھیں۔ ایک دو مرتبہ جب راؤ حمید نے اسے بے تکلف کرنے کی کوشش کی تو لبنیٰ نے بڑے نرم لہجے میں انہیں باور کرانے کی کوشش کی کہ وہ ذرا مختلف قسم کی لڑکی ہے۔ اسے اس طرح کے بیہودہ مذاق بالکل پسند نہیں ہیں۔

لبنیٰ کی طرف سے کھنچاؤ دیکھ کر وہ ذرا ٹھہر جاتے' لیکن کچھ دنوں کے بعد پھر سے اپنی کارروائی شروع کر دیتے۔ ایک دن انہوں نے حد ہی کر دی۔ منگنی کی انگوٹھی دیکھتے ہوئے انہوں نے بڑی بے تکلفی سے لبنیٰ کا ہاتھ تھام لیا۔

لبنیٰ کو بہت طیش آیا۔ اس کا جی چاہا کہ اٹھ کر اپنے پیر سے سینڈل نکالے اور تڑاتڑ راؤ حمید کے سر پر برسانا شروع کر دے' لیکن اس نے اپنے غصے کو ضبط کیا' اور آہستگی سے ان سے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی' لیکن راؤ حمید نے اس کا ہاتھ چھوڑنے کے بجائے اور مضبوطی سے تھام لیا۔

''پلیز' راؤ صاحب' میرا ہاتھ چھوڑ دیں۔'' اس نے سخت لہجے میں کہا۔ ''ارے' آپ کو تو غصہ آ گیا' لیجیے چھوڑے دیتا ہوں۔ میں تو آپ کے ہاتھ کی لکیریں دیکھنا چاہتا تھا۔''

''مجھے ہاتھ کی لکیریں دکھانے کا بالکل شوق نہیں۔ میں جانتی ہوں کہ میری قسمت میں کیا لکھا ہے۔'' لبنیٰ نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''اچھا' اب میں چلتی ہوں' کافی دیر ہو گئی۔''

اور پھر لبنیٰ نے راؤ حمید کا جواب بھی نہیں سنا۔ تیزی سے ان کے کمرے سے نکل آئی۔

اس کے کمرے سے نکلنے کے بعد راؤ حمید نے ایک گہرا سانس لیا اور خود کلامی کے انداز میں بولے۔

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

"بے وقوف لڑکی' تجھے کیا معلوم کہ تیری قسمت میں کیا لکھا ہے۔ یہ میں جانتا ہوں کہ تیری قسمت میں کیا لکھا ہے اور جو کچھ لکھا ہے' وہ اتنا خوشگوار نہیں ہے۔"

راؤ حمید بہت ضدی آدمی تھے۔ بہت شاہانہ مزاج پایا تھا۔ انکار سننا تو ان کی برداشت سے باہر تھا۔ جو چیز انہیں پسند آ جاتی' اسے حاصل کر کے چھوڑتے' چاہے اس کے لیے انہیں کچھ بھی کرنا پڑتا۔ لبنیٰ کا انہوں نے ہاتھ پکڑنا چاہا تھا' لیکن وہ ہاتھ چھڑا کر بھاگ گئی تھی اور ہاتھ ملتے رہ گئے تھے۔ انہیں لبنیٰ کی اس حرکت پر بہت غصہ تھا' لیکن انہوں نے سوچ لیا تھا کہ کہ آئندہ کیا کرنا ہے۔ وہ بہت شاطر آدمی تھے۔ انہوں نے دوسرے دن لبنیٰ کو کسی قسم کا احساس نہ ہونے دیا کہ کل اس کا اس طرح چلے جانا' انہیں سخت ناگوار گزرا ہے۔ آہستہ آہستہ وہ نارمل ہو گئے۔ اب انہوں نے اسے دفتر کے بعد بٹھانا بند کر دیا تھا اور انتہائی شائستگی سے پیش آنے لگے تھے۔ لبنیٰ خوش تھی کہ اس نے ایک عفریت کو آسانی سے قابو میں کر لیا تھا۔

لبنیٰ نے ہاتھ پکڑنے والی بات روشن کو نہیں بتائی تھی۔ اس نے سوچا خواہ مخواہ اس کا ذہن خراب ہو گا۔ ویسے بھی راؤ حمید نے اب سیدھی راہ اختیار کر لی تھی۔ اگر وہ اب بھی ٹیڑھی راہ پر گامزن ہوتے تو وہ ضرور روشن کے علم میں لے آتی۔ اور ملازمت بھی چھوڑ دیتی۔

وہ کچھ نہ کر پائی' لیکن وقت نے اپنا ہاتھ دکھا دیا۔ وقت کی ایک ٹھوکر سے لبنیٰ کی دنیا تہ و بالا ہو گئی۔ وہ دنیا جو ابھی بسنے بھی نہ پائی تھی۔

اب وہ بستر علالت پر لیٹی تھی اور آئینہ اس کے دکھوں کا مداوا بن گیا تھا۔ وہ آئینہ دیکھتی تو اس کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو آ جاتے۔ لبنیٰ کے دل میں آگ لگی تھی۔ وہ اس آگ کو ٹھنڈا کرنا چاہتی تھی۔ وہ شعلے جو اس کی آنکھوں میں ناچ رہے تھے' ان شعلوں کو وہ کسی اور آنکھ میں رقصاں دیکھنا چاہتی تھی' لیکن وقت اسے مہلت ہی نہیں دے رہا تھا' اس پر مسلسل بے ہوشی کے دورے پڑ رہے تھے۔ اسے یہ بھی اندازہ نہ تھا کہ اسے کون' کب دیکھنے آتا ہے۔ جب وہ ہوش میں آتی تو اس کے لبوں پر جیسے مہر لگ جاتی۔ اسے یوں محسوس ہوتا جیسے کسی نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا ہو۔

دکھ تھا کہ بڑھتا ہی جاتا تھا۔

ایک دن جب اسے ہوش آیا تو اس نے اپنے سامنے روشن کو بیٹھا پایا۔ روشن اسے دیکھنے بڑی پابندی سے آتا تھا۔ وہ دفتر سے سیدھا لبنیٰ کے گھر آ جاتا اور پھر اس کے سرہانے دو تین گھنٹے بیٹھ کر جاتا۔ وہ جب بھی آتا' لبنیٰ اسے بے ہوش ہی ملتی۔ ایک آدھا بار وہ ہوش میں بھی ملی تو کوئی بات نہ ہو پائی۔ روشن اس کا ہاتھ پکڑے اسے خاموشی سے دیکھتا رہا۔

وقت گزرنے کے ساتھ بے ہوشی کے دوروں میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اب لبنیٰ مسلسل کئی کئی دن تک بے ہوش رہنے لگی تھی۔

آج وہ ہوش میں آئی تو سامنے روشن تھا۔ کمرے میں اس وقت اس کے علاوہ کوئی نہ

تھا۔ لبنیٰ نے اشارے سے اسے دروازہ بند کرنے کو کہا۔ روشن نے فوراً اٹھ کر دروازہ بند کر دیا۔ پھر لبنیٰ نے اسے اپنے قریب بٹھا کر اس کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے دیا۔ روشن نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

پھر اس نے آہستہ آہستہ' رک رک کر وہ سب کہہ دیا جو وہ آئینے سے کہتی رہتی تھی۔ وہ سب کچھ بتا کر جو اس کے دل میں ابل رہا تھا' اسے سکون مل گیا۔ وہ پھر سے ہوش گنوا بیٹھی۔

لبنیٰ کو کس نے اغوا کیا تھا اور وہاں اس کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا وہ سن کر روشن کے ہونٹ سختی سے بھنچ گئے' مٹھیاں بند ہو گئیں' پیشانی پر بل پڑ گئے' آنکھوں میں آگ دہک اٹھی۔

اس نے دل ہی دل میں طے کیا کہ وہ اسے کسی قیمت پر زندہ نہ چھوڑے گا۔ اس نے لبنیٰ کو روشن سے چھین کر اس کی عزت پامال کی تھی۔ اب وہ اس کی زندگی پامال کر کے رہے گا۔

جب روشن لبنیٰ کے گھر سے نکلا تو اس کا سینہ انتقام کی سوزش سے پھنک رہا تھا۔ لبنیٰ اس کی محبت تھی' آدھی زندگی تھی' اس کی بیوی تھی' اس نے سوچ لیا تھا' اچھی طرح سوچ لیا تھا کہ کیا کرنا ہے۔

☆.....☆.....☆

اس وقت رات کے ساڑھے سات بجے تھے۔

راؤ حمید دفتر میں اکیلے تھے۔ انہیں بڑی بے چینی سے روشن کا انتظار تھا۔ وہ بظاہر بڑے پرسکون انداز میں چار انچ کے ٹی وی پر جو ان کی میز کی بائیں جانب' ایک ریک پر رکھا تھا موسیقی کا پروگرام دیکھ رہے تھے۔ گاہے گاہے وہ دیوار پر لگے وال کلاک پر بھی نظر ڈالتے جاتے تھے۔

روشن نے ٹھیک ساڑھے سات بجے دفتر پہنچنے کا وعدہ کیا تھا۔ وہ راؤ حمید سے کسی لڑکی کو ملوانے لا رہا تھا۔ روشن نے لبنیٰ کی تشویشناک صورتحال کے پیش نظر اس کا استعفیٰ پیش کر دیا تھا اور ساتھ ہی کہا تھا کہ اپنی ایک رشتے دار لڑکی کو راؤ حمید سے ملوائے گا۔ انٹرویو کے بعد لڑکی اگر انہیں پسند آ جائے تو اسے پرائیویٹ سیکرٹری کے طور پر ملازم رکھ لیں۔ اس نے لڑکی کا ذکر کرتے ہوئے جہاں اس کی قابلیت کا ذکر بیان کیا تھا وہاں غیر محسوس طریقے سے اس کے حسن کی بھی بے پناہ تعریف کی تھی۔ راؤ حمید کسی حسین لڑکی کا ذکر سن کر اندر ہی اندر مچل اٹھے تھے اور انہوں نے فوراً ہی اس سے ملنے کا وقت دے دیا تھا۔ روشن نے راؤ حمید کی بے چینی کو سمجھتے ہوئے کہا تھا کہ دفتری اوقات میں' وہ اس لڑکی سے ملوا دے گا' لیکن انہوں نے کہا تھا کہ آج شام کو وہ دفتر میں دیر تک رہیں گے۔ لہٰذا وہ آج شام کو اس لڑکی کو لے کر آ جائے۔ وہ فوری طور پر کسی لڑکی کو رکھنا چاہتے تھے' کیونکہ پرائیویٹ سیکرٹری کے بغیر وہ بالکل مفلوج ہو کر رہ گئے تھے۔

روشن بھی یہی چاہتا تھا کہ وہ دفتر کے اوقات کے بعد اسے وقت دیں۔ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو وہ خود کوئی بہانہ کر کے دفتر کے بعد کا وقت مقرر کرواتا۔

ساڑھے سات بج رہے تھے۔ راؤ حمید کسی نئی لڑکی سے ملنے کے خیال سے ایک ہیجانی کیفیت میں مبتلا تھے۔ ٹیلی ویژن سکرین پر نظریں تھیں' لیکن کھلی آنکھوں وہ پرکیف خواب دیکھنے

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

میں مصروف تھے۔

ادھر روشن' اکبر اور مجیب دفتر کے دروازے تک آ پہنچے تھے۔ روشن کو معلوم تھا کہ اس وقت دفتر میں راؤ حمید کے علاوہ دفتر کا پرانا چپراسی معصوم علی ہوگا۔ روشن کو معلوم تھا کہ معصوم علی' محض نام کا ہی معصوم تھا' کام اس کے بڑے ظالمانہ تھے۔ وہ سٹاف کی مخبری پر مامور تھا۔

وہ دروازہ کھول کر تیزی سے اندر آئے۔ تینوں کے چہروں پر نقاب تھے۔ پورا دفتر خالی پڑا تھا اور معصوم علی ایک کرسی پر بیٹھا' بڑے آرام سے سگریٹ کے کش لے رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھتا' وہ تینوں اس کے سر پر پہنچ گئے۔ اکبر نے ریوالور اس کی کھوپڑی سے لگا دی۔ روشن نے اسے کچھ بولنے کا موقع نہ دیا۔ اس نے جیب سے رومال نکال کر اس کی ناک پر رکھ دیا اور اس وقت تک نہ ہٹایا جب تک اس کی گردن نہ ڈھلک گئی۔

اسی وقت راؤ حمید نے معصوم علی کو بلانے کے لیے گھنٹی بجائی۔ فوراً ہی درواہ کھلا راؤ حمید نے یہ دیکھے بغیر کہ کون اندر آیا ہے' کہا۔

''معصوم علی' دیکھو روشن صاحب آنے والے ہیں۔ وہ جیسے ہی آئیں' انہیں فوراً اندر بھیج دینا۔'' راؤ حمید کی آنکھیں ٹیلی ویژن سکرین پر تھیں۔

''میں آ گیا ہوں سر۔'' روشن نے کہا' اس نے چہرے سے نقاب ہٹا دیا تھا۔

''ارے!'' راؤ حمید کو بڑی حیرت ہوئی اور جب انہوں نے اپنی کرسی دروازے کی جانب موڑی تو انہیں روشن کے ساتھ دو آدمی اور نظر آئے' کسی لڑکی کا دور تک پتا نہ تھا۔

''کیا بات ہے روشن؟'' روشن کو دو آدمیوں کے ساتھ دیکھ کر ان کے ہوش اڑنے لگے تھے' لیکن انہوں نے سنبھالا لینے کی کوشش کی۔

''کوئی بات نہیں سر۔'' روشن نے بڑے اطمینان سے کہا۔ ''آپ سے ملنے کا وقت مقرر تھا نا' دیکھ لیجئے میں مقررہ وقت پر یہاں پہنچ گیا ہوں۔''

یہ کہہ کر روشن نے کوٹ کی جیب سے ریوالور نکال لیا۔

''یہ کیا ہے؟'' راؤ حمید کی آواز گھٹنے لگی۔

''یہ ریوالور ہے سر' ابھی دو تین دن پہلے خریدا ہے۔ ہو سکتا ہے وہ آپ ہی کے آدمی ہوں۔''

''میں اس طرح کا کاروبار نہیں کرتا۔'' راؤ حمید نے جھجکتے ہوئے کہا۔

اب مجھے اچھی طرح اندازہ ہو گیا ہے کہ آپ کس قسم کا کاروبار کرتے ہیں۔ میں نے آپ کے اندر کے آدمی کو اچھی طرح پہچان لیا ہے۔'' روشن نے راؤ حمید پر ریوالور تانتے ہوئے کہا۔ ''میری بیوی لبنیٰ کے ساتھ آپ نے جو کچھ کیا' میں اسے زندگی بھر نہیں بھول سکتا۔ آپ سمجھتے تھے کہ چہرے پر نقاب چڑھا کر..... اور نشہ آور انجکشن لگا کر پورے اطمینان سے اسے اپنی ہوس کا نشانہ بنا لیں گے اور کوئی آپ کا کچھ نہ بگاڑ سکے گا۔ کوئی آپ کو پہچان نہ سکے گا' لیکن لبنیٰ نے آپ کو نقاب پہنے اور اپنی شکل کے باوجود پہچان لیا۔ جانتے ہیں کیسے؟''

''روشن' یہ تم کس قسم کی باتیں کر رہے ہو۔'' راؤ حمید نے کمزوری آواز نکالی۔

''جانتے ہیں' اس نے کیسے آپ کو پہچان لیا؟ اس انگوٹھی کی وجہ سے جو اس وقت بھی آپ کے ہاتھ میں ہے۔'' روشن یہ کہہ کر خاموش ہو گیا۔

انگوٹھی کا ذکر سن کر راؤ حمید نے اپنا بایاں ہاتھ فوراً میز سے ہٹا کر اپنے کوٹ کی جیب میں چھپا لیا اور روشن کی طرف خالی خالی نگاہوں سے دیکھنے لگے۔

روشن نے آگے بڑھ کر ریوالور ان کی کنپٹی سے لگا دیا۔

''راؤ حمید! خاموشی سے بیٹھے رہنا' ہلنا جلنا مت۔ ورنہ اپنی موت کو بہت نزدیک پاؤ گے۔''

راؤ حمید نے اپنی موت کو بہت نزدیک دیکھ لیا تھا۔ موت اس کی کنپٹی سے لگی کھڑی تھی۔ موت کو اتنے نزدیک پا کر اس کی رگوں میں خون ٹھنڈا ہونے لگا۔ اس نے کچھ بولنے کی کوشش کی' لیکن زبان نے ساتھ نہ دیا۔ وہ ''میں' میں'' کر کے رہ گیا۔

''راؤ حمید' تو ایک گھناؤنے کردار کا آدمی ہی نہیں' گھناؤنے کاروبار کا مالک بھی ہے۔ بس اب کھیل ختم ہوا۔ تو نے لبنیٰ کا جسم ہی پامال نہیں کیا' اس کی روح بھی زخمی کر دی ہے۔ وہ معصوم لڑکی موت و زیست کی کشمکش میں مبتلا ہے۔ وہ اپنے ہوش گنوا بیٹھی ہے۔ تو نے راؤ حمید ہمارے ساتھ بہت برا کیا ہے۔ تو نے ہمیں کس قدر نقصان پہنچایا تجھے اس کا اندازہ نہیں۔ بہرحال اب اپنے کیے کو بھگت۔'' یہ کہہ کر وہ ایک لمحے کو خاموش ہوا' پھر اکبر سے مخاطب ہو کر بولا۔ چلو' اکبر اپنا کام کرو۔''

''روشن! کیا کرنے والے ہو؟ راؤ حمید نے کانپتی آواز میں بمشکل کہا۔

''ہم تمہیں ایک نشہ آور انجکشن لگائیں گے۔ اتنی زیادہ مقدار میں کہ تمہیں تین دن تک ہوش نہیں آئے گا۔ تمہارے بے ہوش ہوتے ہی ہم تمہیں اس پلازہ کی ساتویں منزل سے نیچے پھینک دیں گے۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کہے گی کہ تم نے نشہ آور انجکشن لگا کر' کھڑکی سے کود کر خودکشی کر لی۔'' روشن نے اسے پورے اطمینان سے بتایا۔

پھر منصوبے پر عمل کرنے میں مشکل سے دو تین منٹ لگے۔ انجکشن لگتے ہی راؤ حمید پر بے ہوشی طاری ہو گئی۔ روشن نے ریوالور کا دستہ مار کر کھڑکی کا شیشہ توڑا۔ پھر اس نے اپنے بھائی' مجید کی مدد سے راؤ حمید کو اٹھایا اور کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔

روشن نے اسے سر کے بل زمین پر گرتے دیکھا۔ جب وہ سڑک پر جا کر پڑا تو ایک ہلکی سی دھپ کی آواز آئی۔

پھر اکبر نے بے ہوش معصوم علی کو راؤ حمید کے کمرے میں ڈالا اور وہ تینوں پورے اطمینان سے دروازے سے نکل گئے۔

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

جب وہ لوگ اپنی گاڑی لے کر راؤ حمید کی لاش کے پاس سے گزرے تو وہاں آٹھ دس آدمی جمع ہو چکے تھے اور وہ بار بار اوپر سر اٹھا کر دیکھ رہے تھے۔ شاید یہ اندازہ کر رہے تھے کہ یہ شخص کہاں سے گرا ہے۔

اکبر کے منع کرنے کے باوجود روشن گاڑی سے اترا' اس نے دو آدمیوں کے کندھوں کے پیچھے سے راؤ حمید کو چاروں خانے چت پڑے دیکھا۔ اس کی لاش کے گرد خون پھیلا ہوا تھا۔

روشن نے راؤ حمید کی لاش کو دیکھ کر ایک ٹھنڈا سانس لیا اور پھر تیزی سے گاڑی میں آ بیٹھا۔

اس کے تصور میں لیلیٰ مسکرا رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

رُوح کا جھگڑا

میں ایک ایسا جسم ہوں جسے غم کھائے جا رہا ہے۔ غم وہ دیمک ہے جو آہستہ آہستہ آدمی کو چاٹتی رہتی ہے اور ایک دن وہ آتا ہے کہ ہرا بھرا جسم مٹی ہو جاتا ہے۔ غم اور پھر مستقل غم۔ ایک دو روز کی بات ہو تو کوئی سہہ لے اور اگر مستقل روگ لگ جائے تو پھر آدمی کیا کرے۔ نہ مرنے کا اور نہ جینے کا، میں وہ نصیبوں جلا باپ ہوں جس کے اپنے ہی خون نے اسے باپ ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ اپنے دکھ سکھ بھول کر اس کے دکھ سکھ کا خیال رکھا۔ اپنی آنکھوں سے نیند اڑا کر اسکی آنکھوں میں بھری۔ ٹھیک دس سال بعد اسی بچے نے ایک دن مجھ سے کہا۔ "پاپا آپ ہمارے پاپا نہیں" میں نے سمجھا مذاق کرتا ہے۔ ہنسی میں ٹال گیا۔ کچھ دیر بعد اس نے یہی بات دہرائی۔

"مجھے میرے پتا جی کے پاس لے چلو۔" میرا ماتھا ٹھنکا۔ اس نے "پاپا" کے بجائے "پتا جی" کہا تھا۔

"بیٹے ہم ہی تو ہیں تمہارے پتا جی" میں نے اسے سمجھایا۔

"نہیں تم نہیں ہو۔ ہمارے پتا جی تو بریلی میں رہتے ہیں۔"

میں پریشان ہو گیا۔ سوچا اسکے دماغ پر کسی قسم کا اثر ہو گیا ہے۔ میں نے اس کا بدن دیکھا، بخار نہ تھا۔ شام ہو چکی تھی۔ میں نے نوکر کو بلا کر کہا۔ "غلام رسول" ذرا تہذیب کو باہر ٹہلا لاؤ۔

"ہم نہیں جائیں گے باہر۔ ہم تو اپنے پتا جی کے پاس جائیں گے بابا ہمیں لے چلو۔" بابا نے میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"پتہ نہیں اس کو کیا ہو گیا ہے۔ پتا جی، پتا جی کی رٹ لگائے ہوئے ہے۔" میں نے کہا۔

بوڑھے نوکر غلام رسول نے اسے گود میں اٹھا لیا اور بولا۔ "بیٹے تمہارے پاپا تو تمہارے سامنے ہیں۔ تم کس پتا جی کے پاس جاؤ گے؟"

"نہیں یہ میرے پتا جی نہیں۔ میرے پتا جی تو بریلی میں ہیں وہ ہیڈ ماسٹر ہیں۔ باقر گنج میں میرا گھر ہے۔ گھر کے سامنے ایک نل لگا ہوا ہے۔ جہاں میں روز نہاتا تھا۔" میرے پاؤں سے زمین سرکنے لگی مجھ پر سکتہ سا طاری ہو گیا۔ یا الٰہی یہ کیا ماجرا ہے۔ میں آئے دن اخباروں میں پڑھتا رہتا تھا کہ فلاں لڑکے نے مرنے کے بعد فلاں آدمی کے یہاں جنم لے لیا اور جب وہ اس عمر کو پہنچا

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

جس عمر میں اس کی موت ہوئی تھی۔ تو اسے پچھلے جنم کی باتیں یاد آ گئیں۔ اور تصدیق کرنے پر اسکی باتیں حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوئیں۔

کہیں یہ بھی جنم کا چکر تو نہیں؟

مسلمان ہونے کے ناطے میرا عقیدہ ہے کہ انسان ایک بار پیدا ہوتا ہے اور ایک بار ہی مرتا ہے۔ مر مر کر جنم نہیں لیتا۔ غلام رسول کو ساتھ لے کر میں سیدھا ڈاکٹر کے پاس پہنچا۔ اس نے اچھی طرح دیکھا بھالا پھر کہا "یہ تو ٹھیک ہے۔"

میں نے اسے پوری بات بتائی تو وہ حیرت میں پڑ گیا۔

"تہذیب تمہارے پتاجی کہاں ہیں؟" اس نے بڑے پیار سے پوچھا۔

"بریلی میں۔"

"وہ کیا کرتے ہیں۔؟"

"ہیڈ ماسٹر ہیں۔"

"بیٹے ان کا نام کیا ہے؟"

"شیام سندر لال جی۔"

"اور تمہارا نام کیا ہے؟"

"سورج پرکاش کے تہذیب۔"

"نہیں، میرا نام سورج پرکاش ہے۔ میں ہندو ہوں۔"

"اچھا تم یہاں کیسے آ گئے؟"

"مجھے نہیں معلوم، ایک دن مجھے بہت زور کا بخار آیا تھا پھر مجھے نیند آ گئی۔"

"بیٹے تم اپنے پتاجی کو پہچان لو گے؟"

"ہاں، مجھے میرے پتاجی کے پاس لے تو چلو۔"

"ڈاکٹر صاحب میرے بیٹے کو کیا ہو گیا ہے۔ میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔"

"میری سمجھ میں خود نہیں آتا کہ معاملہ کیا ہے۔ لیکن آپ اسے بریلی ضرور لے جایئے تاکہ معلوم تو ہو کہ اس کا بیان کہاں تک درست ہے۔"

اس رات میں سو نہ سکا۔ شیشے کے نوکیلے ٹکڑوں پر لوٹتا رہا۔ پھر مجھے شاہدہ یاد آئی۔ جو اسے اپنے پہلو میں جاگتا چھوڑ کر ہمیشہ کے لئے سو گئی تھی۔ میں نے دن کو دن اور رات کو رات نہ جانا۔ اس ننھی سی جان کی پرورش میں نے ماں بن کر کی۔ اسکے خراش بھی آ جاتی تو میرا کلیجہ چھلنی ہو جاتا۔ میں نے اسے زمین پر نہیں اترنے دیا کہ کہیں اس کی نازک کھال نہ چھل جائے۔ میں نے اسے مخمل کے گدوں پر سلایا تاکہ چبھن کا احساس نہ ہو۔ لوگوں نے بہت کہا دوسری شادی کر لو۔ لیکن میں نے اپنے اکلوتے بیٹے کی وجہ سے دوسری شادی نہ کی۔ اپنی ہستی اسکے لئے مٹا دی اور آج یہی مجھ سے کہتا ہے کہ میں سورج پرکاش ہوں۔ میرے پتا کا نام شیام سندر ہے۔ میں ہندو ہوں۔

صبح کے وقت کچھ دیر کے لئے آنکھ لگ گئی۔ ابھی جھپکی آئی ہی تھی کہ کسی نے زور سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ غلام رسول نے دروازہ کھولا تو پتا چلا کہ کوئی صاحب اس ہندو بچے کو دیکھنے کے لئے آئے ہیں جس نے ایک مسلمان کے یہاں جنم لیا ہے۔ پھر ایک کے بعد ایک لوگ تہذیب کو دیکھنے کے لئے آنے لگے۔ خدا جانے یہ خبر راتوں رات سارے شہر میں کس طرح پھیل گئی تھی۔ دوپہر کو تھانیدار آیا۔ اس نے تہذیب کا اور میرا بیان لیا۔ تہذیب نے اپنے بیان میں کئی نئی باتوں کا انکشاف کیا۔ تھانیدار رپورٹ لکھ کر چلا گیا۔ شام کو پھر مجھے تھانے بلایا گیا۔ جب میں تھانے پہنچا تو وہاں پولیس کے اعلیٰ حکام موجود تھے ایک بار پھر میرا اور تہذیب کا بیان لیا گیا تہذیب نے وہی بات دہرائی اور پتاجی سے ملنے کی رٹ لگاتا رہا۔ طے یہ ہوا کہ پولیس انسپکٹر کے ساتھ میں تہذیب کو بریلی لے کر جاؤں۔ اور اس کے بتائے ہوئے پتے پر جا کر دیکھا جائے کہ اس کا بیان صحیح ہے یا نہیں اور یہ کہ وہ اپنے پتاجی کو پہچانتا ہے کہ نہیں۔

علی گڑھ سے بریلی کے لئے کئی گاڑیاں جاتی ہیں۔ سفر کے لئے صبح کی گاڑی کا انتخاب کیا گیا۔ میں گاڑی میں بیٹھا ہوا اپنے آپ کو مجرم تصور کر رہا تھا۔ جیسے میں نے کسی لڑکے کا اغوا کر لیا تھا اور اب پکڑا گیا تھا۔ اور پولیس انسپکٹر لڑکے کو والدین کے پاس چھوڑنے جا رہا تھا۔ رکشا لے کر ہم باقر گنج کی طرف چل دیئے۔ راستے میں جو کچھ ہوا اس سے میری حیرت میں اضافہ ہوتا گیا۔ تہذیب کے چہرے پر اس وقت خوشی کی لہر تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شہر کی یہ سڑکیں اسکی دیکھی بھالی ہیں اور وہ ہر چیز پر اپنائیت سے نظر ڈال رہا تھا۔ راستے میں میونسپلٹی کا ایک سکول آیا وہ چیخ پڑا۔ یہ میرا سکول ہے۔ جہاں میں پانچویں کلاس میں پڑھتا تھا یہ کہہ کر وہ رکشہ سے کودنے لگا انسپکٹر نے اور میں نے پکڑ لیا۔ "تمہارے ماسٹر جی کا کیا نام تھا بیٹے؟" انسپکٹر نے پوچھا۔

"ہری کشن جی۔"

"وہ میرا محلہ آ گیا" وہ پھر چیخا۔

میں نے رکشہ والے سے پوچھا۔

"کیوں بھئی باقر گنج آ گیا۔"

"ہاں جی، وہ سامنے باقر گنج ہے۔" رکشہ ابھی تھوڑی دور ہی چلا تھا کہ وہ پھر خوشی سے چلایا۔ "روکو رکشہ روکو۔" اس گلی میں موڑو" میرا گھر اس گلی میں ہی ہے۔" اور جب رکشہ گلی میں داخل ہوا تو وہ اچھل کر رکشہ سے کود پڑا۔ "وہ ہے میرا گھر۔ وہ ہے میرا گھر۔"

ہم رکشہ سے اتر کر اس کے پیچھے بھاگے۔ انسپکٹر نے لپک کر اسے اپنی گرفت میں لے لیا۔ مجھے چھوڑ دو۔ "پتاجی، پتاجی" سامنے ایک پرانے طرز کا مکان تھا۔ دروازے پر نیم پلیٹ لگی تھی۔ اس پر لکھا تھا۔ شیام سندر لال۔ بی اے، بی ایڈ۔ اس مکان کے سامنے میونسپلٹی کا نل تھا۔ میں نے دروازہ کھٹکھٹایا چند لمحوں بعد کوئی کھانستا ہوا باہر آیا۔ ابھی وہ اچھی طرں دروازے پر آ بھی نہ پایا تھا کہ تہذیب "پتاجی، پتاجی" کہتا ہوا اس سے لپٹ گیا۔ یہ ایک ادھیڑ عمر کا آدمی تھا۔ بال خاصے سفید

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہو چکے تھے۔ آنکھوں پر موٹے شیشوں کی عینک تھی۔ وہ دھوتی اور کرتا پہنے ہوئے تھا۔ جب اس شخص نے تہذیب کی گردن اٹھا کر دیکھا تو اس پر رقت طاری ہوگئی۔ ''ارے بیٹا سورج پرکاش تو ہمیں چھوڑ کر کہاں چلا گیا تھا۔''

دروازے پر شور سن کر ایک بوڑھی سی عورت باہر نکل کر آئی۔ تہذیب اسے دیکھتے ہی پکار اٹھا ''ماتا جی، ماتا جی۔''

پھر ہم سب مکان میں داخل ہوئے۔ وہ اپنی ماں سے ہاتھ چھڑا کر کمرے میں گھس گیا۔ وہاں ایک لکڑی کی الماری کے پاس کھڑا ہوگیا۔ الماری میں تالا بند تھا۔ ''یہ میری الماری ہے۔'' بوڑھی عورت نے اس الماری کا تالا کھولا تو اس نے اپنی کتابیں نکال کر دکھائیں۔ ان کتابوں پر سورج پرکاش لکھا ہوا تھا۔ میں نے کہا۔ ''بیٹے ذرا اس کتاب کو پڑھنا تو۔'' اور اس نے فرفر کتاب پڑھ دی۔ حالانکہ وہ کتاب ہندی کی تھی اور ہندی کا ایک حرف بھی تہذیب کو نہ آتا تھا۔

''ماتا جی، میری ڈرائنگ کی کاپی کہاں ہے۔ اس میں میں نے ایک آم بنایا تھا جس پر ماسٹر جی نے ویری گڈ دیا تھا۔ پھر اس نے خود ہی ڈرائنگ کی کاپی کھوج نکالی۔ اس نے وہ آم دکھایا اور آم پر دیا گیا ویری گڈ بھی۔ مجھے چکر آنے لگے۔ میں نے دیوار کا سہارا لیا لیکن پھر بھی سنبھل نہ سکا۔ زمین پر چکرا کر گر گیا اور بے ہوش ہوگیا۔ جب ہوش آیا تو میں ایک چارپائی پر لیٹا رو رہا تھا۔ میرے داہنے ہاتھ انسپکٹر بیٹھا تھا۔ بائیں ہاتھ ڈاکٹر کھڑا ہوا تھا۔ میرے بالکل سامنے شیام سندر تھا میں نے آنکھیں کھولیں تو سب سے پہلے انسپکٹر نے پوچھا ''آپ کیسے ہیں۔''

''فی الحال ٹھیک ہوں۔''

''دیکھئے پریشان مت ہوئیے۔ انسپکٹر صاحب سے مجھے سب معلوم ہوگیا ہے'' یہ تو بھگوان کی لیلا ہے۔ اس کے بھید وہی جانے۔ شیام سندر نے بڑی نرمی سے کہا۔ مجھے کچھ اطمینان سا ہوا۔ اور جب چلنے کا وقت آیا تو تہذیب نے میرے ساتھ چلنے سے انکار کردیا۔ میں نے محبت سے اس کا ہاتھ پکڑا تو وہ بلک بلک کر رو دیا۔ ''میں نہیں جاؤں گا۔ میں نہیں جاؤں گا۔''

میری آنکھوں میں بے اختیار آنسو نکل پڑے۔ گلا رندھ گیا۔ اتنا رویا کہ روتے روتے میری ہچکیاں بندھ گئیں۔ شیام سندر مجھے تسلی دیتا رہا۔ دیکھئے ذرا دھیرج رکھیئے۔ یہ آپ کا اپنا گھر ہے۔ یہ آپ کا اپنا بیٹا ہے۔ جب جی چاہے اس سے آکر مل جایئے گا۔

چلتے وقت میں نے اپنے دل کے ٹکڑے کو بھینچ بھینچ کر پیار کیا اور دل میں ٹیس، آنکھوں میں درد، ٹانگوں میں رعشہ لئے علی گڑھ واپس آ گیا۔ اب دنیا میرے لئے اندھیر ہوگئی تھی۔ کسی کام میں جی نہیں لگتا تھا۔ ہر وقت بے قراری، بے چینی ہوتی تھی۔ سکون دل لٹ گیا تھا۔ کمزور بے انتہا ہوگیا تھا۔ دل کے دورے پڑنے لگے تھے۔ ہر وقت تہذیب کی تصویر سینے سے لگائے پھرتا تھا۔ لوگ مجھے پاگل سمجھنے لگے میں واقعی پاگل ہوگیا تھا۔ ایک دو روز کی بات ہو تو کوئی سہہ لے، برداشت کر لے اور اگر مستقل روگ لگ جائے تو پھر آدمی کیا کرے۔ نہ مرنے کا نہ جینے کا۔ آدمی اپنی ہی لاش

کندھے پر اٹھائے پھرتا ہے۔ لاکھ کوشش کرے کہ اسے بے گور و کفن ہی کہیں پھینک دے لیکن ایسا کرنے سے بھی اپنے کو لاچار اور مجبور پاتا ہے۔

تہذیب کو میں کیسے بھلا سکتا تھا۔ اسکی بھولی صورت، اسکی پیاری پیاری شرارت آمیز باتیں، کھلونوں سے بھری الماری، اس کے کپڑے، اسکی کتابیں، اس کا اٹھنا بیٹھنا، پیار سے گلے میں بانہیں ڈالنا، رات کو کہانی سننا، کبھی سنانا، میں کیسے بھلا سکتا تھا، کبھی شاہدہ کی تصویر کے پاس کھڑا ہو جاتا تو وہ سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھتی۔ ''میرا تہذیب کہاں ہے؟''

میں شاہدہ کو کیا جواب دیتا۔ اسے کیسے بتاتا کہ تمہارا تہذیب اب تہذیب نہیں رہا۔ سورج پرکاش بن گیا ہے۔ ادھر غلام رسول الگ اپنی آنکھوں میں آنسو بھرے پھرتا۔ تہذیب اکیلا میرا بیٹا تو نہ تھا۔ غلام رسول کے جگر کا ٹکڑا بھی تو تھا۔ میں اس سے کیسے کہتا کہ غم نہ کرو۔ اسے کیسے تسلی دیتا۔

میرا دامن صبر خود ہاتھ سے چھوٹا جاتا ہے۔

☆.....☆.....☆

گاڑی کئی گھنٹے لیٹ تھی۔ صبح کے سات بج رہے تھے۔ اسٹیشن سے نکل کر سیدھا شیام سندر کے گھر جانا مناسب نہ سمجھا۔ اس لئے قریب ہی ایک ہوٹل کی راہ لی۔ کمرے میں اپنا سوٹ کیس رکھ کر غسل خانے میں گھس گیا۔

میں اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر یہاں آ گیا تھا۔ تہذیب سے جدا ہوئے ابھی پندرہ دن ہوئے تھے لیکن یہ پندرہ دن میرے لئے پندرہ یگوں سے کم نہ تھے۔

آج تہذیب مجھے اچانک دیکھے گا تو کیسا خوش ہوگا ممکن ہے ''پاپا'' کہہ کر مجھ سے لپٹ جائے۔ میں اپنے تہذیب کو خوب بھینچ بھینچ کر پیار کروں گا اور اسے بتاؤں گا کہ اسکے بنا گھر کیسا سونا ہوگیا ہے۔ شاہدہ کی روح الگ بے چین ہے۔ اس کا بابا غلام رسول کیسے چھپ چھپ کر آنسو بہاتا ہے۔ ممکن ہے یہ سب سن کر وہ سورج پرکاش سے پھر تہذیب بن جائے۔

تب ہی دروازے پر کسی نے دستک دی۔ دروازہ کھلا تھا۔ میں نے غسل خانے سے اسے اندر آنے کو کہا۔ کھٹ سے دروازہ کھلنے اور ٹرے بجنے کی آواز آئی۔ شاید بیرا ناشتا لے آیا تھا۔

''کیا ناشتا ہے؟'' میں نے جلدی سے اپنے جسم پر تولیہ لپیٹتے ہوئے پوچھا۔

''جی صاحب! آپ نہارے ہیں تو واپس لے جاؤں۔''

''نہیں، نہیں رکھ دو۔ میں باہر آ رہا ہوں۔''

تولیہ لپیٹے لپیٹے میں نے ناشتہ کیا۔ پھر جلدی جلدی کپڑے بدلنے لگا۔ ہوٹل سے باہر نکل کر میں نے رکشہ پکڑا جیسے جیسے باقر گنج قریب آتا جا رہا تھا۔ میرے دل کی حالت عجیب ہوتی جا رہی تھی۔ رگ و پے میں خون کی گردش تیز ہوگئی تھی۔ تہذیب کو جلد سے جلد گلے لگانے کی خواہش شدت اختیار کرتی جا رہی تھی۔

جوں ہی رکشہ گلی میں داخل ہوا۔ مجھے اپنا دل حلق میں اٹکتا ہوا محسوس ہوا۔ میں نے اپنے

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہاتھوں سے اپنا دل تھام لیا۔ مکان کے سامنے پہنچ کر رکشہ والے کو پیسے دینے کے لئے جیب میں ہاتھ ڈالا ہی تھا کہ مکان کے دروازے پر نظر پڑی۔ میرا ہارٹ فیل ہوتے ہوتے بچا۔ اگر رکشہ کو مضبوطی سے نہ تھام لیا ہوتا تو یقیناً چکرا کر زمین پر گر پڑتا۔

دروازے میں یہ بڑا تالا لگا ہوا تھا۔ کواڑ سے شیام سندر لال بی، اے بی، ایڈ کی نیم پلیٹ غائب تھی اور دہلیز پر پڑی ہوئی گرد سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ تقریباً ایک ہفتے سے مکان کی دہلیز کسی نے پار نہیں کی۔

میں نے مایوسی سے بجلی چوکھٹ میں لگے بڑے سے تالے کو ہلا کر چھوڑ دیا۔ اور اپنی انگلیوں پر لگی گرد کو جھاڑتے ہوئے سوچنے لگا۔ اب کیا کروں۔

"صاحب جی! برابر والے مکان سے پتہ کر لو۔" رکشہ والے نے مشورہ دیا۔ میں نے کہا اچھا دروازہ کھٹکھٹاؤ۔

رکشہ والے نے برابر والے مکان کی کنڈی بجائی۔ اور اپنے رکشہ کے پاس جا کھڑا ہوا۔ میں دروازے کے سامنے آ گیا۔ دروازہ کھلا ایک لڑکی مسکراتی ہوئی باہر نکلی پھر دروازے پر کسی اجنبی کو دیکھ کر جھجک کر پیچھے ہٹ گئی۔

"جی کس سے ملنا ہے۔" جوان لڑکی نے اپنے جسم کو اچھی طرح ساڑی میں لپیٹتے ہوئے پوچھا۔

"یہ آپ کے پڑوسی شیام سندر جی کہاں گئے۔ ان ہی سے ملنا تھا، میں علی گڑھ سے آیا ہوں۔"

"جی وہ تو اپنے نئے مکان میں چلے گئے ہیں۔"

"آپ ان کا پتہ بتا سکتی ہیں۔"

"جی ان کی گلی اور مکان نمبر تو مجھے یاد نہیں اور صرف محلے سے کام چلے گا نہیں۔ آپ ایسا کریں کہ نہرو ہائی سکول چلے جائیں۔ وہاں شیام سندر جی آپ کو مل جائیں گے۔"

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور رکشہ میں آ بیٹھا۔ رکشہ والا نہرو ہائی سکول سے واقف تھا۔ سکول اسی محلے میں پلیا کے پاس تھا۔ وہ مجھے لے چلا۔

نہرو ہائی سکول کے گیٹ پر بچوں کا جمگھٹا لگا ہوا تھا بچے دہی بڑے، آلو چھولے اور آئس کریم پر ٹوٹے پڑ رہے تھے۔ شاید انٹرول ہوا تھا۔ میں نے رکشہ والے کو منہ مانگے پیسے دیئے اور اتر کر ایک ایک بچے کو غور سے دیکھنے لگا۔ تہذیب بھی انہیں بچوں میں کہیں ہوگا۔ آخر وہ آئس کریم خریدتا ہوا مجھے نظر آ ہی گیا۔ میں دبے پاؤں اسکی طرف بڑھا اور پیچھے سے جا کر اسکی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیئے۔ تہذیب نے میرے ہاتھوں کو ٹٹولا اور پھر اسکی انگلیاں میری انگوٹھی پر رک گئیں۔ انگوٹھی چھوتے ہی اسکے جسم میں لرزا سا آ گیا۔ وہ تڑپ کر مجھ سے الگ ہوا۔ خوفزدہ نگاہوں سے مجھے دیکھا اور پھر بجلی کی طرح سکول کی طرف لپکا۔

میں نے تیز قدموں سے اسکا پیچھا کیا اور جب میں ہیڈ ماسٹر کے کمرے کے قریب پہنچا تو اندر سے آواز سنائی دی۔

"کون تھا بیٹا۔" "آؤ میرے ساتھ آؤ مجھے دکھاؤ۔"

میں چق اٹھا کر اندر داخل ہوا۔ شیام سندر تہذیب کا ہاتھ پکڑے باہر نکلنے والا تھا کہ مجھے دیکھ کر رک گیا۔ پھر مسکراتے ہوئے بولا۔ آیئے آیئے۔ تو آپ سے ڈر کر بھاگا تھا سورج پرکاش۔ پھر میرا ہاتھ پکڑ کر صوفے پر بٹھایا اور تہذیب سے مخاطب ہوا۔

"بیٹے یہ تمہارے چاچا ہیں۔ انہیں نمستے کرو۔"

"نمستے چاچا جی" تہذیب نے ہاتھ جوڑ کر نمسکار کی۔

تہذیب کے منہ سے چاچا جی کا لفظ سن کر میرے دل پر گھونسا سا لگا۔ سوچا اس سے کہوں کہ تہذیب میں تمہارا چاچا نہیں پاپا ہوں، مجھے پاپا کہو بیٹے۔ مگر میں کچھ نہ کہہ سکا۔ بس دعا دے کر رہ گیا۔

"آپ کس گاڑی سے آئے۔" شیام سندر نے پوچھا۔

"جی صبح کی۔"

"آپ کا سامان کہاں ہے۔" "جی ہوٹل میں۔" خیر۔ ہوٹل سے سامان آ جائے گا۔ اب آپ میرے ساتھ ٹھہریں گے۔

"جی تکلف کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں رات کی گاڑی سے واپس چلا جاؤں گا۔ میں تہذیب کو دیکھنے آیا تھا۔"

"سورج پرکاش آپ کا بیٹا ہے۔ اسے جی بھر کر دیکھئے" پھر شیام سندر نے تہذیب سے کہا۔ "بیٹے اپنے چاچا جی سے باتیں کرو۔"

میں نے ہاتھ پکڑ کر اسے اپنی گود میں بٹھا لیا اور اس کے پھولے ہوئے سرخ سفید گالوں پر پیار کیا۔ لیکن اس پیار کے جواب میں اس نے تہذیب کی طرح میرے گالوں پر اپنے ننھے ہونٹ نہ رکھے۔ وہ سورج پرکاش بنا لاتعلق سا بیٹھا رہا۔

"کہو بیٹے کیسے ہو۔"

"میں ٹھیک ہوں۔"

"خوش تو ہو۔"

"جی ہاں۔ بہت خوش۔"

مجھے تہذیب کی یہ بات اچھی نہ لگی۔ میں اسکے منہ سے کچھ اور ہی سننا چاہتا تھا لیکن تہذیب یہاں رہ کر نہ صرف خوش تھا بلکہ بہت خوش۔

"کس کلاس میں داخلہ لیا ہے تم نے۔"

"میں نے اسے پانچویں میں داخل کرایا ہے۔" تہذیب کی بجائے شیام سندر بولا۔

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

"اصل میں یہ اس وقت پانچویں میں ہی تھا اور اس کے کلاس ٹیچر ہری کرشن تھے۔ میں نے وہی ماحول پیدا کرنے کے لئے ہری کرشن کو اسکی کلاس کا انچارج بنا دیا ہے تاکہ اسے اجنبیت محسوس نہ ہو۔ اور آپ سے بھی درخواست کروں گا۔ دیکھئے برا نہ مانیئے گا وعدہ کیجئے کہ برا نہیں مانیں گے۔"

کہیئے آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔ میں برا نہیں مانوں گا۔" شیام سندر نے ساری بات انگریزی میں کی تھی اور مصلحت بھی اسی میں تھی، لہٰذا میں نے بھی انگریزی میں جواب دیا۔"

"میں چاہتا ہوں کہ آپ اس کے چاچا بن جائیں تاکہ اسے اپنا ماضی بھولنے میں آسانی ہو۔" یہ سن کر میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ شیام سندر کتنی چالاکی سے مجھ سے میرا تہذیب چھین لینا چاہتا تھا۔

"شیام صاحب! یہ کیسے ممکن ہے۔ میں اس کا باپ ہوں چاچا نہیں۔ یہ میرا بیٹا ہے بھتیجا نہیں ہے۔ پھر حقیقت اتنی آسانی سے کیسے جھٹلائی جا سکتی ہے۔ بات صرف تہذیب کے ماضی کی نہیں میرے ماضی کی بھی ہے۔ میں اپنا ماضی کس طرح بھلا دوں۔" میرا لہجہ بیحد تلخ ہو گیا تھا۔

تہذیب بڑی معصومیت سے کبھی مجھے کبھی شیام سندر کو دیکھ رہا تھا۔ ہمارے درمیان ہونے والی گفتگو اسکی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ تب ہی سکول کی گھنٹی بجی۔ شاید وقفہ ختم ہوا تھا۔

تہذیب میری گود سے اتر کر کھڑا ہو گیا اور بولا۔

"پتا جی، میں کلاس میں جاؤں؟"

"ہاں بیٹے۔ تم جاؤ۔"

"نہیں تہذیب تم کلاس میں نہیں جاؤ گے۔ تم میرے ساتھ علی گڑھ چلو گے۔ میں اسی مقصد سے یہاں آیا ہوں۔"

"دیکھئے ناراض نہ ہوں۔ بات سمجھنے کی کوشش کیجئے۔"

"میں اب کچھ سننے کے لئے تیار نہیں۔ تہذیب میرا بیٹا ہے میں اسے اپنے ساتھ لے کر جاؤں گا مجھے کوئی نہیں روک سکتا۔" میں نے چیخ کر کہا اور تہذیب کا ہاتھ پکڑ کر اسے کھینچتا ہوا باہر کی طرف چلا۔ شیام سندر تڑپ کر اٹھا اور اس نے لپک کر تہذیب کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"نہیں سورج پرکاش کو آپ نہیں لے جا سکتے۔"

اب تہذیب بیچ میں لٹک رہا تھا۔ ایک طرف سے اسے میں کھینچ رہا تھا اور دوسری طرف سے شیام سندر۔ وہ پتا جی، پتا جی کہہ کر چیخ کہا تھا۔ اتنے میں کئی ٹیچر مع چپڑاسی کمرے میں داخل ہوئے۔ شاید چپڑاسی موقع کی نزاکت سمجھ کر انہیں بلا لایا تھا۔ "سر! کیا بات ہے؟"

"یہ آدمی میرے سورج پرکاش کو بھگا کر لئے جا رہا ہے۔ شیام سندر نے میری طرف اشارہ کیا۔"

"تہذیب میرا بیٹا ہے۔ کسی باپ پر اسکے بیٹے کے اغواء کا الزام نہیں لگایا جا سکتا۔ آپ لوگ میرے سامنے سے ہٹ جائیں میں اپنے بیٹے کو اپنے ساتھ لے کر جاؤں گا۔"

"یہ آپ کا بیٹا نہیں۔ میرا بیٹا ہے یہ سورج پرکاش ہے۔"

"نہیں، یہ تہذیب ہے۔" میں نے جھٹکا دے کر تہذیب کو شیام سندر سے چھڑا لیا۔ اور اسے گود میں لے کر فرار ہونے ہی والا تھا کہ ایک ٹیچر نے بڑھ کر میری کمر پکڑی۔ دوسرے نے گردن میں ہاتھ ڈالا اور چپڑاسی میری ٹانگوں سے لپٹ گیا۔ میں بے بس ہوا تو شیام سندر نے تہذیب کو مجھ سے چھین لیا۔

"اسکو سکول سے باہر نکال دو۔ شیام سندر نے حکم دیا۔"

"شیام سندر تو نے میرے تہذیب پر ڈاکا مارا ہے۔ یاد رکھ میں تجھ سے اپنا تہذیب لے کر رہوں گا۔ میں اس کیس کو عدالت میں لے جاؤں گا۔ پھر دیکھوں گا کون مجھ سے اپنے تہذیب کو جدا کرتا ہے۔" یہ کہہ کر میں دفتر سے باہر نکل آیا۔

☆.....☆.....☆

آج دنیا کے سب سے انوکھے مقدمے کی آخری پیشی تھی اور فیصلے کا دن بھی۔ آج تہذیب کا بیان لیا جانے والا تھا۔ اس سے پہلے میرے، شیام سندر اور انسپکٹر کے بیانات قلمبند ہو چکے تھے۔ میری اور شیام سندر کی طرف سے متعدد گواہیاں بھی گزر چکی تھیں۔ میں نے اسکے سکول کا ریکارڈ، میونسپلٹی سے پیدائش کا سرٹیفکیٹ پیش کر دیا تھا۔

جب عدالت میں تہذیب کو پیش کیا گیا تو عدالت کا کمرہ لوگوں سے کھچا کھچ بھر چکا تھا۔ اسکے علاوہ برآمدے میں بھی خاصی پبلک اکٹھی تھی اس ہجوم میں پریس فوٹو گرافر اور اخباروں کے نمائندے بھی موجود تھے۔ ہندوستان کے تمام بڑے اخباروں میں اس مقدمے کے فیصلے کا انتظار تھا۔

تہذیب سفید ململ کا کرتا اور دھوتی پہنے تھا۔ پیشانی پر چوڑا سا گیروے رنگ کا تلک لگا ہوا تھا اور سر پر گاندھی ٹوپی۔ غرض اسے خاص طور پر ہندو بنا کر پیش کیا گیا تھا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟" عدالت نے تہذیب سے سوالات کرنے شروع کئے۔

"سورج پرکاش۔"

"تم کس کے بیٹے ہو؟"

"میں شیام سندر لال جی کا بیٹا ہوں۔"

پھر عدالت نے مجھے آگے آنے کا اشارہ کیا۔ میں آگے آیا تو میری طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"سورج پرکاش انہیں پہچانتے ہو؟"

"جی ہاں"

"یہ تمہارے کون ہیں؟"

"جی میرے چاچا۔"

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

سورج پرکاش، ذاکر صاحب کو غور سے دیکھو کیا یہ تمہارے پتا جی نہیں؟

"جی نہیں، میرے پتا جی شیام سندر ہیں۔"

"پھر تم ان کے گھر کیسے پہنچے؟"

"میں نہیں بتا سکتا۔"

سورج پرکاش، اگر ہم تمہیں ذاکر صاحب کے ساتھ بھیج دیں تو کیا تم جانا پسند کرو گے؟

"حضور، مجھے ان کے ساتھ ہرگز نہ بھیجئے۔ میرے پتا شیام سندر ہیں۔ میں اپنے پتا جی کے ساتھ رہنا چاہتا ہوں۔ یہ کہہ کر وہ رونے لگا۔ تہذیب کی اس چیخ پکار سے کمرے میں بیٹھے ہوئے تمام لوگ متاثر ہوئے۔ ایک آدھ کونے سے "چچ چچ" کی آوازیں بھی آئیں اور ایک فوٹو گرافر نے تہذیب کی روتے ہوئے تصویر بھی کھینچ لی۔ جسے فوراً عدالت سے باہر نکال دیا گیا۔

عدالت کا جھکاؤ شروع سے ہی شیام سندر کی طرف تھا۔ اور تہذیب سے جس انداز سے سوالات کئے گئے تھے اس سے صاف ظاہر ہوتا تھا۔ کہ مقدمے کا فیصلہ شیام سندر کے حق میں ہو جائے گا۔ اور ہوا بھی یہی دو گھنٹے کے بعد جب فیصلہ سنایا گیا تو مجھے باپ کے حق سے محروم کر دیا گیا اور تہذیب کو بالغ ہونے تک شیام سندر کے ساتھ رہنے کا حق دے دیا گیا۔"

عدالت نے اپنے فیصلے میں لکھا، جیسا کہ عدالت میں ہونے والی گواہیوں، سکول ریکارڈ اور پولیس انسپکٹر کے بیان سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ تہذیب ذاکر حسین کا بیٹا ہے اور اسی طرح دوسری طرف سے پیش ہونے والی گواہیوں، سکول ریکارڈ، پیدائش کے سرٹیفکٹ اور پولیس کے بیان سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ سورج پرکاش، شیام سندر کا بیٹا ہے۔ یہ اصل میں آواگون کا مسئلہ ہے اور بھگوان کے اس کرشمے میں انسان کا بنایا ہوا قانون فیصلہ دینے سے قاصر ہے۔ یہ روح اور جسم کا جھگڑا ہے۔ اس وقت اس لڑکے کا جسم تہذیب کا ہے اور اس کا دعویدار ذاکر حسین ہے۔ اور روح سورج پرکاش کی ہے جس کا دعویدار شیام سندر ہے۔ جسم روح کے تابع ہوتا ہے۔ اور اصل چیز روح ہوتی ہے۔ اور روح کو جسم سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے علاوہ یہ لڑکا شیام سندر کے ساتھ رہنا چاہتا ہے۔ اس لئے عدالت شیام سندر کے حق میں فیصلہ دیتی ہے۔ اور ذاکر حسین کا دعویٰ مسترد کرتی ہے۔ اور سورج پرکاش کو بالغ ہونے تک اپنے باپ شیام سندر کے ساتھ رہنے کی اجازت دیتی ہے۔

اور یوں مجسٹریٹ جگدیش بمل نے میرے جگر کے ٹکڑے کو شیام سندر کے حوالے کر دیا اور میں تڑپتا رہ گیا۔

☆.....☆.....☆

آج تہذیب کی سالگرہ تھی۔

بڑی سی میز پر سالگرہ کا کیک رکھا تھا اور اس پر ایک موم بتی جل رہی تھی۔ میں شمع کی آنکھ سے ٹپکتے ہوئے آنسوؤں کو بغور دیکھ رہا تھا اور خود بھی اندر ہی اندر پگھل رہا تھا۔ یہ میرے

تہذیب کی پہلی سالگرہ تھی جو اس کے بغیر منائی جا رہی تھی۔ اور میں تہذیب کا منتظر تھا۔

غلام رسول تہذیب کو لینے گیا تھا اور وہ یہ کہہ کر گیا تھا کہ وہ تہذیب کو اپنے ساتھ لے کر ہی آئے گا چاہے اسے اغواء ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔ اور اگر خدانخواستہ وہ تہذیب کو لانے میں ناکام رہا تو پھر اس گھر کی دہلیز پر قدم نہ رکھے گا غلام رسول نے اتنی بڑی قسم میرے چہرے سے جھانکتی ہوئی اداسی کو دیکھ کر کھائی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ کم از کم تہذیب سالگرہ کے دن تو اس گھر میں رہے۔

ہر آہٹ پر میں چونک اٹھتا۔ شاید میرا تہذیب آیا۔ ہر دستک پر میرا دل دھڑکنے لگتا۔ مجھے ہر لمحے اپنے بیٹے کا انتظار تھا اور یہ انتظار کرب کی صورت اختیار کرتا جا رہا تھا۔ نظریں گھڑی پر تھی اور گھڑی شاید بند تھی۔ کم از کم مجھے تو ایسا ہی محسوس ہوتا تھا کہ جیسے وقت رک گیا ہو، گھڑی کی سوئیاں رک گئی ہوں۔ غلام رسول کو اب تک آ جانا چاہیئے تھا۔ گاڑی کا وقت تو کب کا ہو چکا تھا۔ کہیں غلام رسول کے ساتھ کوئی حادثہ تو پیش نہیں آ گیا۔ کسی مصیبت میں گرفتار تو نہیں ہو گیا بیچارہ۔ پر میرا دل کہتا تھا کہ وہ ضرور آئے گا اور تہذیب کو ساتھ لے کر آئے گا۔

تب ہی کسی نے دروازے پر دستک دی۔ میں اٹھ کر بھاگا۔ دروازہ کھولا تو میری خوشی کا ٹھکانا نہ رہا۔ غلام رسول دروازے پر تہذیب کو گود میں اٹھائے فاتحانہ انداز میں کھڑا تھا۔

"ارے میرا بیٹا۔" میں نے خوشی سے اپنی بانہیں پھیلا دیں۔

وہ میری گود میں آ تو گیا مگر کسی گرمجوشی کا اظہار نہ کیا اسکے چہرے پر زردی پھیلی ہوئی تھی اور وہ سہما سہما سا مجھے دیکھے جا رہا تھا۔

تہذیب کی آمد کی اطلاع آناً فاناً سارے محلے میں پھیل گئی ذرا سی دیر میں میرا گھر عورتوں، مردوں، اور بچوں سے بھر گیا۔ ہر شخص نے بڑھ کر تہذیب کو پیار کیا اسے پچھلی باتیں یاد دلائیں مگر وہ گم صم بیٹھا رہا۔

میرے کہنے پر بڑی خاموشی سے اس نے موم بتی بجھائی، کیک کاٹا۔ چاروں طرف سے مبارک سلامت کا شور اٹھا مگر وہ مٹی کا مادھو بنا بیٹھا رہا۔ جیسے یہ اسکی سالگرہ کی تقریب نہ تھی اس کا اپنا گھر نہ تھا۔ میں اس کا باپ نہ تھا۔ غلام رسول سے اس کا کوئی رشتہ نہ تھا۔ محلے پڑوس کے لڑکوں سے اسکی کوئی واقفیت نہ تھی۔ تہذیب نے کتنی جلدی سب کچھ بھلا دیا تھا۔

تہذیب صبح سے بھوکا تھا۔ اور جب سے یہاں آیا تھا۔ اس نے میرے اصرار کے باوجود چھ نہ کھایا حتیٰ کہ پانی تک نہیں پیا تھا۔ میں نے اور غلام رسول نے لاکھ اسے سمجھایا، تسلیاں دیں، بہلایا پھسلایا مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔

پھر میں نے زیادہ ضد کرنی مناسب نہ سمجھی سوچا آخر کب تک بھوکا رہے گا۔ بھوک سے نڈھال ہو گا تو خود بہ خود راستے پر آ جائے گا۔

اب میں کسی قیمت پر تہذیب کو اپنے سے جدا نہ ہونے دوں گا۔ میں صبح ہی سے اسے

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

لیکر کہیں اور چلا جاؤں گا۔ شیام سندر اسے کہاں کہاں تلاش کرے گا۔ تھک ہار کر اپنے آپ خاموش ہو جائے گا۔ پھر تہذیب میرے پاس رہے گا تو ضرور بدل جائے گا۔ میں اپنے پیار سے اسے ضرور بدل دوں گا۔

ابھی غلام رسول سفر کا ضروری سامان باندھ ہی رہا تھا کہ کسی نے بڑے زور سے دروازے کی کنڈی بجائی۔ الٰہی خیر! یہ صبح کے تین بجے کون آ ٹپکا۔

"غلام رسول دیکھو تو دروازے پر کون ہے۔" میں نے کہا۔

دروازہ کھولتے ہی غلام رسول کی ایک چیخ سی سنائی دی۔

"کیا ہوا" میں دروازے کی طرف بھاگا۔

"مالک۔ پولیس۔"

میرے بھاگتے قدم زمین میں گڑ گئے۔ پولیس انسپکٹر، شیام سندر اور تین چار سپاہی گھر میں داخل ہو چکے تھے اور میری طرف بڑھ رہے تھے۔

غلام رسول کو اور مجھے ہتھکڑیاں پہنا دی گئیں۔ تہذیب کو جب سوتے سے اٹھایا گیا تو شیام سندر کو اپنے سرہانے کھڑا دیکھ کر دیوانوں کی طرح اٹھا اور "پتا جی" کہہ کر شیام سندر کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔ اپنے خون کو غیر کی ٹانگوں سے لپٹتے دیکھ کر میری آنکھوں میں خون اتر آیا۔ جی چاہا کہ تہذیب کا ابھی گلا دبا دوں۔ لیکن ہاتھ میں پڑی ہتھکڑی سے مجبور تھا۔

مقدمہ چلا تو غلام رسول اور مجھے اپنے ہی بیٹے کے کے اغوا کے الزام میں سزا ہو گئی۔ اور ہم جیل کی سلاخوں کے پیچھے ہفتے اور مہینے شمار کرتے رہے۔

آخر وہ دن آ ہی پہنچا۔ جب ہم دونوں پر جیل کا دروازہ کھل گیا۔ میرے سر اور چہرے کے بال بے تحاشا بڑھے ہوئے تھے اور یہی حال میرے ملازم غلام رسول کا تھا۔ ہم دونوں کو اس حالت میں اگر ہمارے شہر کا کوئی آدمی دیکھتا تو ہرگز نہ پہچان پاتا۔

اور شاید اسی لئے بریلی جیل سے رہا ہو کر میں نے اپنے شہر کا رخ کرنے کی بجائے شہر کی دھرم شالہ میں ٹھہرنے کا پروگرام بنایا۔ جیل میں، میں نے ایک منصوبہ تیار کیا تھا اور اب اسی منصوبے پر عمل کرنے کا ارادہ تھا۔ سب سے پہلے شیام سندر کا مکان معلوم کرنا تھا۔ جو ایسا مشکل کام نہ تھا۔ پھر مکان کا جائزہ لے کر کسی طرح شیام سندر کے گھر میں داخل ہونا تھا اور وہیں رات کا انتظار کرنا تھا۔ یہ کام مشکل تھا اور خطرناک بھی لیکن اسکے لئے بھی راہ نکال لی تھی اور آگے کا معاملہ خدا کے بھروسے پر چھوڑ دیا تھا۔

گلی میں دھوپ بھری تھی۔ لو کے تھپیڑے کانوں اور منہ میں نوٹے کانچ کی طرح چبھ رہے تھے۔ گلی بالکل سنسان تھی۔ مکانوں کے دروازے اور کھڑکیاں بند تھیں۔ ہر آدمی دھوپ کی تیزی اور لو کی تپش سے گھبرایا ہوا گھر میں گھسا بیٹھا تھا۔

ہم دونوں سادھو بنے۔ ہری نام جپتے، شیام سندر کے مکان کی طرف بڑھ رہے تھے۔

میرا دل دھڑک رہا تھا جسم پسینے میں ڈوبا ہوا تھا۔ میں نے گھبرا کر چادر سے اپنے چہرے کا پسینہ پونچھا۔

"اوم نام ست ہے۔ ہے کوئی پیاسے کو جل دینے والا۔" شیام سندر کے دروازے پر پہنچ کر میں نے صدا لگائی۔

"پیاسے کو جو دے جل۔ اس کو ملے گا یہیں پر پھل" غلام رسول نے ٹکڑا لگایا۔

تھوڑی دیر میں دروازہ کھلا۔ شیام سندر باہر آیا۔ شاید وہ ابھی سکول سے آیا تھا۔ ابھی اس نے لباس بھی تبدیل نہیں کیا تھا۔

"نمستے مہاراج۔" شیام سندر نے مصنوعی سی مسکراہٹ سے ہمارا استقبال کیا۔ "جگ جگ جیو بیٹا۔" میں نے دعا دی پھر بولا "ہم پیاسے ہیں بیٹا۔ کیا جل ملے گا۔" کیوں نہیں مہاراج۔ ضرور ملے گا۔ میں ابھی بیٹھک کھولتا ہوں۔ آپ لوگ آرام سے بیٹھ کر جل پان کریں۔

"دھنیہ ہو بیٹا۔ سدا سکھی رہو۔"

شیام سندر نے اندر جا کر دوسرا دروازہ کھولا۔ ہمیں بیٹھک میں بٹھا کر خود اندر چلا گیا۔

میں نے فوراً ہی بیٹھک کا جائزہ لیا۔ سادہ سی بیٹھک تھی اور میرے چھپنے کے لئے وہ تخت کافی تھا۔ جس پر بڑی سی چادر پڑی تھی جس سے تخت کا نچلا حصہ بالکل ڈھکا ہوا تھا۔ اگر کوئی تخت کے نیچے گھس کر بیٹھ جائے تو پھر اس کا دکھائی دے جانا آسان نہ تھا۔

بیٹھک کے اندرونی دروازے پر کچھ آہٹ سی ہوئی۔ میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔ دروازے سے تہذیب داخل ہوا۔ وہ خاکی نیکر اور بنیان پہنے ہوئے تھا۔ آتے ہی اس نے ہم دونوں کو ہاتھ جوڑ کر نمسکار کیا۔

تہذیب کو دیکھتے ہی میرے اندر لاوا سا پھوٹ پڑا۔ میں نے بانہیں پھیلا کر اسے اپنے پاس بلایا۔ "سکھی رہو بچہ۔ آؤ ہمارے سینے سے لگ جاؤ۔"

تہذیب نے میرے چہرے کو بڑے غور سے دیکھا۔ میری آواز سے میری شکل پہچاننے کی کوشش کی۔ تب میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔ "کیا دیکھتے ہو تہذیب۔ ہم تمہارے پاپا ہیں۔ آؤ میرے سینے سے لگ جاؤ۔"

یہ سن کر تہذیب نے بھاگنا چاہا لیکن میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اتنے میں شیام سندر بیٹھک میں داخل ہو۔ اسکے ہاتھ میں بڑی سی لٹھ تھی اور اسکے منہ پر برف کا ٹکڑا رکھا ہوا تھا۔

شیام سندر کو اصل معاملے کی تہہ تک پہنچنے میں ایک سیکنڈ نہ لگا۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولے۔ میں نے چہرے سے پے در پے وار کر کے اسے ٹھنڈا کر دیا۔

"شیام سندر تو نے میرے تہذیب پر ڈاکہ مارا تھا یہ اسکی سزا ہے۔" میں نے نفرت سے شیام سندر کی لاش کو ٹھوکر ماری۔ پھر تہذیب کی طرف بڑھا۔ تہذیب خوف کے مارے تخت کے نیچے گھس گیا تھا۔ میں نے گھسیٹ کر باہر نکالا اور دونوں ہاتھوں سے اس کا گلا دبوچ لیا۔

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

"مالک۔ یہ کیا کر رہے ہیں۔" غلام رسول گھبرایا۔

میں نے وحشی آنکھوں سے غلام رسول کو گھورا۔ اور تہذیب کے گلے پر میری گرفت تنگ ہوتی گئی۔

"تہذیب میرا تھا۔ اب یہ کسی کا نہ رہے گا۔"

"تہذیب تڑپ تڑپ کر ٹھنڈا ہو گیا۔ میں نے اسکے مردہ جسم کو گلے سے لگالیا۔ وہ خاموشی سے میرے گلے لگ گیا۔ اس نے اف بھی نہ کی۔ کاش زندگی میں بھی ایسا ہوتا۔"

اور جب میں تھانے میں داخل ہوا تو میرے کندھے پر اپنے تہذیب کی لاش تھی۔ ہاتھ میں خون آلود چھرا۔ میں تنہا تھا۔ غلام رسول کو میں نے بھگا دیا تھا۔

مجھے دیکھتے ہی سپاہیوں نے میرے گرد گھیرا ڈال لیا۔ میں بڑی لاپرواہی سے آگے بڑھتا رہا۔ تھانیدار کی میز پر میں نے تہذیب کی لاش لٹادی۔ اور اپنے قاتل ہاتھ تھانیدار کی طرف پھیلا کر بولا۔

"میں نے اپنے تہذیب کو قتل کیا ہے۔ جی ہاں اپنے بیٹے کو، میں نے اس آدمی کو بھی مار دیا ہے جس نے میرے تہذیب پر ڈاکا مارا تھا۔"

تھانیدار میری باتوں پر حیران تھا۔ پھر اس نے میرے ہاتھ میں ہتھکڑی ڈال دی۔

☆.....☆.....☆

آٹھویں محبّت

میں کون ہوں؟

یہ ایک ایسا سوال ہے کہ اگر میں اس پر بہت پہلے سوچ لیتا اور اپنے آپ سے اپنی شناخت کروالیتا تو میں وہ نہ ہوتا' جو آج ہوں اور کون جانے میں جو آج ہوں کل وہ رہوں نہ رہوں۔ ہوسکتا ہے میں اپنی شناخت کرلوں' میں اپنے آپ کو جان لوں۔

میں کون ہوں؟

اس سوال کا جواب میں آپ کو بعد میں دوں گا فی الحال میں اتنا بتائے دیتا ہوں کہ میں کہاں سے آیا ہوں۔ اگر اس بات کا میں نے صداقت سے جواب دیا تو بات اوپر تک پہنچے گی اور یہ میں چاہتا نہیں کہ کسی چھوٹی بات کے لیے اس عظیم ہستی کو اپنے درمیان لاؤں۔ میں آپ کو یہ بتاتا ہوں کہ میں کہاں کا ہوں۔ اب میں بات معرفت کی نہیں کروں گا بلکہ میں آپ کو یہ بتاؤں گا کہ میں لاہور کا رہنے والا ہوں' نہیں میں کوئٹہ سے آیا ہوں۔ شاید میں پشاور کا ہوں' نہیں جناب میں کراچی کا رہنے والا ہوں۔ آپ میری بات سن کر پریشان نہ ہوں۔ اصل بات یہ ہے کہ میں کہیں کا رہنے والا نہیں ہوں۔

میں کون ہوں؟ میں پنجابی ہوں' نہ پٹھان' میں بلوچی ہوں نہ سندھی' نہ مہاجر۔ میں اصل میں پاکستانی ہوں۔ یہ الگ بات ہے کہ میں آئینہ دیکھتے ہوئے شرمندہ ہوتا ہوں۔ ایسے ہوتے ہیں پاکستانی۔ بات دراصل یہ ہے کہ میرا کوئی شہر نہیں' میرا کوئی چہرہ نہیں۔ میں جس شہر میں ہوتا ہوں وہ میرا شہر ہوتا ہے اور اسی شہر کے مطابق میں اپنا چہرہ بنالیتا ہوں۔ میرے تن پر اسی شہر کا لباس ہوتا ہے اور زبان پر اسی علاقے کی زبان۔ میں پاکستان کی چھ سات علاقائی زبانوں پر عبور رکھتا ہوں۔

میرا نام وقار ہے لیکن وقار نام کی کوئی چیز میرے اندر نہیں۔ جس آدمی کی کوئی پہچان نہ ہو' جس کا کوئی چہرہ نہ ہو' جو ہر زمین پر ایک نیا روپ دھار لیتا ہو' اس کا بھلا کیا وقار ہوسکتا ہے؟

میرے شوق بھی نرالے ہیں۔ مجھے دو چیزوں کا بہت شوق ہے۔ ایک خوبصورت عورتوں سے شادی کا اور دوسرا قیمتی گاڑیوں کی خرید و فروخت کا۔ یہ خرید و فروخت تو میں نے محاورتاً کہہ دیا ہے' اصل کام فروخت کا ہے۔ میں اب تک سات شادیاں کر چکا ہوں۔ گاڑیاں میں نے پچاسوں فروخت کر دی ہوں گی' آپ مجھے کار ڈیلر تصور نہ کر لیں۔ میں کار ڈیلر نہیں ہوں۔ میں آپ کو

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

صاف بتا دوں' میں کار چور ہوں۔ میرے کام کا دائرہ پورے پاکستان میں پھیلا ہوا ہے۔ میں کراچی کی گاڑی لاہور میں اور لاہور کی گاڑی کوئٹہ میں فروخت کرتا ہوں پھر کوئٹہ کا مال حیدر آباد میں اور حیدر آباد کی چیز فیصل آباد میں ٹھکانے لگا آتا ہوں۔ پھر فیصل آباد کی گاڑی پشاور اور پشاور کی گاڑی اسلام آباد میں فروخت کر دیتا ہوں۔ میرا کوئی گروہ نہیں ہے' میں یہ کام اکیلے کرتا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ پچاسوں گاڑیاں ٹھکانے لگانے کے باوجود میں آج تک گرفت میں نہیں آ سکا۔ یہ بات میں فخر سے نہیں' عاجزی سے کہہ رہا ہوں کیونکہ میں یہ بات اچھی طرح جانتا ہوں کہ ہر برے کام کا نتیجہ برا ہوتا ہے۔ ضرور ایک دن وہ آئے گا جب میں پکڑا جاؤں گا' لیکن مجھے پکڑے جانے کی فکر نہیں ہے' اس لیے کہ یہاں پکڑے جانے کا مطلب پکڑے جانا نہیں ہوتا' بلکہ چھوٹ جانا ہوتا ہے۔ جس معاشرے میں لفظوں کے معنی تبدیل ہو چکے ہوں' وہاں پکڑے جانے کے خوف میں خود کو کون مبتلا کرے۔

میں گاڑیوں کے جعلی کاغذات بالکل اصل کے مطابق بنانے کا ماہر ہوں۔ میرے بنائے ہوئے کاغذات ماہر سے ماہر کار ڈیلر بھی نہیں پکڑ سکے اور جو کبھی پکڑ لیتے ہیں' وہاں ہزار دو ہزار روپے اوپر نیچے کر کے گاڑی ان کے حوالے کر دیتا ہوں۔

میں ناک نقشے کا ٹھیک ٹھاک آدمی ہوں بلکہ یوں کہنا چاہیے میں خوبصورت آدمی ہوں۔ میری مردانہ وجاہت پر خواتین مرمٹنے کو تیار ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں اب تک سات شادیاں کر چکا ہوں۔ میں اپنے چہرے سے' چال ڈھال سے' اپنی گفتگو سے چور ہرگز نہیں معلوم ہوتا بلکہ بزنس مین دکھائی دیتا ہوں اور میں لوگوں سے کہتا بھی یہی ہوں اور کیونکہ میں آئے دن پاکستان کے مختلف شہروں میں چکر لگاتا رہتا ہوں اور میرے نیچے ایک سے ایک عمدہ گاڑی رہتی ہے اس لیے میرے جاننے والوں کو مجھ پر کبھی شبہ نہیں ہوتا۔ ویسے بھی اس نفسانفسی کے دور میں کوئی کسی کو تفصیل سے جاننے کی کوشش بھی نہیں کرتا۔ آپ نے جو بتا دیا' ٹھیک ہے' اتنا وقت کس کے پاس ہے کہ وہ تصدیق کرتا پھرے یہی وجہ ہے کہ آج کے زمانے میں دھوکا دینا زیادہ آسان ہو گیا ہے۔ لوگ ظاہری نیم نام سے کیموفلاج ہو جاتے ہیں۔

میرے پاس لوگوں پر سحر کرنے کیلئے کس چیز کی کمی تھی۔ میں ایک سمارٹ آدمی تھا' قیمتی گاڑی اور اچھے گھر میں رہتا تھا۔ میری گاڑی میں میری بیوی کی صورت میں کوئی حسین عورت ہوتی تھی۔ میں بڑے ریستورانوں اور بڑے ہوٹلوں میں اٹھتا بیٹھتا تھا' جس کے نتیجے میں لوگ مجھ سے خود بخود مرعوب ہو جاتے تھے اور جو نہیں ہوتے تھے انہیں میں اپنے اخلاق سے متاثر کر لیتا تھا۔

میں کوئی کنجوس آدمی نہ تھا۔ میرے پاس پیسے ہوتے تو دونوں ہاتھوں سے خرچ کرتا اور جب تک میرے پاس پیسے رہتے' میں کبھی کسی گاڑی پر ہاتھ نہ ڈالتا۔ دولت کے معاملے میں میں ہوس پرست نہ تھا' قناعت پسند تھا۔ ایک گاڑی اٹھاتا اور جب تک اسے چٹ' نہ کر لیتا دوسری گاڑی کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے بھی نہ دیکھتا لیکن دوسرے معاملے میں یہ اصول قابل عمل نہ تھا۔

یہی وجہ تھی کہ میں نے اب تک سات شادیاں کی تھیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ ساری شادیاں میں نے بیک وقت نہ کی تھیں لیکن چار بیویاں میرے پاس بیک وقت ضرور رہی تھیں۔ چار سے پانچ کبھی نہ ہوئی تھیں اور ایسا اتفاقاً ہوا تھا' میں نے کوئی باقاعدہ اہتمام نہ کیا تھا۔ البتہ ایک وقت ایسا ضرور آیا تھا کہ میرے پاس بیویوں کا کوٹا ختم ہونے لگا تھا۔ تب میں نے بھاگ دوڑ کر کے اس کوٹے کو پورا کیا تھا۔ میں دو سے کم بیویاں رکھنے کا قائل نہ تھا۔ اس وقت میرے پاس تین بیویاں تھیں' دو میرے ساتھ تھیں' ہیڈ کوارٹر میں۔ ہیڈ کوارٹر میں کراچی کو کہا کرتا تھا کیونکہ میرا کاروبار زیادہ تر یہیں تھا۔ یہاں ایک سے ایک اعلیٰ گاڑی موجود تھی۔ اس شہر میں گاڑی اٹھائے جانے پر مالک زیادہ پریشان نہ ہوتے تھے۔ دولت کی فراوانی ہو تو گاڑی کا چوری ہو جانا کوئی اتنا بڑا صدمہ نہیں ہوتا کہ آدمی دل کو لگا کر بیٹھ جائے۔ بعض تو تھانے میں رپورٹ بھی نہ لکھواتے تھے۔ ہاں کبھی کبھار اخبار میں گاڑی چوری ہونے کا اشتہار ضرور آ جاتا تھا کہ فلاں جگہ سے فلاں رنگ کی فلاں میک کی گاڑی چوری ہو گئی ہے۔ گاڑی کے بارے میں اطلاع دینے والے کو یہ انعام دیا جائے گا' یا چوری کے بارے میں اطلاع دینے والے کو یہ انعام دیا جائے گا' یا چوری ہونے والی گاڑی میں کچھ ضروری کاغذات ہوتے ہیں انہیں واپس کرنے کی اپیل کی جاتی۔ میرا وتیرہ یہ تھا کہ مجھے کبھی کسی کی گاڑی میں اس طرح کے ضروری کاغذات مل جاتے تو میں اشتہار کا انتظار کیے بغیر ہی ڈاک کے ذریعے ان کاغذات کو بھجوا دیتا۔ اس لیے کہ میرا کام کھانا تھا پیڑ گننا نہیں۔

بات کہاں سے کہاں نکل گئی۔ ہاں تو میں ذکر کر رہا تھا' اپنی تین بیویوں کا۔ دو میرے ساتھ یہاں کراچی میں تھیں اور ایک لاہور میں۔ کراچی والی دونوں بیویاں شمع اور نگار ایک ہی چھت کے نیچے تھیں اور دونوں بہت خوش تھیں۔ تیسری کو میں نے سمن آباد میں ایک چھوٹا سا گھر لے کر دیا ہوا تھا۔ آسیہ یوں تو راولپنڈی کی تھی لیکن میں نے اسے آباد لاہور میں کیا ہوا تھا۔ میری کراچی والی بیویوں کی طرح وہ بھی خوش تھی۔

شاید آپ کو یہ بات حیرت انگیز لگے لیکن ہے حقیقت کہ میری بیویوں کو کبھی مجھ سے شکایت نہیں ہوئی۔ میں ان کے پاس دو دن رہوں یا دو مہینے یا مہینوں نہ جاؤں' انہوں نے کبھی اس بات کو وجہ نزاع نہیں بنایا۔ میں ویسے بھی کھلے ہاتھ کا آدمی ہوں۔ میں کہیں بھی رہوں لیکن ہر بیوی کو اس کا ماہانہ خرچہ بڑی پابندی سے ارسال کرتا رہتا ہوں اور میں کیونکہ آزاد خیال آدمی ہوں اس لیے میری طرف سے بیویوں پر کسی قسم کی پابندی نہیں ہوتی۔ عورتوں کو اور کیا چاہیے پیسہ اور آزادی۔ یہ دونوں چیزیں میری ہر بیوی کو میسر تھیں۔ لہٰذا وہ خوش رہتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ سات بیویوں میں سے مجھے ایک بھی چھوڑ کر نہیں بھاگی۔ نہ کبھی طلاق دینے کی نوبت آئی۔ شاید آپ کو اس بات پر بھی حیرت ہو کہ میں شادی کے بعد اپنی نئی بیوی کو اپنے کام کی نوعیت سے آگاہ کر دیتا ہوں۔ اس لیے کہ اس کام میں مجھے ان کے تعاون کی ضرورت پڑتی ہے۔ میرا کام جاننے کے باوجود کبھی کوئی بیوی معترض نہیں ہوئی' سوائے ایک کے۔

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

اصل میں اس بیوی کے انتخاب میں مجھ سے غلطی ہو گئی تھی۔ مجھے اندازہ نہ تھا کہ میں عورت کے روپ میں ایک میزان کو گھر میں ڈال رہا ہوں۔ جب صادقہ نے شادی کے بعد مجھ سے سوال کیا کہ "آپ کیا کرتے ہیں؟"

تو میں نے حسب سابق اسے جواب دیا۔ "بزنس۔"

"یہ کس طرح کا بزنس ہے' آپ تو کہیں آتے جاتے نہیں۔"

"اچھا ہے جو کہیں آتا جاتا نہیں' کہیں آؤں جاؤں گا تو تمہیں پریشانی ہو گی۔"

"مجھے کیوں پریشانی ہو گی بھلا۔ مرد گھر میں پڑا ہوا اچھا نہیں لگتا۔ پریشانی تو مجھے اب ہے۔"

"اچھا زیادہ پریشان نہ ہو' کسی دن میں تمہیں ساتھ لے چلوں گا' تمہیں اپنا کاروبار بتا دوں گا۔ تم خود اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ لینا۔"

"سچ؟" وہ خوش ہو گئی۔ "پھر ہم کب چلیں گے؟"

"آج ہی چلیں گے لیکن ایک شرط ہے۔" میں نے کہا۔

"شرط؟" اس نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ "کیسی شرط؟"

"تم خاموشی سے سب کچھ دیکھو گی' کچھ بولو گی نہیں' کوئی سوال نہیں کرو گی۔ اس وقت تک جب تک میں تم سے سوال کرنے اور بولنے کو نہ کہوں۔"

"یہ تو کچھ عجیب سی بات ہے۔" وہ کچھ پریشان ہو گئی۔

"ہاں' یہ عجیب سی بات ہے لیکن اس پر کاربند رہنا ہو گا۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"کوئی خطرناک بزنس ہے آپ کا؟" وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔

"نہیں' ہرگز نہیں۔" میں نے نگاہیں نیچی کر کے کہا۔

"پھر زبان بندی کی قید کیوں؟"

"اب تو بحث پر اتر آئی ہو' اس کا مطلب ہے کہ تم چاہتی نہیں ہو کہ میرا کاروبار دیکھو۔" میں نے ہلکی سی دھمکی دی۔ وہ فوراً سیدھی ہو گئی۔

"نہیں' خدا کی قسم نہیں۔" وہ ایک دم گھبرا کر بولی۔ "میں چاہتی ہوں آپ کا کاروبار دیکھوں۔ میں آپ کی بیوی ہوں مجھے آپ کے بارے میں سب معلوم ہونا چاہئے۔"

"ہاں اب میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ ہمارے درمیان کوئی پردہ نہ رہے' تم میرے بارے میں سب کچھ جان لو اور سب کچھ جان کر میرے ساتھ تعاون کرو' میاں بیوی ویسے بھی گاڑی کے دو پہیے ہوتے ہیں' یہ شاید تم ہی نے مجھے بتایا تھا۔"

"اس بات میں آپ کو کوئی شک ہے؟"

"نہیں' مجھے تو کوئی شک نہیں' البتہ تمہیں شک ضرور ہے۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"مجھے آپ پر شک کوئی نہیں' اگر شک ہوتا تو شادی کیوں کرتی لیکن میں چاہتی ہوں کہ

مجھے یقین ہو جائے۔"

"کس بات کا؟"

"آپ کے کاروبار کا۔"

"بغیر کاروبار کے کوئی اس طرح ٹھاٹ کی زندگی گزار سکتا ہے؟"

"میں جانتی ہوں لیکن میں جب سے اس گھر میں آئی ہوں میں نے آپ کو کہیں آتے جاتے نہیں دیکھا۔"

"تمہارے حسن کی گرفت اتنی مضبوط ہے کہ وہ مجھے گھر سے باہر نکلنے نہیں دیتی۔" میں نے سچی بات کہی لیکن اس نے اسے مردوں کا جھانسا سمجھا۔

"ہاں' میں خوب جانتی ہوں۔" اس نے چمکیلی نگاہوں سے مجھے دیکھا جس کا مطلب تھا کہ مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش نہ کرو۔

سچی بات تو یہ ہے کہ وہ میرے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی۔ جب میں نے اسے اپنا جلوہ دکھایا تو وہ بھڑک اٹھی۔ "میں آپ کے ساتھ ہرگز نہیں رہوں گی' مجھے فوراً طلاق دیں۔"

ہوا یوں کہ میں وعدے کے مطابق صادقہ کو اپنا کاروبار دکھانے کیلئے گھر سے نکلا۔ سٹیئرنگ پر بیٹھ کر پہلے میں نے سوچا کہ کدھر کا رخ کرنا چاہئے۔ گھڑی پر نظر ڈالی شام کے چھ بج رہے تھے پھر میں نے اپنے ذہن میں فیصلہ کر کے گاڑی سٹارٹ کی اور شہر کے سب سے مصروف شاپنگ پلازہ کا رخ کیا۔

صادقہ کو نہیں معلوم تھا کہ میں کہاں جا رہا ہوں۔ وہ بالکل خاموشی سے میرے ساتھ سفر کرتی رہی' جب میں نے دو گاڑیوں کے درمیان خالی جگہ میں اپنی گاڑی پارک کی تو صادقہ نے مجھے پرتجسس نگاہوں سے دیکھا۔

"شاپنگ؟" اس نے مجھ سے سوال کیا۔

"سوال کوئی نہیں ہو گا' اس کا تم وعدہ کر چکی ہو۔"

"اوہ' سوری۔" اس نے فوراً معذرت کی۔ "اب نہیں بولوں گی۔"

میں نے جہاں گاڑی لگائی تھی' اس نے دائیں جانب ایک اچھی کنڈیشن کی گاڑی کھڑی تھی۔ اس گاڑی کے لاکھ ڈیڑھ لاکھ مل جانا مشکل نہ تھے۔ میں اپنی گاڑی سے اترا مجھے اترتے دیکھ کر صادقہ نے بھی اپنی طرف کا دروازہ کھولا لیکن میں نے فوراً جھک کر اسے گاڑی میں بیٹھے رہنے کا اشارہ کیا۔ اس نے میرا حکم مانتے ہوئے فوراً دروازہ بند کر لیا۔

میں نے ایک دو منٹ کھڑے ہو کر چاروں طرف کا جائزہ لیا۔ اس سڑک پر اس بڑے شاپنگ پلازہ کے ساتھ کئی چھوٹے شاپنگ سنٹر بھی موجود تھے' اس لیے اچھا خاصا رش تھا۔ لوگ اپنے آپ میں مگن آ جا رہے تھے۔ کوشش کے باوجود مجھے دور تک کوئی پولیس والا نظر نہیں آیا۔ تب میں تیزی سے کھڑکی کی طرف جھکا اور اس میں منہ ڈال کر صادقہ سے مخاطب ہوا۔

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

"میں برابر کھڑی گاڑی میں بیٹھ کر جا رہا ہوں' میں جب تک واپس نہ آ جاؤں تم اپنی گاڑی میں اطمینان سے بیٹھی رہنا۔"

"یہ کہہ کر میں نے فوراً کھڑکی سے منہ نکال لیا' صادقہ کا جواب سننے کی مجھے کیا ضرورت تھی' اس سے نہ بولنے کا معاہدہ ہو چکا تھا' لیکن میری بات اس قدر غیر متوقع اور عجیب تھی کہ وہ خاموش نہ رہ سکی۔

"آخر تم کیا کرنے جا رہے ہو؟" وہ گھبرا کر بولی۔

"سوال کوئی نہیں ہوگا' بس خاموشی سے دیکھتی جاؤ۔" یہ کہہ کر میں فوراً ایکشن میں آ گیا۔

اس سے پہلے کہ وہ مزید سوال کرتی میں نے ایک مخصوص چابی سے گاڑی کا دروازہ کھولا۔ اسی ماسٹر کی سے گاڑی سٹارٹ کی اور پیچھے دیکھ کر تیزی سے گاڑی بیک کی۔

صادقہ مجھے حیران پریشان دیکھے جا رہی تھی۔ میں نے اس کی بالکل پروا نہ کی۔ اب میں ایکشن میں آ چکا تھا۔ اب اپنا مشن پایہ تکمیل تک پہنچائے بغیر کوئی چارہ نہ تھا۔ میرا گھر بیس پچیس منٹ کی مسافت پر تھا' میں نے یہ فاصلہ صرف سترہ منٹ میں طے کیا۔

گھر آ کر میں نے گیراج کا دروازہ کھولا۔ گاڑی اس میں کھڑی کی۔ گیراج کو تالا لگایا پھر گھر کے گیٹ پر تالا لگایا اور تیزی سے سڑک کی طرف چلا۔ اتفاق سے سڑک پر پہنچنے سے پہلے ہی ایک گلی میں ٹیکسی مل گئی جو ابھی خالی ہوئی تھی۔ میں ٹیکسی پکڑ کر فوراً شاپنگ پلازہ کی جانب چل پڑا۔ جہاں میری گاڑی کھڑی تھی۔ اس سے سو گز کے فاصلے پر میں نے ٹیکسی رکوائی۔ اسے پیسے دیئے اور تیزی سے صادقہ کی طرف چلا۔

وہاں خیریت تھی۔ جہاں سے میں نے گاڑی اٹھائی تھی' وہاں ایک دوسری گاڑی کھڑی تھی۔ صادقہ بہت پریشان حال بیٹھی تھی۔ مجھے اس نے دیکھا تو اس کے چہرے پر کچھ اطمینان آیا۔ میں مسکراتا ہوا گاڑی میں آ بیٹھا اور بولا۔ "کہو' کیا حال چال ہیں؟"

"یہ سب کیا ہے؟" اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی اور آنکھوں میں آنسو جھلک رہے تھے۔

"سوال اس وقت تک نہیں جب تک میں اس کی اجازت نہ دوں۔" میں نے اس کی حالت کو نظر انداز کرتے ہوئے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔ "یہ بتاؤ شاپنگ کرنی ہے یا گھر چلنا ہے۔"

"گھر چلنا ہے' فوراً اسی وقت۔" وہ ہذیانی انداز میں چیخی۔

"پلیز صادقہ' اپنے اعصاب کو قابو میں رکھو' چیخو چلاؤ مت۔" میں نے بڑی ملائمت سے کہا۔

"میں اس کی کیفیت سے اچھی طرح آگاہ ہو گیا تھا۔ مجھے یہ بھی احساس ہو گیا تھا کہ اس مرتبہ میں نے کسی غلط چیز کا انتخاب کر لیا ہے' شاید صادقہ کو راہ راست پر لانا آسان نہ ہو۔ اس

مرتبہ کوئی دیانت زدہ چیز میرے ہتھے چڑھ گئی تھی۔

شاپنگ پلازہ سے گھر تک وہ بالکل خاموش بیٹھی رہی۔ میں اندازہ نہیں کر پایا تھا کہ میرا کاروبار دیکھ کر اسے غصہ آ رہا تھا یا شدید قسم کا ذہنی جھٹکا لگا تھا۔ یہ دونوں ہی صورتیں میرے لیے کسی عذاب سے کم نہ تھیں۔

گھر پہنچ کر میں پورے اطمینان سے بیڈ پر لیٹ گیا اور بولا۔ "اب تم سوال کر سکتی ہو؟"

"یہ کاروبار ہے آپ کا۔ آپ گاڑیاں چراتے ہیں؟" بالآخر آتش فشاں پھٹا۔

"میں اپنے کاروبار کے سلسلے میں ایک لفظ کی ترمیم چاہتا ہوں' میں گاڑیاں چراتا نہیں اٹھاتا ہوں۔ آئندہ چرانا نہ کہا جائے۔" میں نے ہنسنے کی کوشش کی۔

"وہ گاڑی کہاں ہے؟"

"یہیں اسی گھر میں۔" میں نے بڑے سکون سے کہا۔ "گیراج میں بند ہے' دکھاؤں۔"

"مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ ایک چور ہیں' اگر مجھے یہ معلوم ہوتا تو میں ہرگز آپ سے شادی نہ کرتی' میں اب آپ کے ساتھ' ایک چور کے ساتھ' ہرگز نہیں رہ سکتی۔ آپ مجھے فوراً طلاق دیں۔"

وہ غصے میں بھری ہوئی تھی' لال انگارا ہوئی جا رہی تھی۔ کمرے میں ادھر سے ادھر ٹہل رہی تھی' اس پر ایک دورے کی سی کیفیت تھی۔

میں اسے خاموشی سے دیکھ رہا تھا۔

"خدا کی پناہ! آپ کی شکل دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا کہ آپ کتنا گھناؤنا کاروبار کرتے ہیں۔ آپ نے مجھے یہ سب پہلے کیوں نہیں بتایا؟"

"اگر میں تمہیں بتا دیتا تو مجھ سے شادی کیوں کرتیں بھلا۔" یہ بات میں نے کہی نہیں' دل میں سوچی۔ وہ بولے جا رہی تھی۔

"آپ نے مجھے دھوکا دیا ہے۔ میرے ابا کی آپ کے بارے میں ٹھیک رائے تھی۔ انہیں آپ پسند نہ تھے' میری ضد نے بالآخر مجھے یہ دن دکھا دیا۔ آپ کیا سمجھتے ہیں کہ میں آپ سے سمجھوتہ کر لوں گی' برائی سے سمجھوتہ کر لوں گی ہرگز نہیں' مجھے چاہے بھیک مانگنا پڑ جائے مانگ لوں گی مگر ایک چور کے ساتھ ہرگز نہیں رہوں گی۔ مجھے حرام کی کمائی نہیں چاہیے۔ میں رزق حلال کھانا چاہتی ہوں۔"

"مجھے کیا کرنا ہوگا؟" میں نے بڑی معصومیت سے سوال کیا۔

"طلاق دینا ہوگی یا رزق حلال کمانا ہوگا۔" وہ دوٹوک انداز میں بولی۔

"رزق حلال میں یہ ٹھاٹ نہیں ہو سکتے۔" میں نے اسے سمجھانا چاہا۔

"مجھے نہیں چاہئیں یہ ٹھاٹ' مجھے بس آپ آزاد کر دیں....." وہ کوئی بات سمجھنے کو تیار نہ تھی۔

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

"کر دوں گا آزاد لیکن تم طلاق لے کر کہاں جاؤ گی' تمہارے گھر کے دروازے تو تم پر بند ہو چکے ہیں۔" میں نے اسے خوفزدہ کرنے کی کوشش کی۔

"کوئی بات نہیں' میں اپنے ماں باپ کے گھر نہیں جاؤں گی۔ ابھی میری سکول کی ملازمت برقرار ہے۔ میں چھٹی پر ہوں۔ میں ہوسٹل میں رہوں گی اور ملازمت کروں گی۔ آئندہ زندگی بھر کسی مرد کی صورت نہیں دیکھوں گی' تم مرد لوگ بہت فراڈ ہوتے ہو۔" وہ بلا خوف بولی۔

"میں چاہتا ہوں تم ایک دو روز اور ٹھنڈے دل سے سوچ لو۔ پھر جو کہو گی کر دوں گا۔"

"میں نے سوچ لیا ہے' میں اب اس گھر میں ایک گھنٹہ بھی نہیں گزار سکتی۔" یہ کہہ کر اس نے اپنا سوٹ کیس بھرا اور چلی گئی۔

یہ جو کچھ ہوا اور جتنی تیزی سے ہوا مجھے حیرت زدہ کر گیا۔ وہ چلی گئی لیکن میں نے اسے طلاق نہیں دی۔ میں اس شہر کو چھوڑ کر چلا آیا اور صادقہ کو' اس دیانت زدہ چیز کو میں نے ایک بھیانک خواب کی طرح بھلا دیا۔

میں جانتا ہوں' بعد میں اس نے مجھے نہ ڈھونڈا ہو گا۔ میں جانتا تھا کہ وہ اب دوسری شادی ہرگز نہ کرے گی لہٰذا اسے طلاق کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ اس نے بھی مجھے ایک بھیانک خواب کی طرح بھلا دیا ہو گا۔

یہ دو سال بعد کی بات ہے میں ٹرین میں سفر کر رہا تھا۔ فرسٹ کلاس کے ڈبے میں تھا۔ ایک سٹیشن پر گاڑی رکی تو میں نے سگریٹ لینے کیلئے کھڑکی اٹھائی۔ سامنے گلے میں خوانچہ لٹکائے ایک لڑکا کھڑا تھا' اسے اشارے سے بلا کر میں نے سگریٹ کا پیکٹ لیا۔

ابھی میں پیکٹ کھول کر ایک سگریٹ سلگانے والا ہی تھا کہ میرے عقب سے ایک آواز آئی۔

"اللہ کے واسطے بابو؟"

میں نے گردن گھمائی تو ایک عورت میلے کچیلے کپڑوں میں ہاتھ پھیلائے کھڑی تھی۔

ہم دونوں کی بیک وقت نظریں ایک دوسرے سے ٹکرائیں۔ وہ گھبرا کر پیچھے ہٹی' جیسے اس نے کسی آسیب کو دیکھ لیا ہو۔ پھر اس نے پھٹے ہوئے دوپٹے سے منہ چھپا لیا لیکن میں اسے پہچان چکا تھا' میں نے اسے آواز دی۔ "صادقہ۔"

گارڈ وسل دے چکا تھا' تبھی گاڑی رینگنے لگی۔

اس نے میری پکار سن کر پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ وہ بھاگ رہی تھی۔ ادھر گاڑی پلیٹ فارم چھوڑ رہی تھی۔

میں اٹھ کر دروازے کی طرف بھاگا' لیکن اس وقت تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ گاڑی سپیڈ میں آ چکی تھی۔ سٹیشن بہت تیزی سے پیچھے چھوٹتا جا رہا تھا۔ میں بوجھل قدموں سے اپنے کیبن میں آ گیا اور کسی شہتیر کی طرح برتھ پر گرا۔ اس کیبن میں میرے سوا اور کوئی نہ تھا۔

میرے دماغ میں تیز ہوا کا شور تھا۔ مجھے اپنے چاروں طرف سانپوں کی پھنکار سنائی دے رہی تھی۔ میں آپ کو بتا نہیں سکتا کہ صادقہ کو اس حالت میں دیکھ کر میری کیا کیفیت ہوئی تھی۔ صادقہ آخر کس طرح ان حالوں کو پہنچ سکتی ہے' نہیں' وہ صادقہ ہرگز نہیں تھی۔ پھر ایک خیال سر اٹھاتا' مگر وہ صادقہ نہیں تھی' تو میرا چہرہ دیکھ کر ایک دم پیچھے کیوں ہٹی تھی۔ پھر میرے آواز دینے پر اس نے اپنا چہرہ کیوں چھپایا' وہ مڑ کر بھاگی کیوں۔ اگر وہ کوئی فقیرنی تھی تو پھر اس طرح بھاگی کیوں؟ اسے تو میرے سامنے ہاتھ پھیلائے رکھنا چاہیے تھا۔

وہ یقیناً صادقہ تھی۔ میری آنکھیں مجھے دھوکا نہیں دے سکتیں۔ میری آنکھوں میں وہ دن رات جاگ اٹھے تھے جو میں نے اس کی رفاقت میں گزارے تھے۔ پھر مجھے وہ قیامت کی شام بھی اچھی طرح یاد تھی جب وہ آناً فاناً میرے گھر سے سوٹ کیس اٹھا کر چلی گئی تھی۔ مجھے اس کا یہ جملہ بار بار یاد آ رہا تھا۔ "میں بھیک مانگ لوں گی' مگر ایک چور کے ساتھ ہرگز نہیں رہوں گی۔" میں جانتا تھا کہ اس نے یہ بات کہی تھی تو اس کے ذہن میں ہرگز یہ بات نہ ہو گی کہ اس کا کہنا سچ ہو جائے گا۔

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ صادقہ کا یہ حال دیکھ کر میں خوش ہوا ہوں گا۔ خدا کی قسم' ہرگز نہیں۔ میں نے اسے جب اس روپ میں دیکھا تو میری آنکھوں کے گرد اندھیرا چھا گیا تھا۔ میرا دل کٹ کر رہ گیا تھا۔ میرے اندر غم کی آندھی چلنے لگی تھی۔

خدا جانے اس پر کیا بیتی؟ ہو سکتا ہے سکول والوں نے اسے نکال دیا ہو۔ تنہا عورت اس معاشرے میں کٹی پتنگ کی طرح ہوتی ہے۔ جانے اس پر کیسے کیسے الزامات لگائے گئے ہوں؟

گاڑی پوری رفتار سے اڑی جا رہی تھی۔ اسی رفتار سے میرے دماغ میں سینکڑوں خیالات گزر رہے تھے۔ مجھے چلتی گاڑی سے باہر کا منظر دکھائی دے رہا تھا' نہ میرے دماغ میں گزرنے والے خیالات میں سے کسی ایک خیال پر دل جم رہا تھا۔

بار بار میرے دماغ میں صادقہ کا چہرہ گھوم رہا تھا۔ ہائے' وہ کیسی ہو گئی تھی۔ بالکل پیلی زرد' اس کا تو چہرہ ہی بگڑ گیا تھا۔ وہ جو شہزادیوں جیسے حسن کی مالک تھی' بھکارن کا چہرہ اختیار کر گئی تھی' جانے اس نے کیسے کیسے صدمات برداشت کیے ہوں گے۔ ایک صدمہ تو میں نے ہی اسے دیا تھا' اس کا دل دکھایا تھا' مجھ سے بچھڑ کر جانے کن حالات سے دوچار ہوئی۔ پتا نہیں اس کے ساتھ کیا ہوا کہ وہ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلانے لگی۔ مجھے تو وہ نیم پاگل سی دکھائی دے رہی تھی۔

یہ سب کیسے ہوا؟ یہ ایک ایسا سوال تھا جو کسی کیکڑے کی طرح میرے دماغ میں پنجے گاڑ کر بیٹھ گیا تھا۔

پھر گاڑی کی رفتار کم ہونے لگی۔ شاید کوئی سٹیشن آ رہا تھا۔ پھر میں نے بلا سوچے سمجھے اپنا سوٹ کیس سنبھالا اور گاڑی کے پلیٹ فارم پر رکتے ہی' میں گاڑی سے اتر آیا۔ یہ کوئی چھوٹی سی جگہ تھی۔

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

معلومات کرنے پر معلوم ہوا کہ بیس پچیس منٹ بعد ایک گاڑی آئے گی جس میں بیٹھ کر میں واپس جا سکوں گا۔ میں واپسی کا ٹکٹ لے کر اس چھوٹے سے سٹیشن پر بے چینی سے ٹہلنے لگا۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ میرے پر لگ جائیں اور میں اڑ کر پچھلے سٹیشن پر پہنچ جاؤں۔ صادقہ سے ملوں اور اس سے پوچھوں کہ اس پر کیا بیتی؟

سوال یہ تھا کہ کیا وہ مجھے اپنی آپ بیتی سنا دے گی۔ وہ ہرگز ایسا نہیں کرے گی۔ وہ سمجھے گی کہ میں اس پر ہنسنے آیا ہوں' اس کا مذاق اڑانے آیا ہوں۔ اس پر خوش ہونے آیا ہوں' لیکن نہیں میں اسے یقین دلاؤں گا کہ یہ سب دیکھ کر میں ہرگز خوش نہیں ہوا ہوں۔ میں اس سے ہمدردی اور خلوص سے بات کروں گا تب وہ مجھے اپنے آپ پر گزری' ضرور سنا دے گی۔ اپنا حال دل میرے سامنے ضرور رکھ دے گی۔

اس کی دکھ بھری کہانی سن کر میں اسے ایک مرتبہ پھر پیشکش کروں گا۔ ''صادقہ اب تک جو کچھ ہوا' اسے ایک ڈراؤنے خواب کی طرح بھول جاؤ۔ میں چور ضرور ہوں لیکن تم سے محبت کرتا ہوں۔ آؤ میرے ساتھ چلو۔''

میرا خیال ہے کہ وہ فوراً میری بات مان لے گی۔ اس طرح لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلانے' در در بھٹکنے سے تو بہتر ہے کہ وہ مجھ جیسے چور کے ساتھ زندگی بسر کر لے۔

گاڑی آنے کی آواز آ رہی تھی۔ میں فوراً اپنا سوٹ کیس لے کر تیار ہو گیا۔ گاڑی رکتے ہی سامنے جو ڈبہ آیا' اس میں چڑھ گیا۔ مجھے کسی سیٹ کی ضرورت نہ تھی۔ پندرہ منٹ کا تو راستہ تھا۔ میں ڈبے کے اندر بھی نہ گیا۔ دروازے پر کھڑا رہا۔

جب میں پچھلے سٹیشن پر پہنچا جہاں میں نے صادقہ کو دیکھا تھا تو میرے دل کی دھڑکن یکلخت تیز ہو گئی۔ میرے ہاتھ کانپنے لگے۔ ایسی کیفیت تو میری گاڑی اٹھاتے ہوئے بھی نہ ہوتی تھی۔

گاڑی سے اترتے ہی میں تیزی سے اس شیڈ کی طرف بھاگا جہاں اسے میں نے غائب ہوتے دیکھا تھا۔ میں نے سٹیشن کا چپہ چپہ چھان مارا' گاڑی جا چکی تھی۔ سٹیشن تقریباً ویران ہو گیا تھا۔ اکا دکا مسافر ادھر ادھر نظر آ رہے تھے۔ میں صادقہ کو سٹیشن سے باہر نکل کر بھی دیکھ آیا تھا لیکن وہ مجھے کہیں نظر نہ آئی۔

میں اس کے بارے میں کسی سے کچھ پوچھ بھی نہیں سکتا تھا۔ ایک بھکارن کے بارے میں کس طرح پوچھتا' کیا پوچھتا؟

پھر میں نے بوجھل دل سے اگلی گاڑی پکڑی اور اپنے سفر پر گامزن ہو گیا۔

زندگی کے اس تیز رفتار سفر میں صادقہ کسی چھوٹے سے سٹیشن کی طرح آناً فاناً نظروں میں آئی اور گزر گئی۔ میں کسی میل ٹرین کی طرح سے تھا جو چھوٹے سٹیشنوں کو چھوتی ہوئی گزر جاتی ہے' رکتی نہیں۔

چند دنوں میں' میں نے اس واقعے کو بھلا دیا۔ میں نے اصل میں شعوری طور پر صادقہ کو بھول جانے کی کوشش کی۔ ویسے بھی کسی چیز کو دل سے لگا کر بیٹھ جانا' میری فطرت میں شامل نہیں' میں آگے بڑھنے کا قائل ہوں۔ پیچھے مڑ کر دیکھنا' کمزوری کی علامت سمجھتا ہوں۔ یہی وجہ تھی کہ صادقہ سے شادی اور پھر علیحدگی کے واقعے کو میں نے ماضی کی سلیٹ سے گیلے کپڑے سے صاف کر دیا تھا اور اس تازہ واقعے کو بھی میں نے اپنی فطرت کے مطابق بھول جانے کی شعوری کوشش کی تھی۔ بظاہر میں اس کوشش میں کامیاب بھی نظر آتا تھا لیکن ایسا تھا نہیں۔

بس اچانک ہی' کبھی کھانا کھاتے' کبھی ڈرائیونگ کرتے' کبھی سوتے تو کبھی نہاتے ہوئے' کبھی اخبار پڑھتے ہوئے اچانک صادقہ میرے سامنے آ موجود ہوتی۔ میری سماعت سے اس کی دکھ بھری آواز سنائی دیتی۔ ''اللہ کے واسطے بابو۔'' پھر اس کا غم زدہ چہرہ دکھائی دیتا اور میں چند لمحوں کیلئے اپنے ہوش گنوا بیٹھتا۔

یہ تکلیف دہ واقعہ میرے ذہن کے پردے پر چپک کر رہ گیا تھا۔ اس کی آواز میرے دل کی رگوں میں پیوست ہو گئی تھی۔ اب مجھے کوئی بھی بھکارن نظر آتی تو میں فوراً رک جاتا۔ میں اس کے پھیلتے ہاتھوں پر کچھ رکھے بنا ہرگز نہ بڑھتا۔ یہ میرے اندر ایک تبدیلی تھی۔ ورنہ بھکاریوں کو کچھ دینا میں نے سیکھا ہی نہ تھا۔

پھر لمحوں نے مرہم کا کام کیا۔ وقت ہمارے لیے کتنی بڑی نعمت ہے' گزرتا ہے تو اپنے ساتھ سب کچھ لے جاتا ہے' نہ یہ خوشیوں کو ہمارے پاس رہنے دیتا ہے اور نہ دکھ بھری ساعتوں کو۔ خوشیاں چھینتا ہوا وقت ہمیں کتنا برا لگتا ہے لیکن یہ جب ہمارے عذاب ناک لمحوں کو اپنے دامن میں سمیٹتا ہے تو کوئی نہیں کہتا کہ اے وقت تو کس قدر پیارا ہے۔

وقت کے ساتھ صادقہ کی یاد ہلکی پڑتی گئی' لیکن وہ خلش کبھی دل سے نہ گئی۔ کاش! مجھے یہ معلوم ہو جاتا کہ صادقہ پر یہ غم کا پہاڑ کس طرح ٹوٹا پھر یہ کہ اگر وہ دوبارہ مل جاتی تو شاید میں اسے اپنے ساتھ لے آتا۔ وہ بھکارن نہ رہتی' پھر سے میری بیوی بن جاتی۔

خیر یہ زندگی کی باتیں ہیں۔ آدمی جب دنیا میں آتا ہے تو اسے اس طرح کے واقعات' حادثات سے نمٹنا ہی ہوتا ہے' میں نے بھی نمٹنا سیکھ لیا تھا۔

ہاں میں تو' آپ کو یہ بتا رہا تھا کہ اس وقت میری تین بیویاں ہیں۔ دو میرے ساتھ رہتی ہیں اور ایک لاہور میں ہے۔ لاہور والی آسیہ نے ان دونوں کو نہیں دیکھا تھا لیکن اسے یہ معلوم ہے کہ شمع اور نگار میرے ساتھ رہتی ہیں۔ اسی طرح شمع اور نگار نے آسیہ کو نہیں دیکھا لیکن دونوں کو یہ معلوم ہے کہ لاہور میں میری تیسری بیوی موجود ہے۔

میں نے اب تک جتنی شادیاں کی ہیں' ان میں خوبصورتی قدر مشترک تھی۔ میری ساری بیویاں حسین رہی ہیں لیکن میری تمام بیویوں میں شمع سب سے خوبصورت ہے۔ دوسری بیویوں میں چہرے اور جسم کی دلکشی اپنی جگہ ہے لیکن شمع میں چہرے اور جسم کی کشش کے ساتھ کچھ اور بھی ہے۔

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

مثلاً اس کا اندازہ گفتگو بڑا دل کو بھانے والا ہے۔ اس نے بہت اچھی آواز پائی ہے۔ زیادہ پڑھی لکھی نہیں ہے لیکن بڑی مہذب ہے۔ پھر اس میں سب سے بڑی کوالٹی یہ ہے کہ وہ بات کو مختصر اشارے سے سمجھتی ہے۔ میری اور بیویوں میں یہ خصوصیت موجود نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شمع مجھے اپنے ساری بیویوں میں پیاری ہے' پھر اسے بھی مجھ سے خاصی محبت ہے۔ میرے کام میں بھی وہ مجھ سے خاصا تعاون کرتی ہے بلکہ اب تو اسے گاڑیوں کی اچھی خاصی پہچان ہو گئی ہے' کبھی کبھی وہ مجھے خود ہی کسی اچھی گاڑی کے پاس لے جا کر کھڑا کر دیتی ہے۔

اس شمع کے ساتھ میں نے بڑا ظلم کیا۔ میں کیا کروں میں اپنی حسن پرست فطرت سے مجبور ہوں۔ شمع کے بعد مجھے ایک دفتر میں نگار ٹکرا گئی۔ اس کے حسن سے میں متاثر ہوا۔ میں نے فوراً اس کے گرد جال پھیلایا اور بہت جلد اسے پھنسا لیا۔ میں اس معاملے میں ہمیشہ خوش قسمت رہا ہوں۔ میں نے جب بھی کسی عورت کو دیکھا تو پھر اسے اپنی بیوی بنا کر ہی دم لیا ہے۔ مجھے آج تک اس سلسلے میں ناکامی نہیں ہوئی۔ خیر نگار ایک غریب گھرانے کی لڑکی تھی' اچھی زندگی گزارنے کی خواہاں تھی۔ میں نے بڑی مہارت سے اس پر جال پھینکا۔ اسے جھوٹے سچے خواب دکھائے' نتیجہ یہ ہوا کہ وہ کلرکی چھوڑ کر میری بیوی بننے پر راضی ہو گئی۔

شمع میرے بدلتے ہوئے تیور دیکھ رہی تھی۔ شمع جیسی عورت سے خود کو چھپانا اتنا آسان بھی نہ تھا۔ وہ مجھ سے اچھی طرح واقف تھی۔ کبھی کبھی تو وہ میرے بولنے سے پہلے ہی میرے چہرے کے اتار چڑھاؤ دیکھ کر بتا دیتی ہے کہ میں کچھ کہنے والا ہوں۔

یہ بات تو ایسی تھی کہ اس سے کسی طرح چھپ ہی نہ سکتی تھی لیکن وہ بڑے تحمل سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ ویسے وہ جانتی تھی کہ شور مچا کر یا روک ٹوک کر کچھ حاصل نہ کر سکے گی۔ بپھرے ہوئے دریا پر کہیں ریت سے بند باندھے جا سکتے ہیں۔

ایک دن شام کو جب میں بڑے خوشگوار موڈ میں گھر سے نکل رہا تھا تو شمع نے مجھے آواز دی تھی۔ "سنئے۔"

اس کی آواز سن کر میں واپس نہیں پلٹا مگر رک گیا۔ "ہاں۔"

"کہاں جا رہے ہیں؟" اس کی آواز میں لرزش تھی۔

"باہر۔"

"کوئی کام ہے کیا؟"

"یہی سمجھ لو۔" میں نے بے رخی سے کہا۔

"اچھا' ٹھیک ہے' جائیے' مجھے جو بات کرنا ہے رات کو کر لوں گی۔ رات کو تو جلد لوٹ آئیں گے نا آپ؟" اس نے مسکرانے کی کوشش کی لیکن اس کی آنکھوں میں نمی تھی۔ میں نے فوراً اپنی نظریں پھیر لیں اور بولا۔

"شاید۔"

میرا جواب سن کر وہ مزید اداس ہو گئی لیکن اس نے پھر کچھ نہ کہا۔ خاموشی سے کمرے میں چلی گئی۔

رات کو اگرچہ میرا دیر سے آنے کا پروگرام نہ تھا لیکن ہوٹل سے کھانا کھا کر نکلے تو نگار نے سمندر کے کنارے چلنے کی فرمائش کر دی۔ میں اسے لے کر ساحل سمندر چلا گیا۔ واپسی میں ظاہر ہے' دیر ہو گئی۔ میں گھر پہنچا تو بارہ بج چکے تھے۔

شمع جاگ رہی تھی۔ شاید وہ گھر کے گیٹ پر ہی موجود تھی۔ گھر کے سامنے گاڑی رکتے ہی اس نے گیٹ کھول دیا۔ مجھے اطلاعی گھنٹی بجانے کی ضرورت نہ پڑی۔ گاڑی اندر کھڑی کر کے میں نے باہر کا دروازہ بند کیا۔ پلٹ کر آیا تو وہاں شمع موجود نہ تھی' وہ اندر جا چکی تھی۔

اندر جا کر میں نے کپڑے تبدیل کیے پھر یہ دیکھنے کے لیے کمرے سے باہر نکلا کہ شمع کہاں ہے' وہ کچن میں تھی۔ میں وہیں چلا گیا۔ وہ سالن گرم کر رہی تھی۔ میں خاموشی سے کچن کے دروازے پر کھڑا ہو گیا اور سوچنے لگا' اب کیا کروں' کیسے کہوں۔ میں کھانا کھا کر آیا تھا اور وہ میرے لیے کھانا گرم کر رہی تھی۔

"سوری شمع۔" بالآخر میں نے کہا۔

"کیا کھانا کھا کر آئے ہو؟" اس نے مجھ سے سوال کیا۔ سوال میں بڑی حیرت تھی۔

"ہاں شمع' میں نے کچھ دوستوں کے ساتھ باہر کھانا کھا لیا تھا۔" میں نے جھوٹ بولا۔

میرا جواب سن کر مجھے یوں لگا جیسے شمع ایک دم بجھ سی گئی ہے۔

"اچھا ٹھیک ہے۔" اس نے فوراً چولہا بند کیا اور کچن سے نکل آئی۔

"تم نے تو کھانا کھا لیا ہو گا۔" میں نے سوال کیا۔

وہ میرے سامنے تھی۔ میرے بالکل قریب۔ میں دروازے پر کھڑا تھا اور وہ دروازے سے نکلنا چاہ رہی تھی۔ میرا سوال سن کر اس نے پلکوں کی جھالر اٹھائی۔ اس کی پلکوں پر ننھے ننھے موتی ٹنکے ہوئے تھے۔

"کبھی میں نے آپ کے بغیر کھانا کھایا ہے؟" وہ اداس لہجے میں بولی۔

"جانتا ہوں' اچھا چلو کھانا نکالو' میں تمہارے ساتھ تھوڑا بہت کھا لوں گا۔"

میرا خیال تھا کہ وہ تکلف کرے گی لیکن اس نے ایک لمحہ ضائع نہ کیا۔ وہ خوشی سے واپس پلٹی اور چند منٹ میں کھانا ٹیبل پر سجا دیا۔ مجبوراً مجھے اس کا ساتھ دینا پڑا۔

وہ خاموشی سے کھانا کھاتی رہی اور مجھے دیکھتی رہی۔ اس کی آنکھوں میں مجھے کوئی ایسی بات نظر آ رہی تھی جس کی میں وضاحت نہیں کر سکتا۔ وہ کچھ کہنا چاہ رہی تھی لیکن شاید اسے مناسب الفاظ نہیں مل رہے تھے۔

کھانا کھاتے ہوئے میرا دھیان نگار کی طرف چلا گیا' میں بے خیالی میں اس کی کسی بات پر مسکرایا پھر اچانک مجھے خیال آیا کہ میں گھر پر ہوں اور میرے سامنے نگار نہیں' شمع بیٹھی ہے۔

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

"مجھے تصور کی دنیا سے فوراً نکال آنا چاہیے۔"

میں تو خیر فوراً تصور کی دنیا سے نکل آیا لیکن میں نے دیکھا کہ شمع کھو گئی ہے۔ پھر اس نے کھانا کھاتے کھاتے ہاتھ روک لیا اور کرسی سے اٹھ گئی۔

میں جب بستر پر سونے کیلئے لیٹا تو وہ پہلے سے بیڈ پر موجود تھی اور اپنی آنکھوں پر بازو رکھے لیٹی تھی۔ میں نے آہستگی سے دوسری طرف کروٹ لے لی۔

"سنو۔" شمع کی آواز سنائی دی۔

"ہاں کہو۔" میں نے اس کی طرف رخ کرتے ہوئے کہا۔

"کون ہے وہ؟" اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اچانک پوچھا۔

"میں سمجھا نہیں شمع۔" میں نے معصومیت سے کہا۔

"لیکن میں سمجھ گئی ہوں۔" اس نے بڑی گمبھیرتا سے کہا۔

"تم سمجھ گئی ہو۔" میں نے اسے حیرت سے دیکھا "تم کیا سمجھ گئی ہو؟"

"تمہاری زندگی میں کوئی عورت داخل ہو گئی ہے۔" اس نے وضاحت کی۔

"یہ بات تم کس بنیاد پر کہہ رہی ہو؟" میں نے اس الزام کی وجہ جاننا چاہی۔

"میں تمہاری بیوی ہوں' تمہیں اچھی طرح جانتی ہوں۔ میں تمہیں کافی عرصے سے دیکھ رہی ہوں۔ میں کافی عرصے سے تمہارے گرد کسی اور عورت کی خوشبو محسوس کر رہی ہوں۔ تم مجھ سے چھپ نہیں سکتے' میں تم سے محبت کرتی ہوں جو محبت کرتا ہے اس سے کچھ نہیں چھپا رہتا' بتا دو وہ کون ہے؟"

"تم کو غلط فہمی ہوئی ہے' ایسا کچھ نہیں ہے۔" میں نے لولی لنگڑی صفائی پیش کی لیکن جھوٹ میرے لہجے سے صاف چھلک رہا تھا۔

"آج کھانا' تم نے اسی کے ساتھ کھایا۔" اس نے کہا مجھے نہیں معلوم یہ سوال تھا کہ جواب۔

"نہیں تو۔" میں نے پھر جھوٹ بولا۔

"میری قسم کھاؤ گے۔" اس نے میرے جھوٹ کو میزان پر رکھ دیا۔

میں اس کی جھوٹی قسم نہیں کھا سکتا تھا' وہ مجھے بہت پیاری تھی۔ میں نے کہا۔ "نہیں۔"

"پھر میں جو کچھ کہہ رہی ہوں' سچ ہے۔"

"ہاں۔" میں نے بالآخر ہتھیار ڈال دیئے۔

"شادی کرنا چاہتے ہو؟" اس نے آنسو بھری آنکھوں سے پوچھا۔

"ہاں۔" میں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"کر لو۔" شمع نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

"تم نے یہی کہانا کر لو۔" مجھے اپنی سماعت پر یقین نہ آیا۔ میں نے تصدیق چاہی۔

"ہاں' تم نے ٹھیک سنا لیکن ایک شرط ہے۔" وہ بولی۔

"وہ کیا؟" میں نے لرزتے ہوئے پوچھا۔ مجھے پختہ یقین تھا کہ وہ مجھ سے طلاق مانگے گی اور اسے میں کسی صورت طلاق دینے کو تیار نہ تھا۔ وہ مجھے بہت اچھی لگتی تھی' دوسری طرف میں نگار کو بھی نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ اس سے میں نے شادی کا وعدہ کر لیا تھا۔ میں اس کی آنکھوں پر مرمٹا تھا۔

"کیا اسے معلوم ہے کہ اس گھر میں میں موجود ہوں؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں' ابھی نہیں۔" میں نے صاف بتایا۔

"میں چاہتی ہوں کہ تم اسے بتا دو اور اسی گھر میں اسے بیاہ کر لے آؤ' میں موت کو برداشت کو لوں گی لیکن تمہاری جدائی مجھ سے برداشت نہ ہو گی۔ میں جانتی ہوں کہ تم اس سے شادی ضرور کرو گے' میرے روکنے سے نہیں رکو گے لیکن میں چاہتی ہوں کہ اس کو کہیں اور گھر دلانے کے بجائے یہیں رکھو' اس طرح تم میری نظروں میں تو رہو گے۔ تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ میں تم سے کتنی محبت کرتی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ مجھ سے لپٹ کر جانے کتنی دیر تک روتی رہی۔

میں شمع کی محبت سے بہت متاثر ہوا۔ فوراً جی چاہا کہ میں نگار سے شادی کا ارادہ ترک کر دوں اور صرف شمع کا ہو کر رہ جاؤں لیکن یہ تاثر محض وقتی تھا۔

رات گئی بات گئی۔

صبح اٹھا تو نگار پھر سے آنکھوں میں بسی ہوئی تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ اچھا ہوا میں نے جذبات میں آ کر شمع سے کوئی بات نہ کہی ورنہ بڑی مشکل ہو جاتی۔ شمع نے رات کو بڑی خوبصورتی سے محبت کا جال پھیلا کر مجھے نگار سے دور رکھنے کی کوشش کی تھی لیکن میں بھلا اس سے دور ہونے والا کہاں تھا۔ وہ میری آنکھوں میں بس گئی تھی' اب اسے کوئی میری آنکھوں سے نہیں نکال سکتا تھا۔

شمع کی خواہش کے مطابق میں نے نگار کو شمع کے بارے میں بتا دیا۔ اس بات کا اس نے کوئی خاص اثر نہ لیا۔ وہ ہنس کر بولی۔ "تو پھر کیا ہوا' مجھے تمہاری محبت چاہیے بس۔"

میں جانتا تھا کہ وہ میرے شادی شدہ ہونے کا سن کر زیادہ فکرمند نہ ہو گی' وہ موت بن کر آ رہی تھی۔ اس پر کوئی سوت نہیں آ رہی تھی۔ سوت بن کر جانا تو فتح مندی کی علامت تھی جبکہ کسی پر سوت آنا' ذلت و رسوائی کا باعث۔ فکر شمع کو ہونا چاہیے تھی اور اس کو تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ میں نگار سے شادی کر کے اس کی آنکھ سے اوجھل ہو جاؤں۔ اسی لیے اس نے یہ ذلت برداشت کرنے کی ٹھانی تھی۔

میں نے نگار کو کسی نہ کسی طرح اسی گھر میں رہنے پر راضی کر لیا۔ تھوڑے سے پس و پیش کے بعد وہ راضی ہو گئی۔ اصل میں اسے زندگی کی آسائشیں درکار تھیں جو میں اسے دے رہا تھا اور مجھے ایک حسین عورت درکار تھی جو میری بیوی ہو رہی تھی۔

پھر نگار سے میری شادی ہو گئی۔ پندرہ دن ہم نے اسی گھر میں گزارے۔ جب ہنی ختم ہوا

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

تو واپس کراچی آ گئے۔ اس گھر میں میرا خیال تھا کہ شمع نے مجبوراً اسے اپنے ساتھ رکھنا گوارا تو کر لیا ہے لیکن اسے وہ عزت نہ دے گی۔ وہ نگار کو ملازماؤں کی طرح رکھے گی۔ اس پر حکم چلائے گی۔ طرح طرح سے اسے ستائے گی لیکن ایسا کچھ نہ ہوا۔ شمع نے یہ ثابت کر دکھایا کہ وہ واقعی مجھ سے محبت کرتی ہے۔ اس نے نگار کو اس لیے اپنے پاس رکھا تھا تاکہ میں اس کی نظروں سے دور نہ رہوں۔ اس نے نگار کو بہت عزت سے رکھا۔ بہت جلد وہ آپس میں گھل مل گئیں۔ میرے لیے دو نالی بندوق بن گئیں۔ ایک ہو گئیں۔ ایک طاقت بن گئیں۔ میں ایک کو کچھ کہتا تو دوسری اس کی حمایت کو آ جاتی۔

دو بیویوں کے درمیان ایسا مثالی سلوک میں نے کبھی دیکھا تھا نہ سنا جو شمع اور نگار کے درمیان تھا۔ لیکن اب دیکھ اور سن لیا تھا۔ میں اپنے دوستوں کو بتاتا تو وہ یقین نہ کرتے بلکہ الٹا مجھے ڈراتے۔

"بیٹا' ذرا ہوشیار رہنا' کہیں دونوں مل کر تیرا تختہ نہ کر دیں۔"

"خیر یہ تو مذاق کی بات تھی' وہ میرا تختہ کیا کرتیں' وہ تو خود تختہ مشق بنی ہوئی تھیں۔

کچھ عرصے بعد میری ملاقات راولپنڈی میں آسیہ سے ہو گئی۔ اس کو بھی میں نے بیوی بنا لیا۔ لاہور میں اسے ایک گھر لے کر دے دیا اور جب میں نے وہاں سے رخت سفر باندھا تو آسیہ کو شمع اور نگار کے بارے میں بتا دیا اور یہاں آ کر شمع اور نگار کو آسیہ کے بارے میں بتا دیا۔

تینوں کو وقتی طور پر صدمہ پہنچا' پھر وقت نے مرہم رکھ دیا۔ تینوں رو دھو کر چپ ہو گئیں۔

شمع سے پہلے میں نے چار شادیاں کی تھیں لیکن اتفاق سے کوئی بھی راس نہ آئی۔ صادقہ کے بارے میں' میں آپ کو بتا چکا ہوں اس کی یاد جب بھی آ جاتی ہے میرا دل چیر جاتی ہے۔ صادقہ سے پہلے میں نے تین شادیاں کیں' اتفاق سے ان میں کوئی بھی زندہ نہ رہی۔ تینوں مر گئیں۔ تینوں فطری موت مریں۔ ایک کو کینسر نکلا' دوسری دل کی مریضہ نکلی' تیسری کے دماغ کی شریان پھٹ گئی۔ عجیب صورتحال تھی ان دنوں۔ ادھر میں شادی کرتا' ادھر وہ دامن چھڑا کر آسمان کا رخ کرتی۔ ایک وقت ایسا آیا کہ میں خود کو منحوس تصور کرنے لگا۔

مرنے والیوں سے نجات ملی تو پھر صادقہ آ ٹکرائی۔ اس کا بھی قصہ پاک ہوا اور میں تنہا رہ گیا۔

میری مہم جوئی جاری رہی۔ گاڑیوں کی چوری کے ساتھ' بیویوں کی تلاش بھی جاری رہی پھر مجھے شمع ملی۔ شمع کو دیکھا تو دل نے انگڑائی لی' طے کر لیا کہ اس سے شادی کر کے رہوں گا۔

شمع کو میں نے بازار حسن میں دیکھا تھا۔

وہ گا رہی تھی' میں سن رہا تھا۔ ایک لڑکی رقص کر رہی تھی۔ لیکن میں اسے نہیں دیکھ رہا تھا۔ میری نظریں صرف شمع پر تھیں۔ اگرچہ رقص کرنے والی بھی کسی سے کم نہ تھی لیکن میری مرکز نگاہ شمع بن گئی تھی جو سادگی سے بیٹھی گا رہی تھی۔

اس کی آواز اور اس کے حسن نے مجھے مبہوت کر دیا تھا اور بیٹھے بیٹھے میں نے طے کر لیا تھا کہ شمع کو میں اس بازار سے لے جاؤں گا چاہے مجھے اس کے لیے کتنی ہی رقم دینا پڑے۔

ادھر میں اس کو اپنانے کے طریقے سوچ رہا تھا اور ادھر وہ میرے خیالوں میں تھی۔ اس کی نظریں مجھ پر جمی ہوئی تھیں اور وہ سوچ رہی تھی کاش یہ شخص مجھے اس دلدل بھری زندگی سے نجات دلا دے۔ یہ بات اس نے مجھے بعد میں بتائی۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھ کر ایک ہی بات سوچی تھی کاش ہم دونوں ایک ہو جائیں۔ اسے شاید پہلی نظر کی محبت کہتے ہیں۔ ایسی محبت دنیا میں کم یاب ضرور ہے لیکن نایاب نہیں۔

جب دو دل ایک ساتھ دھڑکنے لگیں تو پھر دنیا کی کوئی طاقت دھڑکن کی اس لے کو دبا نہیں سکتی۔ شمع کے حصول کے سلسلے میں مجھے زیادہ دقت پیش نہ آئی۔ صولت بائی نے شمع کی جو قیمت مانگی وہ میں نے ادا کر دی لیکن جو قیمت میں نے ادا کی' وہ شمع کی قیمت نہ تھی کیونکہ وہ خود انمول تھی۔

شمع کو میں نے اپنے گھر لا کر بہت عزت دی۔ کبھی اسے اس بات کا احساس نہیں دلایا کہ وہ کون ہے؟ کہاں سے آئی ہے؟ میرے گھر میں آ کر وہ بے انتہا خوش تھی۔ وہ اس بازار سے نکل آئی تھی جہاں اسے روزانہ شمع محفل بننا پڑتا تھا۔ اس گھر میں قدم رکھتے ہی وہ خاتون خانہ بن گئی۔ یہاں آ کر اس نے گانا تو دور کی بات ہے گنگنانا بھی چھوڑ دیا۔ میں اسے گھر کی صفائی کرتے یا کچن میں کھانا پکاتے دیکھتا تو مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ میں سوچتا' یہ وہی عورت ہے جس کے گانے کی دھوم چار سو مچی تھی' اب کیسی گھریلو سی لگ رہی تھی۔

ٹیلی ویژن پر میرے کئی دوست تھے جو شمع کو بطور گلوکارہ متعارف کرانے پر خوشی خوشی راضی ہو جاتے' میں نے شمع سے کہا کہ تم اپنی آواز کا گلا کیوں گھونٹ رہی ہو' ٹیلی ویژن کیلئے گاؤ لیکن اس نے سختی سے منع کر دیا۔

"میں جس دنیا سے نکل آئی ہوں' اب پھر سے اس دنیا میں واپس نہیں جانا چاہتی۔"

"لیکن شمع ٹیلی ویژن کیلئے گانا اور بات ہے۔"

"میرے لیے تقریباً ویسا ہی ہے' میں وہاں چند مخصوص لوگوں کیلئے گاتی تھی' ٹیلی ویژن پر بہت سے لوگوں کیلئے گاؤں گی۔ میں اب لوگوں کیلئے گانا نہیں چاہتی بلکہ گانا ہی نہیں چاہتی' میں بس اس گھر کی چار دیواری میں رہنا چاہتی ہوں' تمہارے ساتھ۔ تم کہو گے تو تمہارے لیے گاؤں گی۔ تم جو کہو گے' وہ کروں گی۔ مجھے شمع محفل ہونے سے بچاؤ۔ اس نے بڑی عاجزی سے میرے سامنے ہاتھ جوڑے۔

میں نے اس کے ہاتھوں کو تھام کر اپنی آنکھوں سے لگایا۔ "میرے ہوتے ہوئے تمہیں کون شمع محفل بنا سکتا ہے۔ تم میری شمع ہو' تم ہمیشہ میرے لیے جلو گی۔ میری آنکھوں کی روشنی بنو گی۔"

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

اور ہوا بھی ایسا ہی۔ وہ آئندہ زندگی میں صرف میرے لیے جلتی رہی' جو میں نے کہا کرتی رہی' لیکن میری فطرت میں وفا نہ تھی۔ پہلے میں نے نگار کو اس کی سوت بنایا' پھر آسیہ آ گئی' آسیہ لاہور میں تھی اس لیے اسے چنداں فرق نہ پڑا۔

اور اب ایک مرتبہ پھر میری آنکھوں میں کوئی اور سمانے لگا تھا۔ میرا حسن پرست مزاج کسی اور زلف کا اسیر ہونے لگا تھا۔

میرے پاس کوئی کام تو تھا نہیں۔ میں دن بھر فارغ رہتا اس لیے وقت گزاری کیلئے میں اپنے دوستوں کی طرف نکل جاتا۔ میرا ایک دوست' ایک ٹریولنگ ایجنسی میں تھا' میں اس کے پاس اکثر جا کر بیٹھ جاتا۔

ایک شام میں عرفان کے پاس پہنچا تو وہ مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ ویسے خوش رہنا اور مسکرانا اس کی عادت تھی اور اس کے پیشے کی ضرورت بھی۔

"اچھا ہوا' تم آ گئے' کچھ دیر ادھر بیٹھو میں تھوڑا سا کام نمٹا لوں' اتنی دیر میں تم چائے پیو' پھر چلتے ہیں۔" عرفان نے کہا۔

"کہاں؟" میں نے گاڑی کی چابی میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

"ایک نمائش میں چلنا ہے۔" اس نے کہا۔

"کس چیز کی نمائش ہے' ہمیں تو صرف بازار مصر سے دلچسپی ہے وہ اگر کہیں لگا ہے تو لے چلو۔" میں نے اپنے مطلب کی بات کی۔

"بیٹا' یہ مصر نہیں پاکستان ہے' یہاں بازار حسن نہیں لگتا۔ منگل بازار لگتا ہے' جمعہ بازار لگتا ہے' جہاں صرف پیاز بکتی ہے۔" عرفان نے یہ کہہ کر قہقہہ لگایا۔

"اچھا کہا تم نے' ویسے یہ سب ہمارا فیض ہے کہ تم ہماری صحبت میں رہ کر اچھے اچھے جملے بولنے لگے ہو' ویسے نمائش کس چیز کی ہے۔"

"یار' وہ اپنا آرٹسٹ دوست نہیں ہے' کیا نام ہے اس کا۔ ہاں ضرغام۔ آج اس کا فون آیا تھا۔ آرٹس کونسل میں اس کے بنائے ہوئے پوسٹروں کی نمائش کا آج افتتاح ہے۔ اس نے کہا تھا خود بھی آنا اور اپنے دوستوں کو بھی لانا۔"

"چھوڑو یار' پوسٹروں کی نمائش دیکھنے کون جائے تصویروں کی نمائش ہوتی تو ایک بات بھی تھی۔" میں نے کہا۔

"نہیں یار جانا ضروری ہے' اپنا دوست ہے' برا مانے گا۔ دوسری بات یہ ہے کہ وہاں اچھی خاصی رونق ہوگی۔ رونق کا مطلب سمجھتے ہو تم۔" عرفان نے میرے مطلب کی بات کی۔

"رونق' کا مطلب میں اچھی طرح سمجھتا تھا' اس لیے میں چلنے کیلئے فوراً راضی ہو گیا۔

جب ہم آرٹس کونسل پہنچے تو وہاں اچھا خاصا رش ہو چکا تھا۔ خاصی رونق تھی۔ میں پوسٹروں کو کم اپنے دائیں بائیں کی رونقوں کو زیادہ دیکھ رہا تھا۔

پھر چلتے چلتے کیا ہوا؟ میرے قدم ایک جگہ جم گئے اور میں اس پوسٹر کو سحر زدہ سا ہو کر دیکھنے لگا۔

وہ کیا حسین چیز تھی؟ بڑی بڑی قاتل آنکھیں' موٹی موٹی پتلیاں۔ ایسی پتلیاں مجھے بہت پسند تھیں۔ مجھے وہ آنکھیں کبھی پسند نہ آتیں جن میں پتلیاں چھوٹی ہونے کی وجہ سے آنکھوں کی سفیدی زیادہ نظر آتی۔ پتلے مگر ابھرے ہوئے ہونٹ۔ ہونٹوں پر دھیمی سی مسکراہٹ۔ پیاری سی ناک' لمبی گردن' پیچھے کھولے ہوئے بال' رنگ ضرور سرخ و سفید ہوگا۔ آدھے چہرے پر آدمی گھڑی کا ڈائل' رومن میں لکھے ہوئے ہندسے' جن میں چھ اور بارہ کے ہندسے کٹے ہوئے تھے۔ سیکنڈ کی سوئی بھی دکھائی گئی تھی جو پچاس کے ہندسے پر پہنچنے والی تھی۔

یہ ایک ایسا پوسٹر تھا جسے کسی بھی گھڑی کے اشتہار کیلئے استعمال کیا جا سکتا تھا۔ اسے کوئی بھی اشتہاری کمپنی بہ آسانی خرید سکتی تھی۔

مجھے پوسٹر سے زیادہ' پوسٹر والی میں دلچسپی تھی۔ میں اب یہ جاننے کیلئے بے قرار ہوا اٹھا تھا کہ یہ ماڈل کون ہے؟

"یار عرفان' یہ لڑکی کون ہے؟" میں نے عرفان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

"کہاں؟ کدھر؟" اس نے تیزی سے دائیں بائیں نظریں گھمائیں۔

"اے' وہ سامنے۔" میں نے عرفان کا چہرہ پوسٹر کی طرف کیا۔

"یہ تو ضرغام ہی بتا سکتا ہے۔" عرفان نے پوسٹر کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "واقعی یہ کوئی لڑکی ہے بھی کہ نہیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ اس نے کسی ماڈل کو استعمال کیا یا کسی انگریزی رسالے سے کٹنگ کر کے پوسٹر تیار کیا ہے۔ مجھے تو یہ کوئی باہر کی چیز نظر آ رہی ہے اور معاف کرنا لڑکی کے بجائے عورت کہا جائے تو زیادہ اچھا ہے۔"

"نہیں' یہ نہیں ہو سکتا۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"یہ لڑکی ہی ہے' چلو مانے لیتے ہیں۔" عرفان نے ہنس کر کہا۔

"یہ لڑکی ہے یا عورت' اس بات کی مجھے پروا نہیں' یہ میرے دل کو بھا گئی ہے' اس سے میں شادی کر کے رہوں گا۔" میں نے اپنے دل کی بات کہی۔

"چاہے' اس کیلئے پیرس ہی جانا پڑے۔" عرفان بولا۔

"میرا دل کہتا ہے' یہ لڑکی اسی شہر میں موجود ہے' یہ تصویر نہیں' زندہ ماڈل ہے۔ چلو ضرغام سے بات کریں۔" میں بے تاب ہوا اٹھا۔

"ٹھہرو' ابھی بات کرتے ہیں' وہ ذرا مہمانوں سے فارغ ہو لے۔"

یہ ضرغام بھی عجیب چیز تھا۔ آرٹسٹ تو لگتا ہی نہ تھا۔ بڑا کھردرا سا آدمی تھا۔ لمبے ڈیل ڈول کا مالک تھا۔ وہ آرٹسٹ سے زیادہ باڈی بلڈر نظر آتا تھا۔ عرفان نے اس سے اپنے طور پر بات کی۔ میں نے اسے منع کر دیا تھا کہ وہ میرے حوالے سے گفتگو نہ کرے ورنہ ہو سکتا ہے کہ وہ کچھ

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

بتانے سے ہی انکار کر دے۔ مجھے ڈر اس بات کا بھی تھا کہ کہیں وہ ماڈل کے بجائے کسی انگریزی رسالے میں چھپی ہوئی تصویر نہ نکلے۔

لیکن میرے سارے خدشے غلط ثابت ہوئے اور دل نے جو گواہی دی تھی وہ سچی نکلی۔ اس پوسٹر میں جس لڑکی کو استعمال کیا گیا تھا وہ زندہ ماڈل تھی۔ اس شہر کے ایک بڑے ہسپتال میں بطور نرس کام کرتی تھی اور ضرغام کی منگیتر تھی۔

میرے لیے اس کے بارے میں اتنی معلومات کافی تھیں۔ میرے لیے اب اس تک پہنچنا چنداں مشکل نہ تھا۔ میں نے شہر کے اس بڑے ہسپتال میں پہنچ کر نہ صرف اس کا نام معلوم کر لیا بلکہ یہ بھی پتا چلا لیا کہ اس کی ڈیوٹی کہاں ہے؟

یوں تو حسین چیزوں پر مرمٹنا میری فطرت میں شامل ہے لیکن جویریہ پر میں کچھ زیادہ ہی فدا ہو بیٹھا تھا۔ میں نے طے کر لیا تھا کہ اسے ہر قیمت پر حاصل کر کے رہوں گا اور جب میں کوئی چیز طے کر لیتا ہوں تو پھر اس پر عمل بھی کرتا ہوں۔ اب تک میں نے جس کو دیکھا تھا اسے پا لیا تھا۔ جویریہ کے بارے میں بھی میں پرامید تھا۔

پھر اچانک میرے دل میں درد اٹھا اور میں شہر کے اس نئے اور بڑے ہسپتال میں جا پہنچا۔ وہاں فوری طور پر میرے کئی ٹیسٹ ہوئے' ایکسرے وغیرہ لیے گئے اور پھر مجھے ایک پرائیویٹ روم میں منتقل کر دیا گیا۔

اس ہسپتال کے پرائیویٹ روم کا کرایہ بارہ سو روپے روز تھا۔ یہ ایک مہنگا ہسپتال تھا لیکن یہاں سہولتیں میسر تھیں' اس کے حساب سے یہ اتنا مہنگا نہ تھا' پھر کمرا تو میں نے خود لیا تھا۔ میں جنرل وارڈ یا سیمی پرائیویٹ میں بھی جا سکتا تھا۔ اس کمرے میں کلر ٹیلی ویژن لگا ہوا تھا۔ ٹیلی ویژن کے پروگراموں کے علاوہ ہسپتال کے چینل سے نشر ہونے والے پروگرام بھی دیکھے جا سکتے تھے۔ اس کے علاوہ یہاں مریض کی دیکھ بھال پوری ذمے داری اور توجہ سے کی جاتی تھی۔ کمرے میں ٹیلی فون تھا' بیل تھی جس سے فوری طور پر نرس کو بلایا جا سکتا تھا۔

میرے دل میں کوئی درد نہ تھا لیکن میں ڈاکٹروں سے کہہ رہا تھا کہ میرے دل میں درد ہے' یہ درد ایسا تھا کہ اسے پکڑا نہیں جا سکتا تھا۔ میرے دل میں جو درد تھا اس کا علاج ان بے چارے ڈاکٹروں کے پاس نہ تھا' ان کی ایک نرس جویریہ کے پاس تھا۔ جس کی ڈیوٹی ان پرائیویٹ روموں پر لگی ہوئی تھی۔

کمرے میں منتقل ہونے کے بعد' جویریہ کئی مرتبہ میرے کمرے میں آ چکی تھی۔

میں نے اس سے کوئی بات نہ کی تھی۔ بس میں نے اسے دیکھا تھا اور دیکھا بھی اس طرح تھا کہ وہ مجھے دیکھتا ہوا نہ دیکھ سکے۔ جویریہ بہت خوبصورت لڑکی تھی۔ اس پوسٹر میں تو اس کا آدھا حسن بھی اجاگر نہ ہو سکا تھا' میں اسے دیکھ کر پہلی بار تو پلکیں جھپکانا ہی بھول گیا تھا۔

شام تک مختلف مشینوں اور ایکسرے رپورٹ سے بات ثابت ہو گئی کہ مجھے دل کا کوئی

مرض لاحق نہیں اور ایسے کیسرے ابھی ایجاد نہیں ہوئے جو دل میں چھپی ہوئی محبت کو عکس بند کر کے دل کی چوری پکڑ لیں۔ یہ جان کر کہ مجھے دل کا کوئی عارضہ نہیں ہے' بظاہر میں بہت خوش ہوا' تاکہ کسی کو مجھ پر کوئی شبہ نہ ہو۔ شام کو مجھے ہسپتال سے فارغ کر دیا گیا۔ میری تسلی کیلئے احتیاطاً دو چار دوائیں لکھ دی گئیں۔

ہسپتال سے رخصت ہونے سے پہلے میں نے جویریہ سے بات کی' سب سے پہلے مجھے جویریہ ہی نے بتایا تھا کہ میری رپورٹس اور ایکسرے بالکل کلیئر ہیں' مجھے دل کا کوئی مرض نہیں ہے۔

تب میں نے فوراً فیصلہ کیا کہ یہ وقت ہے جویریہ سے بات کرنے کا۔ دن بھر میں نے بڑی متانت اسے دکھائی تھی۔ اب اگر میں نے کوئی بات نہ کی تو میں دل کی دل میں لیے ہسپتال سے رخصت ہو جاؤں گا۔ میں نے سوچا۔

"آپ یہ کیسے کہہ سکتی ہیں کہ مجھے دل کا کوئی مرض نہیں جبکہ میرے دل میں مسلسل درد ہے' ٹیسیں اٹھ رہی ہیں۔" میں نے دل پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

یہ بات میں نے کیونکہ ذرا مسکرا کر کہی تھی' اس لیے وہ بھی خوشدلی سے بولی۔ "اس کی وجہ کچھ اور بھی ہو سکتی ہے۔"

"وہ کیا؟" میں نے پوچھا۔

"میں کیا جانوں' آپ خود بہتر سمجھ سکتے ہیں' بہرحال آپ کو دل کی کوئی تکلیف نہیں۔"

"مس جویریہ۔"

میرے منہ سے اپنا نام سن کر وہ چونکی' اسے ایک خوشگوار حیرت سی ہوئی۔ "ارے آپ کو میرا نام کس طرح معلوم ہوا؟"

"جب آدمی کچھ معلوم کرنا چاہے تو اسے سب معلوم ہو جاتا ہے۔" میں نے زندگی کا ایک اصول بیان کیا۔

"ہوں۔" اس نے براہ راست میری آنکھوں میں دیکھا۔

"مجھے آپ کا نام ہی معلوم نہیں بلکہ میں ضرغام کو بھی جانتا ہوں اور میں نے کئی دن پہلے آرٹس کونسل میں وہ پوسٹر بھی دیکھا ہے جس پر گھڑی کا آدھا ڈائل بنا ہے۔"

"ہاں' وہ پوسٹر اس نے میری ایک تصویر سے بنایا تھا' آپ کو پسند آیا؟" اس نے پوچھا۔

"پوسٹر نہیں۔" میں نے گردن ہلائی۔

"تو پھر۔" وہ ذرا سا مسکرائی۔

"آپ۔" میں نے ذرا جذباتی انداز اختیار کیا۔ "اس پوسٹر میں آپ نہ ہوتیں تو اس میں کچھ نہ ہوتا اور سچی بات تو یہ ہے کہ آپ جتنی حسین ہیں' اتنی حسین تو اس پوسٹر میں دکھائی بھی نہیں دیتیں۔ ضرغام آپ کی بیوٹی کو مکمل طور پر دکھا نہیں سکا۔"

وہ میری بات بڑی دلچسپی اور محویت سے سن رہی تھی۔ میں نے اس کی توجہ حاصل کر لی

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

تھی۔ بس یہی وقت تھا' ضرب لگانے کا۔ اپنے دل کی بات کہنے لگا۔

"آپ کو ایک بات بتا دوں۔" میں نے عاشقانہ انداز اختیار کر لیا۔

"جی۔" جویریہ دھیرے سے بولی۔

"میری بات کا یقین کر لیں گی۔" میں نے کہا۔

"آپ بات تو کہیں۔" اس نے کہا۔

"یہ بات میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ مجھے دل کا کوئی مرض لاحق نہیں' لیکن میں پھر بھی یہاں آ گیا۔ آپ جانتی ہیں کیوں؟" میں نے اس کی چمکتی آنکھوں میں جھانکا۔

"نہیں۔" وہ بولی۔ وہ حیران ہو رہی تھی۔

"آپ کے لیے۔" بالآخر میں نے وہ بات کہی جس کیلئے میں نے یہ سارا ڈرامہ کیا تھا۔

"میرے لیے؟"

"ہاں' آپ کے لیے۔" میں نے اپنی آواز میں بڑی محبت پیدا کر کے کہا۔ "میں آپ کی خاطر بیمار پڑا اور یہاں آیا۔ محبت آدمی سے کیا کیا کرواتی ہے اور یہ ایسا مرض ہے جو کبھی ایکسرے میں نہیں آتا۔ میرا علاج ڈاکٹروں کے پاس نہیں' آپ کے پاس ہے۔ میں نے آپ کو بڑی مشکلوں سے ڈھونڈا ہے۔ اب کھو نہ جانا ورنہ جویریہ' میں مر جاؤں گا۔"

مجھے نہیں معلوم' میں اس دن اس سے جنوں میں جانے کیا کیا کہتا رہا۔ وہ میری بات کا ایک ایک لفظ سمجھتی رہی لیکن جواب میں اس نے کچھ نہ کہا۔

لیکن اس کی خاموشی میں ایک رمز تھا اور میں رمز شناس تھا' اس لیے میں چپ چاپ ہسپتال سے واپس آ گیا۔

شمو اور نگی سے میں حیدر آباد کا کہہ کر گھر سے نکلا تھا' انہیں نہ معلوم ہو سکا کہ میں حیدر آباد نہیں گیا۔ اسی شہر کے ہسپتال میں تھا اور وہاں اپنا دل ہار آیا ہوں۔

جویریہ اس جذبے سے جو میرے دل میں اس کے لیے موجزن تھا' بہت متاثر ہوئی پھر ہماری ملاقاتیں ہونے لگیں۔

انہی ملاقاتوں میں معلوم ہوا کہ ضرغام جویریہ کا منگیتر نہ تھا۔ ان کی کوئی باقاعدہ منگنی نہیں ہوئی تھی۔ منگنی تو دور کی بات ہے' رشتہ بھی طے نہ تھا۔ بس ضرغام کے دماغ میں یہ بات تھی یا ان کے والدین کے۔

میرے ڈرامے سے جویریہ خاصی متاثر ہوئی تھی۔ اسے یقین آ گیا تھا کہ میں واقعی اس سے محبت کرتا ہوں ورنہ آج کے زمانے میں کون اتنا کرتا ہے۔ میں اس ہسپتال کے پرائیویٹ روم میں رہا تھا اس سے اسے میری مالی حالت کا اندازہ لگانے میں دیر نہ لگی۔ پھر میں سمارٹ آدمی تھا۔ غرض جتنی دلیلیں تھیں' وہ سب میرے حق میں تھیں' اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اپنے دل کا مقدمہ ہار بیٹھی۔ ہماری ملاقاتیں جاری تھیں۔ میں سات شادیاں کر چکا تھا اور یہ سب محبت کی شادیاں تھیں۔

میں محبت کرنے کے ایک سو ایک اور ایک سے ایک گر جانتا تھا۔ لہٰذا وہ ہر ملاقات میں مجھ سے قریب ہوتی جا رہی تھی۔ میری دیوانی بنتی جا رہی تھی۔

یہ میری آٹھویں محبت تھی' اس محبت میں مجھے بڑا مزہ آ رہا تھا۔

عرفان کو ہماری ملاقاتوں کا علم تھا۔ وہ میرا دوست تھا لیکن کبھی کبھی رازداں ہی دشمن بن جاتے ہیں۔ ویسے عرفان میرے اس عشق کے حق میں نہ تھا' اس کا جھکاؤ ضرغام کی طرف تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ میں جویریہ کو ضرغام سے چھینوں۔ وہ اکثر مجھے منع کرتا رہا تھا۔ اس نے ایک مرتبہ دھمکی بھی دی تھی کہ اگر میں جویریہ سے ملنے سے باز نہ آیا تو ساری صورتحال وہ ضرغام کو بتا دے گا۔ میں اس کی حسیبہ کے باوجود باز نہ آیا اور اسے چڑانے کیلئے اپنی تازہ ملاقات کا حال اسے سنایا تو وہ خاموش ہو گیا اور اس کی یہ خاموشی میرے لیے خطرناک ثابت ہوئی۔

عرفان میرا بہت اچھا دوست تھا' لیکن وہ میرے دوسرے دوستوں کی طرح میرے بارے میں کچھ نہ جانتا تھا۔ اس نے میرا گھر بھی نہ دیکھا تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ میں شادی شدہ ہوں۔ نہ صرف شادی شدہ ہوں بلکہ دو بیویوں کو ایک ہی چھت کے نیچے رکھتا ہوں۔ اسے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ میں ایک پیشہ ور کار چوں ہوں۔ وہ مجھے کوئی بزنس مین سمجھتا تھا۔ ہر دوسرے تیسرے دن اس سے ملاقاتیں رہتی تھیں۔ جب سے جویریہ کا چکر چلا تھا' میں نے عرفان کی طرف جانا کم کر دیا تھا۔ ایک دن میں اس کے پاس پہنچا تو اس نے سیدھے منہ بات نہ کی۔

"یار' ناراض ہو۔" میں نے کریدا۔

"تمہاری حرکتیں ہی ایسی ہیں۔" وہ منہ پھلا کر بولا۔

"کیا کیا ہے میں نے یار۔" میں نے ذرا لہجے کو تیکھا کر کے کہا۔ "محبت کرنا کوئی جرم تو نہیں۔"

"اس صورت میں جرم ہے جب آدمی کو یہ معلوم ہو کہ وہ لڑکی کسی اور سے منسوب ہے۔ تم نے میرے دوست کے حق پر ڈاکہ ڈالا ہے اور یہ بات میں نے تمہیں فوراً ہی بتا دی تھی لیکن تم باز نہیں آئے۔ بہرحال اب میں نے ضرغام کو ساری صورتحال سے آگاہ کر دیا ہے۔"

"یار' یہ تم نے اچھا نہیں کیا۔" میں ایک دم پریشان ہو گیا۔

"تو تم نے کون سا اچھا کیا۔ کسی اور کی چیز کو غصب کرنے چلے تھے۔" اس نے مجھے ٹیڑھی نظروں سے دیکھا۔

"تم نے یہ کیسے اندازہ لگا لیا کہ میں اسے چھوڑ دوں گا۔" میں نے ریت پر پاؤں جمانے کی کوشش کی۔

"تم ضرغام سے واقف نہیں ہو' میں اگر درمیان میں نہ ہوتا تو شاید اب تک واقف ہو چکے ہوتے۔ وہ باڈی بلڈر آدمی ہے۔ اس کا غصہ بہت خراب ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ تمہیں اس کے ذریعے کوئی نقصان پہنچ جائے' بہتر ہو گا کہ تم جویریہ کا پیچھا چھوڑ دو' ورنہ نتیجے کے تم خود ذمے دار ہو

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

گے۔" عرفان نے صاف صاف دھمکی دی۔

"تم میرے کیسے دوست ہو۔" میں نے پینترا بدلا۔

"میں تمہارا بہت اچھا دوست ہوں لیکن اصولوں پر میں کبھی سمجھوتا نہیں کرتا' جو بات غلط ہے' وہ غلط ہے۔ تمہیں ہر قیمت پر جویریہ کو چھوڑنا ہوگا' اس نے فیصلہ سنایا۔

"اچھا' ٹھیک ہے' میں اس بات پر غور کرتا ہوں۔"

یہ بات تو میں نے عرفان سے ایسے ہی کہہ دی تھی۔ اس بات پر غور کرنے کا میرا کوئی ارادہ نہ تھا۔ اگلی ملاقات پر میں نے جویریہ کے سامنے سارے حالات رکھے۔ ضرغام کی دھمکی سن کر وہ پریشان ہوگئی۔ گھبرا کر بولی۔

"اب کیا ہوگا؟"

"کچھ نہیں ہوگا' ہم تم شادی کرلیں گے۔" میں نے بظاہر بڑے اطمینان سے کہا لیکن اندر طوفان اٹھ رہے تھے۔

"وہ ہم دونوں کو قتل کردے گا' وہ بڑا جنونی آدمی ہے' تم اسے نہیں جانتے۔ اس کا غصہ پورے خاندان میں مشہور ہے۔" وہ پریشان ہوگئی تھی۔

"اس سے اتنا ڈرتی ہو تو پھر تم اس سے شادی کرلو۔"

"مجھے اس سے شادی کرنا ہوتی تو میں کب کی کرچکی ہوتی' تم سے ملاقات کی نوبت ہی نہیں آتی لیکن میں اس سے شادی نہیں کرسکتی' وہ بہت گندا آدمی ہے۔"

"گندا آدمی ہے' میں سمجھا نہیں۔" میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"وہ مہینوں نہیں نہاتا۔ اس کے جسم پر میل کی بتیاں چڑھی رہتی ہیں۔ جنہیں وہ وقتاً فوقتاً اتارتا رہتا ہے۔ قسم خدا کی مجھے تو اسے دیکھ کر ہی ابکائی آنے لگتی ہے' میں تو اس سے بات بھی بہت دور سے کرتی ہوں۔ شادی کا تو میں تصور بھی نہیں کرسکتی۔"

"پھر تمہاری امی کیوں مصر ہیں اس رشتے پر' انہیں تم نے نہیں بتایا۔"

"ضرغام میری امی کی چچیری بہن کا بیٹا ہے پھر میں امی کو اپنی پرابلم بتاتی ہوں تو وہ اسے انتہائی غیر سنجیدگی سے لیتی ہیں۔ کیا فضول بات کرتی ہے' کہہ کر ٹال دیتی ہیں۔ مجھے تو اسے دیکھ کر گھن آتی ہے' میں کیا کروں۔" اس کی پریشانی انتہا پر پہنچ چکی تھی۔

اب جو کرنا تھا' مجھے ہی کرنا تھا۔ میں نے ضرغام کو دیکھا ہوا تھا۔ وہ شکل سے آرٹسٹ کے بجائے پہلوان لگتا تھا۔ اس کے بارے میں' میں نے جویریہ اور عرفان سے جو کچھ سنا تھا وہ مجھے ہوشیار کرنے کیلئے کافی تھا۔

میں ضرغام جیسے ہوش آدمی سے ٹکر لینے کی پوزیشن میں نہ تھا۔ میں خون خرابے سے ویسے ہی ڈرتا ہوں لیکن میں اس پہلوان سے شکست ماننے کیلئے بھی تیار نہ تھا۔ میں نے سوچ لیا کہ اسے طاقت کے بجائے عقل سے ٹھکانے لگا دوں گا۔ اس کی میں نے باقاعدہ منصوبہ بندی کرلی

تھی۔ اب صرف جویریہ کو پکا کرنا تھا اور یہ دیکھنا تھا کہ وہ میرا کہاں تک ساتھ دے سکتی ہے' مجھ سے کس حد تک محبت کرتی ہے؟

میں نے کہا۔ "یہ میں تمہیں بتا دوں گا کہ تم کو کیا کرنا ہے اور اگر تم میرے کہے پر چلیں تو تم کو مجھ سے کوئی نہیں چھین سکتا۔"

"میرا دل ڈرتا ہے' ضرغام بہت جنونی آدمی ہے۔" اس کی آواز میں لرزش تھی۔

"اس کا جنون دھرا رہ جائے گا' وہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ بس تمہیں ذرا مضبوط ہونا پڑے گا۔" میں نے اسے تسلی دی۔

"میں بہت مضبوط عورت ہوں۔ تم جو کہو گے کر گزروں گی' مجھے آزما کر تو دیکھو۔"

"بس بس' مجھے یہی سننا تھا۔" میں نے خوش ہو کر کہا۔ اب ضرغام ہمارا کچھ نہ بگاڑ سکے گا۔ میں اس کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دوں گا۔ بس تم دیکھتی جاؤ۔"

پھر میں نے اپنے منصوبے کے پہلے حصے پر عمل کیا۔ میں عرفان سے ملا۔ اس سے میں نے جا کر معافی مانگی اور کہا۔ "عرفان' میں نے جویریہ سے ملنا جلنا ترک کر دیا ہے۔ مجھ سے واقعی بھول ہوئی مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ یار اب تم مجھے معاف کردو' میں اب جویریہ سے کبھی نہیں ملوں گا۔ میں تم جیسے پیارے دوست سے خروم نہیں ہونا چاہتا۔ اب تم ضرغام کا دل بھی میری طرف سے صاف کروا دینا۔"

میری باتیں اور مسکین صورت دیکھ کر عرفان حیران رہ گیا۔ اسے یہ ہرگز امید نہیں تھی کہ میں اتنی آسانی سے جویریہ سے دستبردار ہو جاؤں گا۔ بہرحال وہ میرے معذرت بھرے جملے سن کر بہت خوش ہوا' وہ ایک دم کھڑا ہوگیا۔ اس نے مجھے گلے سے لگا کر خوب بھینچا اور بولا۔

"یار تم بہت عظیم آدمی ہو' تم میرے بہت اچھے دوست ہو۔"

میں کتنا اچھا دوست تھا اور کتنا عظیم آدمی تھا' یہ صرف مجھے معلوم تھا۔ آدمی جب فریب دینے پر آتا ہے تو اپنے چہرے پر ایسے رنگ چڑھا لیتا ہے کہ ان رنگوں کی اصل تک پہنچنا مشکل ہو جاتا ہے۔

میری عرفان سے ملاقاتیں جاری رہیں۔ اب میں تقریباً روزانہ ہی اس کے پاس چلا جاتا تھا۔ دفتر سے فارغ ہو کر ہم ادھر ادھر گھومنے نکل جاتے یا کسی ریستوران میں جا بیٹھتے۔ میں جویریہ یا ضرغام کا جان بوجھ کر ذکر نہ کرتا لیکن میرے کان ہر وقت ان کی کوئی خبر سننے کے متمنی رہتے۔

میں نے جویریہ سے قطع تعلق کرلیا تھا۔ جب سے میں نے جویریہ سے نہ ملنے کا وعدہ کیا تھا اس وقت سے آج تک میں جویریہ سے نہیں ملا تھا۔ البتہ اس کے ہسپتال کبھی کبھی فون پر بات کر لیا کرتا تھا۔

پھر ایک دن عرفان نے مجھے وہ خبر سنا ہی دی جس کا میں بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

"اچھا' لیکن جویریہ تو اس سے شادی کرنا نہیں چاہتی تھی۔" میں نے کہا۔

"ایسا تمہاری وجہ سے ہوا تھا۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

"میری وجہ سے نہیں' وہ کہتی تھی' ضرغام بڑا گندا رہتا ہے' مہینوں نہیں نہاتا۔ مجھے اسے دیکھ کر گھن آتی ہے۔" میں نے وضاحت کی۔

"یار' یہ لڑکیاں شادی سے پہلے اسی قسم کے نخرے دکھاتی ہیں۔ شادی ہو جانے دو' اگر ایک سال میں ان کے یہاں اولاد نہ ہو جائے تو میرا نام بدل دینا' پھر پوچھیں گے کہ اسے ضرغام کو دیکھ کر گھن آتی ہے یا نہیں۔" عرفان نے ہنستے ہوئے کہا۔

"یہ بات تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" میں نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی' اسی میں عافیت تھی۔

پھر وہ وقت بھی آ گیا کہ ضرغام اور جویریہ ایک بندھن میں بندھنے لگے۔ شادی سے ایک ہفتہ پہلے جویریہ نے ہسپتال سے چھٹی لے لی۔ آخری دن میں نے جویریہ سے بات کی۔

"ہاں بھئی مضبوط عورت تمہارے کیا حال ہیں؟" میں نے اسے چھیڑا۔

"مجھے ڈراؤ مت' میں پہلے ہی گھبرائی ہوئی ہوں۔"

"اب یہ وقت گھبرانے کا نہیں ہے۔"

"جانتی ہوں۔" اس نے اپنے لہجے میں اعتماد بحال کرتے ہوئے کہا۔ "کیا تم مجھ سے مل نہیں سکتے؟"

"نہیں جویریہ' بنا بنایا کام نہ بگاڑو۔"

"میں نہیں جانتی کہ آگے کیا ہو جائے؟ تم سے ایک مرتبہ مل لیتی تو اچھا ہوتا۔ تم سے ملاقات کیے ہوئے بھی تو ایک عرصہ ہو گیا۔"

"جویریہ ہمت سے کام لو' سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں تصور کی آنکھ سے خوشیوں بھرے دن دیکھ رہا ہوں۔ جب ہم اور تم ہاتھ میں ہاتھ ڈالے کسی حسین وادی میں ہنی مون منا رہے ہوں گے۔ ان اچھے دنوں کی آس میں برے دن گزار دو۔ اس وقت ہمارا ملنا کسی دھماکے سے کم نہ ہو گا۔"

"اچھا' ٹھیک ہے۔" جویریہ نے اداسی سے کہا۔ "پھر یہ ہماری آخری گفتگو ہے۔"

"آخری گفتگو تو نہ کہو۔" میں نے اسے ٹوکا۔ "تم کو زندگی بھر بولنا ہے اور مجھ کو زندگی بھر سننا ہے۔" میں نے بڑی محبت سے کہا۔

"خدا کرے ایسا ہی ہو۔" اس کی آواز میں لرزش آ گئی۔

"ایسا ہی ہو گا' تم پریشان نہ ہو' ہمت اور ہوشیاری سے کام لو' انشاء اللہ فتح ہماری ہو گی۔"

"اچھا خدا حافظ۔" یہ کہہ کر اس نے فوراً ریسیور رکھ دیا۔ اس نے میرا جواب بھی نہ سنا۔ میں جانتا تھا' وہ اس وقت اپنے سفید رومال سے آنکھوں سے ٹپ ٹپ گرتے آنسو

پونچھ رہی ہو گی۔

"خدا حافظ جان!" میں نے خاموش ریسیور میں دھیرے سے کہا اور ریسیور رکھ کر کچھ سوچنے لگا۔

میں سوچ رہا تھا کہ ایک ہفتے بعد جویریہ کی شادی ہو جائے گی۔ شادی کے بعد اچانک ایک ہنگامہ کھڑا ہو گا۔ پھر یہ ہنگامہ فرو ہوتے ہوتے دو تین ماہ لے گا۔ اس کے بعد حالات یکسر پلٹا کھائیں گے اور پھر جویریہ میری ہو جائے گی۔ گویا ابھی دو تین مہینے تھے میرے پاس۔ ان دو تین مہینوں میں مجھے دو تین گاڑیاں اٹھا کر ضرور ٹھکانے لگانا تھیں تاکہ میں مالی طور پر مستحکم ہو جاؤں اور جویریہ کو جو میرے پاس خاصی تھکی ہوئی آئے گی' اس کے اعصاب کو سکون پہنچانے کیلئے میں پاکستان کی وادی وادی گھوم سکوں۔

میں اپنے پیشے کے معاملے میں بڑا قناعت پسند تھا اور یہ قناعت پسندی ہی مجھے جیل سے دور رکھے ہوئے تھی۔ میں ایک گاڑی اٹھاتا' اسے فروخت کرتا اور جب تک سارے پیسے ختم نہ ہو جاتے' میں دوسری گاڑی کو ہاتھ نہ لگاتا لیکن جویریہ کیلئے اس اصول کو توڑنا تھا۔ میں اپنی مون بڑی شان سے منانا چاہتا تھا اور اس کیلئے ضروری تھا کہ میں یکے بعد دیگرے دو تین گاڑیوں پر ہاتھ صاف کروں۔

گھر پہنچ کر میں نے شمع سے کہا۔ "شمو آج شکار پر چلنا ہے۔"

"پیسے ختم ہو گئے کیا؟" شمع نے پوچھا۔

"نہیں پیسے تو ختم نہیں ہوئے لیکن میں سوچ رہا ہوں کہ دو تین گاڑیوں پر ہاتھ صاف کر کے کچھ رقم اکٹھا کر لوں۔" میں نے کہا۔

"وہ کیوں؟" شمع نے مجھے ترچھی نظروں سے دیکھا اور مسکرا کر بولی۔ "کوئی اور عورت گھر میں ڈالنا ہے کیا؟"

"ہاں' یہی سمجھ لو۔" اس نے یہ بات مذاق میں کہی تھی لیکن میں نے اسے حقیقت بتا دی۔

"تو پھر اسی سے کروانا یہ کام' میں کیوں کسی کی خدمت کروں۔"

"اری بے وقوف عورت۔ میں نے کچھ اور سوچا ہے۔"

"میں سمجھتی ہوں تمہاری ساری سوچ کو' پھر تم کسی عورت کے چکر میں پڑ گئے ہو۔"

"میری پوری بات تو سن لو۔"

"اچھا' سناؤ۔"

"میں اصل میں چار پانچ لاکھ روپے جمع کرنا چاہتا ہوں' میرا خیال ہے کہ میں کوئی چھوٹا موٹا بزنس کر لوں اور گاڑیاں چرانے سے توبہ کر لوں۔ چوری پھر چوری ہے۔ ابھی تک ہم نہیں پکڑے گئے لیکن برا وقت آتے دیر نہیں لگتی۔ میں اندر چلا گیا تو تم لوگوں کا کیا ہو گا؟ کچھ پیسے بزنس

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

میں لگے ہوں گے تو تم لوگوں کو سہارا رہے گا۔ میرے کئی دوست ہیں جو مجھے سرمایہ کاری کیلئے کہتے ہیں' میرا خیال ہے' اس مرتبہ میں پیسے جمع کر کے لگا ہی دوں بزنس میں۔ کیوں کیا خیال ہے؟"

"یہ خیال تو بہت اچھا ہے' میں تو تم سے کب سے کہہ رہی ہوں کہ کوئی کام کرو مگر تمہیں تو شادیوں کے علاوہ اور کوئی کام آتا ہی نہیں۔" اس نے ہنس کر کہا۔

"شادیاں کرنا بھی تو ایک کام ہے آخر' میں نے چار پانچ سالوں میں سات شادیاں کی ہیں' کوئی اور کر کے تو دکھائے میں نے خامی کو بھی خوبی میں بدل ڈالا۔

"بڑا اچھا کام کیا ہے۔" شمع نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "سیدھے جنت میں جاؤ گے۔"

"ویسے شمع' وہاں ایک آدمی کو کتنی بیویاں ملیں گی؟" میں نے بڑی معصومیت سے پوچھا۔

"زیادہ بکواس کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"اچھا' یہ نگار کدھر ہے؟ اس سے بھی مشورہ کر لیں۔"

"پڑوس میں گئی ہے۔"

"یہ گھر میں ٹکتی ہی نہیں' میں جب بھی باہر سے واپس آتا ہوں' یہ گھر سے باہر نکلی ہوتی ہے۔ کتنی دیر ہو گئی اسے گئے ہوئے؟" میں نے پوچھا۔

"بہت دیر ہو گئی۔ میرا خیال ہے دو اڑھائی گھنٹے تو ہو گئے ہوں گے۔ کیا بلاؤں اسے؟"

"نہیں' رہنے دو خود آ جائے گی' پھر شام کو شکار کا پروگرام پکا ہے۔"

"آج نگی کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔"

"نہیں' آج میں دونوں کو ساتھ لے کر جاؤں گا۔ اکیلا آدمی گاڑی میں بیٹھا بور ہوتا رہتا ہے' تم دونوں ایک ساتھ ہو گی تو باتوں میں وقت گزر جائے گا۔" میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

"چلو ٹھیک ہے' جیسے تمہاری مرضی۔" اس نے سعادت مندی سے کہا۔

شمع کی یہ عادت مجھے بہت پسند تھی۔ وہ میری بات فوراً مان لیتی تھی۔ میرے فیصلے پر فوراً سر جھکا دیتی تھی۔ کبھی حیل و حجت نہیں کرتی تھی' بحث میں نہیں الجھتی تھی' اس کے برخلاف نگار ہر معاملے میں "نہیں نہیں" کرتی تھی۔ ہر معاملے میں بحث کرتی تھی۔ بات تو خیر وہ بھی مان لیتی تھی لیکن تھوڑے بحث و مباحثے کے بعد۔ نگار کی یہ عادت مجھے پسند نہ تھی۔ لیکن میں کچھ کر نہیں سکتا تھا۔ اس کی فطرت نہیں بدل سکتا تھا۔

میں دوسروں کی کیا بات کروں۔ میں خود اپنی فطرت نہیں بدل سکتا۔ مجھے دوسروں کو فریب دینے کی عادت ہے' سو وہ میں دیے جاتا ہوں۔ میں نے جتنی شادیاں کیں سب فریب سے کیں۔ اگر میں کسی عورت کو اپنی حقیقت بتا دیتا تو وہ مجھ سے ہرگز شادی نہ کرتی۔

اس وقت بھی میں نے شمع کو چکر دیا تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ میں نے اپنے پیشے کا

اصول کیوں توڑا ہے۔ وہ خوش تھی کہ کبھی تو میں نے عقل کی بات سوچی۔

چکر تو خیر میں نے جویریہ کو بھی دے دیا تھا۔ وہ میری ظاہری شکل و صورت پر مر مٹی تھی۔ میری لچھے دار گفتگو پر فدا ہو گئی تھی' وہ میری شان دیکھ کر عاشق ہو گئی تھی۔ میں نے اسے اپنے بارے میں کچھ نہ بتایا تھا' اسے نہیں معلوم تھا کہ میں سات شادیاں کر چکا ہوں۔ اس وقت تین بیویوں کا مالک ہوں۔ اگر اسے یہ سب معلوم ہو جاتا تو وہ جو کچھ کرنے جا رہی تھی' کبھی نہ کرتی' وہ خاموشی سے ضرغام کی ہو جاتی اور شکر ادا کرتی کہ مجھ فریبی کے جال میں آنے سے بچ گئی۔

لیکن ایسا اس وقت ہوتا جب میں نے اس کے گرد جال نہ پھیلایا ہوتا۔ اس مادی دنیا میں دولت ایک ایسا طاقتور جال ہے کہ اس کے ذریعے کسی کو بھی پھنسایا جا سکتا ہے۔ دولت انسانوں کو بندروں کی طرح ناچنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ اپنا آپ بھلا دیتی ہے۔

لیکن دولت کی وجہ سے میں بھی اپنا آپ نہیں بھولا تھا۔ البتہ عورتیں دیکھ کر میں اپنا آپ ضرور بھول جاتا تھا۔ دولت کے معاملے میں' میں بڑا قناعت پسند آدمی تھا' لیکن عورتوں کے معاملے میں' میں قناعت پسند نہ تھا۔ جب جہاں بھی کوئی خوبصورت چیز دکھائی دیتی تھی فوراً اس کے حصول کیلئے تگ و دو شروع کر دیتا تھا۔ جویریہ کے سلسلے میں بھی اپنی کوششیں جاری تھیں۔ میں اب روزانہ عرفان سے ملنے جانے لگا تھا۔ اگر کسی وجہ سے جا نہ پاتا تو اسے فون کر لیتا۔ شاید کوئی جویریہ کے بارے میں اطلاع مل جائے۔

جوں جوں جویریہ کی شادی نزدیک آتی جا رہی تھی' میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہوتی جا رہی تھیں۔ میں سوچتا جانے کیا ہو' کہیں جویریہ منصوبے پر عمل کرنے سے جھجک نہ جائے۔ اگر ایسا ہو گیا تو ہم دونوں مشکل میں پھنس جائیں گے' ہمارے خواب ادھورے رہ جائیں گے۔

شادی کا دن آیا اور گزر گیا۔

میں اس دن گھر سے نہ نکلا۔ شمع اور نگار کے درمیان رہا' جب رات آئی تو میں اپنے کمرے میں چلا گیا اور اندر سے دروازہ بند کر کے خاموشی سے لیٹ گیا اور تصور کی آنکھ سے جویریہ کو دلہن بنے بیڈ پر بیٹھا دیکھتا رہا۔ سوچتا رہا' اب یوں ہوا ہو گا' اب ایسا ہوا ہو گا' پھر جانے کب میری آنکھ لگ گئی۔

صبح شمع نے میرے کمرے کا دروازہ زور سے دھڑ دھڑایا تو میں گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ مجھے لگا جیسے دروازے پر جویریہ ہے۔ پھر ذرا ہوش آیا تو معلوم ہوا میں اپنے گھر پر ہوں۔ یہاں بھلا جویریہ کیسے آ سکتی ہے؟ میں نے جلدی سے اٹھ کر دروازہ کھولا اور پھر واپس آ کر بیڈ پر لیٹ گیا۔

شمع کچھ حیرت زدہ سی اندر آئی اور بولی۔ "خیریت تو ہے' یہ تم نے اندر سے دروازہ کیوں بند کر رکھا تھا۔ اس سے پہلے تو تم نے ایسا کبھی نہیں کیا؟"

"آدمی میں تبدیلی آتے کیا دیر لگتی ہے؟" میں نے آنکھیں بند کیے کہا۔

"اچھا۔" اچھا کو اس نے خاصا کھینچ کر کہا۔ "اس تبدیلی کی وجہ پوچھ سکتی ہوں؟"

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

اب میں اسے تبدیلی کی بھلا کیا وجہ بتاتا۔ میں نے ایسے ہی الٹے سیدھے جملے بول کر اسے خاموش کر دیا۔ پھر اٹھ کر میں نہایا دھویا۔ جلدی جلدی ناشتہ کیا اور گھر سے نکل گیا۔

میں سیدھا عرفان کے دفتر پہنچا۔ مجھے توقع تھی کہ اس سے ضرور کوئی نہ کوئی خبر مل جائے گی لیکن وہاں پہنچ کر مجھے بڑی مایوسی ہوئی۔ عرفان آج دفتر نہیں آیا تھا۔ چھٹی پر تھا۔ عرفان کے ساتھی نے بتایا کہ اس نے ضرغام کی شادی کی وجہ سے چھٹی لی ہے۔ اب وہ کل دفتر آئے گا۔

لیکن یہ آج کیسے گزرے گا۔ میں نے سوچا۔ میرے لیے تو پل پل بھاری ہو رہا تھا۔ رات گزر چکی تھی جو کچھ ہونا تھا ہو چکا ہوگا۔ میرے پاس ایسا کوئی ذریعہ نہ تھا کہ میں یہ جان سکوں کہ رات کو کیا ہوا؟ عرفان ہی ذریعہ تھا سو وہ بھی غائب ہو گیا تھا۔

خیر میں نے اپنے دل کو سمجھایا ذرا صبر سے کام لینا چاہیے۔ کل کون سا دور ہے صرف چوبیس گھنٹے کی تو بات ہے۔ عجلت دکھانے میں کھیل بگڑنے کا امکان تھا۔

میں دوسرے دن عرفان کے دفتر پہنچا تو وہ موجود تھا۔ اسے دیکھ کر میں نے سکون کا سانس لیا' وہ کام میں مصروف تھا۔ میں خاموشی سے ایک کرسی گھسیٹ کر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

اس نے نظریں اٹھائیں اور مسکرا کر بولا۔ "اچھا' یہ تم ہو۔"

"کل کہاں غائب تھے؟" میں نے پوچھا۔

"تم آئے تھے کیا؟" اس نے سوال پر سوال کیا۔

"ہاں' میں آیا تھا' سوچا تھا تمہیں تمہارے دوست کی شادی کی مبارکباد دیتا چلوں۔"

"یار' وہاں بہت گڑبڑ ہو گئی ہے۔ رات کو ضرغام نے مجھے اپنے گھر پر ہی روک لیا تھا' خاصی دیر ہو گئی تھی۔ اس نے کہا' اب اتنی رات گئے کہاں جاؤ گے؟ صبح چلے جانا۔ دفتر سے میں نے چھٹی لے رکھی تھی اس لیے میں نے اس کی بات مان لی اور ڈرائنگ روم میں صوفے پر پڑ کر سو گیا۔ گڑبڑ کیا ہوئی؟ میں اندر سے بہت بے چین تھا لیکن میں نے چہرے سے یہ ظاہر نہ ہونے دیا۔

"ایسی بات ہوئی ہے جو کبھی سنی نہ دیکھی۔" اس کی یہ بات سن کر مجھے کچھ اطمینان ہوا۔

"آخر ہوا کیا' کچھ بتاؤ تو میں نے بے قراری سے پوچھا۔ ظاہر تو یہی کرنا تھا۔

"جویریہ' ضرغام کو دیکھتے ہی بیہوش ہو گئی۔" اس نے بتایا۔

"تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟ بعض لڑکیوں کے دل میں اس رات سے متعلق کچھ الجھنیں ہوتی ہیں' کچھ خوف ہوتے ہیں اسی لیے وہ بیہوش ہو جاتی ہیں' یہ تو نارمل بات ہے۔"

"تم جو کہہ رہے ہو' وہ بات نہیں تھی' کسی قسم کی بات کی ابھی نوبت ہی نہیں آئی تھی۔ بس ضرغام دروازے میں داخل ہوا۔ جویریہ نے سر اٹھایا' ایک زوردار چیخ ماری اور بیہوش ہو گئی۔ ضرغام کی بھابی' بہنیں' جو اسے کمرے میں دھکیلنے آئی تھیں وہ ابھی دروازے کے نزدیک ہی تھیں' انہوں نے جویریہ کی چیخ سنی تو وہ اندر دوڑیں۔ جویریہ بیڈ کی دوسری طرف فرش پر بے سدھ پڑی تھی۔ شاید

وہ بیڈ سے اٹھ کر بھاگی تھی۔ خواتین نے اسے اٹھا کر بیڈ پر ڈالا۔ اس کے ہاتھ پاؤں سہلائے۔ منہ پر پانی کے چھینٹے دیئے تو کچھ دیر کے بعد اسے ہوش آ گیا۔ ہوش آنے کے بعد اس نے چاروں طرف پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھا۔ خواتین نے اسے تسلی دی۔ اسے پانی پلایا۔ آدھا کپ چائے پلائی گئی جب اس کے حواس مکمل طور پر بحال ہو گئے تو بھابی نے ضرغام کو آواز دی کہ آ جاؤ بھئی اپنی دلہن کو سنبھالو۔ اسے آواز دے کر خواتین کمرے سے نکلنے لگیں۔ ادھر سے ضرغام کمرے میں داخل ہوا۔ ابھی ضرغام نے کمرے میں قدم ہی رکھا تھا کہ وہ اسے دیکھ کر زور سے چیخی اور پھر بیہوش ہو گئی۔ اس نے جو بات کہہ کر چیخ ماری تھی' وہ سب کو پریشان کر گئی۔ اس نے بتایا۔

"کیا کہا اس نے؟" میں نے کہا۔

"اس نے ضرغام کو دیکھتے ہی جن' جن کہا' ہذیانی انداز میں چیخی اور بیہوش ہو گئی۔"

"ارے' یہ کتنی حیران کن بات ہے۔"

"یہی تو میں تمہیں بتا رہا تھا کہ ایسی بات ہوئی جو کبھی دیکھی نہ سنی۔"

"لیکن ضرغام تو اس کی خالہ کا لڑکا ہے۔ ان لوگوں کا ایک دوسرے کے گھر آنا جانا ہو گا۔ بات چیت بھی ہو گی پھر وہ اچانک جن کیسے بن گیا؟" میں نے ضرغام کے حق میں دلیل دی۔ یہ بات بھی میرے منصوبے میں شامل تھی۔ میں یہ نہیں چاہتا تھا کہ [illegible] کی وجہ سے اس کیس میں ملوث کر لیا جائے' میں نے کھلے دل سے جویریہ کو ضرغام کو سونپ دیا تھا اور میں نے عرفان سے جو وعدہ کیا تھا اس پر سختی سے کاربند تھا۔ میں عرفان کو ہر قیمت پر اپنے اعتماد میں لینا چاہتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ عرفان کو اس بات کا یقین ہو جائے کہ میں نے دوستی کی خاطر خلوص دل سے جویریہ کو چھوڑ دیا ہے اور یہ تاثر قائم کرنے میں' میں بالآخر کامیاب ہو گیا۔

"یار' یہی تو بات سمجھ میں نہیں آئی' وہ اسے دیکھتے ہی جن جن کہہ کر چیخ مارتی ہے اور بیہوش ہو جاتی ہے۔"

"ہوش آنے کے بعد' کسی نے اس سے پوچھا نہیں کہ وہ ایسا کیوں کرتی ہے۔ اسے آخر کیا نظر آتا ہے کہ وہ خوفزدہ ہو کر اپنے ہوش کھو بیٹھتی ہے۔"

"وہ کہتی ہے کہ ضرغام کی دیکھتے ہی دیکھتے ہیبت ناک صورت بن جاتی ہے۔ ایک دم سر بڑا ہو جاتا ہے' آنکھیں پھٹ جاتی ہیں اور کافی لمبی زبان باہر نکل آتی ہے۔"

"ارے' یہ کتنی عجیب بات ہے۔" میں نے کہا۔

"یار ضرغام کی بڑی بری حالت ہے۔ اس کے سارے خواب چکنا چور ہو گئے ہیں۔ اس نے بڑے چاؤ سے یہ شادی کی تھی۔ وہ اس سے بہت محبت کرتا ہے۔ وہ بڑی الجھن کا شکار ہے۔ پوری رات گھر کا کوئی فرد نہیں سویا۔ جویریہ کو بار بار سمجھایا گیا کہ اسے غلط فہمی ہوئی ہے۔ وہ خواہ مخواہ ڈر گئی ہے۔ ضرغام بالکل ٹھیک ہے۔ یہ وہی ضرغام ہے جس سے شادی سے پہلے تمہاری ملاقات رہی ہے لیکن اس پر ان باتوں کا کوئی اثر نہ ہوا۔ ضرغام کا نام آتے ہی اس کا جسم کانپنے لگتا ہے۔

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

خوف سے اس کی مٹھیاں بھنچ جاتی ہیں۔ گھر کا ہر شخص پریشان ہے۔ اس شادی نے تو دونوں گھروں میں خوف و ہراس پھیلا دیا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا' کیا کیا جائے؟" عرفان بہت پریشان تھا۔

جویریہ کو کسی ماہر نفسیات کو دکھاؤ' اگر کوئی الجھن ہو گی تو وہ دور کر دے گا۔" میں نے مشورہ دیا۔

☆.....☆.....☆

جویریہ کو ماہر نفسیات کو دکھایا لیکن وہ سوائے سکون آور دوائیں دینے کے کچھ اور نہ کر سکا۔ اس کی سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ یہ کیس کیا ہے۔ وہ ضرغام سے اچانک اس قدر خوفزدہ کیوں ہو گئی ہے جبکہ وہ کہتی تھی کہ اسے ضرغام سے بہت محبت ہے اور یہ شادی محبت کی شادی تھی۔ ماہر نفسیات کو جویریہ نے غلط راستوں پر ڈال دیا۔ وہ بے چارہ اس کی نفسیاتی الجھنیں سلجھاتے سلجھاتے خود الجھن کا شکار ہو گیا۔ ایک دن اس نے اس کیس کو اپنے بس سے باہر قرار دے دیا۔

وقت گزرتا رہا' ضرغام وقفے وقفے سے اس کے پاس آتا رہا اور وہ اسے دیکھ کر بیہوش ہوتی رہی۔ خوف کے مارے اب جویریہ کی حالت دگرگوں ہوتی جا رہی تھی۔ اس نے کھانا پینا چھوڑ دیا تھا۔ وہ دبلی اور زرد ہوتی جا رہی تھی۔

گھر کی عورتوں نے اسے کئی پیروں فقیروں کو دکھا دیا تھا لیکن اس کی حالت جوں کی توں تھی۔ یہ ساری باتیں مجھے عرفان کے ذریعے معلوم ہوتی رہتی تھیں۔

ایک دن میں نے عرفان کو مشورہ دیا۔ "یار تم لوگ جویریہ کو پیروں' فقیروں کے پاس لیے پھر رہے ہو۔ آخر تم لوگ ضرغام کو کسی عامل کے پاس کیوں نہیں لے جاتے۔ کیا پتا جویریہ ٹھیک ہی کہتی ہو۔ اس پر واقعی کسی جن کا سایہ ہو۔"

"ہاں' کہتے تو تم ٹھیک ہو' جہاں جویریہ کا اتنا علاج ہوا ہے' وہاں ضرغام کو بھی کسی پیر فقیر کو دکھا لینا چاہیے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ میں تو کسی پیر فقیر کو جانتا نہیں۔ اگر کسی اشتہاری پروفیسر کو دکھایا جائے تو وہ تو پیسے بٹورنے کی بات کرے گا۔" عرفان نے کہا۔

"میں ایک عامل کو جانتا ہوں۔ نہایت شریف آدمی ہیں اور سنا ہے کہ جن اتارنے کے بڑے ماہر ہیں۔ کسی سے ایک پیسہ نہیں لیتے۔ اگر تم چاہو تو ان کے پاس چلے جاؤ۔"

"میں ضرغام سے بات کر کے دیکھتا ہوں' اگر وہ راضی ہو گیا تو پھر تمہارے ساتھ ہی چلیں گے۔" اس نے مجھے پر امید نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں یار' میرا جانا مناسب نہیں ہو گا۔ تم دونوں چلے جانا۔ میں تمہیں پتا بتا دوں گا۔ ان سے میرا نام لے دینا۔ وہ ضرغام کو اچھی طرح دیکھ لیں گے۔"

یہ بات کہ میرا ضرغام کے ساتھ جانا مناسب نہ ہو گا' عرفان کی سمجھ میں آ گئی۔ وہ میرے بتائے ہوئے پتے پر ضرغام کو لے گیا۔ اس عامل پروفیسر نے میری مرضی کے مطابق اپنا بیان دے دیا۔ اس بیان کیلئے مجھے صرف ایک ہزار روپے اسے دینے پڑے۔ اس نے ضرغام کو اس

قدر ڈرایا کہ وہ خود بھی اسے پانچ سو روپے دینے کیلئے تیار ہو گیا۔ اس نے کہا تمہارے اوپر بڑے خطرناک قسم کے جن نے قبضہ کر لیا ہے۔ جب تم اپنی بیوی کے کمرے میں جاتے ہو تو وہ تمہارے جسم میں داخل ہو جاتا ہے۔ اس طرح وہ تمہاری بیوی پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ جب تک تمہارے سر سے جن اتر نہ جائے' اپنی بیوی سے دور رہو۔ میں تمہارے لیے چلہ کشی کروں گا۔

گیارہ دن عامل نے چلہ کشی کی' پھر ضرغام کو جن اترنے کی نوید سنائی اور اسے کچھ احتیاط بتائی۔ ایک تعویذ گلے میں ڈالا اور کہا' اب تم اپنی بیوی کے پاس جا سکتے ہو۔

ضرغام بڑا خوش ہوا۔ رات کو جب وہ جھومتا جھامتا بیڈ روم میں داخل ہوا تو نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات والا نکلا۔ جویریہ نے اسے دیکھتے ہی جن جن کہا اور بے ہوش ہو گئی۔

دوسرے دن عرفان نے مجھے ساری کہانی سنائی۔ کہانی سن کر میں نے بڑا افسوس ظاہر کیا اور کہا۔ "شاید کوئی ضرغام سے بداحتیاطی ہو گئی۔ عامل صاحب سے پھر ملو۔"

"نہیں یار ضرغام کو بہت غصہ ہے' وہ اب کہیں جانے کو تیار نہیں ہے۔ اس کا ہر شخص سے اعتماد اٹھ گیا ہے۔"

اور میں یہی چاہتا تھا کہ ضرغام کا دنیا کے ہر شخص سے اعتماد اٹھ جائے۔ اسے اپنے آپ پر بھی اعتماد نہ رہے۔ ایک جنون اور غصے کی سی کیفیت اس پر طاری ہو جائے۔ کبھی وہ شدید یاسیت کا شکار ہو اور خودکشی کے بارے میں سوچے اور میں جو چاہتا تھا' وہی کچھ ہو رہا تھا۔

میرا خیال تھا کہ جویریہ میرے منصوبے پر اتنی اچھی طرح عمل نہ کر سکے گی لیکن اب تک کی پرفارمنس نے یہ ثابت کیا تھا کہ وہ اچھی اداکارہ بن سکتی ہے۔ اس نے تو کمال کر دکھایا تھا' خوفزدہ ہو کر غش کھانے کی ایسی شاندار اداکاری کی تھی کہ پورے خاندان کو نچا کر رکھ دیا تھا۔ میں دل ہی دل میں اسے شاباش دے رہا تھا اور اندھیرے چھٹنے کا انتظار کر رہا تھا۔

میرا اندازہ یہ تھا کہ اگر جویریہ ثابت قدم رہی' اسی طرح پرفارمنس دیتی رہی تو یہ معاملہ تین ماہ سے زیادہ نہ لے گا۔ ضرغام بالآخر گھبرا کر اسے طلاق دے دے گا لیکن میرا اندازہ غلط ثابت ہوا۔ ضرغام نے دو ماہ میں ہی طلاق دے دی۔ یہ طلاق باہمی رضامندی سے ہوئی۔ جویریہ کی حالت تو بگڑ ہی رہی تھی۔ ضرغام بھی اس حادثے سے خاصا متاثر ہوا تھا' اب کوئی فائدہ نہ تھا۔ سارے علاج معالجے کرا کر دیکھ لیے گئے تھے لیکن فائدہ کچھ نہ ہوا تھا۔ تب آپس میں بیٹھ کر یہی طے ہوا کہ جویریہ کو طلاق دے کر اسے اس عذاب سے نجات دلا دی جائے اور ضرغام جس کرب میں مبتلا ہے اسے بھی سکون میسر آ جائے لہٰذا طلاق ہو گئی۔

طلاق کے بعد جویریہ نے ہسپتال جوائن کر لیا۔ اگرچہ مجھے جویریہ کے ہسپتال جوائن کرنے کی اطلاع عرفان سے مل گئی تھی لیکن میں نے اس سے فوراً رابطہ قائم کرنے کی کوشش نہیں کی۔ چند دن گزار کر میں نے پھر اسے فون کیا۔

اس کے ریسیور اٹھانے پر میں نے کہا۔ "یہ میں ہوں۔"

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

"ہوں۔" اس نے مخصوص انداز میں کہا۔

"ہوں۔" میں نے بھی جواب میں "ہوں" کی۔ یہ ہمارا مخصوص انداز تھا۔ اس طرح ہم ایک دوسرے کو بغیر کسی شک کے پہچان لیتے تھے۔

"طلاق مبارک ہو۔" میں نے خوش ہو کر کہا۔

"ہاں" تمہیں بھی مبارک ہو' کہو کیسی رہی؟" وہ بھی بہت خوش تھی۔

"بہت شاندار اداکاری کی تم نے' میری توقعات سے بڑھ کر۔ مجھے عرفان کے ذریعے سب معلوم ہوتا رہا۔ یار تم نے تو کمال کر دیا۔" میں نے اس کی تعریف کی۔

"ابھی تمہیں بہت سی باتیں نئی معلوم ہوں گی۔ میں تمہیں بتاؤں گی۔" اس نے کہا۔

"پھر ملو۔" میں نے بے قراری سے کہا۔ "کہاں ملو گی؟"

"جہاں تم کہو گے لیکن ابھی چند دن ٹھہر جاؤ تو اچھا ہو۔"

"اب تو میں چند لمحے ٹھہرنے کیلئے تیار نہیں ہوں۔ تمہاری صورت دیکھے ایک عرصہ ہو گیا۔"

"میرا جی بھی چاہتا ہے کہ فوراً تمہارے پاس اڑ کر پہنچ جاؤں لیکن خود پر کنٹرول کرنا ہوگا ورنہ بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا۔"

"اب کیا کھیل بگڑے گا۔ اسے تو تمہاری صورت سے نفرت ہو گئی ہو گی۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"ایسی ویسی اس کا بس چلتا تو شاید وہ مجھے قتل ہی کر دیتا۔"

"یہ فون ہے' ذرا محتاط گفتگو کرو۔" میں نے اسے تنبیہ کی۔

"اس وقت آس پاس کوئی نہیں ہے۔" اس نے کہا۔

"اچھا' ویسے تم نے بھی اسے رسوا کرنے میں کوئی کسر اٹھا رکھی۔ اچھے بھلے بندے کو جن بنا دیا۔ اب تو اس کی شادی بھی مشکل ہو جائے گی۔ کون دے گا اب جن کو بیٹی۔"

"میری طرف سے جہنم میں جائے۔" جویریہ نے بے نیازی سے کہا۔ "بس میری جان چھوٹ گئی ورنہ اس گندے آدمی کے ساتھ زندگی عذاب بن جاتی۔"

پھر میں نے چند دن کی جدائی کا عذاب اور جھیلا' اس کے بعد اسے فون پر ایک جگہ کھڑے ہو کر انتظار کرنے کی ہدایت کی۔ میں وقت مقررہ پر اس جگہ پہنچ گیا۔ وہ ابھی نہیں آئی تھی۔ میں نے اپنی گاڑی سائڈ میں کھڑی کر لی اور گاڑی سے باہر نکل کر اس کا انتظار کرنے لگا۔

کچھ دیر کے بعد ایک رکشہ میرے نزدیک رکا۔ جویریہ رکشہ میں موجود تھی۔ اس کا رنگ بھی زرد ہو گیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے واقعی اس نے اپنے شوہر کے روپ میں کسی جن کو دیکھا ہو۔ وہ رکشے سے اتر کر میری گاڑی میں بیٹھ گئی۔ میری گاڑی شہر کے ایک چھوٹے سے ہسپتال کے احاطے میں کھڑی تھی۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں ہمیں مشکل سے ہی دیکھا جا سکتا تھا۔

پھر ہم نے وہاں سے نکل کر ایک ریستوران کا رخ کیا اور وہاں بیٹھ کر مستقبل کی منصوبہ بندی کی۔ میں اب بہت بے قرار ہو رہا تھا۔ چاہتا تھا جویریہ کا جلد از جلد قرب میسر آ جائے۔ وہ بھی یہی چاہتی تھی کہ فوراً میری ہو جائے۔ میاں بیوی راضی تھے' اب قاضی کا مسئلہ تھا جس نے ہمارا نکاح پڑھانا تھا۔

☆.....☆.....☆

پھر یہ شادی سے ایک دن پہلے کی بات ہے جویریہ میرے ساتھ تھی۔ صدر سے ہم لوگوں کو کچھ شاپنگ کرنا تھی۔ میں اسے کچھ زیورات دلوانا چاہتا تھا۔ صدر کی اس معروف اور مشہور سڑک پر میں اپنی گاڑی کو پارک کرنے کی جگہ تلاش کر رہا تھا۔ بالآخر مجھے ایک گاڑی بیک ہوتی دکھائی دی۔ میں نے اپنی گاڑی روک لی تاکہ وہ گاڑی نکل جائے تو میں اپنی گاڑی وہاں کھڑی کر دوں۔

اپنی گاڑی پارک کر کے جب میں نے اپنے دائیں جانب نظر ڈالی تو میرے منہ میں پانی بھر آیا۔ میرے برابر ایک چمچماتی گاڑی کھڑی تھی۔ نیا ماڈل تھا' گاڑی کے اندر بریف کیس بھی پڑا ہوا تھا۔

بس ایک دم ہی میرا دماغ سنسنا اٹھا۔ مجھے پیسوں کی شدید ضرورت تھی۔ میں ابھی تک مطلوبہ رقم اکٹھا نہیں کر پایا تھا۔ اوپر والے نے چھپر پھاڑ کر خود بخود موقع دے دیا تھا۔ میں اس موقع کو ہاتھ سے گنوانا نہیں چاہتا تھا۔

میں نے جویریہ سے کہا۔ "جویریہ' یہ گاڑی دیکھ رہی ہو۔"

"ہاں' دیکھ رہی ہوں' خوبصورت اور نئی ہے' کلر بہت پیارا ہے۔" وہ جانے کن خوابوں میں تھی۔

"میں اس گاڑی کو چرانا چاہتا ہوں۔" میری بات سن کر وہ اس طرح چونکی جیسے بچھو نے اسے ڈنک مار دیا ہو۔

"یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟" اس کے سارے خواب بکھر گئے۔

"پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے' یہ میرے ایک دوست کی گاڑی ہے' میں اس گاڑی کو یہاں سے نکال کر ذرا دور کھڑی کر کے آتا ہوں' تم جب تک گاڑی میں بیٹھی رہو' وہ گاڑی یہاں نہ پا کر بڑا پریشان ہوگا' بہت مزہ آئے گا' پھر ہم اس سے رات کا کھانا کسی اچھے سے ہوٹل میں کھائیں گے اور گاڑی اس کے حوالے کر دیں گے۔ ٹھیک ہے نا' بس تم گاڑی میں بیٹھی رہنا جب تک میں واپس نہ آ جاؤں۔"

"لیکن تم ان کی گاڑی کس طرح کھولو گے؟" اس نے پوچھا۔

"میرے پاس جو چابی ہے' اتفاق سے اس ماڈل کی کار میں آسانی سے لگ جاتی ہے۔"

یہ کہہ کر میں اپنی گاڑی سے اتر آیا اور پھر ایکشن میں آ گیا۔

گاڑی کا دروازہ کھولنے میں مجھے چند سیکنڈ لگے۔ زندگی بھر میں نے اور کیا ہی کیا تھا۔

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

جب میں گاڑی بیک کر رہا تھا تو میں نے جویریہ کے چہرے پر کچھ الجھن دیکھی۔ اس نے کہا۔ "ذرا جلدی آنا۔"

میرے پاس اس کی بات کا جواب دینے کا وقت نہ تھا۔ یہ بڑے جان لیوا لمحات ہوتے تھے۔ ایک ایک لمحہ قیمتی ہوتا تھا۔ گاڑی بیک کر کے میں نے تیر کی طرح چلائی۔

پھر جب میں گاڑی کو ایک محفوظ مقام پر کھڑا کر کے جائے واردات پر پہنچا تو میرے چھکے چھوٹ گئے' یہ تو اچھا ہوا کہ میں سڑک کے اس پار تھا اور ذرا فاصلے پر تھا۔ میں نے لپک کر ایک گاڑی کی آڑ لے لی۔

میں نے جو دیکھا اس سے یہ اندازہ لگانے میں مجھے دیر نہ لگی کہ کیا ہوا ہوگا۔ جہاں سے میں نے گاڑی اٹھائی تھی وہاں بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ اس رش میں مجھے جویریہ کا پریشان چہرہ نظر آ رہا تھا۔ وہ بڑی بے قراری سے گردن اٹھا کر اس سمت دیکھ رہی تھی جدھر سے میرے آنے کی توقع تھی۔ اس کے سامنے ایک سوٹ پوش مرد کھڑا تھا' غالباً یہ گاڑی کا مالک تھا۔ ٹریفک پولیس کے دو ایک سپاہی بھی نظر آ رہے تھے اور سامنے سے میں ایگل اسکواڈ کی گاڑی آتے ہوئے بھی دیکھ رہا تھا۔

ایک لمحے کو مجھے خیال آیا کہ میں جویریہ کے پاس پہنچ جاؤں اور اسے اس مصیبت سے نجات دلا دوں' یہ سوچ کر میں گاڑی کی اوٹ سے نکلا بھی لیکن پھر میری خودغرضانہ فطرت نے میرے پاؤں روک لیے۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ تمہاری آٹھویں محبت ہے اور کل تمہاری اس سے شادی ہونے جا رہی ہے لیکن تم اگر اسے بچانے کیلئے سامنے آئے تو پولیس تم سے اگلا پچھلا تمام کھایا پیا اگلوا لے گی۔ جانے تم کو کتنے مقدمات میں ملوث کر دیا جائے۔ تم جیل چلے گئے تو پھر یہ آٹھویں محبت رہے گی اور نہ وہ محبتیں رہیں گی جو نگار' شمع اور آسیہ کی صورت میں موجود ہیں۔ سب کچھ اجڑ جائے گا' یہ ساری محبتیں تمہارے دم سے ہیں۔ تم نہ رہے تو یہ محبتیں بھی نہ رہیں گی اور تم رہے تو زندگی پڑی ہے' یہ آٹھویں محبت کیا نویں دسویں محبتیں بھی تمہیں حاصل ہو جائیں گی لہٰذا یہاں سے راہ فرار اختیار کرو۔ جویریہ بے قصور ہے' پولیس اس کا کچھ نہ بگاڑ سکے گی' وہ چھوٹ جائے گی۔ نہ بھی چھوٹے تو تمہیں کیا تمہیں کیا غم ہے' جائے جہنم میں۔

ایگل اسکواڈ کی گاڑی رکتے ہی میں نے راہ فرار اختیار کی۔ واپس اس مقام پر آیا جہاں میں نے چوری کی گاڑی کھڑی کی تھی' وہ گاڑی میں نے وہاں سے اٹھائی اور سیدھی اپنے گھر کی راہ لی۔

اپنے گھر پہنچ کر میں نے سکون کا سانس لیا۔ اب محفوظ ہو گیا تھا۔ جویریہ کو میرے ٹھکانے کا علم نہ تھا' اسے تو صحیح طور پر یہ معلوم بھی نہ تھا کہ میں کون ہوں؟ وہ میری محبت میں ایسی گرفتار ہوئی تھی کہ کبھی اس نے میرے اندر کے جھوٹ کو گرفت میں لینے کی کوشش نہ کی تھی۔ میں نے اسے جو بتا دیا تھا اس پر اس نے یقین کر لیا تھا۔ میں پیسے والا آدمی تھا' سمارٹ تھا' غیر شادی شدہ تھا اور اس سے بے پناہ محبت کرتا تھا۔ بس اتنا اس کیلئے کافی تھا' میں اس سے بھی بڑا اداکار تھا۔

ویسے وہ کتنی بڑی پھنسی تھی' اس کا اندازہ اسے اب ہوا ہوگا۔ یوں بھول مجھ سے بھی ہوئی تھی' اگر میں گاڑی دیکھ کر لالچ میں نہ آتا تو جویریہ میرے ہاتھ سے کبھی نہ نکلتی۔ وہ اس معاملے میں تربیت یافتہ نہ تھی۔ شمع اور نگار اس معاملے میں بہت ٹرینڈ تھیں۔ ایسا کئی بار ہوا تھا کہ گاڑی اٹھانے کے بعد اور میرے جائے واردات پر پہنچنے سے پہلے ہی گاڑی کا مالک نمودار ہو گیا تھا لیکن وہ دونوں معاملے کو اس طرح سنبھالتی تھیں کہ مجھ پر آنچ بھی نہ آتی تھی۔

جویریہ کو تو میں نے کچھ بتایا ہی نہ تھا۔ مجھے معلوم ہے کہ کیا ہوا ہوگا۔ میرے وہاں سے نکلتے ہی گاڑی کا مالک آ گیا ہوگا۔ وہ اپنی گاڑی غائب دیکھ کر پریشان ہوا ہوگا۔ اس نے جویریہ سے بھی اپنی گاڑی کے بارے میں پوچھا ہوگا۔ جویریہ اس کی پریشانی دیکھ کر محفوظ ہوئی ہوگی اور اس نے بڑے سوکھے منہ سے گاڑی کے بارے میں کچھ بتانے سے انکار کر دیا ہوگا لیکن جب گاڑی کا مالک خاصا پریشان ہو گیا ہوگا اور اس نے پولیس والے کی تلاش شروع کی ہوگی تو جویریہ نے اسے بڑی رازداری سے بتا دیا ہوگا کہ یہ کام آپ کے دوست نے کیا ہے۔ گاڑی کا مالک یہ سن کر حیران رہ گیا ہوگا۔ اب گاڑی کے مالک کی نگاہوں میں جویریہ مشکوک ہو گئی ہوگی پھر میرا انتظار شروع ہوا ہوگا اور جب میں واپس نہیں پہنچا تو پولیس اسے تھانے لے گئی ہوگی۔ جویریہ کے ساتھ پولیس نے میری گاڑی پر بھی قبضہ کر لیا ہوگا۔

اپنی گاڑی کا خیال آتے ہی جیسے میری روح میں سناٹا اتر گیا۔ میں نے فوراً گھڑی دیکھی' اس واردات کو ہوئے تین چار گھنٹے گزر چکے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ میں جو خود کو خطرے سے باہر سمجھ رہا تھا' اب صحیح معنوں میں خطرے میں آ گیا تھا۔

اس وقت رات کے دس بج رہے تھے۔ شمع اور نگار ٹی وی دیکھ رہی تھیں۔ میں اپنے کمرے میں بیڈ پر لیٹا تھا۔ میں فوراً اٹھ بیٹھا اور گھبرا کر شمع اور نگار کو آواز دی۔

"ارے کیا ہوا۔ خیر تو ہے۔" وہ دونوں میری تھرائی ہوئی آواز سن کر پریشان ہو کر کمرے میں آئیں۔

"شمع' نگار خیریت نہیں ہے' میں فوراً یہاں سے نکل رہا ہوں' اگر پولیس آئے تو تم دونوں کہہ دینا کہ میں گھر میں نہیں آیا اور یہ کہ تمہیں نہیں معلوم میں کہاں ہوں' ویسے میں لاہور چلا جاؤں گا۔" میں نے جلدی جلدی انہیں بتایا۔

"لیکن کیوں؟" شمع نے پوچھا۔

"اری بے وقوف عورت' تجھے نہیں معلوم کہ گھر میں چوری کی گاڑی کھڑی ہے اور میری گاڑی پولیس کے قبضے میں ہے' میری گاڑی میں ڈرائیونگ لائسنس موجود ہے' اس میں اس گھر کا پتا لکھا ہے۔" میں نے جلدی جلدی لباس تبدیل کرتے ہوئے کہا۔

"لیکن تمہاری گاڑی ان کے قبضے میں کیسے آئی۔" شمع سوال پر سوال کیے جا رہی تھی اور مجھے اپنی جان کی پڑی ہوئی تھی۔ میں اسے کیا بتاتا کہ گاڑی کیسے پولیس کے قبضے میں آئی؟

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

میں نے اسے ڈانٹ کر کہا۔ ”شمع یہ وقت سوالات کا نہیں ہے‘ میں تمہیں ساری تفصیل بتا دوں گا‘ اس وقت مجھے جانے دو اور دیکھو گھبراؤ مت میں لاہور جاتے ہی تمہیں خط لکھوں گا۔“

خط لکھنا تو دور کی بات ہے‘ میرے لاہور جانے کی بھی نوبت نہ آئی۔ جب میں ٹکٹ کیلئے گاڑی سٹارٹ کر رہا تھا‘ اس وقت پولیس کی گاڑی میرے گھر کے دروازے تک پہنچ گئی تھی۔

پولیس کے ساتھ جویریہ تھی‘ ضرغام تھا‘ عرفان تھا‘ گاڑی کا مالک تھا اور ان کے سائے میں موجود تھا۔ چوری کی گاڑی موجود تھی۔

مجھے دیکھ کر ضرغام نے میرے اوپر ہاتھ اٹھانے کی کوشش کی۔ وہ بہت غصے میں تھا۔ میرے خیال میں جویریہ نے اسے سب کچھ بتا دیا ہوگا لیکن تھانے کے انچارج نے ضرغام کو روک لیا۔

”نہیں ضرغام صاحب‘ آپ ذرا صبر سے کام لیں‘ اس کام کیلئے ہم موجود ہیں‘ اس بندے کی تو ہمیں عرصے سے تلاش تھی‘ چل اوئے۔“

انسپکٹر نے مجھے جیپ کی طرف دھکا دیا۔ میں نے گاڑی میں چڑھتے ہوئے اپنے پیچھے اپنی بیویوں کو دیکھا‘ جویریہ کی طرف دیکھنے کی مجھے ہمت نہ ہوئی۔ شمع اور نگار سہمی ہوئی کھڑی تھیں۔ ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

میری بیویاں اگرچہ میرے جرم میں برابر کی شریک تھیں لیکن میں نے انہیں بچا لیا۔ اپنے بیان میں‘ میں نے ان کا کوئی تذکرہ نہ کیا۔ پولیس نے میرے ساتھ وہی کیا جو اس طرح کے مجرموں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ اس نے میرے کھاتے میں دوسروں کے جرم بھی ڈال دیئے‘ نہ صرف پولیس نے میرے جرائم کی فہرست طویل کر دی بلکہ وہ کام بھی کر دکھایا جس کا اطمینان اس نے ضرغام کو دلایا تھا۔ حوالات میں میرے ہاتھ پاؤں توڑ دیئے گئے۔ مناسب علاج نہ ہونے کے باعث میری ایک ٹانگ خراب ہو گئی جسے مجبوراً ڈاکٹروں نے کاٹ دیا۔ میرا سیدھا ہاتھ بظاہر بالکل ٹھیک تھا لیکن وہ بے جان ہو کر رہ گیا۔ اس ہاتھ کو میں ہلا جلا بھی نہیں سکتا تھا۔

مجھے پانچ سال کی قید بامشقت ہو گئی لیکن جیل حکام مجھ سے مشقت نہ لے سکے کیونکہ میں ایک ٹانگ اور ایک ہاتھ سے معذور ہو چکا تھا۔ میں اپنی کٹی ہوئی ٹانگ اور مفلوج ہاتھ کو دیکھ دیکھ کر روتا رہتا تھا۔ میری ہنستی مسکراتی زندگی فریاد بن کر رہ گئی تھی۔

میرے جیل میں آتے ہی میری محبت بھری زندگی بکھر کر رہ گئی تھی۔ سب سے پہلے نگار نے خود کو میری قید سے آزاد کیا‘ اس نے کوئی مالدار آسامی تلاش کر لی اور اس کے ساتھ چلی گئی۔ لاہور والی آسیہ کو شمع نے خط لکھ کر میرے بارے میں بتا دیا تھا۔ پانچ سال تک میرا انتظار کرنا اس کے بس کا نہ تھا۔ اس نے بھی اپنے لیے دوسرا ٹھکانہ ڈھونڈ لیا۔ رہ گئی شمع تو اس نے بہت کوشش کی‘ میرا ساتھ نبھانے کی لیکن اکیلی عورت کا اس معاشرے میں زندگی گزارنا کس قدر مشکل ہے یہ مجھے شمع کے خطوں سے اندازہ ہوا۔ بالآخر شمع بھی شکست کھا گئی۔ اس نے اپنے آخری خط میں لکھا۔

”میں اپنے ٹھکانے پر واپس جا رہی ہوں‘ قید سے چھوٹو تو ملنے ضرور آنا۔“

جیل سے چھوٹا تو میں اس سے ملنے نہ جا سکا۔ بغل میں بیساکھی دبائے میں اس سے کیا ملنے جاتا۔ میں اب اس قابل کہاں رہا تھا کہ اس سے ملتا۔ اس سے مل کر میں اسے کیا دیتا۔ آنسو..... آنسو تو اس کی زندگی میں پہلے ہی میں نے بھر دیئے تھے۔

جیل میں رہ کر میری جسمانی حالت تو تباہ تھی ہی‘ ذہنی حالت میں پراگندہ ہو گئی تھی۔ باہر آ کر میں ایک دیوار کے سائے میں بیٹھ گیا۔ کٹی ہوئی ٹانگ‘ بڑھی ہوئی داڑھی‘ مفلوج ہاتھ‘ زمین پر بیٹھا ہوا آدمی‘ مجھے لوگوں نے بھکاری سمجھ لیا۔ میرے سامنے سکے گرنے لگے اور میں کسی سے نہ کہہ سکا کہ میں بھکاری نہیں ہوں‘ میری زبان گنگ ہو گئی۔ شاید یہی میرے اعمالوں کی سزا تھی۔

میں آج بھی ایک دیوار کے سائے میں بیٹھا ہوں اور میں جس دیوار کے سائے میں بیٹھا ہوں‘ یہ ایک کالج کی دیوار ہے۔ ایک سزا یافتہ مجرم اس دیوار کا سہارا لیے ہوئے ہے جس کے پیچھے قانون پڑھایا جاتا ہے۔

ایک دن شام کو میں نے اس کالج کے گیٹ پر صادقہ کو دیکھا۔ وہ شاید کسی پروفیسر کے ساتھ تھی۔ گلابی ساڑی میں وہ بہت پیاری لگ رہی تھی اور بہت خوش تھی۔ وہ دونوں میرے سامنے سے باتیں کرتے گزر گئے۔ آگے جا کر انہوں نے ایک ٹیکسی پکڑی اور دونوں اس میں بیٹھ کر چلے گئے۔

ایک وقت تھا کہ میں نے صادقہ کو بھکاری کے روپ میں دیکھا تھا اور میں اسے اس روپ میں دیکھ کر فوراً واپس آیا تھا تاکہ اس سے معلوم کروں کہ اس پر کیا بیتی؟ ایک یہ وقت تھا کہ اب میں اس کے سامنے بھکاری کے روپ میں بیٹھا تھا لیکن اس نے مجھ پر نظر بھی نہ ڈالی تھی۔

اور میرے خیال میں یہ اچھا ہی ہوا تھا۔ میں نے خود اسے دیکھ کر منہ پھیر لیا تھا‘ میں نہیں چاہتا تھا کہ اس کے سامنے جائے عبرت بنوں۔

یہ زندگی بھی عجیب تماشا ہے‘ کیسے کیسے کھیل دکھاتی ہے‘ کیسے کیسے رنگ سامنے آتے ہیں؟ صادقہ کی زندگی میرے لیے معمہ بن گئی تھی۔ ویسے صادقہ کو اس نئے روپ میں دیکھ کر مجھے بالکل خوشی نہ ہوئی تھی۔

اگر صادقہ مجھے بھکارن کے روپ میں ملی ہوتی تو کتنا اچھا ہوتا‘ اس طرح مجھے میرے معیار کی ایک عدد بیوی تو میسر آ جاتی۔ بیوی کے بغیر میں کس قدر تنہا ہوں۔

☆.....☆.....☆

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

توبہ

آج صبح ہی سے میرے دل پر دھواں سا چھایا تھا۔ کچھ عجیب سی کیفیت تھی۔ دل میں ایک بوجھ سا تھا۔ میرے اندر دور تک ایک سناٹا اترا ہوا تھا۔ اس سناٹے میں گھٹی گھٹی سی چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔ ایک بے چینی سی تھی' الجھن سی تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کچھ ہونے والا ہے۔

میں صبح جلد اٹھنے کا عادی ہوں۔ مؤذن کی صدا پر آنکھ کھل جاتی ہے۔ فجر کی نماز پڑھ کر میں آفتاب بینی کے لیے بیٹھ جاتا ہوں۔ اس سے فارغ ہو کر میں چائے بناتا ہوں۔ اتنے میں اخبار میرے گھر کی چاردیواری میں آ کر گرتا ہے' تب میں اخبار بینی کے لیے بیٹھ جاتا ہوں۔ اخبار پڑھتا جاتا ہوں اور چائے پیتا جاتا ہوں۔ چائے میں گھونٹ گھونٹ کر کے پیتا ہوں۔ چائے چار پانچ منٹ میں ختم ہو جاتی ہے' لیکن اخبار ختم نہیں ہوتا۔

آج نماز میں بھی دل نہیں لگا اور اب اخبار میں بھی کوئی کشش محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ نظریں اخبار پر تھیں لیکن کیا پڑھ رہا تھا' یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ البتہ سیٹھ نبی بخش کے اغوا کی خبر میں نے ضرور دلچسپی سے پڑھی تھی۔ ایسی خبریں میں بڑے غور سے پڑھتا تھا۔ ان خبروں سے میرے اندر کہانیاں جنم لیتی تھیں۔

سیٹھ نبی بخش فجر کی نماز پڑھنے مسجد میں جا رہے تھے کہ ایک گاڑی ان کے نزدیک رکی۔ اس میں سے دو تین آدمی اتر کر باہر آئے اور نبی بخش کو زبردستی گاڑی میں ڈال کر لے گئے۔

اس خبر کو پڑھ کر میں نے اخبار میز پر ڈال دیا اور ٹانگیں پھیلا کر پورے اطمینان سے آنکھیں بند کر لیں۔ میں کچھ سوچنا چاہ رہا تھا' لیکن دل کی کیفیت کچھ عجیب سی تھی' دھواں سا چھایا تھا' تب میں اغوا کی خبر بھول کر یہ سوچنے لگا کہ میں بے چین کیوں ہوں؟

ابھی میں اس کیفیت کا جائزہ لے ہی رہا تھا کہ گھر کی گھنٹی بجی۔ اس گھنٹی کی آواز نے بیگم کی بھی آنکھیں کھول دیں۔ انہوں نے بیڈ پر لیٹے لیٹے آواز لگائی "اجی! سنتے ہو؟"

"ہاں' سنتا ہوں' بہرا نہیں ہوں میں۔" میں نے ذرا مترنم ہو کر جواب دیا۔

"یہ صبح ہی صبح کون آ گیا دروازے پر؟"۔ انہوں نے پوچھا۔

"سسرال سے آیا ہوگا کوئی یا پھر کوئی فقیر ہوگا"۔ میں نے تیر چھوڑا۔

"کیا اصل میں دونوں ایک ہیں؟" ادھر سے وضاحت چاہی گئی۔

"ہاں' موت سے پہلے آدمی ان سے نجات پائے کیوں"۔ میں نے ہنس کر وضاحت کی۔

اتنے میں ایک مرتبہ گھنٹی اور بجی۔

"جاؤ' دیکھو تو"۔ ادھر سے حکم ملا۔

"دیکھتا ہوں بابا..... دیکھتا ہوں"۔ بالآخر مجھے اٹھنا ہی پڑا۔

میں بڑے اطمینان سے کرسی سے اٹھا۔ زینہ اترتے اترتے اس بے صبرے نے گھنٹی کے بٹن پر ایک مرتبہ اور انگلی رکھ دی۔ لیکن میں نے بالکل عجلت نہ برتی۔ مجھے معلوم تھا کہ سسرال سے آنے والا یا مانگنے والا اتنی آسانی سے واپس جانے والا نہیں۔

جب میں نے دروازہ کھولا تو میرا قیاس دھواں بن کر ہوا میں تحلیل ہو گیا۔

میرے سامنے ایک خوش پوش نوجوان کھڑا تھا اور یہ سسرال والا تھا نہ مانگنے والا۔

"سر! آپ کا نام اخلاق احمد ہے"۔ اس نے بڑے ادب سے پوچھا۔

"جی ہاں' میں اخلاق ہوں"۔

"سر وہ گلی کے موڑ پر ایک گاڑی کھڑی ہے' وہ آپ کو بلا رہے ہیں"۔

"مجھے بلا رہے ہیں؟" میں نے تصدیق چاہی۔

"ہاں جی' وہ آپ کو بلا رہے ہیں"۔

"وہ کون؟"

"سیٹھ اکرم"۔

"سیٹھ اکرم..... لیکن میں کسی سیٹھ اکرم سے واقف نہیں"۔

"وہ آپ کو بہت اچھی طرح جانتے ہیں' اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو ذرا چل کر بات کر لیں"۔ اس نوجوان نے انتہائی شائستگی سے کہا۔

"اچھا ٹھیک ہے' چلو"۔ میں فوراً اس نوجوان کے ساتھ ہو لیا۔

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کون سیٹھ صاحب مجھ سے ملنے آ گئے۔ میری دوستی کسی سیٹھ سے نہ تھی۔ میں متوسط طبقے کا آدمی تھا اور اپنے جیسے لوگوں سے تعلقات رکھتا تھا' یہ سیٹھ اکرم کون تھے اور مجھ سے کیسے واقف تھے' یہی سوچتا میں چلا جا رہا تھا کہ گلی کے موڑ پر مجھے ایک شاندار گاڑی کھڑی دکھائی دی۔

میں گاڑی کے نزدیک پہنچا تو پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے ایک سوٹ پوش شخص نے مجھے مسکرا کر دیکھا۔ میرے ساتھ آنے والے نوجوان نے تیزی سے آگے بڑھ کر گاڑی کا پچھلا

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

دروازہ کھولا جیسے میں کوئی وی آئی پی ہوں۔

"سر' اخلاق صاحب"۔ اس نوجوان نے میرے بارے میں بتایا۔

"آیئے اخلاق صاحب!" اس شخص نے مجھے گاڑی میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"آپ مجھ سے ملنا چاہتے تھے؟"

"آپ گاڑی میں آ جائیں پھر بیٹھ کر بات کرتے ہیں"۔

"میں نے آپ کو پہچانا نہیں"۔

"پہچان جائیں گے' آپ اندر تو تشریف لائیں"۔ اس سوٹ پوش شخص نے بڑی ملائمت سے کہا۔

ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ کیا کروں۔ گاڑی میں بیٹھوں یا سوال جواب کروں۔ اتنے میں اس شخص نے اپنے کوٹ کی جیب سے ہاتھ باہر نکالا اور مجھے دیکھ کر بہت پیار سے مسکرایا اور بولا۔

"پلیز' اخلاق صاحب! اندر آ جائیں"۔

اس شخص کے ہاتھ میں ریوالور تھا اور میں اس ریوالور سے محض دو تین فٹ کے فاصلے پر تھا۔

مجھے بادل ناخواستہ گاڑی میں سوار ہونا پڑا' کیونکہ مجھے پیچھے سے بھی دھکیلا گیا تھا۔ اگرچہ یہ دھکا بھی بڑی شائستگی سے دیا گیا تھا' جیسے میں شیشے کا برتن ہوں' کہیں ٹوٹ نہ جاؤں۔

گلی سنسان پڑی تھی' اگر سنسان نہ بھی ہوتی تو بھی کوئی فرق نہ پڑتا مجھے اغوا ہونے سے کوئی نہیں بچا سکتا تھا۔

میرے گاڑی میں بیٹھنے کے بعد گاڑی چل پڑی۔

اب مجھے معلوم ہوا کہ صبح سے میرا دل دھواں دھواں کیوں ہو رہا تھا۔ دل پر کیسا بوجھ تھا۔ میرے اندر دور تک کیسا سناٹا طاری تھا۔ کچھ الجھن سی تھی' کچھ ہونے والا تھا' جو ہونے والا تھا' وہ ہو گیا تھا اور جو ہوا تھا' وہ میری سمجھ سے بالاتر تھا۔

"سر' مجھے کچھ کہنے کی اجازت ہے؟" میں نے اس سوٹ پوش شخص سے پوچھا۔

"جی' فرمایئے"۔ اس نے بڑی شائستگی سے کہا۔ اس کی اس شائستگی پر فوراً میرا مرنے کو جی چاہا۔

"آپ سیٹھ اکرم ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"جی' نہیں۔ میں ان کا ایک ادنیٰ سا ملازم ہوں"۔ اس نے مسکرا کر کہا۔

"میرا نام اخلاق احمد ہے' یہ تو آپ کو معلوم ہے؟" میں نے تصدیق چاہی۔

"جی ہاں' معلوم ہے تبھی تو آپ ہمارے ساتھ ہیں"۔ اس نے کہا۔

"پھر آپ کو یہ بھی معلوم ہو گا کہ میں کیا کام کرتا ہوں"۔ میں نے مزید وضاحت چاہی۔

"ہاں جی' یہ بھی معلوم ہے' یہ معلوم نہ ہوتا تو ہم آپ کو کیوں زحمت دیتے"۔

"سر' آپ کو ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے' میں کوئی سیٹھ قسم کی چیز نہیں ہوں۔ آپ اغوا کر کے میرے لواحقین سے کوئی تاوان وصول نہ کر سکیں گے' اور میرے لواحقین میں ہے ہی کون؟ ایک عدد بیوی' اسے جب معلوم ہو گا کہ میں اغوا ہو گیا ہوں تو وہ خوش ہو گی' چلو جان چھٹی"۔

میری بات سن کر وہ شخص بے اختیار مسکرا اٹھا۔ اپنی چمکتی آنکھوں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا"۔ آپ بہت دلچسپ آدمی ہیں اخلاق صاحب"۔

"سر.....!" میں نے کچھ کہنا چاہا لیکن اس نے میری بات کاٹ دی۔

"اخلاق صاحب! مجھے سر نہ کہیں میں نے عرض کیا نا کہ میں سیٹھ اکرم کا ادنیٰ سا ملازم ہوں' میں آپ کا دوست ہوں"۔

"کوٹ کی جیب میں ریوالور رکھنے والا میرا دوست کیسے ہو سکتا ہے؟"۔

"اس گستاخی کے لیے میں معافی چاہتا ہوں' آئندہ میں اس کی نمائش ہرگز نہیں کروں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے"۔

"آپ کا نام کیا ہے؟"

"میرا نام سلامت خان ہے"۔

"بھائی سلامت! آپ بتا سکتے ہیں کہ آپ مجھے کہاں لیے جا رہے ہیں؟"۔

"جی ہاں' کیوں نہیں۔ آپ کو سیٹھ اکرم کے پاس لے جایا جا رہا ہے"۔

میں کسی سیٹھ اکرم سے واقف نہ تھا۔ یہ شہر سیٹھوں سے بھرا پڑا تھا۔ میں کس کس سے واقف ہوتا۔ پھر نہ میں بزنس مین تھا' نہ ہی میرا تعلق اعلیٰ طبقے سے تھا۔ جہاں میں تھا' وہاں سیٹھوں سے واقفیت اخباروں کے ذریعے ہو سکتی تھی اور اخبار میں' میں نے آج تک کسی سیٹھ اکرم کا نام نہ پڑھا تھا۔

"سیٹھ اکرم کون ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ارے آپ نہیں جانتے! وہ اس شہر کا سب سے بڑا کیمیا گر ہے"۔

"کیمیا گر؟" میں نے سوالیہ انداز میں دہرایا۔

"جی ہاں' وہ جس چیز کو ہاتھ لگا دے' وہ سونے کی ہو جاتی ہے۔ وہ اس شہر کا ذہین ترین آدمی ہے۔ ایسے ایسے فارمولے ایجاد کرتا ہے کہ لوگ حیرت زدہ رہ جاتے ہیں"۔

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

"بھائی' وہ کوئی سائنس دان قسم کی چیز ہیں' انہوں نے کوئی خفیہ لیبارٹری وغیرہ قائم کر رکھی ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"آپ پریشان نہ ہوں"۔ اس نے میری بگڑی صورت دیکھ کر مجھے تسلی دی۔

"ارے' پریشان کیسے نہ ہوں' مجھے سوئے مقتل لے جاتے ہو اور کہتے ہو' پریشان نہ ہو۔ بھائی سلامت! مجھے سائنسی تجربات کے لیے تو استعمال نہیں کیا جائے گا۔ میں خوفزدہ ہو رہا ہوں۔ بھائی' میں دبلا پتلا آدمی ہوں۔ مجھ میں تو زیادہ خون بھی نہیں ہے۔ اس کام کے لیے ذرا کسی موٹے آدمی کو پکڑا ہوتا"۔

میری بات سن کر وہ زور سے ہنس پڑا"۔ اخلاق صاحب! آپ بھی خوب آدمی ہیں"۔

"بھائی سلامت! اس وقت مجھے اپنی تعریف نہیں' وضاحت چاہیے' آخر مجھے کس لیے اغوا کیا گیا ہے؟"۔

"اخلاق صاحب! آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے' میں آپ کو کسی لیبارٹری میں نہیں لے جا رہا' جہاں آپ پر خدانخواستہ تجربات کیے جائیں' میں تو سیٹھ اکرم کی بات کر رہا ہوں کہ وہ زبردست فارمولے ایجاد کرتے ہیں' انہی فارمولوں میں سے ایک فارمولا آپ بھی ہیں"۔

"بھائی' میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔ شاید میرے دماغ پر اثر ہو گیا ہے یا آپ جان بوجھ کر مجھے الجھا رہے ہیں"۔ میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "میں بھلا کس چیز کا فارمولا ہوں؟"

"دولت بنانے کا"۔ سلامت خان نے بے اختیار کہا۔

"ہیں"! میں نے اسے چونک کر دیکھا۔

"ہاں"۔ اس نے آنکھیں پھیلا کر مجھے دیکھا۔

"اب مجھے پکا یقین ہو گیا ہے کہ آپ لوگوں کو ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے' اگر میرے پاس کوئی ایسا فارمولا ہوتا تو میں کب کی اپنے لیے دولت بنا چکا ہوتا"۔

"ہیرے کی قدر دراصل جوہری جانتا ہے یا وہ ہاتھ جانتے ہیں جو اسے تراشتے ہیں۔ ہیرے بے چارے کو اپنی قدر و قیمت کا کچھ اندازہ نہیں ہوتا' وہ خود کو بتھر ہی سمجھتا ہے"۔

"بھائی سلامت! کچھ پڑھے لکھے بھی ہو؟" میں نے پوچھا۔

"بس اخلاق صاحب! آپ جیسے لوگوں کی صحبت میں بیٹھ کر کچھ بولنا آ گیا ہے' ورنہ اپنی تعلیم تو واجبی سی ہے"۔

"بھائی سلامت! خدا کے واسطے مجھے سچ سچ بتاؤ کہ معاملہ کیا ہے؟ میری بیوی بہت پریشان ہو رہی ہو گی"۔ میں پھر اصل موضوع پر آ گیا۔

"اخلاق صاحب! سوری' اس سے زیادہ میں آپ کو کچھ نہیں بتا سکتا' میری حد مقرر

ہے' اس حد کو توڑا تو میرے پر جلنے لگیں گے"۔ اس نے پھر مجھے ادب کی مار ماری۔

"اچھا بھائی' تم اپنے پر نہ جلاؤ' میں صبر کیے لیتا ہوں"۔ میں نے کہا۔

پھر میں نے واقعی صبر کر لیا۔ ایک غریب آدمی کے پاس صبر سے بڑھ کر کوئی ہتھیار نہیں ہوتا۔ میں نے خاموشی اختیار کر لی کہ خاموشی صبر کا دوسرا نام ہے۔

اس شہر میں آئے دن اغوا کی وارداتیں ہوتی رہتی تھیں' لیکن اغوا کی ایسی شریفانہ واردات میری نظر سے آج تک نہیں گزری تھی۔ ایسا مہذبانہ رویہ' ایسی مؤدبانہ گفتگو' اتنا احترام' آخر یہ سب کیا تھا۔ میرا دماغ چکرا رہا تھا۔

سلامت خان کی گفتگو سے اتنا اندازہ تو ہو گیا تھا کہ مجھے کسی غلط فہمی کے نتیجے میں اغوا نہیں کیا گیا بلکہ سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ایسا کیا گیا تھا' لیکن باوجود کوشش کے میں اب تک یہ اندازہ نہ کر پایا تھا کہ اغوا کرنے والے مجھ سے کیا کام لینا چاہتے تھے۔ ایک متوسط طبقے کا آدمی سیٹھ اکرم کے بھلا کیا کام آ سکتا تھا۔

بقول سلامت خان' میں کوئی ہیرا تھا۔ اگر یہ بات اغوا سے پہلے میری بیوی کو معلوم ہو جاتی تو وہ میرا کب کا سودا کر چکی ہوتی۔ اس کی پوری زندگی مجھے یہ سمجھاتے ہوئے گزر گئی تھی" خدا کے واسطے کوئی ڈھنگ کا کام کرو' کن خرافات میں پڑے ہو"۔

وہ جس چیز کو خرافات سمجھتی تھی' میں اسے اعلیٰ و ارفع کام سمجھتا تھا اور سمجھتا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے آج تک اس کی بات پر کان نہیں دھرے۔ اب سوچتا ہوں' اگر اس کی بات پر کان دھر لیے ہوتے اور کوئی ڈھنگ کا کام اپنا لیا ہوتا تو شاید اس اغوا کی نوبت نہ آتی۔

میں ابھی انہی خیالات میں الجھا ہوا تھا کہ ہماری گاڑی شہر کے ایک بڑے ہوٹل کے گیٹ میں داخل ہوئی۔

گاڑی سے اترتے ہوئے سلامت خان نے کہا۔" اخلاق صاحب! آپ سمجھ دار آدمی ہیں۔ یہاں ذرا سمجھ داری کا ثبوت دیجیے گا۔ کوئی ایسا کام نہ کیجیے گا کہ مجھے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالنا پڑے"۔

میں واقعی سمجھ دار آدمی تھا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ میں نے فرمانبرداری سے اثبات میں گردن ہلائی۔" جی' بہتر"۔

"اس ہوٹل میں ہمارے پاس ایک کمرا ہے' وہاں بیٹھ کر چائے پیتے ہیں' ابھی آپ نے ناشتا بھی نہیں کیا ہو گا' آپ ناشتا کر لیں پھر جیسے ہدایت ملے گی' ویسا کریں گے"۔

میں نے اس سے یہ نہ پوچھا کہ اسے ہدایت کہاں سے ملے گی' کیسے ملے گی۔ اس سے یہ پوچھنا بے کار ہی تھا' وہ بھلا کہاں بتاتا۔ ویسے مجھے یہ معلوم تھا کہ بس اللہ ہی اسے نیک

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہدایت کرسکتا ہے۔

اس بڑے ہوٹل کا کمرا دیکھ کر میری آنکھیں چکا چوند ہوگئیں۔ اس کی ہر چیز دیکھنے والی تھی۔ میں نے کمرے کا بڑی تنقیدی نظر سے جائزہ لیا۔ سوچا' اس اغوا کا کوئی مثبت پہلو تو نکلا۔ میں نے اسی بہانے اس ہوٹل کے کمرے کو دیکھ لیا' ورنہ ایسی جگہوں پر ایک غریب آدمی کا گزر کہاں؟

ناشتے کے بعد سلامت خان نے مجھ سے جانے کی اجازت چاہی' بولا۔ "اخلاق صاحب! اب آپ یہاں کچھ دیر آرام کریں' میں ذرا باہر جا رہا ہوں' کمرا باہر سے بند کر جاؤں گا۔ امید ہے' آپ ہوٹل کی انتظامیہ کو پریشان کرنے کی کوشش نہیں کریں گے۔ ویسے یہ لڑکا یہاں رہے گا' آپ کی خدمت میں۔ یہ مارشل آرٹ کا ماہر ہے۔ اس کا اتنا ہی تعارف کافی ہے"۔

"بھائی سلامت! آپ کو گفتگو کا خوب سلیقہ ہے' سخت سے سخت بات بھی اتنے نرم و ملائم لہجے میں کہتے ہو کہ آدمی غصہ کرنا چاہے بھی تو نہیں کرسکتا۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ویسے آپ کہاں جا رہے ہیں' یہ بتانا پسند کریں گے؟"

"میں ہدایت لینے جا رہا ہوں۔" سلامت خان نے کہا اور دروازے کی طرف بڑھا۔

پھر مجھے دروازہ کھلنے' بند ہونے اور دروازے میں چابی گھومنے کی آواز آئی اور پھر سناٹا طاری ہوگیا۔

میں نے اس لڑکے کی طرف مسکرا کر دیکھا۔ یہ وہی نوجوان تھا جس نے مجھے گھر سے بلایا تھا۔ اسی نوجوان نے مجھے گاڑی میں دھکا دیا تھا اور پھر اس نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی تھی۔ اس لڑکے کی عمر چوبیس پچیس سال رہی ہوگی۔ یہ عمر ابھی پڑھنے لکھنے کی تھی' اپنا مستقبل سنوارنے کی تھی۔ یہ عمر جرائم کی دنیا میں آنے کی ہرگز نہ تھی۔ یہ نوجوان مجھے اپنے رکھ رکھاؤ اور شکل وصورت کے اعتبار سے کسی اچھے گھرانے کا چشم و چراغ معلوم ہو رہا تھا۔

سلامت خان کے جانے کے بعد' وہ ابھی تک کھڑا تھا۔ شاید میری اجازت کا منتظر تھا۔ اس بات کا خیال آتے ہی' میں نے فوراً کہا۔ "صاحبزادے' آپ تشریف رکھیں۔"

"جی سر' تھینک یو۔" وہ اپنا ایک ہاتھ سینے پر رکھ کر ذرا سا مؤدبانہ جھکا اور پھر صوفے پر بیٹھ گیا۔

میں خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ اس کی نظریں سامنے دیوار پر تھیں۔

"صاحبزادے' آپ کا نام کیا ہے؟" میں نے خاموشی توڑی۔

"عاشق۔" اس نے بڑے ادب سے جواب دیا۔

"میاں' میں نے آپ کا پیشہ نہیں' نام پوچھا ہے۔" میں نے بے تکلفی سے کہا۔

"سر میرا نام عاشق ہی ہے' عاشق حسین۔" اس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"پڑھتے ہو؟" میں نے سوال کیا۔ "کس کلاس میں؟"

"پڑھتا تھا' چھوڑ دیا' انٹر کرکے۔"

"سلامت خان سے تمہارا کیا رشتہ ہے؟"

"کوئی رشتہ نہیں' میں صاحب کا باڈی گارڈ ہوں۔"

"سلامت خان کے محافظ ہو۔" میں نے کہا "لیکن سلامت خان کو حفاظت کی کیا ضرورت ہے' میرا مطلب ہے' ان کے دشمن وغیرہ بہت ہیں کیا؟"

"یہ سوال آپ براہ راست ان سے کریں سر۔" عاشق حسین نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"اچھا ٹھیک ہے۔ میں آپ سے وہ سوال تو کرسکتا ہوں جن کا تعلق آپ سے ہے۔"

"جی سر' ضرور۔" اس نے کہا۔

"آپ نے جب میرے گھر کی گھنٹی بجائی تھی تو مجھ سے کہا تھا کہ سیٹھ اکرم آپ کو بلاتے ہیں لیکن گاڑی میں تو سیٹھ اکرم نہیں تھے' کیا ایسا تو نہیں کہ سلامت خان ہی سیٹھ اکرم ہیں؟"

"جی نہیں سر' سلامت خان صاحب' سیٹھ اکرم نہیں ہیں۔" اس نے جواب دیا۔

"پھر آپ نے غلط بیانی سے کیوں کام لیا؟" میں نے اسے ٹوکا۔

"مجھے یہی ہدایت کی گئی تھی۔" اس نے بتایا۔

"بھائی' اس ہدایت نے مجھے بہت پریشان کر رکھا ہے۔ ایک طرف سلامت خان کہیں سے ہدایت لینے گئے ہیں۔ دوسری طرف سے تم کسی کی ہدایت کاری میں اپنا کردار ادا کر رہے ہو۔ عاشق حسین' یہ چکر میری سمجھ میں نہیں آ رہا۔ بھائی' اس پر کچھ روشنی ڈالو' مجھے آخر کیوں اغوا کیا گیا ہے؟" میں نے بڑی مسکین صورت بنا کر کہا۔

"سر' مجھے کچھ نہیں معلوم' یہ سوال بھی آپ براہ راست صاحب سے کریں۔"

"اچھا بھائی۔" میں نے گہرا اور ٹھنڈا سانس لیا۔

"عاشق حسین! تم اس گروہ میں کب سے شامل ہو؟" کچھ دیر خاموش رہ کر میں پھر بولا۔

"گروہ سے کیا مراد ہے آپ کی؟" اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"سلامت خان صاحب' اس شہر کی ایک بہت بڑی فرم کے ڈائریکٹر ہیں جو امپورٹ' ایکسپورٹ کا کام کرتی ہے۔"

"اچھا!" میں نے حیرت سے آنکھیں پھیلائیں۔ "اور سیٹھ اکرم؟"

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

"وہ اس فرم کے مالک ہیں۔" عاشق حسین نے بتایا۔

"کیا تم نے کبھی سیٹھ اکرم کو دیکھا ہے؟"

"جی نہیں۔"

"کیوں' وہ دفتر نہیں آتے کیا؟"

"جی نہیں' وہ دفتر نہیں آتے' انہیں بہت کم لوگوں نے دیکھا ہے۔" اس نے بتایا۔

"عاشق حسین' کیا تمہیں احساس ہے کہ تم کن لوگوں میں پھنسے ہوئے ہو؟"

"جی ہاں۔" اس نے مسکرا کر اثبات میں گردن ہلائی۔

"کن لوگوں میں؟" میں نے پوچھا۔

"بہت اچھے لوگوں میں۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

"کیا تم نہیں جانتے کہ مجھے اغوا کیا گیا ہے' کیا اغوا کرنے والے بھی کبھی اچھے ہوتے ہیں۔"

"یہ ٹھیک ہے کہ آپ کو گھر سے آپ کی مرضی کے خلاف لایا گیا ہے لیکن آپ ذرا یہ سوچیں' آپ کو جس عزت و احترام کے ساتھ لایا گیا ہے' کیا اغوا شدہ شخص کو اسی عزت و احترام کے ساتھ لایا جاتا ہے؟ آپ اچھی طرح جانتے ہوں گے کہ اغوا کرنے والے ہمیشہ اندھے اور بہرے ہوتے ہیں۔ وہ کچھ نہیں دیکھتے اور کچھ نہیں سنتے' بس ان کے ہاتھ چلتے ہیں یا زبان چلتی ہے جبکہ ہم لوگ آپ کے سامنے اندھے ہیں نہ بہرے بلکہ گونگے ہیں اور مفلوج بھی۔"

"میری پریشانی کی اصل وجہ یہی ہے کہ مجھے اغوا تو کیا گیا ہے لیکن برتاؤ میرے ساتھ اعلیٰ شخصیت جیسا ہے' آخر ایسا کیوں ہے؟ میں یہی جاننا چاہتا ہوں۔"

میرا خیال تھا کہ میں عاشق حسین کو باتوں میں لگا کر اس کی زبان سے کچھ نہ کچھ اگلوالوں گا لیکن ایسا ہو نہ سکا۔ میں اس سے بات کرتا رہا' وہ بڑے اطمینان سے ہر بات کا جواب دیتا رہا۔ اس کا ہر جواب مجھے روشنی میں لانے کے بجائے اندھیروں میں بھٹکاتا رہا۔ وہ اپنی عمر کے مقابلے میں بڑے پختہ ذہن کا مالک تھا۔ میں جسے کچا سمجھا تھا' وہ بڑا پکا نکلا۔

اس سے مایوس ہو کر میں نے خاموشی اختیار کر لی اور نرم ملائم بیڈ پر آرام سے پاؤں پھیلا کر لیٹ گیا اور انتظار کرنے لگا۔

ابھی کچھ دیر ہی گزری تھی کہ دروازے میں چابی لگانے کی آواز آئی پھر دروازہ کھلا اور سلامت خان مسکراتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔

"کہیے اخلاق صاحب! آپ کو کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی؟"

"جی نہیں۔" میں نے عاشق حسین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں' میں جانتا تھا کہ عاشق حسین کی موجودگی میں آپ کو کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔"

سلامت خان نے مجھے گہری نظروں سے دیکھا۔

میں اس کی بات کا مطلب بالکل نہ سمجھا۔ میں نے وضاحت چاہنے کے لئے لب کھولے ہی تھے کہ اس نے اپنے بریف کیس سے ایک سادہ کاغذ نکال کر میرے سامنے رکھا اور میرے ہاتھ میں قلم دیتا ہوا بولا۔ "اخلاق صاحب' لکھیں۔"

"کیا لکھوں؟" میں نے اسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔ "طلاق لکھوں یا جائداد لکھوں' آخر کیا لکھوں؟"

"ہم جانتے ہیں کہ آپ کے پاس جائداد نام کی کوئی چیز نہیں' آپ کی بیگم ہمارے لئے قابل احترام ہیں لہٰذا طلاق کا بھی مسئلہ نہیں' آپ وہ لکھیں جو میں لکھواتا ہوں۔"

"جی فرمائیں۔" میں نے بڑی سعادت مندی سے کاغذ' قلم سنبھال لیا۔

"میں جنت میں ہوں۔" سلامت خان نے لکھوانا شروع کیا۔

"بڑی ماڈرن جنت ہے۔" میں نے کمرے کی دیواروں پر نظر ڈالتے ہوئے لکھا۔

"میں جنت میں ہوں۔"

میری بات سن کر وہ صرف مسکرایا اور بولا۔ "میں جنت میں ہوں' اور خوش ہوں' تم بھی خوش رہنا' تمہاری نگرانی کے لئے فرشتے مامور کر دیے گئے ہیں۔"

میں نے اس کے بولے ہوئے جملے لکھ کر اس کی طرف دیکھا۔ "اور.....؟"

"بس' اس کے نیچے اپنے دستخط کر دیں۔"

میں نے اس کاغذ پر بلا جھجک اپنے دستخط کر دیے اور کاغذ اس کی طرف بڑھاتا ہوا بولا۔ "سلامت صاحب۔" اس کا کیا مطلب ہے؟"

سلامت خان نے وہ کاغذ میرے ہاتھ سے لے لیا۔ اس نے بغیر کچھ جواب دیے وہ کاغذ تہ کر کے لفافے میں بند کیا' لفافہ جیب میں رکھا اور عاشق حسین کو باہر چلنے کا اشارہ کیا۔

عاشق حسین کے ساتھ وہ خود بھی باہر چلا گیا۔ دروازہ بند ہو گیا' لیکن تالے میں چابی لگانے کی آواز نہ آئی۔ اس سے میں نے اندازہ کیا کہ وہ دونوں دروازے پر ہی کھڑے ہو کر بات کر رہے ہیں۔

ایک دو منٹ بعد دروازہ کھلا۔ سلامت خان اندر آیا مگر عاشق حسین جا چکا تھا۔

"اب آپ مطمئن ہو جائیں۔" سلامت خان نے اطمینان سے بیٹھتے ہوئے کہا۔

"کس بات سے؟" میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔

"میں نے آپ کا پیغام آپ کی بیگم کے نام بھجوا دیا ہے۔"

urdunovelist.blogspot.com

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

"اچھا تو وہ پرچہ آپ نے میری بیوی کے لیے لکھوایا تھا؟" میں نے کہا۔

"تو آپ کیا سمجھے؟" وہ بولا۔

"میری سمجھ میں تو آج کچھ نہیں آرہا۔ آپ سے پوچھتا ہوں تو بتاتے نہیں' لہٰذا میں نے بغیر سمجھے ہی آپ نے جو کہا' لکھ دیا لیکن اس طرح کا خط بھیج کر آپ نے غلطی کی ہے۔"

"آپ پریشان تھے نا کہ آپ کی بیگم پریشان ہوں گی' ان کے اطمینان کے لئے آپ کی تحریر بھیج دی ہے۔ باقی میں نے عاشق حسین کو سمجھا دیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اب آپ کو اپنی بیگم کی طرف سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں' کافی پیئیں گے؟"

"کافی تو میں ضرور پیوں گا۔" میں نے کہا۔ "آپ میری بیوی سے واقف نہیں ہیں' جس زبان میں آپ نے اسے خط لکھوایا ہے' وہ زبان اس کے فرشتوں کو بھی نہیں آتی۔ وہ دو اور دو چار کی عورت ہے۔ اسے ساری بات سیدھے اور صاف انداز میں سمجھنا پڑتی ہے۔"

سلامت خان نے اٹھ کر فون پر روم سروس کو کافی کا آرڈر دیا اور مسکراتا ہوا بولا۔

"آپ فکر نہ کریں' ہمیں ہر قسم کے لوگوں سے ڈیل کرنا آتا ہے۔"

اور یہ بات اس نے بالکل صحیح کہی تھی۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ سلامت خان نے میری بیوی کو اسی زبان میں سمجھایا تھا جو وہ سمجھتی تھی۔ خط تو محض شناخت کے لیے تھا۔

گھنٹی بجانے پر میری بیوی پروین اوپر سے اتری' دروازہ کھولا تو اس نے دروازے پر ایک خوش پوش نوجوان کو پایا۔ خوش پوش نوجوان عاشق حسین نے بڑے مودبانہ انداز میں سلام کیا اور بولا۔ "آنٹی! میں اخلاق صاحب کا خط لایا ہوں' آپ کے نام۔"

خط کا ذکر سن کر میری بیوی کا چہرہ فق ہوگیا۔ وہ گھبرا کر بولی۔ "اس خط میں کیا ہے' کہیں طلاق نامہ تو نہیں' اخلاق نے کہیں دوسری شادی تو نہیں کرلی اور تم کون ہو' اس کے سالے ہو کیا؟"

"نہیں آنٹی' آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے' میں سالا نہیں ہوں' آپ پہلے خط پڑھ لیں۔" عاشق حسین نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اوئے' خط کیا پڑھ لوں خاک' وہ کہاں ہیں؟ صبح کسی کے گھنٹی بجانے پر نیچے اترے تھے' ابھی تک نہیں پلٹے۔" پروین نے لفافہ کھولتے ہوئے کہا۔ "میرا خیال تھا کہ حامد میاں کے یہاں ہوں گے' شطرنج کھیل رہے ہوں گے لیکن یہ تو کچھ اور ہی چکر معلوم ہوتا ہے۔ ہیں! یہ کیا لکھا ہے' میں جنت میں ہوں' ارے لڑکے! کیا وہ گزر گئے اور تم کون ہو؟ جنت سے آئے ہو' فرشتے ہو۔ ارے' میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔ کیا کروں' پڑوسن کو بلاؤں۔"

"آنٹی! کسی کو بلانے کی ضرورت نہیں' میں آپ کو سمجھائے دیتا ہوں' آپ میری بات

غور سے سنیں آپ نے خط تو پورا پڑھ لیا۔"

"ہاں' پڑھ لیا۔"

"اخلاق صاحب کی تحریر بھی پہچان لی؟"

"ہاں' زندگی گزر گئی' ان کی تحریریں دیکھتے' میں نہیں پہچانوں گی تو اور کون پہچانے گا۔" اس نے بڑے یقین سے کہا۔

"ٹھیک ہے۔" یہ کہہ کر عاشق حسین نے اپنے کوٹ کی جیب سے ایک موٹا سا لفافہ نکالا اور پروین کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ "اخلاق صاحب نے یہ لفافہ اور بھیجا ہے۔"

"ارے اس میں کیا ہے؟" پروین نے لفافہ لیتے ہوئے کہا اور جلدی سے لفافہ کھولا۔

"روپے۔"

"جی آنٹی' روپے۔ پورے پچاس ہزار ہیں۔" عاشق حسین نے بتایا۔

"پچاس ہزار! کل تک تو ان کے پاس پانچ سو روپے نہیں تھے۔ میں نے ایک سوٹ بنانے کی فرمائش کی تھی تو ٹکا سا جواب دے دیا تھا۔ اب یہ اتنے پیسے کہاں سے آگئے؟ یہ بڑے پراسرار آدمی ہیں' میں انہیں آج تک نہیں سمجھ پائی۔"

"یہ پیسے ان کے نہیں۔" کمپنی کے مالک نے آپ کو بھجوائے ہیں۔"

"ارے' یہ کمپنی بہادر کہاں سے پیدا ہوگئی اور مجھے کیوں بھجوائے ہیں؟"

"شاید آپ نہیں جانتیں کہ آپ کے شوہر کو اغوا کرلیا گیا ہے!"

"ہیں! یہ کیا کہہ رہے ہو' اغوا بھی کرلیا ہے اور اغوا کرنے والوں نے پیسے بھی بھجوائے ہیں۔ ارے' یہ الٹی گنگا کیسے بہہ رہی ہے؟"

"کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔"

"لیکن انہیں اغوا کیوں کیا گیا ہے' انہوں نے کسی کا کیا بگاڑا تھا؟"

"یہ مجھے نہیں معلوم۔"

"پھر تم یہاں کیوں آئے ہو' اسے بھیجے جسے کچھ معلوم ہوتا۔"

"میں آپ کو یہ بتانے آیا ہوں کہ آپ کو پریشان ہونے کی بالکل ضرورت نہیں ہے۔ یہ پچاس ہزار روپے آپ کے ہیں' انہیں جس طرح چاہے خرچ کیجئے۔ اخلاق صاحب ہمارے پاس ہیں۔ وہ بالکل ٹھیک ہیں' ان کی طرف سے فکر کرنے کی ضرورت نہیں' اس سلسلے میں پولیس وغیرہ کو بھی زحمت نہ دی جائے ورنہ دوسری صورت میں آپ کے شوہر کی زندگی خطرے میں پڑ سکتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ آنٹی' آپ نے میری بات سمجھ لی ہوگی۔"

پھر ایک حیرت ناک بات ہوئی جو عورت مجھ سے زندگی بھر پیسے کے لیے لڑتی رہی تھی'

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہر وقت اپنی خواہشوں اور آرزوؤں کا تذکرہ کرتی رہی تھی۔ تکمیل نہ پانے والی فرمائشوں کا رونا روتی رہی تھی۔ پچاس ہزار روپے پا کر میرے خیال میں اسے خوش ہو جانا چاہئے تھا۔

حیرت کی بات یہی تھی کہ وہ اتنے سارے روپے دیکھ کر بالکل خوش نہ ہوئی۔ اس نے عاشق حسین کو روپوں کا لفافہ واپس کرتے ہوئے کہا۔ ”مجھے یہ روپے نہیں چاہئیں' انہیں واپس لے جاؤ مجھے میرا شوہر چاہیے۔“

تب عاشق حسین نے زبردستی وہ لفافہ اس کے ہاتھ میں تھمایا اور واپس چلا آیا۔

جب عاشق حسین نے مجھے یہ ساری باتیں سنائیں تو میں بہت دیر تک پروین کے بارے میں سوچتا رہا۔ ایک ایک پیسے کے لیے تڑپنے والی عورت اندر سے کتنی مضبوط تھی' کتنی پیاری تھی' یہ مجھے اغوا ہو کر معلوم ہوا۔ کبھی کبھی تخریب سے بھی تعمیر کا پہلو نکل آتا ہے۔

کچھ دیر کے بعد کافی آ گئی۔ کافی پینے کے بعد سلامت خان نے دو تین ٹیلی فون کیے۔ یہ ٹیلی فون کچھ کاروباری نوعیت کے تھے۔

دوپہر کو ہم نے ہوٹل ہی میں کھانا کھایا۔ کچھ دیر آرام کیا پھر شام کی چائے پی۔ چار بجے کے قریب ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ سلامت خان نے بہت مختصر بات کی۔ بس اس نے ایک دو بار اچھا کہا اور ریسیور رکھ دیا۔

”اخلاق صاحب! کیا خیال ہے' اب یہاں سے چلیں۔“ سلامت خان نے مسکراتے ہوئے کہا۔ انداز ایسا تھا جیسے مجھ سے پوچھ رہا ہو' ابھی مزید ہوٹل میں ٹھہرنا ہے یا باہر چلیں؟“

”بھائی سلامت! میں تو آپ کے رحم و کرم پر ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے! یہاں سے بنگلے پر چلتے ہیں' وہاں چل کر سوچیں گے کہ آئندہ کیا کرنا ہے۔“ اس نے اپنا بریف کیس اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”آیئے' چلیں۔“

میں کسی سعادت مند بچے کی طرح اس کے ساتھ ہو لیا۔

میری سعادت مندی دیکھ کر اسے اپنے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر دھمکی دینے کی ضرورت نہ پڑی۔

ہم لوگ ہوٹل سے باہر آئے تو ایک جیپ ہماری منتظر تھی۔ ڈرائیور ہمیں دیکھتے ہی فوراً گاڑی سے باہر آ گیا۔ ہم نزدیک پہنچے تو اس نے فوجی انداز میں سلیوٹ مارا۔

”ہاں شیر خان! کیسے ہو؟“ سلامت خان نے توصیفی نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”میں ٹھیک ہوں سر' اللہ کا شکر ہے۔“ شیر خان نے جیپ کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

سلامت خان نے مجھے جیپ میں سوار ہونے کا اشارہ کیا۔ میرے بیٹھنے کے بعد سلامت خان اندر آیا۔ شیر خان نے باہر سے دروازہ بند کیا اور کھڑکی میں منہ ڈال کر بولا۔

”کدھر سر؟“

”بنگلے پر۔“ سلامت خان نے جواب دیا۔

میں نے شیر خان کو بہت غور سے دیکھا۔ یہ لمبے قد اور مضبوط جسم کا مالک تھا۔ عمر بھی اس کی خاصی تھی۔ لمبا چہرہ' ستواں ناک' شکن آلود پیشانی' جھری زدہ چہرہ۔ پیچھے کی طرف بنے بال' ہونٹوں پر باریک سی مسکراہٹ' لمبی مگر تیز آنکھیں' بھاری پپوٹے' بھاری اور مضبوط ہاتھ' اس کے علاوہ جو سب سے حیران کرنے والی بات اس کے چہرے پر تھی' وہ تھا پسینہ۔

جب اس نے کھڑکی میں منہ ڈالا تو میں نے اس کی ناک اور ٹھوڑی سے پسینے کی بوندیں گرتے دیکھیں۔ پسینے میں نہایا ہوا چہرہ دیکھ کر مجھے ایک دم گرمی کا احساس ہوا۔ موسم گرم ضرور تھا لیکن اتنا گرم نہ تھا کہ چہرہ یوں عرق آلود ہوتا۔ سلامت کا اور میرا چہرہ صاف تھا۔

سلامت خان کا جواب سن کر وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا اور گاڑی اسٹارٹ کرنے سے پہلے اس نے ایک کپڑے سے اپنا چہرہ اچھی طرح صاف کیا۔

جیپ چلی تو مجھے اچانک عاشق حسین کا خیال آیا۔ اسے سلامت خان نے میرے گھر بھیجا تھا۔ جانے وہاں کیا ہوا ہو۔ عاشق حسین نے میری بیوی سے ملاقات کا حال مجھے دو تین دن بعد سنایا تھا اور وہ بھی ضرورتاً' شاید سیٹھ اکرم کی ہدایت پر۔ اس وقت میں مکمل اندھیرے میں تھا اور سوچ رہا تھا کہ پروین میرے اس طرح اچانک غائب ہو جانے پر کس قدر پریشان ہوگی۔ تب میں نے سلامت خان سے براہ راست تو یہ نہیں پوچھا کہ تم نے عاشق حسین کو میرے گھر بھیجا تھا تو وہاں کیا ہوا۔ ہو سکتا ہے' وہ بتانے سے انکار کر دے تو خواہ مخواہ شرمندگی ہوگی' میں نے صرف اتنا پوچھا۔

”عاشق حسین کہاں ہے؟“

سلامت خان نے میری بات کا جواب دینے کے بجائے مجھے بڑے غور سے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک تھی۔ شاید وہ میرے سوال کی گہرائی میں اترنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”اس کا کام ختم ہو گیا' وہ چلا گیا۔“ سلامت خان نے بالآخر جواب دیا۔ ”اب شاید ہی آپ سے اس کی ملاقات ہو۔“

اس جواب کے بعد اب سلامت خان سے کچھ پوچھنا بے کار تھا۔ لہٰذا میں نے خاموشی اختیار کر لی۔

جب گاڑی ایک بنگلے کے گیٹ پر رکی تو مجھے یہ اندازہ تو تھا کہ یہ علاقہ گلشن کا ہے

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

لیکن اگر کوئی مجھ سے یہ پوچھتا کہ اس بنگلے کا پتا بتاؤ تو پتا بتانا تو دور کی بات ہے' میں اس بنگلے پر پہنچ بھی نہیں سکتا تھا' راستے مجھے کبھی یاد نہیں رہتے۔

گاڑی کے ہارن دیتے ہی فوراً بنگلے کا دروازہ کھلا۔ جیپ اندر داخل ہوئی۔ شیر خان نے پہلے اپنے چہرے کا پسینہ صاف کیا پھر گاڑی سے اترا' اتنی دیر میں دوسرا ملازم جس نے بنگلے کا گیٹ کھولا تھا۔ جیپ کا پچھلا دروازہ کھول چکا تھا۔

سلامت خان اور میں گاڑی سے باہر آئے۔

ایک ہزار گز کے پلاٹ پر بنا ہوا یہ بنگلہ دو منزلہ تھا۔ سامنے خوبصورت لان تھا' جہاں رنگ برنگے پھول کھلے ہوئے تھے۔ گھاس مخمل کی طرح بچھی تھی۔

''شیر خان! انہیں اوپر لے جاؤ۔'' سلامت خان نے شیر خان کو حکم دیا پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''اخلاق صاحب! آپ اوپر چل کر آرام کریں۔ یہاں اطمینان سے رہیں۔ سیٹھ اکرم کی آپ سے بہت جلد ملاقات ہوگی۔''

میں نے سلامت خان کی بات کا کوئی جواب نہ دیا' نہ اس سے کوئی سوال کیا۔ اب میں سوال کرنے کی پوزیشن میں تھا نہ جواب دینے کی۔ مجھے ہر صورت میں فرمان بردار رہنا تھا یا پھر جان گنوانی تھی۔

یہ ایک خوبصورت اور آرام دہ کمرہ تھا۔ یہاں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ اس کمرے کو کسی فائیو اسٹار ہوٹل کے کمرے کی طرح سجایا گیا تھا۔

کمرے میں کلر ٹیلی ویژن تو تھا ہی' ٹرالی میں سے وی سی آر بھی جھانک رہا تھا اور ٹیلی ویژن کے پیچھے ٹرے سے ریک میں بے شمار کیسٹ لگے ہوئے تھے۔ خیر یہ میری دلچسپی کی چیز نہ تھی۔ وی سی آر اور فلموں سے مجھے قطعاً کوئی دلچسپی نہ تھی۔ میرے گھر میں وی سی آر موجود تھا۔ فلموں کے کچھ کیسٹ بھی تھے۔ باہر سے کیسٹ آتے بھی رہتے تھے لیکن میں ٹیلی ویژن کے سامنے کبھی نہ بیٹھتا۔ البتہ پروین کو فلموں کا بڑا شوق تھا۔ وہ روزانہ ایک فلم ضرور دیکھتی تھی بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ فلم دیکھے بغیر اسے نیند نہیں آتی تھی۔ جب وہ فلم دیکھ رہی ہوتی تو میں کوئی کتاب پڑھ رہا ہوتا۔ کوئی بہت اچھی فلم ہوتی تو وہ میرے ہاتھ سے کتاب چھین کر بیڈ پر پھینکتی اور میرا ہاتھ پکڑ کر ٹیلی ویژن کے سامنے لے جاتی۔

''اللہ' بڑی خوبصورت فلم ہے' ذرا دیکھیں تو۔''

پروین کے کہنے پر میں ٹیلی ویژن کے سامنے بیٹھ جاتا اور فلم کتنی ہی دلچسپ کیوں نہ ہوتی' میں فلم دیکھتے دیکھتے اونگھنے لگتا۔ میری اس بات سے پروین کو بہت چڑ تھی۔ وہ مجھے سوتا دیکھ کر' مجھے زور سے ہلاتی اور ہاتھ جوڑ کر کہتی۔ ''جائیں بابا جائیں' آپ اپنی کتاب پڑھیں' میں

اکیلے ہی فلم دیکھ لوں گی۔''

تب میں مسکراتا ہوا اپنے بیڈ پر آجاتا اور خاموشی سے کتاب اٹھا کر پڑھنے لگتا۔ کتابوں میں میری جان تھی' جس طرح پروین کو فلم دیکھے بغیر نیند نہیں آتی تھی' ویسے ہی مجھے بھی کوئی کتاب پڑھے بغیر نیند نہیں آتی تھی۔ کتابیں میرے لئے نشہ تھیں تو فلمیں اس کے لیے۔

اس کمرے میں وی سی آر اور فلموں کے بے شمار کیسٹ دیکھ کر مجھے بے اختیار پروین یاد آگئی۔ وہ اس وقت اگر اس کمرے میں ہوتی تو فلموں کے کیسٹوں پر ٹوٹ پڑتی۔ اس کمرے میں سب کچھ تھا' نہیں تھیں تو کتابیں۔

مجھے جب صبح گھر سے اٹھایا گیا تو میں ان کپڑوں میں تھا جنہیں میں رات کو پہن کر سویا تھا۔ کپڑے شکن آلود تھے۔ اس حسین کمرے میں وہ کپڑے کسی ٹاٹ کے پیوند کی طرح محسوس ہو رہے تھے۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں فوراً لباس تبدیل کرلوں۔

میں ہمیشہ ریڈی میڈ سوٹ پہننے کا عادی تھا۔ میرے پاس بے شمار شلوار سوٹ تھے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ مارکیٹ میں کوئی نئی چیز آئی ہو اور وہ میں نے نہ خریدی ہو۔ کتابیں اور کپڑے میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر خریدتا تھا۔

مجھ سے غلطی ہوگئی۔ عاشق حسین میرے گھر گیا تھا۔ اس کے ہاتھ اپنے دو چار سوٹ ہی منگوالیتا پھر مجھے اپنی اس سوچ پر قہقہہ لگانے کو جی چاہا۔ حسن سلوک اور اچھی رہائش نے لاشعوری طور پر مجھے اتنا متاثر کیا تھا کہ میں یہاں سے رہائی کے بجائے یہاں رہنے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ مجھے اغوا کیا گیا تھا۔ میں نامعلوم لوگوں کی قید میں تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس قید میں مجھے اے کلاس دے دی گئی تھی لیکن میں تھا ان کے رحم و کرم پر۔ ایسے حالات میں لباس تبدیل کرنے کی خواہش کرنا' کچھ عجیب سی بات تھی۔ اصل میں میرا مزاج ہی ایسا تھا کہ میں شکن آلود کپڑے زیادہ دیر نہیں پہن سکتا تھا۔

شیر خان کمرے میں میرے ساتھ ہی آیا تھا لیکن وہ کب واپس ہوا۔ اس کا مجھے احساس نہ ہوا۔ میں کمرے کی خوبصورتی میں گم ہوا تو شیر خان دروازہ بند کرکر کمرے سے گم ہوا۔ میں بند دروازے کی طرف بڑھا۔ دروازے میں لگے ہینڈل کو گھمایا' دروازہ مقفل تھا اور یہ کوئی حیرت کی بات نہ تھی۔

دروازے سے پلٹ کر میں بیڈ کی طرف بڑھا مجھے کچھ تھکن سی ہو رہی تھی۔ دوپہر کے کھانے کے بعد میں کچھ دیر سوتا ضرور تھا۔ آج کی دوپہر سلامت خان کے ساتھ گزری تھی۔ اس وقت مجھے نیند آرہی تھی۔ میں بیڈ پر لیٹ گیا اور سوگیا۔

پھر میری آنکھ انٹر کام کی آواز پر کھلی۔ میں نے اپنی کلائی پر بندھی گھڑی پر نظر ڈالی۔

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

چھ بج رہے تھے۔ میں فوراً اٹھا۔ سامنے چھوٹی میز پر انٹرکام رکھا تھا۔ اس انٹرکام کے ساتھ ٹیلی فون بھی تھا۔ کالے رنگ کے اس ٹیلی فون سیٹ میں تالا پڑا تھا۔ میں نے انٹرکام کا ریسیور اٹھایا۔

"جی۔"

"اخلاق صاحب! میں شیر خان بول رہا ہوں۔"

"جی' فرمایئے۔"

"آپ رات کا کھانا کتنے بجے تک کھائیں گے؟"

"میں نو بجے کھاتا ہوں رات کا کھانا۔"

"اگر آپ اپنی پسند کی کوئی چیز کھانا چاہیں تو ہمیں بتادیں۔"

"جی' آپ کا بہت شکریہ۔ میں دنیا کی ہر چیز کھالیتا ہوں۔"

"جی' بہت بہتر۔" شیر خان نے بڑے مؤدبانہ انداز سے کہا اور انٹرکام بند کردیا۔

میں نے انٹرکام کے ریسیور کو دیکھا اور پھر اسے زور سے رکھ دیا اور خودکلامی کے انداز میں بولا۔ "واہ بھئی اخلاق احمد! خوب پھنسے۔"

پھر میں باتھ روم میں جاکر نہایا۔ نہا کر دوبارہ انہی کپڑوں کو پہننے کو دل نہ چاہا لیکن کیا کرتا' مجبوراً پہننے پڑے۔

ابھی سات بجنے میں دو منٹ باقی تھے۔ میں نے ٹیلی ویژن کھول دیا۔

سوچا' خبریں ہی دیکھ لوں۔ مجھے سیاست سے بہت دلچسپی تھی۔ ملکی سیاست کے علاوہ عالمی حالات سے بھی مجھے اچھی خاصی واقفیت تھی۔ اخبار' ٹیلی ویژن کے علاوہ میں ریڈیو پر آنے والے دنیا بھر کے پروگرام بڑے شوق سے سنا کرتا تھا۔

ابھی ٹیلی ویژن پر خبریں شروع ہی ہوئی تھیں کہ میرے کمرے کا دروازہ کھلا۔ آنے والا شیر خان تھا' نہ سلامت خان اور نہ عاشق حسین' یہ کوئی اور ہی تھا۔

آنے والے نے مجھے بڑی دلچسپی اور غور سے دیکھا پھر وہ دروازہ بند کرکے بڑی تیزی سے میری طرف بڑھا۔ اس نے بڑی گرم جوشی سے مجھ سے ہاتھ ملایا۔

"میں اکرم ہوں' اخلاق صاحب! آپ کو یہاں کوئی تکلیف تو نہیں پہنچی؟" اس نے بڑے نرم وملائم لہجے میں کہا۔

"اوہ' آپ سیٹھ اکرم ہیں۔" میں نے اس کا نام سن کر ٹیلی ویژن آف کردیا اور بیڈ پر بیٹھ گیا۔ سیٹھ اکرم میرے سامنے صوفے پر بیٹھ چکا تھا پھر اس نے انٹرکام پر کوئی نمبر ملا کر کہا۔

"کافی۔" اور ریسیور رکھ دیا۔

میں نے اسے غور سے دیکھا۔ سیٹھ اکرم ایک خوبصورت آدمی تھا' جوان تھا' اسمارٹ

تھا' جسم پر اس کے ایک قیمتی سوٹ تھا۔ کلائی پر جو گھڑی بندھی تھی' اس میں ہیرے جگمگا رہے تھے' انگوٹھی میں بیش قیمت پتھر تھا۔ سیٹھ اکرم کی شخصیت کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ اس کے چہرے پر کرختگی بالکل نہ تھی۔ وہ مسکراتا تو اس کے چہرے کی معصومیت اور بڑھ جاتی۔ اسے دیکھ کر کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ کوئی جرائم پیشہ آدمی ہے۔

"سیٹھ اکرم! میں آپ سے کچھ سوالات کرسکتا ہوں؟" میں نے اجازت چاہی۔

"ہی ہاں" فرمائیں' میں آپ کے پاس کچھ سننے اور کچھ سنانے آیا ہوں۔" وہ مسکرا کر بولا۔

"پہلے تو میں اپنی یہ غلط فہمی دور کرنا چاہتا ہوں کہ آپ نے جس آدمی کو اغوا کروانا تھا' کیا وہ شخص میں ہی ہوں' میرا مطلب ہے.....؟" میری بات پوری نہ ہوسکی' اس نے بات کاٹ دی۔

"میں آپ کا مطلب سمجھ گیا اخلاق صاحب!" میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ہم نے کسی غلط آدمی کو اغوا نہیں کیا۔ آپ ہی وہ شخص ہیں جس کی ہمیں ضرورت تھی' ویسے آپ اسے اغوا کا نام کیوں دیتے ہیں۔ ہم جس عزت واحترام سے آپ کو لائے ہیں' اس طرح کون کسی کو لاتا ہے۔ چلیے' آپ اسے اغوا کہنے پر ہی مصر ہیں تو پھر اسے وی آئی پی اغوا کہیے۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

"وی آئی پی اغوا!" میرے چہرے پر مسکراہٹ آگئی۔ "یہ تو کسی اسٹیج ڈرامے کا نام معلوم ہوتا ہے۔"

"چلیے' ہم نے آپ کو ایک عنوان دے دیا۔ اب آپ سٹیج ڈرامہ لکھیے' کبھی لکھا ہے آپ نے ڈراما۔"

"ڈراما تو میں بعد میں لکھوں گا' فی الحال اس ڈرامے سے نمٹ لوں جو میرے ساتھ ہو رہا ہے۔"

"ہاہاہا۔" میری بات سن کر اس نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ اب آپ کو یقین ہوا کہ ہم نے صحیح آدمی کو اغوا کیا ہے' میرا مطلب ہے' وی آئی پی اغوا۔"

"اس کا مطلب ہے کہ آپ میرے بارے میں اچھی طرح جانتے ہیں کہ میں کون ہوں' کیا کرتا ہوں؟"

"جی بالکل۔" سیٹھ اکرم نے پرتصدیق لہجے میں کہا۔ "میں آپ کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں اور اب سے نہیں' میرا خیال ہے کہ بیس بائیس سال سے۔"

"آپ مجھے بیس بائیس سال سے جانتے ہیں!" میرے اوپر حیرت کا پہاڑ ٹوٹا۔

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

"جی ہاں' یہ اور بات ہے کہ میں نے آپ کو دیکھا آج ہے۔ میرا خیال تھا کہ آپ کوئی معمر شخص ہوں گے لیکن میرے اندازے کے برعکس آپ خاصے جوان نکلے۔"

"آپ کو میرے بوڑھا ہونے کا احساس کیسے ہوا؟"

"آپ کی تحریریں پڑھ کر یہی اندازہ ہوتا ہے کہ جیسے آپ خاصی عمر کے آدمی ہیں۔"

"آپ نے میری تحریریں پڑھی ہیں؟"

"اخلاق صاحب! میں آپ کا فین ہوں' شاید ہی کوئی کہانی آپ کی ایسی ہو جو میری نظر سے نہ گزری ہو۔" اس نے مجھے پرشوق نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بتایا۔

"اوہ' اچھی بات ہے' اب تک میں یہی سمجھ رہا تھا کہ سیٹھ اکرم نے مجھے کسی غلط فہمی کے تحت اغوا کروالیا ہے' لیکن اپنی کہانیوں کے بارے میں ذکر سن کر مجھے اب یقین ہوگیا ہے کہ اس نے ٹھیک آدمی کو اغوا کیا ہے۔ اب سوال یہ تھا کہ ایک کہانی نویس کو اغوا کرنے کی اسے ضرورت پیش کیوں آئی؟"

"سیٹھ اکرم' میرے اغوا کی وجہ بتانا پسند کریں گے؟" اب میں نے براہ راست سوال کیا۔

وہ کچھ جواب دینے والا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

"آجاؤ۔" سیٹھ اکرم نے کہا۔

شیر خان اندر داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں ٹرے تھی۔ ٹرے اس نے میز پر رکھی اور مؤدبانہ کھڑا ہوگیا۔

میں نے اس کا چہرہ دیکھا' وہ پسینے میں بھیگ رہا تھا۔ اس نے اپنی واسکٹ کی جیب سے رومال نکال کر پسینہ پونچھا۔

"کافی بناؤ۔" سیٹھ اکرم نے اسے حکم دیا۔ وہ میز کے نزدیک بیٹھ کر کافی بنانے لگا۔

"آج کل آپ کیا لکھ رہے ہیں؟" اس نے پوچھا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ شیر خان کی موجودگی میں میری بات کا جواب نہیں دینا چاہتا۔

"ایک ناول پر کام کر رہا ہوں۔" میں نے کہا۔

"سر' کافی میں چینی کتنی ڈالوں؟" شیر خان مجھ سے مخاطب تھا۔

"ایک چمچہ' لیکن دودھ زیادہ ڈالیے گا' میں زیادہ دودھ کی کافی پیتا ہوں۔"

"جی بہتر۔" شیر خان نے کہا۔

شیر خان کافی بنا کر کمرے سے رخصت ہوگیا۔ میں نے دیکھا کہ سیٹھ اکرم کی کافی میں دودھ تھا نہ چینی پھر میں نے یہ بھی دیکھا..... کہ شیر خان نے واپس جاتے ہوئے رومال سے

ایک مرتبہ اپنا چہرہ اور صاف کیا۔

"میں نے آپ کو یہاں بلانے کی کیوں زحمت دی' یہ بتانے سے پہلے میں آپ کی ایک کہانی کا ذکر کرنا چاہوں گا۔" سیٹھ اکرم نے میرے سوال کا جواب دیا۔ "اس کہانی نے میری زندگی کا رخ بدل دیا' آج میں جو کچھ ہوں' اس کہانی کی بدولت ہوں۔"

"ارے' ایسی میں نے کون سی کہانی لکھ دی!" میں نے حیرت سے کہا۔

"آپ کو یاد ہوگا' آپ نے ایک کہانی کار کی چوری سے متعلق لکھی تھی' جس میں ایک راشی افسر کے گھر کے دروازے سے کار چرانے کے بعد' کار چور گاڑی واپس کر جاتا ہے اور گاڑی میں کسی نئی فلم کے ٹکٹ رکھ دیتا ہے' جب گھر والے سینما ہال میں فلم دیکھنے چلے جاتے ہیں تو وہ چور پورے گھر کا صفایا کر دیتا ہے اور نقدی' زیورات کے ساتھ گاڑی بھی لے اڑتا ہے۔"

"ہاں' میں نے لکھی تھی یہ کہانی۔" وہ کہانی مجھے فوراً یاد آگئی۔

"لیکن اس کہانی نے آپ کی زندگی کا رخ کس طرح بدل دیا؟"

"اس کہانی کو پڑھ کر میں نے پہلی کامیاب واردات کی۔"

"واردات؟" اس کی بات سن کر میں مجسم سوال ہوگیا۔

"جی ہاں' پہلے میں نے گاڑی چرائی' پھر سینما کے ٹکٹ رکھ کر گاڑی واپس کر دی۔ سب لوگ فلم دیکھنے چلے گئے تو میں اطمینان سے گھر میں داخل ہوا' وہاں سے مجھے تقریباً تین چار لاکھ کا مال ملا۔ نقدی' زیورات' پرائز بانڈ' وہ گھر بھی ایک راشی افسر کا تھا۔ اس واردات نے میری زندگی کا رخ موڑ دیا۔ میں جو راتوں رات امیر بننے کے خواب دیکھا کرتا تھا' اس واردات نے میرے خوابوں کی تکمیل کر دی۔ مجھے میری منال دکھا دی پھر میں اس راہ پر چل پڑا۔ دو تین بار جیل کی ہوا بھی کھائی لیکن میں روز بہ روز پختہ ہوتا گیا۔ کل کا ایک معمولی کلرک آج آپ کے سامنے سیٹھ اکرم کی صورت میں بیٹھا ہے۔ آج میں جو کچھ ہوں' آپ کی بدولت ہوں' آپ میرے بالواسطہ استاد ہیں۔"

اس کی باتیں سن کر میں سناٹے میں آگیا۔ میں نے کانپتے ہاتھوں سے کافی کا مگ میز پر رکھا۔ اس کی یہ بات سن کر مجھے بڑا صدمہ ہوا۔

"آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ میں نے آپ کو جرم کرنا سکھایا؟" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"نہیں' میں یہ نہیں کہنا چاہتا کہ آپ نے مجھے جرم کرنا سکھایا بلکہ میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ آپ کی ایک کہانی سے میں نے جرم کرنا سیکھا۔"

"اس میں میرا کیا قصور ہے؟" میں نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ "یہ واقعہ میں نے بھی

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

کسی سے سنا تھا۔ میں جو کچھ لکھتا ہوں' وہ میرے ذہن کی تخلیق نہیں ہوتا بلکہ اس دنیا کی تخلیق ہوتا ہے۔ زندگی میں روزانہ ہونے والے واقعات کو ہمارا حساس ذہن ریکارڈ کرتا رہتا ہے۔ اسی جمع شدہ خام مال سے کہانی جنم لیتی ہے۔ میں نے کبھی کسی جرم کو خوشنما بنا کر نہیں پیش کیا۔ میری کہانیوں میں مثبت پہلو زیادہ اجاگر ہوتا ہے۔ میں نے اس کہانی میں بھی یہی بتانے کی کوشش کی تھی کہ رشوت اور ناجائز کمائی کبھی راس نہیں آئی' اسے اچانک چور لے اڑتے ہیں پھر چوری کا انوکھا طریقہ بتا کر اپنے قارئین کو ہوشیار کیا تھا۔ پولیس کو بھی اس نوعیت کی واردات سے آگاہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ افسوس کہ اس کہانی سے پولیس نے کوئی مثبت نتیجہ اخذ کیا نہ قارئین ہوشیار ہوئے' اگر ہوئے ہوں تو مجھے معلوم نہیں لیکن ایک مجرمانہ ذہن نے اس سے فائدہ اٹھالیا اور یہ بات میرے لیے صدمے کا باعث ہے۔" میں جذبات کی رو میں بولے جارہا تھا اور وہ بڑے تحمل سے ہونٹوں پر مسکراہٹ سجائے میری بات سن رہا تھا۔ "یہ بات میرے لیے افسوسناک ضرور ہے لیکن اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔ چھری بنانے والے نے یہ کبھی نہیں سوچا ہوگا کہ لوگ اس سے سبزی کاٹنے کے بجائے لوگوں کے گلے کاٹیں گے۔ وی سی آر بنانے والے نے یہ بھی خیال نہ کیا ہوگا کہ لوگ اس پر معلوماتی پروگرام دیکھنے کے بجائے صرف بلیو فلمیں دیکھیں گے۔ آپ نے میری کہانی کا غلط استعمال کیا ہے تو اس کے ذمے دار آپ ہیں' میں نہیں۔ میں اسی طرح جرائم سے پردہ ہٹاتا رہوں گا' یہ میری زندگی کا مشن ہے۔" میں نے بڑے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

"آپ نے میری بات کا غلط مطلب لیا' میں نے آپ کو قصوروار نہیں ٹھہرایا۔ میں تو صرف آپ کی معلومات میں اضافہ کررہا تھا۔"

"یہ بڑا بھیانک اضافہ ہے۔" میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"اتنی جلدی پریشان ہوگئے' ابھی اور سنیے۔ آپ نے ابھی سوال کیا تھا کہ میں نے آپ کو اغوا کیوں کیا ہے تو اب میں آپ کو اس سلسلے میں بتاتا ہوں۔ یہ آئیڈیا بھی میں نے آپ کی ایک کہانی سے لیا ہے۔ آپ کو وہ کہانی یاد نہیں' ابھی حال ہی میں تو چھپی ہے وہ کہانی۔ اس کہانی میں آپ ہی کی طرح کا مصنف ہے جو جرائم کی کہانیاں لکھتا ہے۔ اس مصنف کو ایک جرائم پیشہ شخص اغوا کروالیتا ہے اور اس سے کہتا ہے کہ اب تم صرف میرے لیے جرائم کی کہانیاں لکھو گے اور پھر وہ اس کے دیے ہوئے آئیڈیوں پر جرائم کی دنیا میں تہلکہ مچا دیتا ہے۔"

اس کی بات سن کر میری روح تک کانپ گئی۔ تو اس مقصد کے لیے مجھے اغوا کیا گیا ہے؟ میرا ہی جال' مجھ پر پھینکا گیا ہے لیکن اس کو شاید معلوم نہیں کہ وہ محض ایک کہانی تھی۔ یہ پوری زندگی بھی مجھے قید میں رکھے تب بھی میں اس کہانی کا مصنف نہ بن سکوں گا۔

اس نے مجھے سمجھ کیا رکھا ہے' میری غصے سے دونوں مٹھیاں بھنچ گئیں۔

"ایک بات بتائیں اخلاق صاحب!" وہ بولا۔ "اگر آپ مصنف نہ ہوتے تو کیا ہوتے؟"

"میں اگر مصنف نہ ہوتا تو فوٹوگرافر ہوتا کیونکہ عکاسی میری فطرت میں شامل ہے۔ معاشرے کی عکاسی نہ سہی' بندوں کی عکاسی سہی۔" میں نے اسے بتایا۔

"لیکن میرا خیال اس سے مختلف ہے۔ میرے خیال میں اگر آپ مصنف نہ ہوتے تو بہت بڑے اسمگلر ہوتے۔ جرائم کی دنیا میں آپ کا سکہ چلتا اور آپ ایک شاہانہ زندگی گزارتے۔"

میں سمجھ رہا تھا کہ وہ کیا کہنا چاہ رہا ہے لیکن میں خاموش رہا۔

"اچھا یہ بتائیے' آپ کو ایک کہانی کا معاوضہ کتنا ملتا ہے؟" اس نے پوچھا۔

میں نے معاوضہ بتایا۔

"ارے!" میرا معاوضہ سن کر اس نے حیرت ظاہر کی۔ اس حیرت میں ہمدردی بھی شامل تھی۔ "یہ تو کچھ نہ ہوا۔" اس نے گردن دائیں بائیں ہلاتے ہوئے کہا۔

"لیکن میرے لیے یہ بہت کچھ ہے۔ میری ضروریات کے لیے کافی ہے۔ ہم دو میاں بیوی ہیں' مکان ذاتی ہے' نیچے کرائے دار رہتے ہیں' کچھ کرایہ آجاتا ہے' کچھ کہانیوں کا معاوضہ آجاتا ہے' زندگی کی گاڑی ٹھیک ٹھاک چل رہی ہے۔" میں نے بڑی قناعت پسندی سے کہا۔

"اس روتی' بسورتی زندگی کو ٹھیک ٹھاک کہتے ہیں۔ اب آپ ہمارے ساتھ آگئے ہیں' زندگی تو آپ اب گزاریں گے۔ کسی بڑے علاقے میں آپ کا خوبصورت گھر ہوگا' اس گھر کا ہر کمرا سجا ہوا ہوگا۔ ہر کمرے میں اے سی ہوگا' گھر میں دو تین گاڑیاں کھڑی ہوں گی' نوکر چاکر ہوں گے' نئی بیوی ہوگی۔ دوسری شادی کرنا پسند نہیں کریں گے تو کم عمر اور دلکش سیکرٹری ہوگی۔ اس گھر میں وہ سب کچھ ہوگا جس کا آپ تصور کریں گے۔ اس خوبصورت زندگی کے عوض آپ صرف اتنا کریں گے کہ آئندہ کسی پرچے کے لیے کوئی کہانی نہیں لکھیں گے' صرف میرے لیے لکھیں گے اور یہ کہانی کہیں نہیں شائع ہوگی۔"

"سیٹھ اکرم! خدا کے واسطے مجھے خواب نہ دکھائیں' مجھے ورغلائیں نہیں' میں کسی قیمت پر شریک جرم نہیں ہوں گا۔" میں نے بڑے پروثوق لہجے میں کہا۔

"ابھی آپ جذباتی ہو رہے ہیں' کچھ دن ہمارے ساتھ رہیں گے تو پھر حقیقت پسندانہ انداز میں سوچنے لگیں گے۔" یہ کہہ کر وہ کھڑا ہوگیا۔ اس کے کھڑے ہونے کے انداز میں دھمکی پوشیدہ تھی۔

اس کے جانے کے بعد باہر سے دروازہ بند ہوگیا۔ تالے میں چابی گھوم گئی۔

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

میں نے ایک گہرا اور ٹھنڈا سانس لیا۔ ''اے خدا! تو نے مجھے کہاں پھنسا دیا؟''

پھر سوچا' اس میں خدا کیا کیا قصور ہے' یہ تو وہ گڑھا ہے جو خود میں نے اپنے ہاتھوں سے کھودا ہے۔ میرا بنا ہوا جال' خود میرے اوپر ہی آ پڑا ہے۔ خود اپنے دام میں صیاد آ گیا' شاید اسی کو کہتے ہیں۔ کیا ضرورت تھی ایسی کہانی لکھنے کی جس میں مصنف جرائم پیشہ افراد کا آلہ کار بن جاتا ہے۔ اب آئیڈیا دیا ہے تو سیٹھ اکرم کا ساتھ بھی دو' لکھو اس کے لئے کہانیاں اور ہو جاؤ مالا مال۔

مجھے اپنے آپ پر بڑا غصہ تھا۔ میں مٹھیاں بھینچے ٹہلتا رہا اور سوچتا رہا۔

ٹھیک نو بجے میرے بتائے ہوئے وقت پر کھانا آ گیا' یہ ایک پرتکلف کھانا تھا۔ لانے والا شیر خان ہی تھا۔ میز پر ٹرے رکھ کر اس نے رومال سے اپنے چہرے کا پسینہ صاف کیا۔

''شیر خان! تم اس قدر شرمندہ کیوں رہتے ہو؟'' میں نے اسے پسینہ پونچھتے ہوئے دیکھ کر پوچھا۔

''میں سمجھا نہیں صاحب۔'' اس نے مجھے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

''میں یہ پوچھنا چاہ رہا تھا کہ تمہارا چہرہ ہر وقت پسینے میں کیوں نہایا رہتا ہے؟''

''سر جی! اس پسینے سے میں خود بیزار ہوں' یہ کوئی بیماری ہے لیکن آج تک کوئی ڈاکٹر اسے ٹھیک نہیں کر پایا' میں نے بہت علاج کرایا ہے۔'' شیر خان نے بیزاری سے کہا۔

''عجیب بیماری ہے۔'' میں نے کہا۔

''ہمارے شہر میں ایک حکیم جی تھے' بہت اچھے حکیم تھے۔ ان کی شہرت دور دور تھی۔ عمر کے آخری حصے میں انہیں ایک بیماری ہوگئی تھی۔ ہنسنے کی۔ وہ بات کم کرتے' ہنستے زیادہ تھے۔ اس عمل کے دوران وہ اپنی اس بیماری کی معذرت بھی کرتے جاتے۔ شادی بیاہ کے موقع پر تو ان کی اس ہنسی کو برداشت کیا جاسکتا تھا لیکن وہ موت کے گھر میں بھی قہقہے لگانے سے باز نہ آتے جب ان کی بیماری حد سے زیادہ بڑھی تو پھر انہوں نے گھر سے نکلنا ہی چھوڑ دیا اور یوں ہنستے ہنستے ایک دن ان کا انتقال ہوگیا۔'' شیر خان نے بتایا ''کتنا عجیب مرض تھا انہیں' مجھے تو صرف پسینہ ہی آتا ہے۔''

''انہیں مالیخولیا ہوگیا ہوگا۔'' میں نے اپنی علمیت جھاڑنے کی کوشش کی۔

''جی شاید اسی قسم کا کوئی مرض تھا انہیں اور دلچسپ بات یہ ہے کہ اسی مرض کے وہ ماہر سمجھے جاتے تھے۔ خیر چھوڑیے اس قہقہے کو' آپ کھانا کھائیں سر۔'' شیر خان نے کھانے کی طرف توجہ دلائی۔

اس کے کمرے سے نکلنے کے بعد میں کھانا کھانے بیٹھا تو مجھے فوراً پروین کا خیال

آ گیا۔ ہم دونوں کے کھانے کا وقت یہی تھا۔ ادھر ٹی وی پر خبریں شروع ہوتیں اور ادھر ہمارا کھانا شروع ہوتا۔ میں اور پروین رات کا کھانا ہمیشہ ساتھ کھانے کے عادی تھے۔ یہ عادت ایک لمبے عرصے سے چلی آ رہی تھی۔ آج کھانا تھا' ٹی وی تھا' میں تھا' اگر نہیں تھی تو میری بیوی پروین۔

کھاتے کھاتے میں نے فوراً اپنا ہاتھ کھینچ لیا مگر یہ محض وقتی بات تھی۔ کھانے سے کس نے منہ موڑا ہے اور کب تک۔

منہ تو خیر سیٹھ اکرم نے بھی مجھ سے نہیں موڑا حالانکہ میں نے اسے صاف صاف بتا دیا تھا کہ میں اس کے لیے کام نہیں کروں گا۔ اگلے تین دن بڑے فیصلہ کن ثابت ہوئے۔ ان تین دنوں میں میرے ساتھ چوہے بلی کا کھیل جاری رہا۔ مجھ پر طرح طرح کے نفسیاتی حربے آزمائے گئے۔

شہر کے ایک بڑے سٹور سے میرے لیے کپڑے منگوائے گئے۔ اچھے سگریٹ اور اچھی شراب کی پیشکش کی گئی۔ شراب تو دور کی بات ہے' میں تو سگریٹ بھی نہیں پیتا تھا۔ ہاں' البتہ کبھی کبھی پان کھالیا کرتا تھا۔ ان نوازشات کے دوران سیٹھ اکرم بھی اپنی شکل دکھاتے رہے۔ وہ گھوم پھر کر اپنے موضوع پر پہنچ جاتے۔ ''ہاں اخلاق صاحب! پھر کب سے شروع کر رہے ہیں ہمارے لیے کام؟''

میں انکار کرتا تو وہ مسکرا اٹھتے اور ان کی اس مسکراہٹ پر میری جان جل کر رہ جاتی۔

سلامت خان نے بھی ایک آدھ دن چکر لگایا اور ادھر ادھر کی باتیں کر کے چلا گیا۔

میں پروین کی طرف سے بہت پریشان تھا۔ اس کا ذکر میں سب سے کرتا رہتا تھا پھر ایک دن عاشق حسین آیا۔ اس نے میری فکر کم کرنے کے لئے میری بیوی سے ملاقات کا حال سنایا اور یہ بھی بتایا کہ وہ زبردستی پروین کو پچاس ہزار روپے دے آیا ہے۔

یہ سارا واقعہ دہرانے کے بعد وہ بولا۔ ''میں آج بھی آپ کے گھر گیا تھا۔ مجھے سیٹھ صاحب نے بھیجا تھا۔''

''کیسی ہے پروین؟'' میں نے پوچھا۔

''جی' وہ بالکل ٹھیک ہیں' انہوں نے آپ کے نام ایک خط دیا ہے۔'' عاشق حسین نے بتایا۔

''خط!'' میں نے حیرت سے کہا۔ ''لاؤ' کدھر ہے۔''

اس نے اپنی پینٹ کی جیبیں ٹٹول کر' ایک مڑا تڑا پرچہ نکال کر میرے ہاتھ پر رکھا۔

پرچہ کھول کر میں نے پڑھا۔ لکھا تھا۔

''پیارے اخلاق! تم ان لوگوں کی بات کیوں نہیں مان لیتے' آخر رسالوں کے لیے

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

بھی تو تم کہانیاں لکھتے تھے' اگر ان کے لیے لکھ دو گے تو کیا ہو جائے گا؟ میں خیریت سے ہوں اور تمہیں یاد کرتی ہوں' آج گھر سے گئے ہوئے تمہیں تین دن ہو گئے لیکن مجھے لگتا ہے جیسے نئے سال ہو گئے' اپنا خیال رکھنا اور ہاں' یہ لڑکا مجھے دو دن پہلے پچاس ہزار روپے دے گیا تھا۔ مجھے تمہاری آمد کا شدت سے انتظار ہے۔ دیکھو کوئی ایسا قدم نہ اٹھانا کہ میں تمہاری صورت دیکھنے سے بھی محروم ہو جاؤں۔

تمہاری منتظر پروین۔

اس پرچے کو میں نے پڑھنے کے بعد' پورے اطمینان سے پھاڑ دیا اور اس کے ٹکڑے عاشق حسین کے ہاتھ پر رکھ دیئے' وہ ان ٹکڑوں کو لے کر کمرے سے نکل گیا۔

یہ شاید میرے اغوا کے چوتھے دن کی بات ہے۔ میں صبح کو باتھ روم سے نہا کر نکلا تو میں نے کمرے میں شیر خان کو پایا۔

میں دروازے پر ہی ٹھٹک گیا۔ وہ منظر ہی کچھ ایسا تھا۔

شیر خان جھکا ہوا کسی بڑی سی تصویر کو ایک کپڑے سے صاف کر رہا تھا۔ ناک کی نوک اور ٹھوڑی سے پسینے کے قطر ٹپکا ہی چاہتے تھے۔ ہارڈ بورڈ پر چپکی اس تصویر کو وہ بڑے انہماک سے صاف کر رہا تھا اور وہ جس چیز کو صرف کر رہا تھا' وہ یقیناً خون تھا۔

پھر میری اس چہرے پر نظر پڑی' لمبی آنکھوں اور باریک بھوؤں والا چہرہ۔ باریک کھنچے ہوئے ہونٹ' پھیلی ہوئی ناک' اس چہرے کی آنکھوں میں بڑی پراسراریت تھی۔ آدمی اسے دیکھے تو دیکھتا ہی رہ جائے۔ شیر خان نے کیونکر تصویر کو جھکا رکھا تھا اور میں سامنے ذرا فاصلے پر تھا تو وہ چہرہ مجھے پھیلا پھیلا دکھائی دے رہا تھا۔

لیکن جب میں نے بالوں سے ٹپکتا ہوا پانی اور اپنی آنکھیں تولیے سے صاف کیں اور دو قدم آگے بڑھا تو نہ وہ تصویر رہی اور نہ ہی وہ چہرہ رہا۔

اب میں نے دیکھا کہ جسے میں ہارڈ بورڈ پر چپکی ہوئی تصویر سمجھ رہا تھا' وہ تصویر نہ تھی' میرے مقابل آئینہ تھا' جس کے اوپر کا حصہ دھندلا تھا اور جس جگہ شیر خان صفائی کر رہا تھا' وہاں خون کے دھبے تھے۔

وہ چہرہ کہاں غائب ہو گیا؟

کیا یہ فریب نظر تھا یا واقعی میں نے شیر خان کے ہاتھ کے نیچے کسی چہرے کو دیکھا تھا۔

پھر اچانک مجھے خوشبو کا احساس ہوا۔ دلفریب اور مسحور کن خوشبو مجھے ایسا لگا جیسے کوئی نسوانی وجود ہے اس کمرے میں۔

میں نے فوراً دائیں بائیں نظریں گھمائیں۔ تب دائیں جانب میری نظریں جیسے منجمد ہو کر رہ گئیں۔

وارڈ روب کے پس منظر میں مجھے وہ حسین پیکر کھڑا دکھائی دیا۔ مجھے اپنی طرف متوجہ پا کر وہ مسکراتی ہوئی آگے بڑھی۔ میں بائیں جانب تھوڑا سا پیچھے ہٹا۔

"سر جی' ان سے ملیے۔" کمرے میں شیر خان کی آواز گونجی۔ "یہ ہیں مس انجم آرا۔"

وہ سرو قامت' مجھ پر قیامت کی نظر ڈالتی' میرے نزدیک آ گئی۔ گلابی ریشمی اور کسی ہوئی ساری' چھوٹا بلاؤز' کھلے بال' دلفریب چال' میں اسے دیکھتا رہ گیا۔

میری محویت دیکھ کر شیر خان نے میز سے آئینہ اٹھایا۔ آئینہ اس طرح اٹھایا کہ میں اس میں صاف نظر آنے لگا۔ گویا وہ مجھے آئینہ دکھا رہا تھا۔

آئینے میں' میں اپنے آپ کو دیکھ کر سٹپٹا گیا۔

"آپ تشریف رکھیے نا۔" میں نے گھبرا کر اس سے کہا۔

"جی ہاں' میں یہاں بیٹھنے کے لیے ہی آئی ہوں' یہ لیجیے میں بیٹھ گئی۔" وہ بے تکلفی سے صوفے پر بیٹھ گئی۔ وہ کچھ اس طرح بیٹھی کہ ریشمی آنچل پھسلا لیکن اس نے اس طرف کوئی توجہ نہ دی۔

"شیر خان! وہ شیر خان سے مخاطب ہوئی۔

"جی مس صاحبہ!"

"دیکھو' آئینے پر سے خون کے دھبے اچھی طرح صرف کر دینا۔" وہ مخاطب تو شیر خان سے تھی لیکن دیکھ مجھے رہی تھی جیسے مجھے کچھ سمجھانا چاہتی ہو۔

"کوشش تو کر رہا ہوں۔" شیر خان نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اس بندے کا خون بہت خراب تھا مس صاحبہ' چپک کر رہ گیا ہے۔"

"ہاں' وہ احمق بہت ضدی تھا' اس نے باس کی بات نہ مان کر اپنے آپ کو نقصان پہنچا لیا۔ زندگی جیسی خوبصورت چیز کو داؤ پر لگا دیا۔" وہ بڑی سفاکی سے بولی۔

"بس جی مس صاحبہ' سر پھرے ایسے ہی ہوتے ہیں۔" شیر خان کی نظریں مجھ پر تھیں۔

یہ گفتگو بہ ظاہر وہ آپس میں کر رہے تھے لیکن اس گفتگو کا ایک ایک لفظ تیر بن کر میرے دل میں چبھ رہا تھا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں' اب بات فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہو گئی تھی۔ اب تک ان لوگوں نے میرے ساتھ کوئی بدسلوکی نہیں کی تھی لیکن میں جانتا تھا کہ اگر میں نے ان کی بات نہ مانی تو آئینہ زندگی کو دھندلانے میں اب یہ زیادہ وقت نہیں لیں گے۔ یہ بالواسطہ قتل کی دھمکی تھی اور سیٹھ اکرم جیسے سفاک لوگوں سے کوئی بعید بھی نہیں تھا۔ وہ اپنے

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

مقصد کے حصول کے لیے کچھ بھی کر سکتے تھے۔ جب ان کے لیے اغوا اتنا آسان تھا تو قتل کون سا مشکل کام تھا؟

"آپ کیوں خاموش ہیں اخلاق صاحب؟" اس نے اپنی گہری آنکھوں سے مجھے دیکھا۔

"میں کیا بولوں مس صاحبہ؟" میں نے ٹھنڈا سانس لے کر کہا۔

"مس صاحبہ نہیں' میرا نام لیجئے' میرا نام انجم آرا ہے۔" اس نے دلربائی سے کہا۔

"جیسی آپ خود ہیں' ویسا ہی آپ کا نام ہے۔ فرمائیے آپ مجھ سے کیا سننا چاہتی ہیں؟"

"مجھے آپ سے ہمدردی ہے' میں نہیں چاہتی کہ آپ کو کوئی نقصان پہنچے۔" اس نے کہا۔

میں خود بھی نہیں چاہتا تھا کہ مجھے کوئی نقصان پہنچے۔ میں ابھی جینا چاہتا تھا' مجھے زندگی سے بہت پیار تھا لیکن دوسری طرف میں اپنے اصولوں پر سمجھوتا بھی نہیں چاہتا تھا۔ مجھے اپنے اصول بھی بہت پیارے تھے۔ میں نے بڑی صاف ستھری زندگی گزاری تھی۔ اپنے رزق میں' میں نے کبھی حرام شامل ہونے نہیں دیا تھا لیکن اب زندگی نے مجھے امتحان میں ڈال دیا تھا۔

پھر میں نے کچھ سوچ کر زندگی کے سامنے سر جھکا دیا۔ انجم آرا کا کہنا مان لیا۔

میرا جھکا ہوا سر دیکھ کر انجم آرا کسی پھول کی طرح کھل اٹھی۔ اس کی خوشی بتا رہی تھی جیسے میں نے اپنا سر زندگی کے سامنے نہ جھکایا ہو' اس کے سامنے جھکایا ہو بے وقوف۔

شام کو سیٹھ اکرم آیا۔ اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا ویری گڈ!"

میں نے اپنے دل میں سوچا کہ ابھی سے گڈ کہنے کا کیا فائدہ' یہ تو آگے چل کر پتا چلے گا کہ گڈ یا بیڈ۔

سیٹھ اکرم کی گفتگو سے اندازہ ہوا کہ اس نے اب تک سمگلنگ کا کام زیادہ کیا تھا۔ سونے اور ہیروئن کی اسمگلنگ میں اسے زیادہ دلچسپی تھی۔ بظاہر اس نے کراچی میں دو تین کاروبار کر رکھے تھے۔ اس میں ایکسپورٹ اور امپورٹ کے علاوہ گارمنٹ اور پلاسٹک کا کام شامل تھا۔ یہ سب کاروبار ٹھیک ٹھاک چل رہے تھے' لیکن جب آدمی دولت کے دام میں آ جائے تو پھر کہیں کا نہیں رہتا۔ اسے اٹھتے' بیٹھتے' سوتے' جاگتے ہر طرف نوٹ ہی نوٹ نظر آتے ہیں۔ دولت کی ہوس کا کوئی اختتام نہیں۔ اس کا ہر اختتام ابتدا بن جاتا ہے۔ آدمی سوچتا ہے' ابھی دولت کچھ کم ہے تھوڑی سی اور' تھوڑی سی اور۔

سیٹھ اکرم بھی تھوڑی سی اور کے چکر میں سرگرداں تھا۔ ساتھ ہی وہ یہ بھی کہتا تھا کہ

اخلاق صاحب! اب میں تھک گیا ہوں۔ دماغ ہر وقت دباؤ میں رہتا ہے۔ رات کو نیند نہیں آتی' سو جاتا ہوں تو خوفزدہ ہو کر اٹھ جاتا ہوں۔ مال کے پکڑے جانے کا خوف' پولیس کا خطرہ' کنگال ہونے کا ڈر۔ اب تو میرا جی چاہتا ہے کہ ایک آخری داؤ لگاؤں اور اس ملک سے نکل جاؤں پھر کہیں اور جا کر سکون کی زندگی گزاروں۔

وہ جب سکون کی زندگی کی بات کرتا تو مجھے اندر ہی اندر ہنسی آتی۔ آج اس کے پاس پیسے کی کون سی کمی تھی۔ پھر بھی اسے سکون و اطمینان کی زندگی میسر نہ تھی۔ راتوں کی نیندیں حرام تھیں۔ آخری داؤ لگانے کے بعد اس بات کی کیا ضمانت تھی کہ اسے پرسکون زندگی میسر آ جائے گی۔ حرام کما کر آدمی کو کبھی سکون ملا ہے؟ لیکن اس طرح سے اس نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا اور اس طرح وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا' دولت کی ہوس' آدمی سے اس کے حواس چھین لیتی ہے۔

جس طرح وہ آخری داؤ کے چکر میں تھا' ویسے ہی میں بھی آخری داؤ کے چکر میں تھا۔ اب کون کس کے داؤ میں آتا ہے' فیصلہ تقدیر کے ہاتھ میں تھا۔

میں نے اپنا روپ بدل لیا تھا۔ میں سیٹھ اکرم سے اب اس کے رنگ کی باتیں کرتا تھا۔ میری باتیں سن کر وہ بہت خوش ہوتا۔ کہتا "اب آئے نا' اخلاق صاحب صحیح رنگ پر"۔

"ہاں سیٹھ اکرم! میں واقعی غفلت کی زندگی گزار رہا تھا۔ روتی بسورتی زندگی جی رہا تھا۔ کیا رکھا ہے ایسی زندگی میں' آدمی جیے تو شان سے جیے"۔ میں اس کی زبان بولتا۔

"بہت اچھے' جی خوش کر دیا"۔ اپنی زبان میں گفتگو سن کر اس کا جی خوش ہو جاتا۔

"کیا ہوا پنڈی والے مال کا؟" میں نے موضوع بدلا۔

"وہ تو بہ حفاظت پہنچ گیا' آپ نے ترکیب ہی ایسی بتائی' پنڈی سے کراچی تک بذریعہ کار سفر۔ کار میں دو میاں بیوی' تین بچے' ایک ڈرائیور' ایسی گاڑی کو پولیس روک کر بھلا کیوں تلاشی لیتی۔ اسے کیا معلوم تھا کہ یہ ظاہر شریف نظر آنے والی فیملی گاڑی میں بیس کلو ہیروئن لے جا رہی ہے۔ بھئی اخلاق صاحب! میں آپ کو مان گیا' اب اگلے ٹرپ کی بات کریں"۔

"اگلے ٹرپ میں' ایک خاندان اسلام آباد سے کراچی آئے گا۔ ٹرک میں گھر کا سامان ہوگا اور اسی گھر کے سامان میں ہمارا مال ہوگا۔ ٹرک پر دو معصوم صورت آدمی ہوں گے۔ معصوم صورتیں شرافت کی ضمانت ہوں گی۔ گھریلو سامان سے بھرے ٹرک اور شریف اہل خانہ کو دیکھ کر پولیس کبھی ایسے ٹرک پر ہاتھ نہیں ڈالے گی"۔

میری بتائی ہوئی ترکیب پر عمل کر کے دوسرا ٹرپ بھی کامیاب ثابت ہوا۔ دو ڈھائی من ہیروئن بہ آسانی اس کی تحویل میں آ گئی۔ دس پندرہ دن میں وہ لاکھوں ڈالر کا مالک بن گیا۔ وہ بہت خوش تھا اور اس کی خوشی دیکھ کر میرے تن بدن میں آگ لگتی تھی۔ اس نے بالواسطہ مجھے

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

شریک جرم کر لیا تھا۔

اب اس سے میری خاصی بے تکلفی ہو گئی تھی۔

وہ میرے پاس گھنٹوں بیٹھا' اپنی زندگی کی حکایات سناتا رہتا۔ اپنے آئندہ کے پلان بناتا رہتا۔ اس کے بارے میں مجھے اچھی خاصی معلومات حاصل ہو گئی تھیں۔

سب سے حیرت کی بات یہ تھی کہ اس نے ابھی تک شادی نہیں کی تھی' اور شادی کی اسے کوئی دلچسپی بھی نہ تھی۔ انجم آرا جیسی لڑکیاں اس کے آس پاس رہتی تھیں' پھر اسے شادی کا جھنجھٹ پالنے کی کیا ضرورت تھی۔ انجم آرا اس کی پرائیویٹ سیکرٹری تھی۔ سیٹھ اکرم کے پاس کئی دفتر تھے۔ ظاہر ہے' ہر دفتر میں ایک سیکرٹری بھی رہی ہو گی۔ سیٹھ اکرم اس دنیا میں تنہا تھا۔ والدین کا بچپن میں انتقال ہو گیا تھا۔ ادھر ادھر رشتے داروں میں پل کر جوان ہوا۔ زندگی میں اس نے ٹھوکریں ہی ٹھوکریں کھائیں۔ اس نے اپنے طور پر محنت کی۔ کچھ پڑھا لکھا اور ایک سرکاری محکمے میں کلرک ہو گیا۔ زندگی نے اسے ایک سبق دیا۔ اس نے دیکھا کہ جہاں پیسہ تھا' وہاں عزت تھی' جہاں غربت تھی' وہاں ذلت تھی۔ اس نے بہت ذلتیں اٹھائیں۔ تب اس کے دل میں دولت پھانس بن کر چبھ گئی۔ اس نے راتوں رات امیر بننے کی ٹھان لی۔ حلال اور حرام کی تمیز اس نے ذہن سے جھٹک دی' پھر وہ برے راستوں پر چل پڑا اور آج تک انہیں راستوں پر گامزن تھا۔

میں آہستہ آہستہ اس کے دل میں گھر کرتا جا رہا تھا۔ اب میں ایک کمرے میں قید نہ رہا تھا۔ اوپر کی پوری منزل میرے لیے کھول دی گئی تھی۔ میں آزادی سے گھوم پھر سکتا تھا' لیکن نیچے جانے کا راستہ اب بھی بند تھا۔

میں نے اپنے قید و بند پر کبھی اعتراض نہیں کیا تھا۔ اب تو میں ہر وقت اس سے دولت کی باتیں کرتا تھا۔ میں اب ایک پرتعیش زندگی گزارنا چاہتا تھا۔ اب مجھے اپنی بیوی بری لگنے لگی تھی۔ میں کسی انجم آرا جیسی لڑکی سے شادی کا خواہش مند تھا۔ میرے بتائے ہوئے آئیڈیاز پر مجھے بھاری معاوضہ مل رہا تھا۔ میں ان روپوں کو دیکھ کر خوشی کا اظہار کرتا تو سیٹھ اکرم میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہتا۔

"یہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔ اخلاق صاحب! آپ دیکھتے جایئے' میں آپ کے لیے کیا کرتا ہوں۔ آپ میرا دماغ ہیں"۔

میں واقعی اس کا دماغ تھا۔ میں نے اسے اسمگلنگ کے ایسے ایسے طریقے بتائے تھے کہ وہ حیران ہو جاتا تھا۔ حیرت مجھے خود اپنے آپ پر بھی ہوئی تھی۔ میں اگر منفی راستوں پر چل پڑوں تو اسمگلنگ کی دنیا میں تہلکہ مچا دوں۔

سیٹھ اکرم آخری داؤ کے چکر میں تھا۔ میرے بتائے ہوئے راستوں پر چل کر اس

نے اندرون ملک سے خاصی ہیروئن اکٹھی کر لی تھی۔ اب اسے بیرون ملک اسمگل کرنے کا مسئلہ درپیش تھا۔ تب میں نے اسے ہیروئن کی اگربتی بنانے کا مشورہ دیا۔

اس نے فوراً اس پر عمل کیا اور بڑی مقدار میں اگربتیوں کی صورت' بیرون ملک ہیروئن ایکسپورٹ کر دی اور یہ مال بہ حفاظت پارٹی کے پاس پہنچ گیا۔

جب مال کی وصولیابی کا ٹیلکس سیٹھ اکرم کو ملا تو وہ خوشی سے جھوم اٹھا۔ وہ فوراً میرے پاس آیا اور اس نے آتے ہی میرے دونوں ہاتھ چوم لیے۔ "مان گئے استاد"۔

ہاں' وہ وقت اب زیادہ دور نہیں' جب تم میری استادی کا ایک ایسا ہاتھ دیکھو گے کہ تمہارا جی خوش ہو جائے گا۔ یہ بات میں نے اپنے دل میں سوچی۔

اس دن وہ مجھے اپنے ساتھ گھمانے لے گیا۔ اس نے مجھے اپنے تمام کاروباری دفاتر دکھائے' اپنا بنگلا دکھایا۔ ایک فائیو سٹار ہوٹل میں مجھے کھانا کھلایا۔ اس کے بعد وہ مجھے ایک خفیہ جگہ لے گیا جہاں عیاشی کے تمام سامان مہیا تھے۔ یہ ایک بڑا جوا گھر تھا۔

اس دن سیٹھ اکرم نے دل بھر کر جوا کھیلا اور میرا خیال ہے کہ چار پانچ لاکھ روپے ہارے۔ یہ چار پانچ لاکھ روپے اس نے اس انداز سے ہارے جیسے چار پانچ ہزار ہارا ہوں۔ بعض وقت دولت کی فراوانی' دولت کو کتنا ہیچ کر دیتی ہے۔

سیٹھ اکرم نے اس خفیہ جوئے گھر میں داخل ہوتے ہوئے میری جیبوں میں نوٹوں کی گڈیاں ٹھونس دی تھیں لیکن مجھے جوئے سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ میں نے یہاں کی کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا۔ اس کو بھی نہیں جس نے آدم کو جنت سے نکلوایا تھا۔

رات گئے اس نے مجھے گلشن کے بنگلے پر چھوڑا اور اگلی صبح ملاقات کا کہہ کر چلا گیا۔

صبح تک مجھے اس کے لیے ایک آخری منصوبہ اور تیار کرنا تھا۔

وہ ایک ایسے ملک میں ہیروئن اسمگل کرنا چاہتا تھا' جہاں ہیروئن کی قیمت سب سے زیادہ تھی۔ میں رات بھر اس پلان پر غور کرتا رہا۔ آخر میں کسی نتیجے پر پہنچ ہی گیا۔

صبح کو جب وہ مجھ سے ملنے آیا تو میں نے اس کے سامنے منصوبہ رکھا۔ میرا منصوبہ سن کر وہ حسب معمول خوش ہوا اور یوں خوبصورت پیکنگ میں ہیروئن کو چاکلیٹ کے روپ میں اسمگل کر دیا گیا۔

جب تک وہاں سے مال کے بہ حفاظت پہنچنے کی اطلاع نہیں آ گئی سیٹھ اکرم' فکرمند اور بے چین گھومتا رہا۔ کئی مرتبہ وہ میرے پاس بھی آیا۔

"کیا ہو گا؟" پریشانی اس کے چہرے سے پھوٹی پڑ رہی تھی۔

"کچھ نہیں ہو گا مالہ بہ حفاظت پہنچ جائے گا"۔

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

اور پھر ہوا بھی یہی۔ مال کے بہ حفاظت پہنچ جانے کی جیسے ہی اطلاع سیٹھ اکرم کو ملی وہ خوشی سے رقص کرا اٹھا' بھاگ کر میرے پاس آیا اور مجھ سے لپٹ گیا۔ خوشی کے مارے اس کے منہ سے لفظ بھی ٹھیک طرح نہیں نکل رہے تھے۔

اس کا آخری داؤ کامیاب رہا۔ اب وہ کروڑوں ڈالر کا مالک ہو گیا تھا۔

وہ مجھے اپنا دماغ کہتا تھا اور میں تھا بھی واقعی اس کا دماغ۔ میرے بتائے ہوئے منصوبوں پر عمل کر کے اس نے بے شمار کامیابیاں حاصل کی تھیں' لیکن اب میرا کام ختم ہو چکا تھا۔ اس نے بہت کچھ کما لیا تھا۔ اتنا کہ وہ پوری زندگی شہزادوں کی طرح گزار سکتا تھا۔ اس کی دولت کئی ملکوں میں جمع تھی۔ اب صرف دولت کو سمیٹ کر کسی پسندیدہ ملک میں رہائش پذیر ہو جانا تھا بس اتنا ہی کام باقی رہ گیا تھا اور یہ کام اب اسی کے کرنے کا تھا۔

البتہ ایک کام ضرور ایسا تھا جو میرے کرنے کا تھا' جس طرح اس نے اپنے آخری داؤ میں کامیابی حاصل کر لی تھی' ویسے ہی مجھے بھی اب ایک آخری داؤ لگانا تھا اور کامیابی حاصل کرنا تھی۔

اس نے ملک چھوڑتے ہوئے اپنے وعدے کیمطابق مجھے بڑے انعام و اکرام سے نوازا۔ اس نے اس شہر میں موجود تمام کاروبار میرے سپرد کر دیا۔ گلشن کا یہ بنگلہ جہاں مجھے قید رکھا گیا تھا' اس نے مجھے سونپ دیا۔ اسمگلنگ کا کام جاری رکھنے کے لیے اس نے اندرون ملک تمام پارٹیوں کے پتے' ٹھکانوں سے مجھے آگاہ کر دیا۔

سب سے پہلے اس نے دبئی جانا تھا۔ وہاں سے پیسے سمیٹ کر لندن اور پھر پیرس۔ میں اس کے ملک چھوڑنے کی وجہ سے بہ ظاہر بہت رنجیدہ تھا۔ اس اثناء میں اس سے اچھی خاصی دوستی ہو گئی تھی۔ وہ مجھ پر بہت اعتماد کرنے لگا تھا۔ اس نے اس شہر کا راج پاٹ میرے حوالے کر دیا تھا۔ میں اس کی ان نوازشات سے اس کا بہت احسان مند تھا۔

''سیٹھ اکرم! میں چاہتا ہوں' آپ کے ساتھ دبئی چلوں۔ جب آپ وہاں سے لندن جائیں گے تو میں واپس لوٹ آؤں گا۔ اس طرح کچھ دن اور آپ کا ساتھ رہے گا' ورنہ اب کے بچھڑے پھر جانے کب ملیں؟'' میں نے بھیگی آنکھوں سے کہا۔

''ہاں' ٹھیک ہے' آپ میرے ساتھ چلیں' وہاں میں آپ کو ایک پارٹی سے بھی ملا دوں گا' یہ ملک میں ضرور چھوڑ رہا ہوں' لیکن آپ مجھے ہمیشہ یاد رہیں گے' مجھ سے رابطہ رکھنا۔ جب بھی میری ضرورت محسوس ہو' مجھے لکھ دینا' میں آپ کو پیرس بلا لوں گا''۔ اس نے کہا۔

اس طرح خلوص دکھا کر میں نے اس کے ساتھ دبئی جانے کا پروگرام بنا لیا۔

اگرچہ اب مجھ پر قید و بند کی پابندی نہ رہی تھی' لیکن میں نے قید سے آزاد ہونے کے

باوجود اپنا پنجرہ نہ چھوڑا تھا۔ میں نے خود کو اس پرندے کی طرح ظاہر کیا تھا جو قید کا اتنا عادی ہو جاتا ہے کہ کھلا پنجرہ دیکھ کر بھی دروازے سے منہ موڑ لیتا ہے۔ گویا میں نے وفا شعاری کی بلندیوں کو چھو لیا تھا۔

دبئی جانے کے لیے جب پاسپورٹ کی ضرورت پڑی تو میں نے خط لکھ کر اپنے گھر سے پاسپورٹ منگوا لیا اور خط کے آخر میں ایک جملہ لکھا ''فکر نہ کرنا'' اچھے دن دور نہیں ہیں۔

میری ان باتوں سے سیٹھ اکرم کو بہت متاثر کیا۔ وہ مجھ پر اندھا اعتماد کرنے لگا۔ اس کے ذہن میں یہ بات اچھی طرح بیٹھ گئی کہ میں اس کے رنگ میں رنگ گیا ہوں' پکا مجرم بن گیا ہوں۔

☆.....☆.....☆

اس دن سہ پہر کو جب میں نے اپنے گھر کی گھنٹی پر ہاتھ رکھا تو مجھے اس گھر سے جدا ہوئے پورے تین ماہ ہو چکے تھے۔ نوے دن سے میں نے اپنی بیوی پروین کی شکل نہیں دیکھی تھی۔ مجھے اپنی بیوی سے بہت محبت تھی۔ اس محبت کا ایک ثبوت تو یہ تھا کہ اولاد نہ ہونے کے باوجود میں نے اسے نہیں چھوڑا تھا۔ جب کہ یہ بات پروین بھی جانتی تھی اور میں بھی واقف تھا کہ اولاد سے محرومی میں قصور وار وہ خود ہے' لیکن اس کی اس معذوری سے میں نے کبھی فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ میرے پاس کون سی جائیداد رکھی تھی' کون سے خزانے گڑھے ہوئے تھے جو میں وارث کے لیے پریشان ہوتا۔

ایک منٹ کے بعد جب دروازہ کھلا تو میرے سامنے پروین کھڑی تھی۔ اس نے مجھے یوں اچانک دروازے پر پایا تو اپنے جذبات پر قابو نہ پا سکی۔ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ اس نے اپنے دوپٹے کا گولا سا بنا کر اپنے سینے کو دبا لیا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

''یہ تم ہو اخلاق؟''

''ہاں' یہ میں، ہوں پروین''۔ میں نے شگفتہ لہجے میں کہا۔

''تم کہاں چلے گئے تھے؟'' اس کی آنکھوں سے ٹپاٹپ آنسو گر رہے تھے۔

''میں دبئی چلا گیا تھا''۔ میں نے زینہ چڑھتے ہوئے کہا۔ ''آؤ' اوپر آؤ''۔

گھر آ کر مجھے عجیب سا سکون محسوس ہوا۔

اپنا گھر' اپنا گھر ہوتا ہے۔ حالانکہ ان تین ماہ میں' میں نے بڑی پرآسائش زندگی گزاری تھی۔ خوبصورت رہائش گاہ کے ساتھ مجھے ہر وہ چیز میسر تھی' جس کی مجھے خواہش تھی' اس کے باوجود اپنے گھر آ کر ایسا لگا جیسے میں کسی جنگل میں زندگی گزار کر آ رہا ہوں۔ میں نے گھر کا ایک ایک گوشہ' ایک ایک کونا دیکھ ڈالا۔ گھر کی ہر چیز جیسے مجھے دیکھتی ہوئی محسوس ہوئی' جیسے پوچھتی ہو' کہاں رہے اتنے دن؟

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

میں نے بیڈ روم میں آ کر ایک گہرا اور ٹھنڈا سانس لیا پھر میں بیڈ پر لیٹ گیا اور پرسکون انداز میں آنکھیں بند کر لیں۔

"وہ کون لوگ تھے' تمھیں کیوں اغوا کیا گیا تھا' یہ کیسا اغوا تھا؟"

"یہ دنیا کا سب سے انوکھا اغوا تھا' اس اغوا میں اغوا کنندگان نے تاوان لینے کے بجائے تاوان ادا کیا' وہ پچاس ہزار روپے تو تم نے خرچ کر لیے ہوں گے؟" میں نے آنکھیں بند کیے کیے پوچھا۔

"تم نے مجھے ایسا سمجھا ہے اخلاق' ہائے! تم مجھے کبھی نہیں سمجھ پاؤ گے۔ ان پیسوں میں سے میں نے ایک روپیہ بھی خرچ نہیں کیا' وہ بہ حفاظت میرے پاس موجود ہیں"۔

"مجھے یہ سن کر خوشی ہوئی۔" میں نے آنکھیں کھول کر اس کی طرف دیکھا۔

"تم دبئی کیوں گئے تھے؟" اس نے مجھے مشکوک انداز میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "جیسے گئے تھے' ویسے ہی آئے ہو..... یا وہاں سے کچھ بن کر آئے ہو"۔

"وہاں سے میں بہت کچھ بن کر آیا ہوں' یوں سمجھو کہ میں نوے دن میں کروڑ پتی بن گیا ہوں"۔ میں نے بیڈ سے اٹھتے ہوئے اسے بتایا۔ "اب میں بقول تمھارے کنگال مصنف نہیں رہا"۔

پھر میں نے اپنی کمر کے پیچھے تکیہ رکھ کر ٹیک لگا لی اور پروین سے چائے بنانے کو کہا۔ جب وہ چائے بنا کر لے آئی تو میں نے اسے نوے دن کی روداد سنانی شروع کی۔ جیسے جیسے میری سرگزشت آگے بڑھتی جاتی' وہ حیران ہو ہو کر مجھے دیکھتی جاتی۔

جب میری روداد ختم ہوئی تو اس نے عجیب انداز میں خوش ہو کر کہا۔ "ہائے' اتنا کچھ تمھارے نام کر گیا سیٹھ اکرم! تم اس دولت کا کیا کرو گے؟"

یہ ایک ایسا سوال تھا جس کا مجھے فوری طور پر کوئی جواب دینا تھا۔ میں نے گھر سے نکل کر ایک قریب پبلک کال بوتھ سے شیر خان' کو ٹیلی فون کیا۔ "میں ساڑھے سات بجے بنگلے پر پہنچوں گا' تم سلامت خان' عاشق حسین اور انجم آرا کو جہاں بھی وہ ہوں' اکٹھا کرو۔"

شیر خان نے بڑے مؤدبانہ لہجے میں کہا۔ "جی سر"۔ میں نے ریسیور کریڈل پر رکھتے ہوئے چشم تصور سے شیر خان کا پسینے میں تر چہرہ دیکھا' میرے اس حکم کے بعد جانے اس نے کتنی بار اپنے چہرے کا پسینہ پونچھا ہوگا۔

میں ٹھیک ساڑھے سات بجے گلشن والے بنگلے پر پہنچ گیا۔ میں جب ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تو سب لوگ مجھے دیکھ کر کھڑے ہو گئے۔ میں نے "انھیں بیٹھنے کو کہا۔ ان سب کے چہروں پر کچھ الجھن سی تھی۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ میں نے انھیں کیا کہنے کے لیے بلایا ہے اس

وقت۔

جب میں نے انھیں یہاں بلانے کا مقصد بتایا تو ان کے چہروں پر خوشیاں رقص کرنے لگیں۔ ان کا بس چلتا تو میرے قدموں میں گر پڑتے۔ ایسی ہی بات کہی تھی میں نے۔

میں نے سلامت خان کو گارمنٹ فیکٹری' عاشق حسین کو پلاسٹک فیکٹری بخش دی تھی اور انجم آرا کو یہ گلشن والا بنگلا مع سامان دے دیا اور شیر خان کے حوالے وہ نقد رقم کر دی جو سیٹھ اکرم مجھے بطور معاوضہ دیتا رہا تھا۔ یہ رقم آٹھ دس لاکھ سے کسی طرح کم نہیں تھی۔

یہ سب دے کر میں نے ان سے حلف لیا کہ آئندہ وہ کسی غیر قانونی کاروبار میں ملوث نہیں ہوں گے۔ انہوں نے صدق دل سے حلف اٹھایا۔

پھر جب رات کے نو بجے میں اپنے گھر پہنچا تو حسب سابق بقول اپنی بیوی' کنگال مصنف تھا۔ اس مادہ پرست زمانے میں ممکن ہے' یہ بات لوگوں کو کچھ عجیب سی لگے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہر زمانے میں کچھ میرے جیسے بے وقوف ضرور پائے جاتے ہیں۔

میں انہی بے وقوفوں میں سے ایک تھا جو ناجائز کمائی کے ڈھیروں پر ہمیشہ لات مار دیتے ہیں اور اس بات کی کبھی پروا نہیں کرتے کہ لوگ کیا کہیں گے۔

گھر آ کر میں نے پروین کو بتایا کہ میں دولت کو کس طرح ٹھکانے لگا آیا ہوں۔ میرا جواب سن کر پروین نے سر پیٹ لیا۔ "تم کبھی نہیں سدھرو گے اخلاق! کم از کم وہ پچاس ہزار روپے تو رہنے دیتے۔"

"پروین' ہمیں اب کراچی چھوڑ دینا ہے۔" میں نے اس کی بات سنی ان سنی کر کے اپنی بات کہی۔

"وہ کیوں؟" وہ حیران رہ گئی۔

"تم نہیں جانتیں؟" میں نے سوال کیا ہاں' تم کہاں جانتی ہو گی"۔ خود ہی جواب دیا۔ "میں نے تمھیں سیٹھ اکرم کا انجام تو بتایا ہی نہیں۔"

"سیٹھ اکرم کا انجام تو مجھے معلوم ہے' وہ اربوں روپیہ لے کر نکل گیا۔ اب ساری زندگی عیش کرے گا"۔ اس نے چمکتی آنکھوں سے کہا۔

"عیش تو وہ اس وقت کرے گا' جب جیل سے چھوٹے گا"۔ میں نے تیر چھوڑا۔

"کیا وہ پکڑا گیا؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں' وہ پکڑا گیا اور اسے میں نے گرفتار کروایا"۔ میں نے انکشاف کیا۔

"تم نے! وہ کیسے؟" وہ حیران رہ گئی۔

"کبھی کبھی یوں ہوتا ہے کہ پورا ہاتھی نکل جاتا ہے' پر اس کی دم اٹک جاتی ہے۔ سیٹھ

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

اکرم کے ساتھ بھی کچھ اسی طرح کا معاملہ ہوا' وہ اپنی کامیاب منصوبہ بندی پر بہت خوش تھا اور آگے کے خواب دیکھ رہا تھا لیکن وہ خواب میں نے اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈلوا کر چکنا چور کر دیئے۔ سیٹھ اکرم نے اب تک جانے کتنے من ہیروئن ادھر سے ادھر کر دی تھی' اور اس کا کوئی کچھ نہ بگاڑ پایا تھا' لیکن جب اسی کا مقدر بگڑنے پر آیا تو محض پچاس گرام ہیروئن نے اس کا سارا مستقبل ستیاناس کر دیا۔ یعنی ہاتھی کو چیونٹی نے پچھاڑ دیا۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"لیکن یہ سب ہوا کیسے؟" وہ اب بھی حیران تھی۔

"یہ سب ہوا ایسے کہ ایئر پورٹ کسٹم پر اس کے سگریٹ کے پیکٹ سے ہیروئن کی ایک چھوٹی سی تھیلی برآمد ہوگئی۔ ہاں' بیچ میں نوکومت' میں بتاتا ہوں۔ سیٹھ اکرم کی ایک عادت تھی کہ وہ سگریٹ کا پیکٹ ہمیشہ اپنے ہاتھ میں رکھتا تھا۔ تم جانتی ہو کہ میں سگریٹ نہیں پیتا لیکن سیٹھ اکرم اصرار کر کے مجھے ایک دو سگریٹ ضرور پلا دیا کرتا تھا۔ ہیروئن حاصل کرنا' میرے لیے کوئی مسئلہ نہ تھا۔ اس بنگلے کے تہ خانے میں ہیروئن کا پورا گودام موجود تھا۔ یہ ہیروئن میں نے اسی برانڈ کے سگریٹ کے پیکٹ میں رکھ لی جو وہ پیتا تھا۔ اس پیکٹ میں چند سگریٹ بھی تھے۔ سامان کا انتظار کرتے ہوئے میں نے اس سے سگریٹ مانگا' اس نے فوراً پیکٹ میرے حوالے کر دیا۔ میں نے سگریٹ نکال کر اس کا پیکٹ اپنے کوٹ کی جیب میں ڈالا اور جیب سے دوسرا پیکٹ نکال کر اس کے حوالے کر دیا۔ اس نے مجھ سے پیکٹ لے کر اپنے ہاتھ میں دبا لیا۔ اس کی نظریں آتے ہوئے سامان پر تھیں۔ سامان ہمارے پاس کوئی خاص نہ تھا' بس ایک سوٹ کیس اور ایک ایک بریف کیس تھا۔ کاؤنٹر پر اس نے اپنا سامان رکھ کر پورے اطمینان سے سگریٹ کا پیکٹ کھولا سگریٹ نکالتے نکالتے جیسے اسے سانپ سونگھ گیا۔ اس نے پیکٹ میں ہیروئن کی رکھی ہوئی تھیلی دیکھ لی تھی۔ اس نے سگریٹ نکالے بغیر پیکٹ بند کیا اور خاموشی سے فرش پر پھینک دیا۔ سگریٹ کا پیکٹ فرش پر پھینکتے ہی ایک سکیورٹی افسر نے اسے آ دبوچا۔ اب فرار کے تمام راستے بند ہو چکے تھے۔ موت کا سوداگر نہ جانے کب سے معصوم لوگوں میں موت تقسیم کر رہا تھا' آج خود ہی اس موت کا شکار ہو گیا تھا سگریٹ کے پیکٹ سے تو ہیروئن برآمد ہوئی ہی تھی لیکن مجھے معلوم تھا کہ اس کے بریف کیس میں کچھ ایسے خفیہ کاغذات تھے جن کا باریک بینی سے مطالعہ کرنے پر اسے ایک بین الاقوامی اسمگلر ثابت کرنا کوئی مشکل کام نہ تھا۔ اس کے ہاتھ میں ہتھکڑی دیکھ کر مجھے بے حد خوشی ہوئی۔"

"تم بھی عجیب آدمی ہو' اسے گرفتار کروانے کے لیے خواہ مخواہ دبئی کا سفر کیا' یہ کام تو تم اپنے ملک میں بھی کروا سکتے تھے جب کہ وہ تمہارا دوست بن گیا تھا اور تمہارے پاس اس کے خلاف ٹھوس ثبوت مہیا تھے۔"

اس کی یہ بات سن کر میں نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور بہت دیر تک ہنستا رہا۔ یہاں تک کہ ہنستے ہنستے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ تب میں نے اپنی آنسو بھری آنکھوں سے اسے دیکھا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "اپنے ملک میں اسے کون پکڑتا۔ یہاں تو رشوت لینے والا بھی رشوت دے کر چھوٹ جاتا ہے۔ میں اگر سارے ثبوت یہاں کی پولیس کو فراہم کر دیتا تو بھی وہ نہ پکڑا جاتا' البتہ اس کے گروہ کے دو چار لوگ ضرور پکڑے جاتے اور ہو سکتا ہے' انہی پکڑے جانے والوں میں' میں بھی ہوتا۔ اب تمہاری سمجھ میں آیا کہ میں نے دبئی تک کا سفر اس کے ساتھ کیوں کیا۔ وہاں کے قوانین بہت سخت ہیں۔ قوانین کے ساتھ' قانون کے محافظ بھی سخت ہیں۔ اب وہ وہاں سے کبھی نہ آ سکے گا' اور اتفاق سے وہاں سے واپس آ گیا تو یہاں آ کر وہ سب سے پہلے مجھے تلاش کرے گا' لہٰذا ہمیں فوراً یہاں سے چلے جانا چاہیے"۔

"لیکن ہم جائیں گے کہاں؟" پروین نے فکر مند ہو کر کہا۔

اس مسئلہ کا حل بھی بالآخر مجھے نکالنا پڑا۔

میرے ایک ہم زلف' اندرون سندھ' ایک گوٹھ میں آباد تھے۔ چھوٹے موٹے زمیندار تھے۔ میں نے ادھر کا رخ کیا' وہ ہم دونوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ ہم ہنگاموں بھرے شہر کو مستقل چھوڑ کر آئے ہیں تو مزید خوش ہوئے۔

ایک مثل مشہور ہے کہ اگر کوئی غم نہ ہو تو وہ بکری پال لے۔ میری ننھی جان کو کیونکہ خاصے غم لگے ہوئے تھے' لہٰذا میں نے بکری کو چھوڑ کر مرغیاں پال لیں اور اس میں خاصا کامیاب رہا۔ میرے سارے غم دور ہو گئے۔

اب میں نے کہانیاں لکھنے سے توبہ کر لی ہے۔ مرغیوں کے ساتھ بڑی پرسکون زندگی گزار رہا ہوں' لیکن سیٹھ اکرم کے ساتھ گزارے ہوئے وہ نوے دن اب بھی مجھے یاد آ جاتے ہیں' تو میں خوفزدہ ہو جاتا ہوں۔

☆.....☆.....☆

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

عامل کامل

ان کی ہنسوں کی جوڑی مشہور تھی۔

وہ کہیں بھی جاتے' کہیں سے گزرتے' جو بھی انہیں دیکھتا' زیرلب ضرور مسکراتا۔ وہ تھے ہی ایسے۔ ان میں ایک کا نام کامل تھا تو دوسرے کا عامل۔ ان دونوں کا نام بھی ہم قافیہ تھا۔ نام ہی ان کا ''ہم قافیہ'' نہیں تھا بلکہ کام بھی ''ہم قافیہ'' تھا۔ وہ دونوں ایک ہی کام کرتے تھے۔

جو لوگ انہیں قریب سے نہیں جانتے تھے' وہ انہیں جڑواں بھائی سمجھتے تھے' لیکن وہ جڑواں بھائی نہیں تھے۔ ان کے درمیان خون کا کوئی رشتہ نہ تھا۔ وہ آپس میں رشتے دار بھی نہ تھے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے دوست تھے۔

ایک کا پورا نام کامل صدیقی اور دوسرے کا عامل قریشی تھا۔ کامل اور عامل کی عمروں میں چار پانچ سال کا فرق تھا۔ کامل بڑا تھا اور عامل چھوٹا' لیکن تیزی طراری میں عامل بڑا تھا۔

وہ دونوں ایک سے کپڑے پہنتے تھے۔ نہ صرف کپڑے یکساں ہوتے بلکہ جوتے بھی ایک ڈیزائن' ایک رنگ کے ہوتے۔ ان کے ہاتھوں پر بندھی ہوئی گھڑیاں اور انگلیوں میں پہنی ہوئی انگوٹھیاں بھی ایک طرح کی ہوتیں۔

ہاں' ان کے گھر الگ الگ تھے حالانکہ انہیں بھی ایک ہونا چاہئے تھا' ان کی بیویاں الگ الگ تھیں' کچھ شریر لوگوں کے خیال میں انہیں بھی ایک.....

ویسے دونوں کی بیویوں میں ایک قدر مشترک تھی۔ وہ دونوں آپس میں سگی بہنیں تو نہ تھیں' لیکن ان دونوں کے درمیان سگی بہنوں جیسی محبت تھی۔ ان دونوں میں قدر مشترک یہ تھی کہ دونوں کالج میں ہم جماعت رہی تھیں۔ شادی کے بعد جب دونوں کو معلوم ہوا' ان کے شوہر آپس میں ایک دوسرے کے جگری یار ہیں تو ان کی پچھلی محبت مزید مضبوط ہوگئی' وہ دوست تو تھیں ہی' اب ایک دوسرے کی سگی بہنوں جیسی بن گئیں۔ انہوں نے اپنے شوہروں کی دوستی میں دراڑیں ڈالنے کی کوشش نہ کی بلکہ دوستی کے ان رشتوں کو تقویت پہنچائی۔

ان دونوں کے گھر الگ الگ ضرور تھے' لیکن ان کے پاس ایک گھر ایسا بھی تھا جو دونوں کا مشترکہ تھا اور اس گھر کا ان کی بیویوں کو علم نہ تھا۔ وہ دونوں گلشن کے علاقے میں رہائش پذیر تھے۔ ان کے گھروں کے درمیان ایک دو کلومیٹر کا فاصلہ ہوگا' لیکن ان کا خفیہ گھر کلفٹن کے علاقے میں تھا۔ ایک لگژری فلیٹ' خوبصورت اور سجا سجایا۔ دونوں کے پاس اس فلیٹ کی الگ الگ چابیاں

تھیں۔ کبھی وہ الگ الگ آتے کبھی ساتھ ساتھ اپنے فرصت کے لمحات یہاں گزارنے آتے تھے۔

لباس کا مسئلہ وہ رات کو گھر جاتے ہوئے طے کرلیا کرتے تھے۔

''ہاں' بھئی کل کیا پہننا ہے؟'' کامل' عامل سے پوچھتا یا عامل' کامل سے پوچھتا۔

وہ دونوں زیادہ تر سفاری سوٹ پہنتے تھے۔ دونوں کے پاس بے شمار سوٹ تھے۔ ان لوگوں نے ان سوٹوں کے عجیب عجیب نام رکھے ہوئے تھے۔

''یار' وہ طارق روڈ والا سوٹ پہن لیں' اچھا' وہ مس نازیہ والا سوٹ کیسا رہے گا۔ یار وہ شوکت کے ویسے والا سوٹ کیوں نہ پہن لیں۔''

رات کو جاتے ہوئے سوٹ کا انتخاب ہو جاتا تو ٹھیک ورنہ وہ ایک دوسرے کو گھر سے ٹیلی فون کرلیا کرتے۔

''یار امینہ پتا کرنا' وہ کمینہ آج کیا پہن رہا ہے؟'' عامل اپنی بیوی سے کہتا۔

''زرینہ' ذرا معلوم تو کرو' اس جانگلوس نے آج کیا پہننا ہے؟'' کامل اپنی بیوی سے کہتا۔

پھر دونوں کی بیویاں ایک دوسرے کو ٹیلی فون کرتیں۔

''ہاں' زرینہ' یہ میں بول رہی ہوں۔'' ادھر سے ٹیلی فون اٹھائے جانے پر امینہ کہتی۔

''جی جناب بولیں' ضرور بولیں' آپ کو بولنے سے بھلا کون روک سکتا ہے۔'' زرینہ خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتی۔

''آج' کیا پہنا رہی ہو اپنے میاں کو؟'' امینہ پوچھتی۔

''جو تم کہو۔'' زرینہ بڑی محبت سے جواب دیتی۔

''وہ گرے سوٹ ٹھیک رہے گا۔''

''اری' کون سا گرے؟ گرے رنگ کے تو کئی سوٹ ہیں۔''

''وہ جس کا کپڑا' نیویارک والا دوست لایا تھا۔''

''چلو ٹھیک ہے۔''

کبھی ایسا ہوتا کہ دفتر جانے سے پہلے تیار ہو کر کوئی بھی ایک دوسرے کے گھر پہنچ جاتا۔ اور وہ اسے دیکھ کر ویسا ہی لباس زیب تن کرلیتا۔

وہ دونوں لباس کے مسئلے پر کبھی بحث نہیں کرتے تھے۔ نہ ہی ایک دوسرے پر اپنی مرضی ٹھونسنے کی کوشش کرتے تھے۔ جو ایک کہہ دیتا اسے دوسرا فوراً مان لیتا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ ان کی دوستی اتنے عرصے سے بڑی کامیابی کے ساتھ چل رہی تھی۔

ان دونوں کی دوستی کا آغاز مشہور اداکار سلطان شامی کے ذریعے ہوا تھا۔ کافی پرانی بات ہے۔ سلطان شامی ان دنوں گاڑی خریدنے کے لیے کراچی آیا ہوا تھا۔ عامل اس کے ساتھ لاہور سے آیا تھا۔ کامل اس زمانے میں کراچی کے ایک مشہور گاڑیوں کے شوروم میں بطور سیلز مین

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

ملازم تھا۔ سلطان شامی شہر کے مختلف شوروموں کا چکر لگاتا ہوا کامل کے شوروم میں پہنچا۔ عامل اس کے ساتھ تھا۔

کامل نے شامی کو کئی گاڑیاں دکھائیں' لیکن اسے کوئی پسند نہ آئی۔ کسی کا رنگ پسند نہ تھا' کسی کا ماڈل' کسی کی قیمت۔ کامل نے محسوس کیا کہ سلطان شامی کو گاڑیوں کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں ہیں' لیکن اس کے ساتھ آنے والا "چچہ" ہر گاڑی میں کوئی نہ کوئی مین میخ نکال کر اس کی رائے خراب کر رہا ہے۔ کامل کو اس پر بہت غصہ آ رہا تھا۔ وہ خواہ مخواہ بڑھ بڑھ کر بول رہا تھا اور اس کا سودا خراب کر رہا تھا۔ پہلے کامل' عامل کو شامی کا دوست سمجھا تھا' لیکن باتوں باتوں میں معلوم ہوا کہ وہ شامی کا دوست نہیں بلکہ چچہ ہے اور اس کی برادری کا آدمی ہے۔ یوں تو عامل نے رعب ڈالنے کے لیے لاہور میں اپنا شوروم بتایا تھا' لیکن کامل نے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ محض ایک سیلز مین ہے۔ اس نے سوچا' پہلے اس کا کچھ کرنا چاہئے' یہ جب تک راستے سے نہیں ہٹے گا' کام نہیں بنے گا۔

ادھر شیشے کی دیوار کے پیچھے بیٹھا' شوروم کا مالک سیٹھ حسن بھائی' بڑے غور سے کامل کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ کامل کو سودا پٹانے میں دقت پیش آ رہی تھی' کیونکہ کامل کو اس نے شوروم میں کھڑی' ہر گاڑی کے پاس جاتے ہوئے دیکھا تھا۔

سیٹھ حسن بھائی جانتا تھا کہ کامل کتنا پختہ سیلز مین ہے۔ ایک بار کسٹمر اس کے جال میں پھنس جائے تو پھر اس کا نکلنا مشکل ہوتا ہے۔ سیٹھ حسن بھائی کو دوسرے کار ڈیلروں کے ذریعے معلوم ہو چکا تھا کہ سلطان شامی شہر کے تمام بڑے شوروموں کا چکر لگا چکا ہے' لیکن ابھی تک اسے کوئی گاڑی پسند نہیں آئی۔ اس کی شدید خواہش تھی کہ اس کے شوروم سے سلطان شامی خالی ہاتھ نہ جائے۔ وہ کامل کو کامیاب دیکھنا چاہتا تھا۔

سیٹھ حسن بھائی نے اسے اشارے سے بلایا۔

کامل نے سیٹھ کا اشارہ پا کر' شوروم کے ایک اور سیلز مین منیر کو اپنے پاس بلایا' جب وہ قریب آ گیا تو اس نے اس سے کہا' "میں سیٹھ کی بات سنتا ہوں' تم ذرا پارٹی اٹینڈ کرو۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔" منیر نے کہا اور سلطان شامی کے نزدیک آ گیا۔

کامل' سیٹھ کے کیبن میں داخل ہوا تو وہ مسکرا کر بولا۔ "کامل' کیا گھپلا ہے؟"

"گھپلا تو کوئی نہیں سیٹھ۔" کامل نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"میں چاہتا ہوں کہ یہ ایکٹر یہاں سے گاڑی لیے بنا نہ جائے۔ یہ تین دن سے شہر کے شوروموں کے چکر کاٹ رہا ہے' اسے کوئی گاڑی دینے والا نہیں۔" سیٹھ حسن بھائی نے اسے چیلنج کیا۔

"میرے لیے بھی یہ شخص چیلنج بن گیا ہے' میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ اسے گاڑی لیے بنا یہاں سے نہ جانے دوں۔" کامل نے اپنے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ "لیکن اس چچے نے معاملہ خراب

کر رکھا ہے۔ جب تک یہ اس کے ساتھ رہے گا' سلطان شامی گاڑی نہ لے پائے گا۔"

"پھر کیا کرنا ہے بولو؟" سیٹھ حسن بھائی نے میز پر مکا مارا۔

"اسے کسی طرح سلطان شامی سے الگ کرنا ہے۔" کامل نے تجویز پیش کی۔

"لیکن وہ لاہور سے اس کے ساتھ چپکا ہوا آیا ہے' وہ کیسے الگ ہو گا؟" وہ سوچ میں پڑ گیا۔

"ہو گا' ضرور ہو گا۔" اس نے یقین سے کہا۔

"آ کھر کیسے؟" سیٹھ حسن بھائی نے پوچھا۔

"وہ آپ کا پرائیویٹ کیبن آخر کب کام آئے گا؟" کامل نے مسکرا کر کہا۔

"ارے گڈ آئیڈیا' کامل میں تیرے کو مان گیا' جا جرا جا کے اسے میرے پاس تو بھیج' میں اسے کھوبصورت جہنم کی سیر کراتا ہوں۔" سیٹھ حسن بھائی نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

"شوروم کی گاڑی تو اسے کوئی پسند نہیں آئی' ایک گاڑی ہے میری نظر میں' بینک کا بندہ ہے' اس کے پاس' بس آنے جانے میں زیادہ سے زیادہ تیس منٹ لگیں گے۔ آپ اس چچے کو اندر بلائیں' میں شامی کو لے کر باہر نکلتا ہوں۔"

"بالکل ٹھیک ہے' تو جا کر بھیج اسے۔"

کامل کیبن سے نکل کر اس کے دروازے پر ہی کھڑا ہو گیا۔ اس نے اشارے سے عامل کو بلایا' جب وہ نزدیک آیا تو بولا "آپ کو سیٹھ صاحب بلا رہے ہیں۔"

"مجھے!" وہ ذرا حیرانی سے بولا۔

"ہاں' جی' آپ کو۔" کامل نے اس کی حیرت دور کرتے ہوئے کہا۔

اس کے اندر جانے کے بعد کامل تیزی سے سلطان شامی کے پاس آیا اور بولا۔ "ہاں' جی' کوئی بات بنی۔"

"اونہیں بادشاہو' ہالے کوئی گل بات نہیں بنی۔" سلطان شامی بولا۔

"تے فیر تسی ساڈے نال آؤ۔" کامل نے اس کا ہاتھ پکڑا۔ "آپ کو ایک ایسی گاڑی دکھاتا ہوں کہ دیکھیں گے تو بس دیکھتے رہ جائیں گے۔"

"چلو پھر' چلو۔" سلطان شامی نے فوراً اس کے ساتھ دو چار قدم بڑھائے پھر کچھ خیال آیا' وہ رک گیا۔ "ساڈا بندہ کتھے ای' اونوں وی نال لینا جے۔"

کامل نے سامنے کیبن میں نظر ماری' وہ خالی پڑا تھا۔ سیٹھ حسن بھائی اسے اپنے پرائیویٹ کیبن میں لے جا چکا تھا۔

"شامی صاحب' وہ میرے خیال میں ٹوائلٹ گیا ہے' جتنی دیر میں وہ آئے گا اتنی دیر میں ہم گاڑی دیکھ کر آ جائیں گے۔ یہ نزدیک ہی تو ہے' آئیں جلدی آئیں' کہیں وہ بندہ نکل نہ جائیں۔" کامل نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

سلطان شامی تذبذب میں تھا کہ کیا کرے' لیکن کامل نے اسے سوچنے کا موقع بالکل نہ دیا' وہ اسے اغوا کرنے والے انداز میں شوروم سے نکال لے گیا۔

عامل کو نہیں معلوم تھا کہ سلطان فطامی کو کامل لے اڑا ہے۔ وہ اس وقت سیٹھ حسن بھائی کی مزے دار گفتگو میں محو تھا۔ سیٹھ حسن بھائی کراچی کے بارے میں اسے بتا رہا تھا۔ عامل کیونکہ پہلی بار کراچی آیا تھا' اس لیے وہ بڑی دلچسپی سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔

"اچھا' یہ باتیں تو چلتی رہیں گی' یہ بولو' کچھ پیو گے؟" سیٹھ حسن بھائی نے اسے چمکتی آنکھوں سے دیکھا۔

"سیٹھ صاحب' پئیں گے نہیں تو جئیں گے کیسے۔" عامل نے ہنس کر کہا۔ پھر میز پر پڑا ہوا شام کا اخبار اٹھا لیا' جس میں کئی نائٹ کلبوں کے اشتہار تھے اور غیر ملکی رقاصاؤں کی نیم عریاں تصاویر چھپی ہوئی تھیں۔

"سیٹھ صاحب! آپ کا شہر بڑا زبردست ہے۔" عامل کی نظر ایک اشتہار پر تھی۔

اس میں کیا شک ہے' پھر آج رات کے لیے میں' کسی نائٹ کلب میں ٹیبل بک کرا لوں؟ سیٹھ حسن بھائی نے اسے چکر دیا۔

"ایسا ہو جائے تو بہت اچھا ہو۔" عامل کی نظریں ابھی تک اشتہار پر گڑی ہوئی تھیں۔

عامل جیسا چاہتا تھا' ویسا تو نہیں ہو سکا' البتہ جیسا کامل چاہتا تھا' ویسا ہو گیا۔ کامل کو صرف آدھا گھنٹہ درکار تھا' وہ اسے مل گیا۔ سیٹھ حسن بھائی ایک چھٹا ہوا آدمی تھا' اس نے عامل کو آدھے گھنٹے تک محض اپنی باتوں میں الجھائے رکھا۔ کچھ پلایا' نہ کھلایا' نہ دکھایا۔ اپنی رنگین گفتگو کے جال میں اسے پھنسائے رکھا۔

جب اسے معلوم ہوا کہ کامل شوروم میں واپس آ گیا ہے تو وہ ایک سیکنڈ ضائع کیے بنا کھڑا ہو گیا۔

"آؤ' جرا باہر چلیں۔" وہ بولا۔

"اچھا جی۔" عامل نے بڑے مرے ہوئے لہجے میں کہا' وہ سیٹھ سے یہ نہ پوچھ سکا کہ وہ پینا پلانا کہاں ہے اور رات کو کس نائٹ کلب پہنچنا ہے اور کب؟

جب وہ پرائیویٹ کیبن سے نکل کر شیشے لگے کیبن میں آئے تو عامل نے سلطان شامی کو ایک نئی گاڑی جو اس شوروم میں نہ تھی' کے گرد چکر لگاتے دیکھا۔ اس کے چہرے سے خوشی پھوٹ رہی تھی۔ سلطان شامی کے چہرے کی خوشی دیکھ کر عامل کا چہرہ بجھ گیا۔ سیٹھ حسن بھائی نے اس کے ساتھ کیا کم کیا تھا کہ اب کامل نے بھی ہاتھ دکھا دیا تھا۔

"اوئے' توں کتھے مر گیا سی؟" عامل کیبن سے باہر آیا تو سلطان شامی نے کہا۔ "اوئے' وچ میں کیڈی شاندار گڈی لایا آں۔"

کامل کا منصوبہ کامیاب ہو گیا تھا۔ اس نے نہ صرف سلطان شامی کو گاڑی پسند کروا دی

تھی بلکہ اس کا سودا بھی ہاتھوں ہاتھ کرا دیا تھا۔ شامی کے پاس نقد رقم موجود تھی۔ اس سودے میں اس نے "ٹاپ" مارا تھا۔ وہ الگ۔

سلطان شامی خوش خوش گاڑی لے کر لاہور چلا گیا' لیکن عامل اس کے ساتھ نہ گیا۔

کراچی کی رنگینیوں نے جیسے اس کے پاؤں جکڑ لیے۔

دو تین دن کے بعد جب عامل' دوبارہ شوروم پر آیا تو کامل اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔

"ارے' تم گئے نہیں؟" کامل نے پوچھا۔

"نہیں' اب کہاں جانا؟" وہ کسی سحر زدہ معمول کی طرح بولا۔

"کیوں' بھئی' تم تو سلطان شامی کے ساتھ آئے تھے' اسے گاڑی دلانے' اسی کے ساتھ تمہیں واپس جانا تھا۔" کامل نے اسے یاد دلایا۔

"ہاں' وہ چلا گیا' میں نے اسے ٹرین کے ذریعے بھیج دیا ہے اور خود اس کے ساتھ جانے سے معذرت کر لی۔" عامل نے وضاحت کی۔

"آخر ایسا کیا ہوا؟" کامل نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر سوال کیا۔

"میں اس شہر کے سحر میں آ گیا ہوں' یہاں کی تو دنیا ہی نرالی ہے۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں اب یہیں رہوں گا۔" اس نے جواب دیا۔

"لیکن لاہور میں تو تمہارا شوروم تھا' تمہیں نے تو بتایا تھا۔" کامل نے اسے چھیڑا۔

"لاہور میں میرا کچھ نہیں ہے۔ صحیح بات تو یہ ہے کہ میرا کہیں کچھ نہیں ہے' میں بالکل اکیلا ہوں' تنہا ہوں۔" اس نے یہ بات اس قدر مایوسی سے کہی کہ کامل کے دل میں فوراً رحم آ گیا۔

کامل کی اس سے کوئی دشمنی نہ تھی بلکہ وہ پہلی نظر میں اسے اچھا لگا تھا' لیکن جب اس نے ٹانگ اڑانے کی کوشش کی تو وہ اسے برا لگا تھا۔

اب تو کوئی مسئلہ ہی نہ رہا تھا۔ سلطان شامی کو وہ گاڑی فروخت کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا اور عامل سے اس کی کوئی پیشہ ورانہ دشمنی نہ تھی۔

کامل نے اس کے گلے میں ہاتھ ڈال کر' اسے اپنے قریب کر لیا اور بولا۔ "اس قدر مایوسی کی بات' ایک سیلز مین ہو کر اس قدر مایوسانہ لہجہ۔ وہ تم نے سنا نہیں' جس کا کوئی نہیں ہوتا اس کا خدا ہوتا ہے۔"

"نہیں کامل صاحب' یہ بات غلط ہے' تنہا آدمی کا کوئی نہیں ہوتا۔ خدا بھی انہی لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے' جس کے ساتھ سب ہوں۔"

"ارے' تم تو مایوسی کی انتہا کر پہنچے ہوئے ہو' خدا سے بھی تمہارا ایمان اٹھ گیا۔"

"آپ نے میری طرح زندگی نہیں گزاری' اس لیے یہ بات کہہ رہے ہیں۔ آپ نے میری طرح زندگی گزاری ہوتی تو میرے کہے پر ایمان لے آتے۔"

"اس دنیا میں مشکلات سے ہر آدمی گزرتا ہے' لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ....."

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

"اچھا' میں یہاں آپ کی تقریر سننے نہیں آیا۔"

"پھر کیسے آنا ہوا؟"

"مجھے اس شوروم پر ملازمت مل جائے گی؟" عامل نے براہ راست سوال کیا۔

کامل نے براہ راست جواب دینے کے بجائے سیٹھ کے کیبن کی طرف دیکھا۔ وہ اس وقت فارغ بیٹھا تھا۔ کامل نے عامل کا ہاتھ پکڑا اور بولا۔ "آؤ میرے ساتھ۔"

سیٹھ حسن بھائی' کامل کے ساتھ عامل کو کیبن میں آتے دیکھ کر چونک اٹھا۔ اس نے فوراً ٹیلی فون کا ریسیور اٹھا لیا اور ایک نمبر ڈائل کرنے لگا۔ جب وہ دونوں نزدیک پہنچ گئے تو سیٹھ نے آنکھ کے اشارے سے انہیں بیٹھنے کو کہا۔

"بیٹھو۔" کامل نے عامل کو ایک کرسی پیش کی۔

سیٹھ حسن بھائی نمبر ڈائل کرتے ہوئے کامل کو مسلسل گھور رہا تھا۔ وہ اندازہ کرنا چاہ رہا تھا کہ معاملہ کیا ہے۔ کامل نے اس کی نظروں کے سوال کو سمجھ کر بڑے اطمینان سے کہا "آپ فون سے فارغ ہو جائیں تو میں بتاتا ہوں۔"

سیٹھ حسن بھائی تو فارغ ہی تھا' وہ تو یونہی نمبر گھما رہا تھا' صرف اپنی اہمیت جتانے کے لیے۔ اس نے ریسیور فوراً کریڈل پر رکھ دیا۔ "سالا پھون ملنا بھی ایک مصیبت ہے اور عامل صاحب! آپ کیسے ہو' ٹھیک تو ہو؟"

"میں ٹھیک ہوں جی۔" عامل نے مسکرانے کی کوشش کی۔

"سیٹھ' عامل صاحب اب اسی شہر میں رہنا چاہتے ہیں۔" کامل بولا۔

"جرور' جرور رہو بھائی' سوق سے رہو' یہ سہر تو بڑا کریب پرور ہے۔"

"یہ اپنے شوروم پر ملازمت چاہتے ہیں؟" کامل نے اصل موضوع کو چھیڑا۔

"ہیں۔" یہ کہہ کر سیٹھ حسن بھائی نے پھر فون اٹھا لیا اور ایک نمبر ڈائل کرنے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ پھر اس نے کچھ سوچ کر نمبر ڈائل کرنے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور ریسیور کریڈل پر ڈال کر اس نے کامل کو گھورا اور پھر سیدھے ہاتھ کو میز پر پھیلا کر انگوٹھا ہلایا۔

وہ ایک خفیہ اشارہ تھا جو اکثر گاڑیوں کی ڈیل کرتے ہوئے کام آتا تھا' کامل' سیٹھ حسن بھائی کا سب سے پسندیدہ سیلز مین تھا۔ وہ اس کی بات ٹالنے کی پوزیشن میں نہ تھے۔ پھر بھی وہ ہاں کرنے سے پہلے اس کا عندیہ جان لینا چاہتے تھے۔ اس لیے انہوں نے اشارہ کیا تھا۔ جواب میں کامل نے بھی میز پر ہاتھ رکھا اور انگوٹھا ہلایا۔

سیٹھ حسن بھائی نے انگوٹھا مخصوص انداز میں ہلا کر پوچھا تھا۔ 'تم کیا کہتے ہو؟'

کامل نے اس کا سوال سمجھ کر مخصوص انداز میں انگوٹھا گھمایا جس کا مطلب تھا۔ 'میری طرف سے او کے ہے۔'

"اچھا۔" سیٹھ حسن بھائی نے کامل کی طرف سے او کے ہو جانے پر زیر لب کہا اور پھر

عامل سے مخاطب ہوا۔ "اس سہر میں آپ کسی کو جانتے ہو؟"

"نہیں سیٹھ صاحب۔"

"پھر تمہاری جمانت کون دے گا؟" سیٹھ حسن بھائی نے یہ کہہ کر ایک مرتبہ پھر ٹیلی فون کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ پھر رک گیا۔ بات یہ ہے کہ یہ سو روم اس وقت کراچی کا سب سے بڑا سو روم ہے۔ یہاں ایک سے ایک اعلیٰ گاڑی موجود ہے اور ان کی چابیاں کی بورڈ پر لگی رہتی ہیں....."

سیٹھ حسن بھائی ابھی کچھ دیر اور بولتا' لیکن کامل نے اسے بولنے نہ دیا۔ اس نے کہا۔

"سیٹھ ان کا ذمہ میں لیتا ہوں۔"

"بس تو پھر کیا ہے' کام سروع کرو۔" سیٹھ نے خوش دلی سے کہا۔

"میری تنخواہ کیا ہو گی؟" عامل نے پوچھا۔

"ابھی' آپ کو کمیشن پر کام کرنا ہو گا' دو تین مہینے میں دیکھ لوں' پھر تنکھا بھی ملے گی۔"

یہ کہہ کر سیٹھ حسن بھائی نے پھر ٹیلی فون کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

کامل نے عامل کی طرف دیکھا اور اٹھنے کا اشارہ کیا۔

"سیٹھ صاحب' آپ کا بہت بہت شکریہ۔" عامل نے کہا۔

"ارے' میرے کائے کو سکریہ بولتے' سکریہ تو کامل کا بولو' اسی کی وجہ سے تو آپ کو یہ جگہ ملی ہے۔" سیٹھ حسن بھائی نے بڑے پیار سے کامل کو دیکھا۔

"سیٹھ آپ کا بہت شکریہ۔" کامل بڑا ممنون تھا۔

"ارے کامل' ایسا بول کر مجے سرمندہ نہ کر' جا کام کر کام۔" یہ کہہ کر سیٹھ حسن بھائی ڈائل گھمانے لگا۔

پھر کامل کو ایک کام اور کرنا پڑا۔ عامل کے پاس رہنے کے لیے کوئی جگہ نہ تھی پہلے وہ سلطان شامی کے ساتھ ایک اچھے ہوٹل میں ٹھہرا تھا اس کے جانے کے بعد وہ ایک چھوٹے سے ہوٹل میں منتقل ہو گیا اور اس چھوٹے سے ہوٹل میں اپنا مختصر سا سامان جو صرف ایک سوٹ کیس پر مشتمل تھا' رکھ کر وہ سیدھا کامل کے پاس پہنچا تھا۔

سلطان شامی کے ساتھ عامل نے کراچی کے بڑے بڑے شو روموں کی خاک چھانی تھی۔ وہ کہیں اور بھی ملازمت کے لیے جا سکتا تھا' لیکن اس نے کہیں اور جانے کے بجائے کامل کے پاس آنا پسند کیا تھا' اسے کامل بھلا آدمی لگا تھا۔ اسے پوری توقع تھی کہ وہ اس کی ضرور مدد کرے گا اور ہوا بھی یہی۔ جب وہ اس کے پاس پہنچا تو اس نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے اسے سیٹھ سے ملا دیا۔ نہ صرف اسے ملازمت دلوا دی بلکہ اس سے کہا کہ وہ اپنا سامان ہوٹل سے لے آئے۔ کامل کے پاس ان دنوں دو کمرے کا ایک چھوٹا سا فلیٹ تھا' جس میں وہ اکیلا رہائش پذیر تھا۔

عامل بڑا خوش تھا۔ وہ خود کو بڑا خوش قسمت گردان رہا تھا کہ ایک دن میں اس کے دونوں مسئلے حل ہو گئے تھے' لیکن اس کی خوش قسمتی پر قسمت مسکرا رہی تھی۔ آج جو بویا جا رہا تھا کل

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

اسے کاٹنا بھی تھا۔ اور یہ بات عامل کو معلوم تھی نہ کامل کو۔ قسمت کے چکر ہی کچھ اس طرح کے ہوتے ہیں کہ ان سے نکلنا آسان نہیں ہوتا۔

کامل کو گھر کے کاموں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ اس فلیٹ کو بس رات کا سہارا سمجھ کر استعمال کرتا تھا۔ کھانا' پینا سب باہر تھا۔ مہینوں فلیٹ میں صفائی نہ ہوتی۔ جب بہت مٹی دھول جم جاتی تو مجبوراً جھاڑو ہاتھ میں پکڑ کر الٹے سیدھے ہاتھ مارتا۔ ایسے کاموں سے اسے بہت الجھن ہوتی تھی۔ عامل نے اس فلیٹ میں آ کر اس کی کایا ہی پلٹ دی تھی۔ وہ ایک نہایت سگھڑ مرد ثابت ہوا' اس نے اس گھر کو صفائی کر کے نہ صرف چمکا دیا بلکہ اس گھر کا باورچی خانہ جو کباڑ خانہ بنا ہوا تھا' اسے مہکا دیا۔ اس باورچی خانے سے طرح طرح کی خوشبوئیں آنے لگیں۔ عامل ان مردوں میں سے تھا جن کو گھرداری کا شوق ہوتا ہے۔ وہ بہت اچھا کھانا بناتا تھا' اس کا کھانا کھا کر کامل بہت خوش ہوتا۔ وہ باہر کا کھانا کھا کھا کر اوب گیا تھا۔ اب صبح ہی صبح ناشتے میں گرما گرم چائے ملتی' خوب سکے ہوئے کرارے پراٹھے ملتے۔ صاف ستھری میز پر ناشتا لگتا تو کامل اسے بڑی پیار بھری نظروں سے دیکھتا اور مکالمہ بولتا۔

"جان' تو نے میری زندگی میں آ کر مجھ پر بڑا احسان کیا۔ تو نے اس گھر کو گلشن بنا دیا ہے۔ تیرے قدموں نے اس گھر کو کھانوں کی خوشبوؤں سے مہکا دیا ہے....."

"میری زندگی میں بہار آ گئی ہے' ہر طرف رنگ بکھر گئے ہیں' اب میں تم سے بچھڑنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ اس سے پہلے کہ یہ ظالم سماج ہم دونوں کو الگ کر دے' آؤ ہم شادی کر لیں..... کامل صاحب اب آنکھیں کھولیں' ایسے ڈائیلاگ عامل نے بہت سن رکھ ہیں۔" عامل کہتا۔

"یار عامل' کاش تو عورت ہوتا۔" اسے پیار بھری نظروں سے دیکھنا جاری رکھتا۔

"پھر کیا ہوتا؟" عامل مسکرا کر کہتا۔

"میں تجھ سے شادی کر لیتا۔"

"لیکن میں اس کے لیے راضی ہوتا' تب نا۔"

"لیکن تو کیوں راضی نہ ہوتا؟ بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ ہوتی۔"

"ایسے کامل آدمی سے شادی کر کے کیا میں اپنی قسمت پھوڑتا جس سے اٹھ کر پانی بھی نہیں پیا جاتا۔" عامل زنانہ آواز میں بولتا۔

یہ سن کر دونوں قہقہہ لگاتے۔

یہ بات بالکل صحیح تھی کہ کامل بہت کامل واقع ہوا تھا' لیکن جتنا گھریلو معاملات میں کامل تھا اتنا ہی اپنے کام میں مستعد تھا۔ وہ پارٹی پر شاہین بن کر جھپٹتا تھا اور جب تک اس پارٹی سے اپنا حصہ جو کمیشن کی صورت میں ہوتا' وصول نہ کر لیتا' کبھی نہ واپس پلٹتا۔

اب دو شاہین اکٹھے ہو گئے تھے۔ عامل اس سے بھی ایک ہاتھ آگے جا رہا تھا۔ وہ خاصا

تیز طرار آدمی تھا۔ وہ مزاجاً بہت شوخ' بات بات پر قہقہہ لگانے والا جبکہ کامل سنجیدہ طبع تھا۔ وہ دونوں مل کر ایک ہو جاتے تھے' ۔ وہ ایک دوسرے کے بغیر جیسے نامکمل تھے۔ عامل اگر لڑکی ہوتا تو یہ دنیا کا ایک خوش نصیب جوڑا ہوتا۔

ان کی دوستی دن بدن مضبوط ہوتی جا رہی تھی' گہری ہوتی رہی تھی۔ ادھر سیٹھ حسن بھائی بھی بہت خوش تھا۔ اب اس نے عامل کی تنخواہ مقرر کر دی تھی' کیونکہ اس کا کمیشن کامل کی تنخواہ سے بھی زیادہ بن رہا تھا۔ وہ دونوں کو چیتوں کی جوڑی کہنے لگا تھا۔ وہ دونوں شکار پر اس طرح جھپٹتے تھے کہ اسے قابو میں کیے بنا نہ پلٹتے۔ سیٹھ حسن بھائی خود کو بڑا ماہر سیلز مین سمجھتا تھا اور وہ تھا بھی۔ وہ اپنی گفتگو کے جال میں بندے کو ایسا پھنساتا کہ وہ گاڑی لیے بنا شوروم سے نہ نکلتا' لیکن اب یہ ہونے لگا تھا جو گھیر اس سے سیدھی نہ ہوتی' ایسی ٹیڑھی کھیر' وہ ان کے حوالے کر دیتا۔ کامل اور عامل اس ٹیڑھی کھیر کو اس طرح سیدھا کرتے کہ سیٹھ حسن بھائی دانتوں میں انگلیاں دبا کر رہ جاتا۔

ایک دن ناشتا کرتے ہوئے عامل نے کہا۔ "کامل' ایک بات تو بتا۔"

"ہاں' پوچھو۔" کامل بولا۔

"یہ ہم اتنے پیسے سیٹھ کو کما کر دیتے ہیں' آخر کیوں؟"

"وہ ہمیں تنخواہ بھی تو دیتا ہے۔"

"تنخواہ تو ہماری کمائی کی آدھی بھی نہیں دیتا۔"

"ہاں' یہ بات تو تمہاری ٹھیک ہے۔"

"اگر یہ بات میری ٹھیک ہے تو ہم اپنی توانائی سیٹھ حسن بھائی کے لیے کیوں ضائع کر رہے ہیں؟" عامل نے ایک نئی راہ دکھائی۔

"پھر ہمیں کیا کرنا چاہئے؟"

"میں یہ چاہتا ہوں کہ ہماری کمائی ہماری جیب میں آئے' کماتے ہم ہیں' کھاتا وہ ہے۔"

"لیکن یہ بھی تو سوچو کہ شوروم بھی تو اس کا ہے۔"

"ہاں' میں بہت دن سے یہی سوچ رہا ہوں' شوروم اس کا ہے' ہمارا کیوں نہیں ہے۔" عامل کی آنکھوں میں خواب لہرا رہے تھے اور نزدیک ہی ان کی تعبیر بھی تھی' وہ چمکتی ہوئی آنکھوں سے کامل کو دیکھتے ہوئے بولا۔ "یار کامل' اب ہمیں اپنا شوروم کھولنا چاہئے بلکہ تجھے تو کھول لینا چاہئے تھا۔ کتنا عرصہ ہو گیا تجھے کام کرتے۔ جب میں' اپنی اور تمہاری کمائی کو سیٹھ کے پیٹ میں جاتے ہوئے دیکھتا ہوں تو میرے آگ لگ جاتی ہے۔ یار یہ آگ تیرے کیوں نہیں لگتی؟"

"بہت لگتی ہے' لیکن شوروم کھولنے کے لیے کافی پیسہ چاہئے۔"

سیٹھ فخر بھائی' آخر کس دن کام آئے گا۔" عامل آنکھ مار کر بولا۔ "وہ پیسہ لگانے کے لیے تیار ہے۔"

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

"کیا تجھ سے اس نے بات کی تھی؟"

"ہاں' اس نے مجھ سے بات کی تھی بلکہ وہ بات تو تجھ سے بھی کئی مرتبہ کر چکا ہے۔"

"ہاں' وہ مجھ سے کر تو چکا ہے' لیکن تجھے معلوم نہیں کہ وہ اپنے سیٹھ کا دشمن نمبر ایک وہ مجھے یہاں سے توڑنے کی فکر میں رہتا ہے۔"

"مجھے معلوم ہے' اسی دشمنی سے تو ہمیں فائدہ اٹھانا ہے' بس اب تو درمیان میں بول' میری بات سن۔ تجھے سیٹھ حسن بھائی کے ساتھ کام کرتے آٹھ سال ہو گئے' لیکن اس نے تج دیا کیا؟ اگر تو اسے دو مہینے کمیشن کما کر نہ دے تو تیسرے مہینے تجھے وہ نکال باہر کرے گا۔ یہ لکھوا مجھ سے۔ تو اب یہ مروت' محبت کا چکر چھوڑ' سیٹھ فخر بھائی کو ہم لوگ پکڑتے ہیں۔ وہ پیسے لگانے تیار ہے اور ہم پارٹنر ہوں گے' ملازم نہیں' کیا سمجھا۔"

کامل کی سمجھ میں بات اچھی طرح آ گئی۔ وہ سیٹھ حسن بھائی کو چھوڑنے کے لیے تیار ہو گیا' لیکن ایک اعتراض تھا اسے۔ سیٹھ فخر بھائی کی سیٹھ حسن بھائی کے ساتھ دشمنی تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ جس شخص کا اس نے اتنے عرصے نمک کھایا' وہ اس کے دشمن کے ساتھ مل جائے۔

"گدھے پن کی باتیں مت کرو' کسی اور پارٹی کا ملنا مشکل ہے۔ ہمیں اس آفر سے فوری طور پر فائدہ اٹھانا چاہئے۔ ہاتھ میں موجود پارٹی کو چھوڑ کر نئی پارٹی کی تلاش میں' میرے نزدیک اس سے بڑی حماقت کوئی نہیں۔" عامل نے کہا۔

"یہ بات میں اس لیے کہہ رہا تھا....."

"میں جانتا ہوں' تجھے آٹھ سال سے سیٹھ حسن بھائی بے وقوف بنا رہا ہے' لیکن میں اب تجھے مزید بے وقوف نہیں بننے دوں گا' کیا تیرا جی نہیں چاہتا کہ تیرا اپنا شوروم ہو؟"

"ہاں' کیوں جی نہیں چاہتا۔"

"بس تو پھر خاموشی اختیار کر اور اپنی آنکھوں میں بے وفائی کا کاجل بھر لے اور دیکھتا کہ میں کیا کرتا ہوں۔" عامل نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

کامل کے لیے آنکھوں میں بے وفائی کا کاجل بھرنا تو مشکل تھا' لیکن اس نے خاموشی اختیار کر لی اور دیکھنے لگا کہ عامل کیا کرتا ہے۔

عامل نے بہت تیزی سے کام دکھایا۔ سب سے پہلے اس نے سیٹھ فخر بھائی سے معاہدے کی شرائط طے کیں۔ سیٹھ سرمایہ لگانے کو تیار تھا' لیکن منافع میں نصف کا حقدار بننا چاہتا تھا۔ یعنی آدھا کامل اور عامل کا اور آدھا سیٹھ فخر بھائی کا' لیکن عامل اڑ گیا۔ وہ جانتا تھا کہ سیٹھ فخر بھائی سیٹھ حسن بھائی کو نیچا دکھانے کے لیے' ابھی اور نیچے آ سکتا ہے اس لیے اس نے تجویز پیش کی کہ سرمایہ بے شک آپ کا ہو گا' لیکن منافع میں تینوں برابر کے حصے دار ہوں گے۔

تھوڑے سے بحث و مباحثے کے بعد سیٹھ فخر بھائی نے یہ تجویز مان لی۔ اس تجویز کی وجہ سے اس کا منافع ضرور کم ہو گیا تھا' لیکن نقصان کوئی نہ تھا۔ ایک تیر سے دو شکار ہو رہے تھے۔

کاروبار چل رہا تھا اور سیٹھ حسن بھائی سکڑ رہا تھا۔

طارق روڈ پر ایک مناسب جگہ دیکھ کر شوروم کھول لیا گیا اسے بہت خوبصورتی سے سجایا جانے لگا۔ ابھی شوروم پر کام جاری تھا کہ سیٹھ حسن بھائی کو کہیں سے بھنک مل گئی۔ دونوں نے شوروم کھولنے کی بات کو بالکل راز رکھا تھا اور انہوں نے سوچا تھا کہ شوروم کے افتتاح کے دن ہی سیٹھ حسن بھائی سے بات کریں گے' لیکن ایسی باتیں بھلا کہاں چھپا کرتی ہیں۔ وہ بھی اس وقت جب دشمن ایک دوسرے کی گھات میں ہوں۔

یہ بات سیٹھ فخر بھائی نے ہی سیٹھ حسن بھائی تک پہنچائی۔ پہلے تو اسے یقین نہ آیا' لیکن جب اس نے اپنے ذرائع سے تحقیق کی تو یہ بات ثابت ہو گئی کہ واقعی طارق روڈ پر ایک شوروم کھل چکا ہے اور عنقریب اس کا افتتاح ہونے والا ہے اور کامل' عامل اس میں شراکت دار ہیں۔

یہ جان کر سیٹھ حسن بھائی کو بہت غصہ آیا اور اس سے پہلے کہ وہ دن آتا کہ کامل' عامل اس سے جانے کی اجازت چاہتے' وہ دن وہ خود ہی لے آیا۔

صبح آتے ہی اس نے دونوں کو بلا بھیجا۔ وہ شیشے کے کیبن کے بجائے اپنی ذاتی کیبن میں تھا۔ میز پر تین گلاس رکھے ہوئے تھے اور سیٹھ حسن بھائی کے ہاتھ میں بوتل تھی۔ اس نے ان دونوں کو اندر آتے دیکھا تو چہرے پر غم کے سائے لہرانے لگے۔ دکھ کے آثار اور نمایاں ہو گئے۔ اس نے بڑے مغموم لہجے میں کہا۔ "آؤ بیٹھو۔"

صورتحال دیکھ کر دونوں کو سمجھ میں فوراً آ گیا کہ حسن بھائی کو ان کے شوروم کی خبر مل گئی ہے اور اس خبر نے اس پر بجلی گرا دی ہے۔ وہ دونوں ذہنی طور پر سوال جواب کے لیے تیار ہو گئے' لیکن وہ اتنا مغموم تھا کہ اس نے شوروم سے متعلق کچھ نہ پوچھا۔ بس اتنا کہا۔

"آج تم دونوں کی میری طرف سے دعوت ہے' یہ ہماری ملاقات کا آخری دن ہے۔ آج کے بعد سے تم دونوں کا اس شوروم سے کوئی تعلق نہ رہے گا۔"

یہ بات اس نے اتنے رقت آمیز لہجے میں کہی کہ کامل کی آنکھوں میں نمی جھلکنے لگی۔ اس نے ابھی کچھ کہنا چاہا تھا کہ عامل نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا اور خود بولا۔ "کوئی بات نہیں سیٹھ' جیسی آپ کی مرضی۔"

بس پھر بات ختم ہو گئی۔ وہ دونوں یہاں سے اٹھ کر اپنے شوروم پر جا بیٹھے۔ کاروباری دنیا میں کامل کا نام نیا نہ تھا' اب تو لوگ عامل سے بھی واقف ہو گئے تھے۔ اسی لیے انہیں نئی جگہ پر کوئی دقت پیش نہ آئی۔ سب جانے پہچانے لوگ تھے' بس ٹھکانا تبدیل ہو گیا تھا۔ دونوں نے بہت محنت اور لگن سے کام کیا۔ اس کے نتیجے میں کامیابیوں نے ان کے قدم چومے۔ کامل اور عامل گاڑیوں کی خرید و فروخت کی دنیا میں معتبر نام گردانے جانے لگے۔

جب ان کے قدم اچھی طرح جم گئے تو انہوں نے سیٹھ فخر بھائی کے قدم اس شوروم سے اکھاڑ پھینکے۔ عامل تو چاہتا تھا کہ سیٹھ کا کاروبار میں لگا بنیادی سرمایہ بھی ہضم کر جائے' لیکن کامل

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

نے اصرار کر کے اس کا سرمایہ واپس کر دیا اور وہ دونوں شوروم کے مالک بن بیٹھے۔ سیٹھ فخر نے خدا کا شکر ادا کیا کہ کم از کم اس کا سرمایہ تو واپس مل گیا۔ پھر اتنے عرصے منافع ملتا رہا' وہ الگ سیٹھ فخر بھائی کسی طرح گھاٹے میں نہ تھا' لیکن پھر بھی اس نے الگ ہوتے ہوئے خوب شور کراچی کے کئی شوروم کے مالکان کو درمیان میں ڈالا اور پھر تھک ہار کر بیٹھ گیا۔ کوئی بات جو نہ بن

کامل اور عامل نے دو کمرے کا وہ چھوٹا سا فلیٹ عرصہ ہوئے چھوڑ دیا تھا۔ اب وہ اچھے علاقے کے بڑے فلیٹ میں منتقل ہو گئے تھے۔ گھر پر ایک ملازم رکھ لیا تھا جو کھانے پکانے علاوہ صفائی ستھرائی نیز چوکیداری کا کام بھی کرتا تھا۔ وہ ایک ہمہ وقتی ملازم تھا۔ چوبیس گھنٹے فلیٹ رہتا تھا۔

ادھر شوروم پر انہوں نے دو سیلز مین رکھ لیے تھے۔ اب وہ چھوٹی موٹی گاڑیوں بجائے بڑی گاڑیوں کو ڈیل کرتے تھے۔ لمبے ہاتھ مارتے تھے' ان کے تعلقات اچھے اور بڑے لوگ سے استوار ہو گئے تھے۔

دونوں کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ کنوارے ہیں' لیکن ایسا نہ تھا۔ کامل کی بہت پہ شادی ہو چکی تھی' لیکن اس کی بیوی ایک مہلک بیماری میں مبتلا ہو کر مر چکی تھی۔ اس کا انتقال شا کے چھ ماہ بعد ہی ہو گیا تھا۔ عامل نے بھی شادی کی تھی' لیکن اس کی اپنی بیوی سے بن نہ سکی۔ روز کے جھگڑوں سے تنگ آ کر' ایک دن اس نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی۔

ان شادیوں کو اتنا عرصہ گزر گیا تھا کہ وہ دونوں خود کو کنوارا ہی محسوس کرتے تھے۔ بیگم شہناز جب ان کے شوروم آتیں تو گاڑی کے علاوہ ان دونوں کی شادی کی بات ضرور کرتیں۔ مشہور سوشل ورکر تھیں۔ ہر چھ ماہ بعد گاڑی تبدیل کرنے کے علاوہ لوگوں کے شادی بیاہ کرانے سے بھی انہیں بڑی دلچسپی تھی۔

ایک دن وہ شوروم آئیں تو یہ طے کر کے آئیں کہ آج کامل' عامل میں سے کسی کو شادی کے لیے راضی کر کے رہیں گی۔ ان کے پاس ایک اچھا رشتہ تھا۔ لڑکی اور لڑکی کے گھر والے عامل کامل کو دیکھ چکے تھے' ان کو دونوں ہی پسند تھے۔

جب بیگم شہناز نے شادی کی بات چھیڑی تو حسب معمول دونوں نے ایک دوسرے کو ٹالا۔

"پہلے تم۔" عامل ہنسا۔

"پہلے تم۔" کامل مسکرایا۔

"پہلے تم' پہلے تم میں کہیں دونوں کے ہاتھ سے بیوی نہ نکل جائے۔" بیگم شہناز نے قہقہہ لگا کر کہا۔ "کامل تم بڑے ہو' اصولی طور پر پہلے تمہاری شادی ہونا چاہئے۔"

"یہ ضروری تو نہیں ہے' بعض اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ بڑا کسی وجہ سے شادی نہ کر چاہے اور رشتہ معقول ہو تو چھوٹے کی کر دی جاتی ہے۔"

"اچھا' یہ تو پھر لمبی بحث شروع ہو جائے گی' آج میں طے کر کے آئی ہوں' تم میں سے کسی ایک کو شادی کے لیے راضی کر کے رہوں گی۔ دیکھو' لڑکی بہت خوبصورت ہے' بے وقوفی کی باتیں چھوڑو' اچھا ایسا کرتے ہیں کہ ٹاس کر لیتے ہیں۔"

"چلو' یہ ٹھیک ہے۔" عامل نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

"تم کیا کہتے ہو کامل؟"

"مجھے آپ کی تجویز منظور ہے۔" وہ بھی تفریح کے موڈ میں تھا۔

"ایک بات میں تم دونوں کو بتا دوں' میں مذاق نہیں کر رہی ہوں' سنجیدہ ہوں۔ اگر تم لوگ اپنے وعدے سے پھرے تو پھر مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔" بیگم شہناز نے ہنس کر کہا۔

"نہیں بیگم شہناز' ایسا نہیں ہوگا' ہم دونوں بھی بڑے سنجیدہ ہیں۔" حالانکہ وہ سنجیدہ بالکل نہ تھے' محض تفریح کے موڈ میں تھے۔

بیگم شہناز نے اپنے پرس سے آٹھ آنے کا سکہ نکالا اور دونوں سے پوچھ کر ہوا میں اچھالا۔ سکہ عامل کے حق میں گرا۔ اس نے خوشی سے نعرہ لگایا۔ "چلو بھائی کامل' اب دولہا بن جاؤ۔"

"ہاں' اب تو شادی کے لیے راضی ہونا ہی پڑے گا۔" بیگم شہناز نے بھی خوش ہو کر کہا۔

"کامل دونوں کی باتیں سن کر ہنستا رہا۔ یہ ہنسی کی بات اس وقت سنجیدگی اختیار کر گئی جب اس نے بیگم شہناز کی سالگرہ کے موقع پر ایک خوبصورت لڑکی کو بیگم شہناز کے اردگرد گھومتے دیکھا۔ کامل کی نظریں بھی بار بار اس لڑکی کی طرف اٹھ رہی تھیں۔ اس نے عامل سے پوچھا۔

"یار' یہ کون ہے؟"

"جو بھی ہے' بہت پیاری ہے۔" عامل نے گہرا سانس لے کر کہا۔

بعد میں جب کامل نے بیگم شہناز سے اس لڑکی کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا۔

"یہ وہی لڑکی ہے' جس سے میں تمہاری شادی کرانا چاہتی ہوں۔"

"اچھا' ویری گڈ۔" کامل نے خوشی کا اظہار کیا۔ "بیگم شہناز' تو پھر نیک کام میں دیر کس بات کی؟"

شادی سے پہلے انہوں نے فلیٹ چھوڑ کر گلشن میں ایک بڑا سا گھر لے لیا۔ کامل کی بیوی زرینہ جہاں خوبصورت تھی' وہاں خوش اخلاق بھی تھی۔ اس نے عامل کی موجودگی کو مسئلہ نہ بنایا۔ عامل ویسے مسئلہ تھا بھی نہیں۔ وہ دونوں بہت اچھے دوست تھے' مشترکہ کاروبار تھا۔ جب وہ دونوں کو یکساں لباس پہن کر گھر سے نکلتے دیکھتی تو اس کی آنکھوں میں رشک ہوتا۔ اس زمانے میں جب بھائی بھائی کا نہیں' یہ دوستی بینظیر و بے مثال تھی۔

کامل کی شادی کے بعد' عامل بھی زیادہ دن کھلا نہ رہ سکا۔ زرینہ نے اسے بھی باندھ لیا۔ بعد اس کی کالج میں کلاس فیلو رہی تھی۔ بہت پرکشش لڑکی تھی' ایک دن زرینہ نے امینہ اور عامل کا آمنا سامنا کرا دیا۔ پھر عامل حسن کے جال سے نہ نکل سکا۔ اس کے جانے کے بعد' عامل نے زرینہ

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

سے تڑپ کر پوچھا۔ ''بھابی' یہ لڑکی کون تھی؟''

''یہ لڑکی جو بھی تھی' بہرحال تمہاری بیوی ہوسکتی ہے۔'' زرینہ نے مسکرا کر کہا۔

''ہاں۔'' عامل نے خوش ہو کر کہا۔ ''بیوی ہوسکتی ہے تو پھر دیر کس بات کی؟ پہنچائیے ہمارا پیغام۔''

اس طرح کامل کی شادی کے چھ ماہ کے اندر اندر عامل کے سر پر بھی سہرا بندھ گیا۔ کامل چاہتا تھا کہ وہ دونوں ساتھ ہی رہیں' لیکن عامل نے گلشن میں ہی' تھوڑے سے فاصلے پر ایک الگ گھر لے لیا' اس نے کہا۔ ''دیکھو کامل! ہم دونوں بہت اچھے دوست ہیں' ایک عرصے سے ساتھ رہ رہے ہیں' ایک دوسرے کے مزاج کو سمجھتے ہیں'' ہمارے درمیان آج تک کسی معمولی سے مسئلے پر بھی لڑائی نہیں ہوئی۔ زرینہ بھابی بھی بہت اچھی ہیں۔ امینہ کی دوست ہے۔ وہ بھی ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھتی ہیں' لیکن ایک بات یاد رکھو۔ خواتین میں حسد کا مادہ بہت زیادہ ہوتا ہے' چھوٹی چھوٹی باتوں پر ان کی نظر ہوتی ہے۔ ہم اگر ساتھ رہے تو مجھے ڈر ہے کہ کہیں ہماری دوستی بھی داؤ پر نہ لگ جائے لہٰذا مجھے ایک گھر لے لینے دو۔''

کامل جانتا تھا کہ عامل ٹھیک کہہ رہا ہے' لہٰذا اس نے کوئی بحث نہ کی۔ فوراً اس کی بات مان لی' ویسے ان دونوں کے درمیان اتنی ذہنی ہم آہنگی تھی کہ وہ آج تک کسی مسئلے پر نہ الجھے تھے۔ بہرحال عامل نے گھر سے الگ ہو کر دوستی کو داؤ پر لگنے سے بچا لیا تھا' لیکن یہ اس کا خیال خام تھا۔

موٹر ڈیلنگ ان کی بہت اچھی چل رہی تھی۔ اب انہوں نے اپنے کاروبار کو وسعت دینے کے بارے میں سوچا۔ کامل کے ذہن میں ایک اچھی تجویز تھی۔ ان دنوں کراچی میں کوئی قابل ذکر ڈرائیونگ سکول نہ تھا۔ اس نے اس تجویز کو عامل کے سامنے رکھا۔ عامل نے اسے فوراً داد کے کر دیا۔ شوروم ان کا خاصا بڑا تھا' انہوں نے اس موٹر ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ کو یہیں سے سٹارٹ کرنے کا فیصلہ کیا۔ ان کے ذہن میں تھا کہ اگر یہ ڈرائیونگ سکول کامیاب ہو گیا تو کراچی کے دوسرے علاقوں میں ان کی شاخیں قائم کر دیں گے۔ کامل نے اس ڈرائیونگ سکول کو جدید خطوط پر چلانے کا فیصلہ کیا۔ جہاں اس نے سکول کا دفتر خوبصورت انداز میں ڈیکوریٹ کروایا' وہیں اس نے اس سکول کی ٹی وی اور اخبارات میں زبردست پبلسٹی کی۔

آر کے ایڈورٹائزنگ کمپنی کا مالک محمود احمد اس کا دوست تھا۔ اس نے اشتہاری فلم بنانے میں خصوصی توجہ دی۔ اس اشتہاری فلم کے لیے کامل کی خواہش کے مطابق ایک نئی لڑکی تلاش کی گئی۔ جب فلم بن کر تیار ہو گئی تو محمود احمد نے دونوں کو اپنے دفتر بلا کر وہ فلم دکھائی۔

فلم کا سکرپٹ بہت اچھا تھا۔ فلم میں جو ماڈل استعمال کی گئی تھی' وہ فلم کے سکرپٹ سے بھی اچھی تھی' فوٹو گرافر نے اسے بہت دل لگا کر عکس بند کیا تھا۔ کامل اور عامل کو فلم سے زیادہ وہ ماڈل گرل پسند آئی تھی۔ انہوں نے کئی مرتبہ اس فلم کو چلوا کر دیکھا تھا۔

جدید لباس میں ملبوس' سلوموشن میں بھاگتی ہوئی وہ ماڈل گرل بدر احمد' دونوں کے دلوں پر

تتلی بن کر چپک گئی تھی۔

کامل اور عامل نے ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھا تھا۔ اپنی نظروں کی معنی خیزی کو وہ خوب سمجھتے تھے۔ دونوں نے اس ماڈل گرل بدر احمد کے بارے میں ایک لائحہ عمل طے کیا۔ وہ چاہتے تو محمود احمد سے اس مسئلے میں مدد لے سکتے تھے' لیکن انہوں نے محمود احمد سے مدد لینا مناسب نہ سمجھا۔ وہ دونوں اس فلم کی تعریف کر کے خاموشی سے باہر نکل آئے۔

اپنے شوروم پہنچ کر کامل نے آر کے ایڈورٹائزنگ کمپنی کے دفتر فون کیا اور وہاں محمود احمد سے بات کرنے کے بجائے منیجر شجاع الدین سے بات کی۔

''شجاع' مجھے بدر احمد کا فون نمبر اور پتا چاہئے' اس چھوٹے سے کام کے لیے میں محمود احمد کو تکلیف نہیں دینا چاہتا تھا۔''

''سیٹھ چھوٹے کاموں کے لیے چھوٹے آدمی ہی بہتر ہوتے ہیں۔ ہم آپ کے خادم ہیں' اس سلسلے میں عرض یہ ہے کہ بدر احمد کے ہاں فون نہیں ہے' پتا میں آپ کو بتائے دیتا ہوں۔ ویسے یہ میری ہی دریافت ہے۔'' شجاع الدین نے جواب دیا۔

اگر ایسا ہے تو پھر پتا بتانے کی ضرورت نہیں' کسی دن خود آ جاؤ' پھر اس کے گھر چلیں گے۔ بولو کب آؤ گے؟'' کامل نے عامل کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''سیٹھ' آپ کو اس کے گھر جانے کی بھلا کیا ضرورت ہے' آپ مجھے حکم دیں' میں اسے آپ کے شوروم پر لے کر آ جاؤں گا۔''

''بھئی شجاع الدین' تم تو بڑے کام کے آدمی نکلے۔ یہاں کتنے دن سے ملازم ہو' تمہاری تو اپنی ایڈورٹائزنگ فرم ہونا چاہئے' سرمائے کا کوئی کام ہو تو ہمیں بتاؤ۔'' یہ اندھیرے کا تیر نہ تھا جو اتفاقاً نشانے پر لگتا' یہ اجالے کا تیر تھا' اور بڑا دیکھ بھال کر چھوڑا گیا تھا۔ یہ سیدھا شجاع الدین کے دل پر لگا۔ اپنے کاروبار کی تڑپ اس کے دل میں عرصے سے مچل رہی تھی' لیکن سرمائے کی کمی نے اسے ابھی تک ایسا نہیں کرنے دیا تھا' وہ آر کے ایڈورٹائزنگ کمپنی کا روح رواں تھا۔ سارا کاروبار اس کے دم سے چل رہا تھا۔ اب سیٹھ کامل نے راہ دکھائی تو اس کے دل میں ہزاروں چراغ جل اٹھے اس نے فوراً کامل سے وقت طے کیا اور بدر احمد کو لے کر شوروم جا پہنچا۔

کامل اور عامل ایک گھاگ آدمی تھے۔ وہ سب سے بڑے' ٹیڑھے آدمی کو دو منٹ میں سیدھا کر لیا کرتے تھے۔ شجاع الدین تو ان کے آگے کوئی چیز ہی نہ تھا۔ اسے انہوں نے اپنی ایڈورٹائزنگ کمپنی کا خواب دکھایا' وہ اس خواب کے فریب میں آ گیا۔ بدر احمد اس کے دور کے رشتے داروں میں تھی۔ وہ ایک شریف خاندان کی لڑکی تھی۔ شجاع الدین کے کہنے پر ہی بدر احمد کے والدین نے اسے پبلسٹی فلم میں کام کرنے کی اجازت دے دی تھی۔ اور اب وہ اس کے کہنے پر ہی کامل عامل کے شوروم تک آ گئی تھی۔

بدر احمد کو دیکھ کر دونوں کا دل مٹھی میں آ گیا۔ وہ جتنی خوبصورت تھی فلم میں تو وہ آدھی

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

بھی نہ آئی تھی۔ گوری چٹی' سرخ سفید' تیکھے نقوش' دلفریب مسکراہٹ' وہ دونوں اسے دیکھتے ہی گئے۔ اس سلسلے میں انہوں نے منصوبہ بندی کر لی تھی۔ پہلے ایک اور پبلسٹی فلم کا چکر چلایا گیا۔ اس فلم کی پروڈکشن کا کام شجاع الدین کے سپرد کر دیا گیا اور اسے منع کر دیا گیا کہ وہ محمود احمد سے اس تذکرہ نہ کرے۔ شجاع الدین بھلا کیوں محمود احمد سے اس کا تذکرہ کرتا' وہ بے وقوف تھوڑا ہی تھا اس نے بالا ہی بالا اس فلم کو بنانے کے انتظامات کر لیے۔

شجاع الدین نے بدر احمد میں کامل عامل کی دلچسپی کو محسوس کر لیا تھا' وہ کوئی بے وقوف آدمی نہ تھا بلکہ جان بوجھ کر بے وقوف بن گیا تھا۔ اس فلم کی شوٹنگ ساحل سمندر پر کی گئی اور کامل عامل پورے دن ساحل سمندر پر رہے۔ وہ فلم کی شوٹنگ دیکھتے رہے۔ شوٹنگ سے زیادہ وہ بدر احمد کو دیکھتے رہے۔ یہاں آنے اور پورا دن یہاں گزارنے کا مقصد ہی یہی تھا۔

فلم جب بن کر تیار ہوئی اور شجاع الدین نے انہیں دکھائی تو دونوں نے یک زبان ہو کر اسے مسترد کر دیا۔ حالانکہ فلم بہت اچھی تھی۔ شجاع الدین کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ اس پر کہ اس پر خاصی رقم خرچ ہو چکی تھی۔ شجاع الدین نے انہیں قائل کرنے کی کوشش کی کہ پوری فلم یکسر مسترد کرنے کے بجائے جہاں جہاں شاٹس کمزور محسوس ہوتے ہیں' انہیں دوبارہ ری شوٹس کر لیا جائے' لیکن عامل کامل نے اس کی ایک نہ سنی۔

"نہیں' شجاع الدین' یہ بڑی کمزور فلم ہے' سینما ہالوں میں چلے گی تو لوگ کرسیاں چھوڑ کر اٹھ جائیں گے۔ اسے دوبارہ بناؤ' پیسے کی فکر نہ کرو۔ اس پر جو خرچ ہوا' اسے ہمارے کھاتے میں ڈال دو۔" عامل نے بڑی فراخدلی سے کہا۔

"جی سیٹھ' ٹھیک ہے۔" شجاع الدین کو اور کیا چاہئے تھا۔

عامل کامل نے شجاع الدین کو اب تک بڑی معمولی سی رقم بطور ایڈوانس دی تھی۔ شجاع الدین نے اپنے طور پر ہی رقم کا انتظام کیا تھا۔ رقم کی طرف سے وہ مطمئن تھا۔ جب چاہے گا' لے لے گا۔ اسے معلوم نہ تھا کہ وہ کیا کھیل کھیل رہے ہیں۔

وہ کئی دن کے بعد جب کامل عامل کو فلم کا سکرپٹ سنانے پہنچا تو اس نے بدر احمد کو وہاں ایک خوبصورت کیبن میں بیٹھے دیکھا۔ شجاع الدین اسے وہاں بیٹھا دیکھ کر بڑا حیران ہوا' اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ بدر احمد یہاں کیا کر رہی ہے؟

عامل اور کامل بھی شوروم میں موجود تھے۔ اس نے سوچا پہلے بدر احمد سے ملے' اس سے پوچھے کہ وہ یہاں کیا کر رہی ہے؟ وہ اس کے دروازے کی طرف مڑنے لگا تو کامل نے فوراً اٹھایا اور انٹرکام پر بدر احمد کو ہدایت کی کہ شجاع الدین کو پہلے اس طرف بھیج دے۔

شجاع الدین نے جب بدر احمد کے کیبن کا دروازہ کھولا اور ابھی اتنا ہی کہہ پایا تھا۔ "تم....." کہ بدر احمد نے اسے ٹوک دیا۔ وہ مسکرا کر بولی۔ "آپ کو سیٹھ صاحب بلا رہے ہیں' ان سے مل لیجئے۔"

"اوہ' اچھا۔" شجاع الدین فوراً اس کے کیبن سے نکل آیا۔ جب وہ کامل عامل کے کیبن میں داخل ہوا تو کامل نے اسے دیکھ کر بڑی گرم جوشی سے کہا۔ "آؤ' بھئی شجاع الدین' کہو' کیسے آنا ہوا۔ بھئی ہم نے بدر احمد کو اپنے شوروم پر ملازم رکھ لیا ہے۔ اسے ڈرائیونگ سکول کا منیجر بنا دیا ہے۔ تمہیں تو کوئی اعتراض نہیں؟"

یہ سن کر شجاع الدین کے بدن میں جیسے آگ لگ گئی۔ اسے بہت غصہ آیا۔ اور یہ غصہ عامل کامل سے زیادہ اسے بدر احمد پر تھا۔ اس نے بغیر مشورہ کیے خاموشی سے ان لوگوں کی ملازمت اختیار کر لی تھی۔ غصہ اسے کامل عامل پر بھی تھا' لیکن وہ اس غصے کا اظہار کر نہیں سکتا تھا۔ جو دلچسپی اس نے ان دونوں کی محسوس کی تھی' اس دلچسپی کے نتیجے میں بدر احمد وہاں بیٹھی تھی۔ وہ اپنے منصوبے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ اب غصہ کرنا یا بگڑنا فضول تھا۔ جو ہونا تھا' ہو چکا تھا۔

"یہ تو بہت خوشی کی بات ہے' بدر کو یہاں ملازم دیکھ کر مجھے بڑی مسرت ہوئی ہے۔" اس نے زبردستی مسکراتے ہوئے کہا۔ ابھی اس کے پیسے بھی پھنسے ہوئے تھے۔

شجاع الدین' فلم کا سکرپٹ سنانے آیا تھا' لیکن کامل نے اسے خوبصورتی سے ٹال دیا۔ پھر وہ اسے مسلسل خوبصورتی سے ٹالتا رہا۔ اس نے فلم کے اخراجات بھی ادا نہ کیے جو اس نے مسترد کر دی تھی۔ شجاع الدین کو بہت غصہ تھا' لیکن وہ ان دونوں کا کچھ بگاڑ نہیں سکتا تھا۔ بدر احمد بھی اس کے ہاتھ سے نکل چکی تھی۔

بدر احمد ایک پڑھی لکھی' سمجھدار لڑکی تھی۔ اس کی طبیعت کا رجحان شوبزنس کی طرف بالکل نہ تھا۔ وہ شاعرانہ ذہن کی لڑکی تھی۔ بہت نازک اور حساس' ڈرائیونگ انسٹی ٹیوٹ چلانا کوئی مشکل کام نہ تھا۔ خوبصورت تو وہ تھی ہی' لیکن خوبصورت ہونے کے ساتھ ہی خوش اخلاق بھی تھی۔ ایک بار جو ڈرائیونگ سکول کے بارے میں معلومات حاصل کرنے اس کے پاس آ جاتا' وہ دوبارہ ضرور آتا۔ سکول بھی نیا نیا تھا' لیکن اس میں داخلوں کی تعداد روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔ سکول کی مقبولیت میں جہاں پبلسٹی کو دخل تھا وہاں بدر احمد کی مسحور کن شخصیت کا بھی ہاتھ تھا۔ کامل' عامل نے بدر احمد کو ایک پرکشش تنخواہ پر رکھا تھا' وہ یہاں کام کر کے بہت خوش تھی' لیکن اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ اس کی یہ خوشی کس قدر عارضی ہے۔

پھر ایک دن صبح کے اخبارات نے قیامت ڈھا دی۔

ہر اخبار میں بدر احمد کی تصویر چھپی تھی اور ساتھ ہی خودکشی کی خبر بھی تھی۔

یہ خبر بدر احمد کے والدین پر بجلی بن کر گری۔ بدر احمد نے سمندر میں ڈوب کر خودکشی کی تھی اور اس میں کوئی شبہ نہ تھا' کیونکہ عینی شہادتیں موجود تھیں۔ لوگوں نے اسے لہروں کی طرف بڑھتے اور ان میں گم ہوتے دیکھا تھا' لیکن لوگوں کو جب یہ احساس ہوا کہ یہ لڑکی خودکشی کے ارادے سے آگے بڑھ رہی ہے تو اس وقت تک کافی دیر ہو چکی تھی۔ سمندر کی ایک بڑی لہر اسے اپنی آغوش میں پوری طرح لے چکی تھی۔ غوطہ خوروں نے اسے لہر سے چھیننے کی کوشش کی' لیکن موت اس کا مقدر بن

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

چکی تھی۔ وہ سمندر کے کنارے آتے آتے زندگی کے کنارے سے بہت دور جا چکی تھی۔

"ہائے میری بچی بڑی نازک تھی' وہ شیشے کی بنی تھی' ہائے کس نے اس سے کیا کہا کہ اس نے زندگی سے منہ موڑ لیا؟" بدراحمد کی ماں بین کرتی رہی' لیکن اس کی موت کا معما حل نہ ہو سکا۔

ایک دو دن اخبارات نے شور مچایا' کچھ دن پولیس نے بھاگ دوڑ کی' پھر زندگی اپنے معمول پر آ گئی۔ ایک لڑکی کے گم ہونے سے کون سا کائنات کے رنگ پھیکے پڑنے کا خدشہ تھا۔

شجاع الدین کو شبہ ہی نہیں بلکہ پورا یقین تھا کہ بدراحمد کی خودکشی میں کامل اور عامل کا ضرور ہاتھ ہے۔ اس نے پولیس کو گمنام ٹیلی فون کر کے اپنے خدشے کا اظہار بھی کر دیا تھا اور پولیس نے عامل' کامل سے اس سلسلے میں پوچھ گچھ بھی کی تھی' لیکن کچھ ثابت نہ ہو سکا تھا۔ وہ ہاتھ خفیہ ہی رہا تھا۔

یہ ٹھیک تھا کہ بدراحمد صبح گھر سے نکلی تھی' اسے ایک لیڈی انسٹرکٹر مسز کاظمی نے گھر سے لیا تھا' بدراحمد کو پک اینڈ ڈراپ کی سہولت دفتر کی طرف سے حاصل تھی' کیونکہ مسز کاظمی اس کے علاقے میں ہی رہتی تھی' اس لیے وہ دفتر جاتے ہوئے اسے گھر سے لے لیا کرتی تھی اور شام کو چھوڑنا بھی اس کی ذمے داری تھی۔ اس شام بھی مسز کاظمی نے اسے گھر کے باہر چھوڑا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ گھر پہنچ کر اس نے خودکشی کا ارادہ کیا اور گھر میں داخل ہونے کے بجائے سمندر کا رخ کیا۔

مسز کاظمی نے جو بیان دیا تھا' اس بیان کی تصدیق گھر والوں نے کر دی تھی۔ اس کا بیان صحیح تھا۔ شام کو اس نے بدراحمد کو گھر کے سامنے چھوڑا تھا' کیونکہ گھر والوں نے مسز کاظمی کی گاڑی کے ہارن کی آواز سنی تھی۔ مسز کاظمی کی عادت تھی کہ وہ صبح جب بدراحمد کو لینے آتی تو اپنے مخصوص انداز میں ہارن بجاتی جسے سن کر بدراحمد باہر نکل آتی۔ شام کو واپسی پر بھی یہی ہوتا کہ وہ اسے اتار کر ہارن بجاتی' اس طرح گھر والوں کو یہ معلوم ہو جاتا کہ بدراحمد واپس آ گئی ہے اور گھر کا کوئی فرد گھر کا دروازہ کھول دیتا۔

یہ عمل ایک عرصے سے جاری تھا' اس دن بھی مسز کاظمی نے ہارن بجایا تھا' گھر میں اس وقت بدر کی امی کے سوا کوئی نہ تھا' وہ باورچی خانے میں برتن دھو رہی تھیں۔ ہارن کی آواز سن کر وہ دروازے پر آئیں' لیکن دروازے پر کوئی نہ تھا۔ گاڑی بھی جا چکی تھی۔ انہوں نے فلیٹ سے ذرا باہر نکل کر دیکھا' لیکن انہیں بدراحمد نظر نہ آئی' پھر انہوں نے سوچا شاید وہ ڈبل روٹی لینے چلی گئی ہوگی' کبھی کبھار وہ ایسا کیا کرتی تھی۔

اس طرح وہ مطمئن ہو کر گھر میں آ گئیں اور دروازہ کھلا چھوڑ دیا۔

لیکن دروازہ کھلا ہی رہا اور ان کا اطمینان کافور ہو گیا۔ بدراحمد واپس نہ پلٹی۔

جب واپس پلٹی تو اس میں زندگی نہ تھی۔ پھر یہ بات بھی معما ہی رہی کہ اس نے زندگی سے منہ کیوں موڑا۔ اس نے واقعی خودکشی کی یا کسی نے اس کی زندگی چھینی تھی۔ اگر اسے خودکشی کرنا ہی تھی تو وہ سیدھی سمندر پر کیوں نہ پہنچی۔ اس نے گھر کا رخ کیوں کیا۔ پھر دروازے سے کیوں

پلٹی؟"

اس طرح کے بہت سے سوالات لوگوں کے ذہن میں گونجتے رہے' لیکن پولیس نے اس کیس میں زیادہ دلچسپی نہ لی۔ ویسے بھی اس کے نزدیک ایک سیدھا سادا خودکشی کا کیس تھا۔ لہٰذا بدر احمد کی زندگی کی طرح' پولیس نے بھی اس کی فائل بند کر دی۔

لیکن ایک شخص ایسا بھی تھا جو اس فائل کو بند ہوتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ لیکن اس کے ہاتھ میں بھی کچھ نہ تھا۔ وہ تھا شجاع الدین۔ کامل' عامل نے اسے بڑی چوٹ دی تھی۔ اسے ایسے زخم لگائے تھے کہ وہ انہیں اب تک چاٹ رہا تھا۔ بدراحمد کی خودکشی اس کے گلے سے نہ اترتی تھی۔ اس کا ذہن اس بات کو قبول ہی نہ کرتا تھا۔ اسے پکا یقین تھا کہ اس خودکشی کے پیچھے کامل' عامل کے ہولناک ہاتھ ہیں' لیکن مشکل یہ تھی کہ وہ ہولناک ہاتھ اسے نظر نہیں آ رہے تھے۔

کامل اور عامل جوئے' شراب اور عورتوں کے عادی تھے۔ عامل تو خیر اس شہر میں یہاں کی رنگینیاں دیکھ کر ہی رکا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ اس ملک میں شراب' جوئے اور نائٹ کلبوں پر کب کی پابندی عائد ہو چکی تھی' لیکن بند کچھ نہ ہوا تھا۔ عامل' کامل کو سب میسر تھا۔ وہ جب چاہتے جوا کھیلتے' انہیں معلوم تھا کہ کہاں کہاں جوا ہوتا ہے۔ وہ جب چاہتے شراب پیتے۔ لوگ شراب کی بوتلیں ان کے ٹھکانے پر پہنچا دیتے۔ وہ جب چاہتے رقص دیکھتے۔ اس مقصد کے لیے کلفٹن والا لگژری فلیٹ کام آتا۔ مجرا کرنے والی عورتیں سادگی سے یہاں آتیں۔ موسیقی کا کیسٹ لگا دیا جاتا اور اس کی دھن پر رقص ہوتا۔

سب کچھ بند ہونے کے باوجود سب کچھ کھلا تھا اور سب کو سب ہوتا دکھائی دے رہا تھا' لیکن کوئی آنکھ کھلی نہ تھی۔

وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔

کامل' عامل کا کاروبار اپنے عروج پر تھا۔ ڈرائیونگ سکول کی کئی شاخیں شہر کے مختلف علاقوں میں قائم ہو چکی تھیں۔ ساری شاخیں اچھا بزنس کر رہی تھیں۔ ڈرائیونگ سیکھنے والی زیادہ تر خواتین تھیں' اس لیے تمام برانچوں پر خواتین سٹاف زیادہ تھا۔ انہیں خواتین سٹاف میں سے کامل اور عامل کو اپنے مطلب کی خواتین بھی مل جاتی تھیں۔

بدراحمد کے انتقال کے بعد اس کی جگہ کئی منیجر خواتین آ کر جا چکی تھیں' لیکن اس جیسی ابھی تک کوئی نہ آئی تھی۔ مسز کاظمی نے اگرچہ کافی کوشش کی تھی' لیکن اسے بدراحمد جیسی لڑکی نہ مل سکی تھی۔ کامل اور عامل اسے اکثر یاد کر کے مسز کاظمی سے کہا کرتے۔

"مسز کاظمی" کچھ کریں نا۔"

"کیا کروں بیٹھ؟" مسز کاظمی سمجھ کر بھی نہ سمجھتی۔

"بھئی' کوئی اچھی سی منیجر لائیں' یہ کیا کالی پیلی چیزیں اٹھالاتی ہیں۔ ایسی چیزوں کو دیکھ کر لوگ اندر آنے کے بجائے باہر سے ہی بھاگ جاتے ہیں۔" عامل ہنس کر کہتا۔

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

"ہاں' یہ بات تو ہے۔" کامل اثبات میں سر ہلاتا۔

"اس مرتبہ اشتہار دے کر دیکھیں۔" مسز کاظمی نے مشورہ دیا۔

"چلو ٹھیک ہے' اشتہار بھی دے کر دیکھ لیتے ہیں' کیوں عامل' ہو سکتا ہے اس طرح ہمارے سکول کے لیے کوئی اچھی لڑکی مل جائے۔" کامل بولا۔

"سیٹھ صرف سکول کے لیے؟" مسز کاظمی نے کامل کو ترچھی نگاہوں سے دیکھا۔

"جب بات کو سمجھتی ہو تو پھر اسے کھلوانا کیوں چاہتی ہو؟" کامل کے بجائے عامل نے جواب دیا۔

پھر اشتہار دیا گیا۔ خاصا بڑا اشتہار تھا۔ یہ اشتہار آر کے ایڈورٹائزنگ کمپنی کے ذریعے دیا گیا تھا۔ اس اشتہار کو شجاع الدین نے ہی تیار کروایا تھا۔ لیڈی منیجر کے اس اشتہار کو دیکھ کر اسے بدر احمد بے اختیار یاد آ گئی تھی۔ بدر احمد کے ساتھ ہی شجاع الدین کے ساتھ کامل' عامل نے جو فراڈ کیا تھا' جو زخم لگائے تھے' وہ ایک سال گزر جانے کے باوجود ہرے ہو گئے تھے۔ اپنے کاروبار کا جھانسا دے کر کامل' عامل نے اسے خوب بے وقوف بنایا تھا۔ پھر بدر احمد کے سلسلے میں بھی وہ خود کو مجرم سمجھتا تھا' اگر وہ اسے ان خبیثوں سے نہ ملواتا تو اس کی زندگی کیوں داؤ پر لگتی۔ اپنے ان دکھوں کو وہ کسی طور نہ بھول پاتا۔

اشتہار کے جواب میں بے شمار درخواستیں موصول ہوئیں۔ ہر درخواست کے ساتھ تصویریں بھی تھیں۔ اچھی صورتیں دیکھ کر کامل عامل نے دس بارہ لڑکیوں کا انٹرویو بھی کیا' لیکن انہیں کوئی لڑکی پسند نہ آئی۔

"یار' کیا ہوا اس شہر کو؟ لگتا ہے اس شہر کا سارا حسن سمندر کھا گیا۔ ایک لڑکی بھی ڈھنگ کی نہ نکلی۔" کامل نے کہا

"ہاں' یہ تو ہے جبکہ ہم نے صرف میٹرک پاس لڑکی مانگی تھی۔ سابقہ تجربے کی قید نہ تھی۔ پک این ڈراپ کی سہولت کے ساتھ پرکشش تنخواہ بھی بتا دی گئی تھی۔ پھر بھی کسی کام کی لڑکی نے درخواست نہ بھیجی۔ مسز کاظمی' یہ تجربہ بھی ناکام رہا۔ اب کیا کریں؟" عامل بولا۔

"سیٹھ' تھوڑا صبر کریں۔" مسز کاظمی نے نسخہ تجویز کیا۔

"وہ تو ہم لوگوں سے نہیں ہوتا۔" مریضوں نے نسخہ استعمال کرنے سے انکار کر دیا۔

"اچھا' پھر میں ہی کچھ کرتی ہوں' لوگوں سے کہتی ہوں۔" مسز کاظمی نے تسلی دی۔

کامل' عامل نے سوچا' جب تک مسز کاظمی ان کی مرضی کے مطابق لڑکی تلاش کرے تب تک انہیں کام چلانے کے لیے ایک لڑکی کا تقرر کر لینا چاہئے' بزنس تو آخر چلانا ہی تھا۔

مسز کاظمی بھی کچھ نہ کر سکی۔ البتہ اس نے یہ ضرور کیا کہ وہ امریکہ چلی گئی۔ امریکہ میں مسز کاظمی کا بیٹا تھا۔ وہ عرصے سے اسے بلا رہا تھا' لیکن وہ یہاں سے ہلتی ہی نہ تھیں۔ تنگ آ کر وہ خود کراچی آ گیا۔ اب مسز کاظمی کے لیے کوئی مفر نہ تھا۔ مجبوراً اس نے رخت سفر باندھ لیا۔

امریکہ جانے سے پہلے وہ کامل' عامل سے ملنے آئی۔ انہیں اس کے جانے کی خبر سن کر بہت افسوس ہوا۔ وہ ان کا اثاثہ تھی۔ اس کے بغیر وہ دونوں خود کو خالی خالی محسوس کرنے لگے تھے۔

"سیٹھ' فکر نہ کرو' میں امریکہ سے آپ کے لیے کوئی خوبصورت سی لیڈی منیجر بھیجوں گی۔" مسز کاظمی نے ہنس کر کہا۔

"مسز کاظمی' آپ ہمیں بہت یاد آئیں گی۔" کامل نے کہا۔

"ہم آپ کو کبھی نہ بھولیں گے۔" عامل بولا۔

"جانتی ہوں' جانتی ہوں۔" مسز کاظمی کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔ "میرا خود یہاں سے جانے کو جی نہیں چاہتا' یہاں میرے بہت دوست ہیں' پر لڑکا مجبور کر رہا ہے۔"

مسز کاظمی! امریکہ جاتے ہوئے اپنے ایک ایک دوست' ایک ایک واقف کار سے ملی۔ جانے سے ایک دن پہلے وہ بدر احمد کے گھر بھی گئی۔ بدر کی امی سے اس کی خاصی جان پہچان تھی۔ بدر احمد کو ساتھ لے جاتے یا لاتے ہوئے وہ کبھی کبھی دو چار منٹ کو اس کے گھر پر رک بھی جاتی تھی' آج وہ ایک طویل عرصے کے بعد اس کے گھر گئی تھی۔ بدر کی امی کو اسے پہچاننے میں کچھ دیر لگی۔ جب اس نے انہیں یاد دلایا تو بدر کی امی کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو آ گئے۔

"آئیں' بیٹھیں۔" انہوں نے آنسو بھری آنکھوں سے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ "میں امریکہ جا رہی تھی۔ بس جانے کیوں میرا دل چاہا کہ آپ سے مل کر جاؤں۔"

"آپ کی مہربانی مسز کاظمی۔" انہوں نے اپنے آنسو دوپٹے سے صاف کرتے ہوئے کہا۔ "آپ کی صورت دیکھ کر مجھے اپنی بیٹی یاد آ گئی۔ آپ نے اسے کہاں چھوڑا تھا مسز کاظمی؟ وہ تو گھر نہیں آئی۔"

"امی' امی!" بدر کی چھوٹی بہن نے انہیں ٹوکا۔ "یہ مسز کاظمی آپ سے ملنے آئی ہیں' الٹا سیدھا باتیں مت کیجئے' جو ہونا تھا ہو چکا۔"

"مسز کاظمی' میری بیٹی کو اس دنیا سے گئے ہوئے ایک سال سے زائد عرصہ ہو گیا' لیکن مجھے ابھی تک صبر نہیں آیا۔ مجھے لگتا ہے جیسے میری بیٹی مری نہیں۔ ابھی ہارن بجے گا اور وہ گھر میں داخل ہو جائے گی۔ میری بیٹی خودکشی نہیں کر سکتی۔ مسز کاظمی' کیا آپ کو وہ ایسی لڑکی دکھائی دیتی تھی۔ مسز کاظمی' میری بیٹی کو کسی نے مارا ہے' وہ خود نہیں مری۔"

"مسز کاظمی' آپ کب جا رہی ہیں امریکہ' وہاں آپ کا کون ہے!" بدر کی بہن نے بالآخر موضوع بدلا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ گھر آئے ہوئے مہمان کو شرمندگی میں مبتلا کیا جائے۔

لیکن بدر کی امی خاموش نہ ہوئیں۔ وہ اپنی بیٹی کی ایک ایک چیز یاد کر کے روتی رہیں۔ مسز کاظمی سے ان کے آنسو نہ دیکھے گئے۔ اس کا کلیجہ منہ کو آنے لگا' وہ بوجھل دل اور بوجھل قدموں کے ساتھ بدر احمد کے گھر سے نکل آئی۔

جب وہ جہاز میں بیٹھی تو اسے راستے میں بدر احمد کی امی یاد آتی رہی۔ بدر احمد کا معصوم

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

چہرہ اس کی نگاہوں میں گھومتا رہا۔ بدر کی امی کی آہیں' کراہیں' اسے سنائی دیتی رہیں۔ اسے ایسا محسوس ہوتا رہا جیسے کوئی دل مٹھی میں لے کر بھینچ رہا ہو۔ اس پر ایک عجیب کیفیت طاری تھی۔

کیفیت تو خیر طاری تھی کامل عامل پر بھی کہ مسز کاظمی کے جانے کے بعد انہیں مسز صادق مل گئی تھی' وہ بھی لڑکیوں کے سلسلے میں کانٹا ثابت ہوئی تھی۔ وہ کانٹا جسے مچھلیوں کے پکڑنے میں استعمال کیا جاتا ہے۔

مسز کاظمی کے جانے کے تین چار ماہ بعد' مسز کاظمی کا ایک خط موصول ہوا۔ یہ خط کامل عامل کے لیے بڑی دلچسپی کا باعث بنا۔ وہ دونوں اسے پڑھ کر بڑی دیر تک ہنستے رہے' پھر جو لوگ مسز کاظمی کے کارناموں سے واقف تھے' انہیں پڑھوا کر خوش ہوتے رہے۔

مسز کاظمی نے لکھا تھا کہ امریکہ آ کر یکسر اس کی زندگی کا رخ بدل گیا ہے۔ اس نے گناہوں سے توبہ کر لی ہے' اب وہ نماز بھی پڑھنے لگی ہے۔ اس نے کامل' عامل کو بھی تلقین کی تھی کہ وہ گناہ آلودہ زندگی سے باز آ جائیں' شراب سے توبہ کر لیں' معصوم لڑکیوں کی زندگیوں سے کھیلنا بند کریں' ورنہ وہ دن دور نہیں جب خود ان پر زندگی تنگ ہو جائے گی۔

اس خط کو جو بھی پڑھتا' وہ مسکرائے بنا نہ رہتا۔ نو سو چوہے کھا کر بلی حج کو چلی' لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ بلی نو سو چوہے کھا کر حج پر چلی جاتی ہے' نیک ہدایت کے لیے وقت کی کوئی قید نہیں ہوتی۔

کامل' عامل چاہتے تھے کہ اس کو اس مزاحیہ خط کا جواب لکھیں' لیکن مسز کاظمی نے اپنا پتا ہی نہیں لکھا تھا۔ ویسے یہ خط واشنگٹن سے آیا تھا' اس پر واشنگٹن کی مہر لگی تھی۔

کامل' سیٹھ زمان کو مسز کاظمی کے خط کے بارے میں بتا رہا تھا۔ اس کے سامنے مسز صادق بیٹھی تھی۔ عامل بھی ٹیلی فون پر ہونے والی گفتگو سے محظوظ ہو رہا تھا۔ اس نے بھی ریسیور اٹھایا ہوا تھا اور وہ بیچ بیچ میں لقمہ دیتا جا رہا تھا۔ سیٹھ زمان ٹیلی فون پر ان دونوں کی گفتگو سن کر قہقہہ لگا رہا تھا۔

کیبن میں کامل' عامل کے قہقہے گونج رہے تھے۔ مسز صادق بھی انہیں ہنستا دیکھ کر مسکرانے پر مجبور تھی..... ایک ہنسی خوشی کی فضا قائم تھی۔

کامل کہہ رہا تھا۔ "سیٹھ زمان' یہ خط اس صدی کا سب سے بڑا عجوبہ ہے۔"

"تم ٹھیک بولتے ہو' اس عورت پر تو وہاں جا کر الٹا ہی اثر ہو گیا۔ حالانکہ امریکہ کی فضا میں تو اسے اور کھل کھیلنا چاہئے تھا۔" سیٹھ زمان نے کہا۔

مجھے کہہ کر گئی تھی کہ سیٹھ آپ کے لیے وہاں سے زبردست لڑکی بھیجوں گی' وہاں سے تو یہ خط اور وہ بھی نصیحت آموز۔ ویسے سیٹھ ایک....." کامل کچھ کہتے کہتے اچانک خاموش ہو گیا۔

اس نے شوروم کے دروازے پر جو دیکھا تھا' وہ اس کی آواز بند کرنے کے لیے کافی تھا۔

"ہاں' کیا ہوا؟" سیٹھ زمان نے ادھر سے پوچھا۔

"میرے شوروم میں قیامت آ گئی ہے' اچھا میں پھر بات کروں گا۔" یہ کہہ کر کامل نے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔ اس نے سیٹھ زمان کے جواب کا بھی انتظار نہ کیا۔

عامل نے ابھی آہستگی سے ریسیور اپنے ہاتھ سے رکھ دیا۔ اس پر بھی کچھ ایسی ہی کیفیت طاری تھی۔ اس کی بھی زبان گنگ ہو کر رہ گئی تھی۔

کامل' عامل کا شوروم کافی بڑا تھا۔ اس میں کافی گاڑیاں کھڑی کرنے کی گنجائش تھی۔ دروازے کے بالکل سامنے کامل' عامل کا کیبن تھا۔ ہر آنے جانے والے پر ان کی نظر رہتی۔ اور جب سے انہوں نے ڈرائیونگ انسٹی ٹیوٹ کھولا تھا تب سے ان کی نظریں ہمہ وقت دروازے پر ہی لگی رہتیں۔ دروازے میں داخل ہوتے ہی بائیں جانب ڈرائیونگ سکول کا کیبن تھا جبکہ کامل' عامل کے کیبن میں پہنچنے کے لیے چالیس پچاس قدم چلنا پڑتا تھا۔

وہ بڑی تمکنت سے چلتی ہوئی شوروم میں داخل ہوئی تھی۔ اس نے جینز اور قمیص پہنی ہوئی تھی اور اسے ہرگز اس بات کا احساس نہ تھا کہ وہ کس قسم کا لباس زیب تن کیے ہوئے ہے۔ وہ بہت خوبصورت لڑکی تھی' لیکن اس لباس نے اسے شعلہ فشاں بنا دیا تھا۔ وہ ایک قیامت بھی جو مکمل از وقت آ گئی تھی۔ اس نے پورے اطمینان سے ڈرائیونگ سکول کے کیبن کا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گئی۔

مسز صادق' آپ ذرا جا کر اس قیامت کو ڈیل کریں۔" کامل نے کہا۔

"جی سیٹھ' ٹھیک ہے۔" مسز صادق فوراً کھڑی ہو گئی۔

مسز صادق کے باہر نکلنے کے بعد کامل' عامل سے مخاطب ہوا' کیسی لڑکی ہے؟"

"زبردست۔" عامل نے خوش ہو کر کہا۔" اس کو ہاتھ سے نکلنا نہیں چاہئے۔"

"اسی لیے تو مسز صادق کو بھیجا ہے' دیکھو کیا کرتی ہے۔"

چار پانچ منٹ کے بعد مسز صادق واپس آئی۔ وہ لڑکی ابھی موجود تھی۔ مسز صادق نے کامل' عامل کے کیبن میں داخل ہوتے ہی بے قراری سے کہا۔" سیٹھ' مس افشاں کو سمجھائیں۔"

"کیا ہوا؟" دونوں نے بیک وقت کہا۔

"وہ لڑکی ڈرائیونگ سیکھنا چاہتی ہے' اسٹوڈنٹ ہے' رعایت مانگ رہی ہے' لیکن مس افشاں نے انکار کر دیا ہے' میں نے اس لڑکی کو بیٹھنے کو کہا کہ سیٹھ سے بات کر کے آتی ہوں۔ سیٹھ' لڑکی بہت اچھی ہے' اسے رعایت ملنا ضروری ہے۔ داخلے کے بعد ہی اس سے رسم و راہ بڑھائی جا سکتی ہے۔" مسز صادق نے لائن دی۔

ٹھیک ہے۔" کامل نے انٹرکام کا ریسیور اٹھایا۔" مس افشاں!"

"جی سر۔" لیڈی منیجر مس افشاں نے مودبانہ جواب دیا۔

"بھئی' طالب علموں کو تو کچھ رعایت کر دیا کریں یہ خاتون کتنی رعایت مانگ رہی ہیں؟

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

کامل نے بہت نرم لہجہ اختیار کیا۔

"سر' سو دو سو کی بات ہوتی تو میں کر دیتی' یہ پانچ سو روپے کی رعایت مانگ رہی ہیں۔" ادھر سے مس افشاں نے کہا۔

"چلیے' کوئی بات نہیں' دے دیجئے بھئی' اسٹوڈنٹس کا خیال رکھنا چاہئے۔" کامل نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

"جی بہتر سر۔" مس افشاں نے مودبانہ کہا۔

"جائیے مسز صادق' اب آپ اس سے دوستی گانٹھیے۔" اس مرتبہ عامل بولا۔

"لیکن بہت تیز چلنے کی ضرورت نہیں ہے' آہستہ آہستہ غیر محسوس انداز میں۔ اس طرح کہ اسے یہ محسوس نہ ہو کہ اس کے لیے جال بچھایا جا رہا ہے۔" کامل نے کہا۔

"سیٹھ آپ فکر نہ کریں' میں ان باتوں کو اچھی طرح سمجھتی ہوں۔" مسز صادق نے ہنس کر کہا۔

"پھر بھی احتیاط لازم ہے' یہ لڑکی مجھے کسی اچھے گھرانے کی معلوم ہوتی ہے۔ اس کی چال میں مجھے بڑا وقار دکھائی دیا ہے۔ ایسی ماڈرن لڑکیاں کبھی کبھی بڑی ٹیڑھی کھیر ثابت ہوتی ہیں۔" عامل نے اونچ نیچ سمجھائی۔

"اور کبھی کبھی حلوا۔" عامل نے ہنس کر کہا۔

وہ لڑکی پہلے دن جس لباس میں نظر آئی تھی' بعد میں اس لباس میں نظر نہ آئی۔ اب وہ شلوار قمیص میں آتی تھی۔ اس نے تین بجے کا وقت لیا تھا۔ پک این ڈراپ کی سہولت سے اس نے فائدہ نہ اٹھایا تھا۔ اس نے کہا کہ وہ خود شوروم پر آئے گی اور یہاں سے خود ہی واپس جائے گی۔

یوں تو لیڈی انسٹرکٹرز کئی تھیں۔ اس لڑکی کو کسی بھی انسٹرکٹر کے حوالے کیا جا سکتا تھا اور اس کا فیصلہ مس افشاں کے ہاتھ میں تھا' لیکن مسز صادق نے خود ہی اس لڑکی کو اپنی شاگردی میں لے لیا۔

دو تھیوری کلاسوں کے بعد اس کی ٹریننگ شروع ہو گئی۔ وہ لڑکی جس کا نام لبنیٰ تھا' ٹھیک تین بجے شوروم آ جاتی۔ مسز صادق اس کے لیے تیار بیٹھی ہوتی۔ وہ فوراً اسے اپنے ساتھ ڈرائیونگ سکھانے لے جاتی۔

کامل اور عامل کو معلوم تھا کہ لبنیٰ تین بجے شوروم آتی ہے' وہ اسے دیکھنے کے لیے اپنے کیبن میں ضرور موجود ہوتے۔ پہلے ایک دو دن تو وہ واپسی میں شوروم کے دروازے سے ہی واپس چلی جاتی تھی' لیکن بعد میں یہ ہونے لگا کہ لبنیٰ مسز صادق کے ساتھ اندر آ جاتی اور کچھ دیر بیٹھ کر چلی جاتی۔ پھر جوں جوں دوستی بڑھتی گئی ویسے ویسے لبنیٰ شوروم میں ٹھہرنے لگی۔ اب وہ تین بجے کے بجائے جلدی آ جاتی اور پھر ڈرائیونگ سیکھنے کے بعد دیر تک بیٹھی رہتی۔ مسز صادق کبھی اس کے لیے کولڈ ڈرنکس منگوا لیتی' کبھی آئس کریم اس طرح خوش گپیوں میں وقت گزرنے لگا۔

ایک دن مسز صادق کو کامل نے بلا کر پوچھا۔ "ہاں مسز صادق' بات کہاں تک پہنچی؟"

"دوستی تو میں نے ٹھیک ٹھاک کر لی ہے۔ اچھی خاصی بے تکلفی ہو گئی ہے۔ ایک مرتبہ میں اسے اپنے گھر بھی لے گئی ہوں' لیکن وہ اپنا گھر دکھانے سے کترا رہی ہے۔"

"تو اس کے پیچھے نہ پڑیں' ہو سکتا ہے' اس کی کوئی خاص وجہ ہو۔ اس کا گھر ٹھیک نہ ہو اس لیے آپ کو لے جاتے ہوئے جھجک رہی ہو۔ آپ اسے گھر لے جانے پر مجبور نہ کریں۔"

"نہیں' میں نے اصرار نہیں کیا' بس ایک آدھ بار سرسری سا ذکر کیا تھا۔ جب میں نے محسوس کیا کہ وہ اپنے گھر لے جانے سے کترا رہی ہے تو پھر میں نے اس ذکر کو چھوڑ دیا۔ البتہ اسے ایک مرتبہ اصرار کر کے اپنے گھر لے گئی۔" مسز صادق نے وضاحت کی۔

"کیا اندازہ لگایا آپ نے' کیسی لڑکی ہے۔" عامل نے پوچھا۔

"کسی بڑے گھر کی نہیں ہے۔ متوسط طبقے کی لڑکی ہے۔ باپ سرکاری ریٹائرڈ افسر ہے۔ بھائی کوئی نہیں۔ بس بہنیں ہیں اور وہ سب پڑھ رہی ہیں۔ پہلی مرتبہ جو وہ جینز اور قمیص پہن کر آئی تھی' وہ اس کی نہیں تھی' اس کی کسی دوست کی تھی۔ ماڈرن لباس پہننے کا اسے بہت شوق ہے' لیکن پہن نہیں سکتی' جس علاقے میں رہتی ہے' وہاں یہ لباس پہننا بہت مشکل ہے۔ بہت شوقین مزاج لڑکی ہے۔ ہر وقت فیشن اور کپڑوں کی باتیں کرتی رہتی ہے۔ فلمیں دیکھنے کا بھی بہت شوق ہے۔ یہ سارے شوق وہ اپنی دوست کے یہاں جا کر پورے کرتی ہے۔ کل شادی کے بارے میں گفتگو ہو رہی تھی تو اس نے ایک بڑی دلچسپ بات کہی۔" مسز صادق نے دونوں کو مسکرا کر دیکھا۔

"وہ کیا؟" دونوں ہمہ تن گوش ہو گئے۔

"جب میں نے اس کا آئیڈیل پوچھا تو کہنے لگی' میرا آئیڈیل پیسہ ہے۔ میں ایک غریب اسمارٹ لڑکے کے بجائے دولت مند مرد سے شادی کرنا پسند کروں گی۔ بے شک وہ شادی شدہ کیوں نہ ہو۔"

"اچھا!" دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھ کر آنکھ ماری۔ "پھر تو چانس ہے" عامل بولا

"ایسے ہی مذاق کر رہی ہو گی" کامل نے کہا۔

"تھی تو خیر وہ سنجیدہ۔" مسز صادق نے یقین دلانے کی کوشش کی۔

"پھر آپ اپنی شادی کی سالگرہ کب کر رہی ہیں؟" عامل نے پوچھا۔

"سالگرہ تو ابھی دو مہینے پہلے ہی کی تھی۔" مسز صادق ہنسی۔

"سالگرہ کا کیا ہے' وہ تو ہر ماہ ہو سکتی ہے۔" کامل نے کہا۔

"ٹھیک ہے' میں صادق سے بات کرتی ہوں۔"

"صادق سے بات کرنے کی کیا ضرورت ہے' آپ ہم سے بات کیجئے۔ بتائیے' کتنے [illegible] دوں۔" کامل نے چیک بک نکالی۔

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

مسز صادق نے تکلفاً' نہیں' نہیں کیا' لیکن کامل نے دو ہزار روپے کا چیک کاٹ کر ان کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ عامل نے خاموشی سے اس چیک پر دستخط کر دیئے تھے۔

"اب تو ملاقات یقینی ہے۔" کامل بولا۔

جب سے کامل اور عامل نے لیٹی کے آئیڈیل کے بارے میں سنا تھا' دونوں کے دل پر بیک وقت اس سے شادی کی خواہش نے انگڑائی لی تھی اور اس خواہش کو دونوں نے ایک دوسرے سے چھپانے کا تہیہ کر لیا تھا۔ وہ دونوں اپنے دائرے میں رہ کر لیٹی کو حاصل کرنے کے خواہش مند تھے اور یہ پہلی دراڑ تھی جو ان کے دلوں میں آہستہ آہستہ گہری ہوتی جا رہی تھی۔

سالگرہ والے دن دوستی کی اس دراڑ میں مزید گہرائی آ گئی۔

یہ سالگرہ بہت محدود پیمانے پر تھی۔ مخصوص لوگوں کو مدعو کیا گیا تھا۔ سالگرہ کی اس تقریب میں صرف تین مرد تھے۔ کامل' عامل اور صادق' باقی سب خواتین تھیں۔ چند سکول کی انسٹرکٹرز تھیں۔ کچھ مسز صادق کی دوست تھیں' ان دوستوں میں وہ بھی تھی جس کے لیے اس تقریب کا جال پھیلایا گیا تھا۔

اس تقریب میں صادق کا ہونا نہ ہونا برابر ہی تھا۔ وہ بے چارہ ملازموں کی طرح تقریب کے انتظامات میں لگا ہوا تھا۔ مسز صادق نے لیٹی کو کامل اور عامل سے متعارف کرا دیا تھا۔ اس کی کوشش تھی کہ وہ زیادہ سے زیادہ وقت ان دونوں کے ساتھ گزارے۔ اگر لیٹی ان دونوں کو چھوڑ کر کسی اور لڑکی سے مخاطب ہو جاتی تو مسز صادق کامل' عامل سے مخاطب ہو کر لیٹی کے متعلق کوئی ایسی بات کہتی جس میں اس کی تعریف ہوتی تو وہ فوراً اس طرف متوجہ ہو جاتی۔

کیک کٹنے کے بعد کچھ فرمائشی پروگرام چلا۔ وہاں موجود ایک دو لڑکیوں نے گانے سنائے۔ موسیقی کے سلسلے میں کامل بڑا باذوق واقع ہوا تھا۔ بے سرے گانے سن سن کر وہ بڑا بور ہو رہا تھا۔ اس کے نزدیک ہی لیٹی بیٹھی تھی۔

"ایسے گانے سننے سے تو خودکشی کرنا بہتر ہے۔" کامل نے اس کی طرف جھک کر آہستہ سے کہا۔

"آپ ٹھیک کہتے ہیں۔" لیٹی نے ہنس کر کہا۔ آج وہ بہت خوش تھی' بات بے بات ہنس رہی تھی۔ شاید اسے معلوم تھا' جب وہ ہنستی ہے تو اور حسین ہو جاتی ہے اور آج تو بجلیاں گرانے کا موسم تھا۔

"مس لیٹی' سنا ہے آپ بہت اچھا گاتی ہیں۔" کامل نے یہ بات ایسے ہی کہہ دی تھی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ اچھا گاتی ہے یا برا۔ گاتی بھی ہے یا نہیں۔

ایک خاتون کا بے سرا گانا ختم ہوا تو کامل نے بے دلی سے تالی بجائی اور لیٹی کی طرف دیکھا۔ "کیا خیال ہے' کچھ آپ کیوں نہ سنائیں۔"

"آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ میں گاتی ہوں؟"

"مسز صادق نے بتایا تھا۔" کامل نے سفید جھوٹ بولا۔

"لیکن مسز صادق سے تو آج تک اس موضوع پر بات نہیں ہوئی۔"

"بھئی کس موضوع پر بات نہیں ہوئی؟" عامل جو ذرا دور بیٹھا تھا' دونوں کو گفتگو کرتا دیکھ کر بے چین ہوا اور پھر نزدیک آ گیا۔

"آخر اندازہ بھی کوئی چیز ہے۔" کامل نے عامل کی بات کا جواب نہ دیا۔

"آپ کا اندازہ بالکل درست ہے۔ میں واقعی بہت اچھا گاتی ہوں۔" اس نے اعتراف کے ساتھ بلا جھجک اپنی تعریف کی۔

"واہ' واہ' پھر کچھ سنائیے نا۔" کامل نے خوش ہو کر کہا۔

"عامل صاحب' آپ کو بھی کچھ دلچسپی ہے گانے وانے سے؟" لیٹی نے مسکرا کر پوچھا۔

یہ مسکرا کر پوچھنا' کامل کو اچھا نہ لگا' اس نے عامل کے کچھ جواب دینے سے پہلے کہا۔

"انہیں گانے کے مقابلے میں رقص سے زیادہ دلچسپی ہے۔"

"یار' بکواس مت کرو۔" عامل نے اسے گھور کر دیکھا۔

"میں جھوٹ بول رہا ہوں؟" کامل نے ہنستے ہوئے لیٹی کو دیکھا۔

"پلیز' کوئی بات نہیں۔" لیٹی نے اسے شرمندگی سے بچانے کی کوشش کی۔ "آج میں آپ کو ایسے گانے سناؤں گی پھر آپ کی کسی چیز میں دلچسپی باقی نہ رہے گی۔"

کامل کو لیٹی کی یہ بات اچھی نہ لگی۔

عامل اس کی یہ بات سن کر پھول کی طرح کھل اٹھا۔

لیٹی نے پھر تین چار گانے سنائے۔ اس کی آواز واقعی بہت اچھی تھی۔ وہ بہت ڈوب کر گاتی تھی۔ اس کی آواز میں بڑا رس تھا۔ ایک سحر تھا' کوئی شعلہ تھا جو بجلی کی طرح چمکتا تھا۔

جب تک وہ گاتی رہی' محفل پر ایک سکوت طاری رہا۔ کامل اس کی آواز سے بڑا محظوظ ہو رہا تھا' لیکن بار بار اسے لیٹی کا جملہ یاد آ رہا تھا۔ 'آج میں آپ کو ایسے گانے سناؤں گی' پھر آپ کی کسی چیز میں دلچسپی باقی نہ رہے گی' یہ جملہ اس نے عامل سے کیوں کہا' اس سے کیوں نہ کہا' جبکہ گانے کی فرمائش اس نے کی تھی۔ یہ بات رہ رہ کر اسے یاد آ رہی تھی اور اس کا دل جلا رہی تھی۔ اس کی رگوں میں کانٹے چبھ رہے تھے۔

پھر کھانے کا وقت ہو گیا' سب لوگ کھانے کے لیے اٹھے' کامل بھی ڈائننگ روم کی طرف چلا۔ پھر اس نے گھوم کر دیکھا تو عامل کو لیٹی کے نزدیک پایا۔ شاید وہ جان بوجھ کر اٹھنے میں دیر لگا رہے تھے۔ "مسز صادق' عامل کو بلائیں۔" کامل نے میز کے نزدیک پہنچ کر کہا۔

"جی بیٹھ۔" مسز صادق فوراً عامل کی طرف لپکی۔

کھانے کے دوران بھی عامل لیٹی کے نزدیک رہا۔ اسے اٹھا اٹھا کر ڈشیں دیتا رہا۔ میز کے اس طرف کامل تھا اور اس کے مقابل لیٹی اور عامل' مسز صادق اس کے نزدیک تھی۔ وہ اصرار کر

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

کے اس کی پلیٹ میں چیزیں ڈال رہی تھی۔

کامل بہت آہستہ آہستہ کھانا کھا رہا تھا۔ اچانک لبنیٰ کی نگاہیں اس کی طرف اٹھیں۔ کی آنکھوں میں بلا کی کشش تھی۔ اس نے کامل پر نگاہیں جما دیں اور مسکرا کر بولی۔ "ارے صاحب' آپ تو کچھ کھا ہی نہیں رہے۔" پھر اس نے ایک کباب اٹھا کر اس کی پلیٹ میں اور بڑے پیار سے بولی' "کھائیے نا۔"

کامل کی بھوک اچانک چمک اٹھی۔

عامل کو ایسا لگا جیسے کسی نے اچانک اس کے پیٹ پر مکا مارا ہو۔

لبنیٰ پتا نہیں' کیا کھیل' کھیل رہی تھی' لیکن اتنا ضرور واضح تھا کہ وہ ایک کو خوش کر دوسرے کو جلا رہی تھی یا وہ دونوں کو خوش کرنا چاہ رہی تھی۔

سالگرہ کے دن کامل نے لبنیٰ کا جھکاؤ عامل کی طرف محسوس کیا تھا جبکہ عامل کا خیال کہ وہ کامل کی طرف جھکی رہی تھی۔

دونوں بہت تیزی سے سوچ رہے تھے۔ پہلے وہ یہ جال مشترکہ طور پر پھیلاتے تھے دوسرے سے مشورہ کرتے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کی موجودگی میں بات کرتے تھے' لیکن یہ مرتبہ ہوا تھا کہ وہ دونوں ایک دوسرے سے الگ ہو کر سوچ رہے تھے۔ ایک دوسرے کے سا بات کرنے سے احتراز کر رہے تھے۔

کامل دوسرے دن شوروم پہنچ کر' وہاں کچھ دیر بیٹھ کر' کسی کام کا بہانہ کر کے او اور سیدھا مسز صادق کے گھر جا پہنچا تھا۔ مسز صادق ان کے ڈرائیونگ انسٹی ٹیوٹ میں میں پا ٹائم ملازم تھی' ۔۔۔ بجے دفتر پہنچتی تھی۔ کامل کو معلوم تھا کہ وہ اس وقت گھر ہو گی۔

کامل کو صبح ہی صبح اپنے گھر کے دروازے پر دیکھ کر حیرت ہوئی۔ وہ ایک جہا عورت تھی' اس نے اپنی حیرت کو خوشی میں بدل لیا اور اس کی آمد کے مطلب کو ایک لمحے میں سمجھ لیکن انجان بن گئی۔

"مسز صادق' ایک کام کر دیں۔" کامل نے ڈرائنگ روم میں بیٹھتے ہی بات شروع کی

"سیٹھ آپ حکم کریں۔"

"کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ لبنیٰ بطور منیجر ہمارے یہاں ملازمت کر لے۔"

"مشکل ہے۔" مسز صادق نے کہا۔ "وہ پڑھ رہی ہے' ایم اے میں اس کا آخری سا ہے۔"

تم اس سے بات تو کرو۔" کامل کو اس کا فوراً انکار اچھا نہ لگا۔ "فل ٹائم نہ سہی' پا ٹائم سہی۔"

"میں اس سے بات کر چکی ہوں سیٹھ' وہ ملازمت نہیں کرنا چاہتی۔" مسز صادق نے انداز اختیار کیا۔

"اچھا۔" کامل نے افسردہ ہو کر کہا۔ "اچھا کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ آپ اس سے میری ملاقات کرا دیں۔" وہ کچھ دیر سوچ کر بولا۔

"کہاں؟" مسز صادق نے پوچھا۔

"یہیں' اسی ڈرائنگ روم میں۔" کامل نے کہا۔

"یہاں' یہ ہو سکتا ہے' یہ تو کوئی مشکل کام نہیں۔" مسز صادق نے اسے مسکرا کر دیکھا۔

"آپ کے شوہر کو تو کوئی اعتراض نہ ہو گا؟" کامل نے خدشہ ظاہر کیا۔

"اسے کیا اعتراض ہو سکتا ہے بھلا۔" مسز صادق طنزیہ انداز میں مسکرائی۔ "وہ اگر اعتراض کرنے کے قابل ہوتا تو اس گھر میں روز روز سالگرہیں نہ منائی جاتیں۔"

"پھر آپ کب بلا رہی ہیں اسے؟" کامل نے بے چینی سے پوچھا۔

"میں اس سے بات کر کے آپ کو بتاؤں گی' پھر آپ آ جائیے گا' لیکن لبنیٰ کو یہ محسوس نہ ہو کہ میں نے آپ کو بلایا ہے۔ آپ اتفاق سے میرے گھر آئیں گے اور اتفاق سے آپ کی ملاقات لبنیٰ سے ہو جائے گی۔" مسز صادق نے منصوبہ پیش کیا۔

"میں آپ کی بات سمجھ گیا' اب آپ بھی ایک بات کا خیال رکھئے گا۔ اس ملاقات کا عامل کو پتا نہ چلے۔" "ٹھیک ہے سیٹھ۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

کامل شوروم سے ڈاکٹر سے چیک اپ کے بہانے نکلا تھا۔ اس کی کسی ڈاڑھ میں درد ہو رہا تھا۔ اس نے دفتر سے نکلتے ہوئے عامل سے کہا تھا۔ "یار' کئی دن سے میری ڈاڑھ میں درد ہے' میں ڈاکٹر کو دکھانے جا رہا ہوں' اس سے میں نے وقت لے رکھا ہے۔"

"معلوم ہوتا ہے' عقل ڈاڑھ نکل رہی ہے۔" عامل نے ہنس کر کہا۔

یہ عقل آنے کا نہیں' جانے کا وقت ہے۔" کامل نے کچھ سوچتے ہوئے کہا اور پھر مسکراتے ہوئے شوروم سے نکل گیا۔

اس کے جانے کے پانچ منٹ بعد فون کی گھنٹی بجی۔ عامل نے ریسیور اٹھایا۔

"ذرا مسز صادق سے بات کرائیے۔" ادھر سے ایک کھنکتی آواز سنائی دی۔

"مسز صادق تو یہاں دو بجے آتی ہیں۔" عامل نے کہا۔

"آپ کون صاحب بول رہے ہیں؟" ادھر سے پوچھا گیا۔

"عامل قریشی۔" عامل نے جواب دیا۔

"اچھا' آپ عامل صاحب بول رہے ہیں۔" ادھر سے خوشی کا اظہار کیا گیا' "آپ نے مجھے پہچانا؟"

"معاف کیجئے گا' میں آپ کو نہیں پہچان سکا۔ میں نے آپ کی آواز پہلی بار سنی ہے۔"

"خیر یہ تو آپ جھوٹ کہہ رہے ہیں' کل میں نے آپ کو اتنے ڈھیر سارے گانے سنائے تھے۔"

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

"ارے! عامل خوشی سے اچھل پڑا۔ آپ مس لبنیٰ ہیں؟"

"جی جناب' میں لبنیٰ ہوں' کہئے آپ کو کل ہمارا گانا کیسا لگا؟"

"بھئی' آپ نے ٹھیک ہی کہا تھا' آپ کا گانا سننے کے بعد مجھے کسی چیز میں دلچسپی باقی نہیں رہی۔ بس ہر طرف آپ ہی آپ نظر آ رہی ہیں۔" عامل نے بے تکلفی سے کہا۔

"جھوٹ۔" لہجے میں بڑا پیار تھا۔

"آپ کی قسم۔" یہ انداز بھی مرمٹنے والا تھا۔

"قسم بھی کھائی تو میری۔" لبنیٰ نے قہقہہ لگایا۔ "ہاں' میں مر جاؤں' آپ کی بلا سے۔ اچھا خیر' کوئی بات نہیں ہم مر جائیں گے۔ آپ یہ بتائیے' موسم کیسا ہو رہا ہے اس وقت؟ لیکن آپ کو موسم کا کیسے پتا چلے گا' آپ تو بند ہیں شیشے کی دیواروں میں۔ آپ کو کیا پتا اس وقت باہر کس قدر خوبصورت بادل چھائے ہیں' کیسی ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے؟ میں یونیورسٹی جا رہی تھی' لیکن اب میں نے یونیورسٹی جانے کا ارادہ ترک کر دیا ہے' اب سمندر پر جانے کو جی چاہتا ہے۔"

"آپ کہاں ہیں؟"

"میں وہاں ہوں' جہاں سے کسی کو کسی کی خبر نہیں آتی' اس موسم نے مجھے پاگل کر دیا ہے۔"

جب کامل' مسز صادق کے گھر سے دفتر پہنچا تو اس نے عامل کو نہ پایا۔ اسے بڑی حیرت ہوئی کہ عامل اس وقت کہاں چلا گیا۔ دفتر میں بھی کسی کو معلوم نہ تھا کہ وہ کہاں گیا ہے۔ بس وہ اچانک اٹھ کر چلا گیا تھا۔

دو تین گھنٹے بعد عامل شوروم پر پہنچا تو اس کے انگ انگ سے خوشی پھوٹی پڑ رہی تھی۔ ایسی خوشی عامل کے چہرے پر اسی وقت نمودار ہوتی تھی' جب وہ کوئی بڑا سودا کر کے آتا تھا۔ کامل کو یہ بات اچھی طرح معلوم تھی کہ اس وقت وہ کسی گاڑی کا سودا کر کے نہیں آیا۔ آج کسی گاڑی کا معاملہ درپیش نہ تھا۔ پھر عامل کہاں سے آ رہا ہے؟ کامل سوچتا رہا' لیکن اس نے عامل سے اس سلسلے میں کوئی استفسار نہ کیا۔

عامل بھی خاموش رہا' اس نے خود سے نہ بتایا کہ وہ کہاں گیا تھا۔ وہ کیسے بتاتا کہ یہ دو تین گھنٹے اس نے ایک حسین لڑکی کے ساتھ گزارے ہیں' سمندر پر۔

لبنیٰ کی حسین باتیں' اس کے نقرئی قہقہے بار بار اس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔ کھلی آنکھوں کے سامنے بار بار اس کا دلکش چہرہ گھوم رہا تھا۔ عامل پر جیسے نشہ چھایا تھا' وہ بے خیالی میں بار بار مسکرا اٹھتا۔

کامل بھی کچھ سوچ سوچ کر مسکرا رہا تھا۔ ایک کی مسکراہٹ میں آج تھا تو دوسرے کی مسکراہٹ میں کل۔

کہتے ہیں کہ کل کبھی نہیں آتا' لیکن مسز صادق کی کوششوں سے 'کل' آ گئی۔ دوسرے

دن ہی لبنیٰ کامل کے ساتھ مسز صادق کے ڈرائنگ روم میں بیٹھی تھی۔ مسز صادق چائے' پانی کا بندوبست کرنے کے بہانے وہاں سے اٹھ گئی تھی۔

یہ ملاقات تقریباً دو گھنٹے جاری رہی۔ لبنیٰ بہت باتونی لڑکی تھی۔ وہ بغیر رکے بولنے کی عادی تھی۔ اس ملاقات میں وہی بولتی رہی اور کامل اس بولتی مینا کے چہرے میں کھویا رہا۔ اس دو گھنٹے کی ملاقات کے بعد کامل کو اندازہ ہوا کہ اس نے دنیا میں اب تک کچھ دیکھا ہی نہ تھا۔ اب لبنیٰ کو دیکھا تو اسے احساس ہوا کہ اس کے بغیر زندگی گزارنا کس قدر مشکل ہے۔

"کہئے ملاقات کیسی رہی؟" لبنیٰ کے جانے کے بعد مسز صادق نے پوچھا۔

"بہت اچھی۔ مسز صادق! آپ کا بہت شکریہ کہ آپ نے مجھے ایک اچھی لڑکی سے ملوایا۔ مسز صادق' میں اس لڑکی سے شادی کروں گا' یہ میں نے طے کر لیا ہے' بس مجھے آپ کے تعاون کی ضرورت ہے۔" کامل پروثوق لہجے میں بولا۔

"میں حاضر ہوں۔" مسز صادق نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "میرا گھر حاضر ہے۔"

"بس بس' مجھے یہی چاہئے' اب مجھے منزل زیادہ دور نظر نہیں آ رہی۔" کامل نے کہا' پھر کچھ سوچ کر بولا۔ "مسز صادق' ایک بات کا اور خیال رکھئے گا۔"

"کس بات کا؟" مسز صادق نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا

"اس ملاقات کا علم کسی اور کو نہ ہو' آپ میری بات سمجھ گئی ہیں نا۔" کامل نے کہا۔

"بات تو میں نے آپ کی سمجھ لی ہے' لیکن ایک بات آپ کو بتا دوں تو بہتر ہو گا۔" مسز صادق نے سنجیدگی سے کہا۔

"ہیں' کیا ہوا؟" کامل' مسز صادق کی سنجیدگی دیکھ کر پریشان ہو گیا۔ "کوئی خاص بات ہے کیا؟"

"جی ہاں' بہت خاص بات ہے۔ آپ اگر لبنیٰ سے شادی کی بات نہ کرتے تو شاید میں یہ بات آپ کو نہ بتاتی' لیکن آج کی ملاقات کے بعد آپ مجھے سیریس نظر آ رہے ہیں اس لیے میں چاہتی ہوں کہ جو میرے علم میں ہے' اسے آپ کو بتا دوں۔" مسز صادق بولی۔

"جلدی بتائیں نا۔" کامل بے چین ہو گیا۔

"لبنیٰ' اب میری اچھی خاصی دوست بن گئی ہے' وہ مجھ سے کچھ نہیں چھپاتی۔ کل وہ سیٹھ عامل سے ملی تھی۔ اس نے انہیں دانستہ فون کر کے بلایا تھا' وہ لوگ سمندر پر گئے تھے' مجھے ایسا محسوس ہوا ہے جیسے وہ سیٹھ عامل کو پسند کرنے لگی ہے۔" مسز صادق نے تیر چھوڑا۔

کیا اس نے یہ بات کہی؟" کامل نے گھبرا کر پوچھا' تیر سیدھا اس کے دل پر لگا تھا۔

"اس نے ایسی تو کوئی بات نہیں کہی' لیکن میں نے اس کی باتوں سے یہی اندازہ لگایا ہے۔"

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

"اندازہ غلط بھی ہو سکتا ہے۔" کامل نے ڈوبتے ہوئے تنکے کا سہارا لیا۔

"ہاں' ہو سکتا ہے۔" مسز صادق نے اثبات میں گردن ہلائی۔

"لیکن مسز صادق' وہ یہاں بھی تو آئی ہے' مجھ سے بھی تو ملی ہے۔" کامل نے کہا۔

"آپ سے اس کی ملاقات اچانک ہوئی ہے اسے نہیں معلوم تھا' آپ یہاں آ جائیں گے۔" مسز صادق نے وضاحت کی۔

"اچھا ٹھیک ہے' ایک دو دن بعد اسے یہاں پر بلائیں' یہ بتا کر کہ میں اس سے ملاقات کا خواہش مند ہوں۔" کامل نے کچھ سوچ کر کہا۔

"ٹھیک ہے۔" مسز صادق نے مودبانہ جواب دیا۔

مسز صادق نے دوسرے دن ہی لبنیٰ کو اپنے گھر بلا لیا۔ یہ بتا کر کہ سیٹھ کامل تم سے بہت متاثر ہوئے ہیں' وہ تم سے دوبارہ ملنے کے خواہش مند ہیں۔ لبنیٰ نے کوئی اعتراض نہ کیا۔ وہ مقررہ وقت پر مسز صادق کے گھر پہنچ گئی۔ کامل وہاں پہلے ہی سے موجود تھا۔

"مبارک ہو سیٹھ۔ وہ آ گئی ہے۔" مسز صادق نے کہا اور کمرے سے نکل گئی۔

لبنیٰ عجیب لڑکی تھی۔ وہ دونوں سے مل رہی تھی۔ یہ اور بات ہے کہ عامل کو کامل سے ملاقاتوں کا علم نہ تھا جبکہ کامل کو معلوم ہو جاتا تھا' لبنیٰ' مسز صادق کو فوراً اس ملاقات سے آگاہ کر دیتی۔

"مسز صادق' یہ لبنیٰ کیا کھیل' کھیل رہی ہے؟" کامل نے ایک دن کہا۔

"میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا۔" مسز صادق الجھ گئی تھی۔

"اسے بہرحال' ہم میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہوگا۔" کامل نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

"ٹھیک ہے' میں اسے سیٹھ عامل سے ملنے سے منع کر دوں گی' لیکن ایک مسئلہ ہے۔"

"وہ کیا؟" کامل بولا۔

"یہ ٹھیک ہے کہ پہلی ملاقات اس نے خود کی تھی' لیکن سیٹھ عامل اب خود اصرار کر کے اس سے ملنا چاہتے ہیں۔ وہ اسے ملاقات کے لیے مجبور کر دیتے ہیں۔ میرے خیال میں لبنیٰ کا جھکاؤ اب آپ کی طرف زیادہ ہے' لیکن کیونکہ وہ سیدھی اور معصوم لڑکی ہے' اس لیے وہ سیٹھ عامل کے اصرار کرنے پر ان سے بھی ملنے چلی جاتی ہے۔"

مسز صادق نے ایک نیا رخ پیش کیا۔

"سیٹھ عامل۔" کامل نے یہ کہہ کر ایک گہرا سانس لیا اور اپنی مٹھیاں بھینچ لیں۔

جب سے دونوں کی لبنیٰ سے ملاقات ہوئی تھی' دونوں کے درمیان ایک سرد جنگ چھڑی تھی۔ دونوں خاموش تھے' ایک دوسرے سے کچھ نہ کہتے تھے' لیکن اندر ہی اندر شعلے لپک رہے تھے۔ وہ دونوں اسے سنجیدگی سے حاصل کرنا چاہتے تھے۔

اس برسوں پرانی دوستی میں' کسی ایک دن بھی ان کے درمیان لڑائی نہ ہوئی تھی۔ وہ شیر و شکر تھے' ایک جان دو قالب تھے' جانے کتنی بجلیاں ان کی زندگی میں آ کر گزر گئی تھیں۔ انہوں نے کسی کو کبھی اتنی سنجیدگی سے لیا ہی نہ تھا۔ عورت ان کے نزدیک ایک جام سے زیادہ حیثیت نہ رکھتی تھی' اسے میز سے اٹھا کر ہونٹوں سے لگایا' خالی کیا اور پھر فرش پر اچھال دیا' لیکن لبنیٰ کے بارے میں ان کا نظریہ یکسر بدل گیا تھا' وہ اس جام کو مستقل اپنے پاس رکھنا چاہتے تھے۔

پھر پہلی بار ان دونوں کے درمیان جھگڑا ہوا۔ لبنیٰ کی وجہ سے نہیں' لیکن کہیں بہت دور جھگڑے کی بنا لبنیٰ ہی تھی' کامل نے کسی بات پر ایک سلز مین کو ڈانٹا۔ وہ سلز مین سر جھکائے کامل کی ڈانٹ سنتا رہا۔

جب وہ چلا گیا تو عامل نے کامل سے کہا۔ "یار' خواہ مخواہ تم نے اسے ڈانٹ دیا۔"

بس اسی بات' پر بات بڑھ گئی۔ دونوں میں خوب تو تو میں میں ہوئی۔ کہیں کا غبار' کہیں نکلا۔ دونوں کے دلوں پر تالا پڑ گیا۔ آئینہ دل میں جس طرح کب کا بال پڑ چکا تھا ایسا ٹوٹا کہ پھر کبھی نہ جڑ سکا۔ اس طرح معمولی جھگڑا' غیر معمولی ہو گیا۔

دونوں نے شام تک ایک دوسرے سے بات نہ کی۔ شوروم بند ہونے کے بعد وہ اگرچہ ایک ہی گاڑی میں گئے' لیکن ان کے درمیان فاصلہ میلوں کا تھا جاتے جاتے انہوں نے یہ بھی طے نہ کیا کہ کل کیا پہننا ہے۔ دوسرے دن کامل نے چاہا بھی کہ ٹیلی فون کر کے معلوم کرے۔ اس نے ریسیور اٹھا کر نمبر ملانے بھی شروع کیے تب ہی لبنیٰ اس کے سامنے آ گئی۔

"کامل صاحب' یہ آپ لوگ ایک جیسا ڈریس کیوں پہنتے ہیں' مجھے تو ایسا لگتا ہے جیسے سکول کے بچے آ رہے ہوں۔" لبنیٰ کی کہی ہوئی بات اچانک اسے یاد آئی۔

اس وقت تو اس نے اس بات کو ہنس کر ٹال دیا تھا' لیکن اب جیسے یہ بات اس کے دل پر گولی کی طرح لگی۔ اس نے جھٹکے سے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا اور آپ ہی آپ بڑبڑایا۔ "مارو گولی۔"

پھر اس دن وہ شوروم پر مختلف لباسوں میں پہنچے تو سب انہیں دیکھ کر حیران رہ گئے۔

وہ دونوں بڑے ماہر سلز مین تھے۔ وہ جس گاڑی کے پیچھے پڑ جاتے' اسے خرید کر چھوڑتے یا فروخت کر کے' کامل کی عامل سے ملاقات ایک گاڑی کے سلسلے میں ہی ہوئی تھی۔ سلطان شامی کو اس نے گاڑی دلوا دی تھی۔ عامل اس کا منہ دیکھتا رہ گیا تھا۔ جبکہ عامل' لاہور سے شامی کے ساتھ گاڑی دلوانے آیا تھا۔ اس سودے میں شکست کھا کر کامل عامل کی دوستی ہوئی تھی۔

آج پھر ایک ایسا ہی مرحلہ آ گیا تھا' لبنیٰ ان کے لیے آزمائش بن گئی تھی اور اس سودے میں کوئی ایک دوسرے سے شکست کھانے کے لیے تیار نہ تھا۔ دونوں ایک دوسرے کی ٹوہ میں رہنے لگے۔ جب ان میں سے کوئی شوروم سے غائب ہوتا تو دوسرا یہی سمجھتا کہ وہ لبنیٰ سے ملنے گیا ہے۔ وہ اس وقت تک کانٹوں پر لوٹتا رہتا جب تک دوسرا واپس نہ آ جاتا۔

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

ادھر عالم' کامل ایک دوسرے کو شکست دینے پر تلے ہوئے تھے تو ادھر لبنیٰ ان دونوں کو شکست دینے کی تیاری کر رہی تھی۔ وہ دونوں میں سے کسی کو چھوڑنا نہ چاہتی تھی' وہ جو کھیل' کھیل رہی تھی' اس کا پتا کامل' عالم کے فرشتوں کو بھی نہ تھا۔ وہ دونوں سے الگ الگ ملتی۔ دونوں کو اپنی محبت کا یقین دلاتی اور کامل کے سامنے عالم کو برا کہتی اور عالم کے سامنے کامل کو برا گردانتی۔ دونوں سمجھتے کہ وہ اس سے محبت کرتی ہے اور کامل یا عالم کباب میں ہڈی بنا ہوا ہے۔

پھر فیصلے کا دن آ پہنچا۔ دونوں نے طے کر لیا کہ کباب سے ہڈی نکال پھینکیں گے۔

لبنیٰ ٹریننگ کے لیے تین بجے آتی تھی۔ آج وہ ابھی تک نہ آئی تھی۔ ساڑھے تین بج رہے تھے۔ عالم بھی ڈھائی بجے سے شوروم سے غائب تھا۔ چار بجے کے قریب کامل نے مسز صادق کو بلوایا اور اس سے پوچھا۔ "آج لبنیٰ نہیں آئی؟"

"جی سیٹھ ابھی تک آئی نہیں' پتا نہیں کیا ہوا' اس کا فون بھی نہیں آیا۔" "اچھا ٹھیک ہے' آپ جائیں۔"

مسز صادق کے جانے کے بعد' وہ کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر کچھ سوچ کر ایک جھٹکے سے اٹھا۔ پھر کچھ خیال آیا تو بیٹھ گیا۔ میز کی دراز سے کلفٹن پر واقع خفیہ فلیٹ کی چابی نکالی اور تیزی سے شوروم سے نکل گیا۔

یہ فلیٹ دونوں کی خفیہ پناہ گاہ تھا۔ اس لگژری فلیٹ میں تمام آسائشیں موجود تھیں۔ جب ان کا جی چاہتا' وہ یہاں آتے' شراب پیتے' دل بہلاتے اور چلے جاتے۔ کبھی وہ اکٹھے آتے اور کبھی الگ الگ۔ اس فلیٹ کے بارے میں ان دونوں کے علاوہ کسی کو کچھ معلوم نہ تھا۔

کامل کو پورا یقین تھا کہ عالم شوروم سے غائب ہے تو وہ یقیناً فلیٹ پر ہو گا اور وہاں لبنیٰ بھی ہو گی۔ بظاہر اس یقین کی کوئی وجہ نہ تھی' لیکن کبھی کبھار آدمی کو بغیر کسی دلیل کے یقین ہو جاتا ہے اور پھر اس کا سوچا ہوا' سچ بھی نکلتا ہے۔

اس وقت بھی اس کا سوچا ہوا' سچ ثابت ہوا۔

جب کامل نے آہستہ سے چابی لگا کر دروازہ کھولا تو دونوں کو وہاں موجود پایا۔ کامل نے پلٹ کر دروازے کو زور سے ہاتھ مارا۔ دروازہ ایک دھماکے سے بند ہو گیا۔ عالم کو اس کی یہ حرکت پسند نہ آئی' لیکن وہ خاموش رہا۔ صرف اسے گھور کر دیکھا۔

میز پر پینے پلانے کا اہتمام تھا۔ صرف اہتمام' ابھی جام گردش میں نہیں آیا تھا۔ کامل بڑے اطمینان سے چلتا ہوا' ایک صوفے پر بیٹھ گیا اور لبنیٰ سے مخاطب ہوا۔

"مس لبنیٰ' آپ آج ٹریننگ کے لیے نہیں آئیں؟"

"تم یہاں صرف یہ معلوم کرنے آئے ہو۔" لبنیٰ سے پہلے عالم بولا۔

"نہیں' میں تو یہاں کچھ اور ہی دیکھنے آیا تھا۔" کامل نے تیکھا لہجہ اختیار کیا۔

"دیکھ لیا؟" عالم مستقل جارحانہ انداز اختیار کیے ہوئے تھا۔

"ہاں۔" کامل نے مختصر سا جواب دیا۔

"پھر اب جاؤ۔"

"جاؤ۔" کامل نے بڑے تلخ لہجے میں کہا۔ "کہاں جاؤں! اس فلیٹ پر جتنا تمہارا حق ہے' اتنا میرا بھی ہے۔"

"تم شوروم چلو' میں وہاں آ کر تمہیں چیک دے دیتا ہوں' تم اس فلیٹ سے اب دستبردار ہو جاؤ۔" عالم نے لبنیٰ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اچھا!" کامل کا لہجہ زہر میں بجھا ہوا تھا۔ "اور لبنیٰ کے بارے میں کیا خیال ہے۔ کیا اس سلسلے میں بھی تم مجھے کوئی چیک دو گے؟"

"لبنیٰ کا ہمارے درمیان کوئی جھگڑا نہیں۔" عالم نے بڑے پرسکون لہجے میں کہا۔

"یہ تم نے کیسے کہہ دیا؟" کامل سیدھا ہوتا ہوا بولا۔

"لبنیٰ مجھ سے محبت کرتی ہے۔" عالم نے بڑے وثوق سے کہا۔

"یہ بات تم سے لبنیٰ نے کہی؟" کامل نے پوچھا۔

"ظاہر ہے اور کون کہے گا۔" عالم نے لبنیٰ کی طرف دیکھا' وہ بالکل بت بنی بیٹھی تھی۔

"لیکن یہی بات لبنیٰ مجھ سے بھی کہہ چکی ہے۔" کامل نے بتایا۔

"ایسا نہیں ہو سکتا۔" عالم نے لبنیٰ کی طرف دیکھا' جو خاموش تماشائی بنی ہوئی تھی۔

"تو پوچھ لو' لبنیٰ تمہارے سامنے بیٹھی ہے۔" کامل نے کہا۔

"کیوں لبنیٰ؟" عالم اس سے مخاطب ہوا۔ "کامل کو بتا دو کہ تم مجھ سے محبت کرتی ہو۔"

"عالم صاحب' سچ بات کہوں' برا تو نہیں مانیں گے؟" لبنیٰ نے لب کھولے۔

"ہاں لبنیٰ تم سچ بات کہو' عالم برا مانتا ہے تو مانے۔" کامل بولا۔

میرے لیے اصل میں آپ دونوں ایک جیسے ہیں' مجھے آپ دونوں اچھے لگتے ہیں۔ مجھے اصل میں ایسا شوہر چاہیے جو مجھے پرتعیش زندگی دے سکے۔ جو زبان پر لاؤں پورا ہو جائے میرا کوئی خواب ادھورا نہ رہے۔ اس نے بڑی حسرت سے دونوں کو دیکھا۔

"میں تمہارے خواب پورے کروں گا۔" کامل نے کہا۔

"خواب تو میں بھی تمہارا کوئی ادھورا نہ رہنے دوں گا۔" عالم نے کہا۔

"پھر آپ دونوں آپس میں فیصلہ کر لیجیے۔" لبنیٰ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"لیکن فیصلہ کیسے ہو؟" کامل نے پوچھا۔

"سکہ اچھال لیجیے۔" لبنیٰ نے تجویز پیش کی۔

"ہاں' ناس کیا جا سکتا ہے' جو ناس جیت جائے' لبنیٰ اس کی۔" کامل نے کہا۔

"عالم صاحب' آپ خاموش کیوں ہیں؟ لبنیٰ نے پوچھا۔

"چلو ٹھیک ہے' نکالو سکہ۔" عالم نے کچھ سوچ کر کہا۔

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

کامل' عامل دونوں میں سے کسی کے پاس کوئی سکہ نہ تھا۔

تب اس مشکل کو لٹی نے حل کیا۔ اس نے اپنے پرس سے ایک اٹھنی نکال کر کامل کو دی۔

"آپ اچھالیں سکہ۔"

سکہ اچھالا گیا۔

سکہ جب قالین پر گرا تو وہ کامل کو خوشی دے گیا اور عامل کا دل ٹکڑے ٹکڑے کر گیا۔

عامل اپنی شکست تسلیم کرنے کو تیار نہ تھا' وہ ہٹ دھرمی پر اتر آیا۔

"سکہ میں اچھالوں گا' تم نے بے ایمانی کی ہے۔" عامل نے غصے میں کہا۔

"مجھے بے ایمان کہا تو آنکھیں نکال لوں گا۔" کامل کو بھی غصہ آ گیا۔

"اچھا تو میری آنکھیں نکالے گا' کتے۔" عامل آپے سے باہر ہو گیا۔ اس نے شراب کی بھری بوتل کامل کے کھینچ ماری۔ کامل کا سر پھٹ گیا۔ بھل بھل کر کے خون نکل آیا۔ لہو اس کے چہرے پر پھیل گیا۔ ناک اور ٹھوڑی سے بوند بوند کر کے ٹپکنے لگا۔ اس نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا تو ہاتھ لہو سے بھر گیا۔ خون دیکھ کر کامل کے جسم میں جیسے کوئی آتش فشاں پھٹا۔ وہ عامل پر ٹوٹ پڑا۔

"کمینے' میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" کامل ہذیانی انداز میں چیخا۔

عامل کو اس کے حملے کی توقع تھی لہٰذا اس کے حملہ آور ہونے سے پہلے ہی وہ کھڑا ہو گیا۔ اس نے بڑی پھرتی سے کامل کے ایک لات جمائی اور ٹوٹی ہوئی بوتل کی گردن اٹھالی۔ اس نے اس ٹوٹی بوتل سے خنجر کا کام لیا۔ اس نے اتنی تیزی سے وار کیے کہ کامل کو سنبھلنے کا موقع نہ ملا۔ وہ کاری زخم کھا کر ایک طرف کو لڑھک گیا۔

"کتے کا بچہ' مجھے مارنے چلا تھا۔ اوئے اب اٹھتا کیوں نہیں۔" وہ چیخا۔

"لگتا ہے مر گیا۔" لٹی نے خدشہ ظاہر کیا۔

"مر گیا ہے تو اچھا ہوا' اگر نہیں مرا ہے تو میں مار دوں گا۔"

"اسے سیدھا کر کے تو دیکھو۔" لٹی نے اصرار کیا۔

جب عامل نے اسے سیدھا کیا تو اس میں زندگی کے کوئی آثار نہ تھے۔ وہ اسے چھوڑ کر کھڑا ہو گیا اور لٹی کے نزدیک آ کر بولا۔ "لٹی' اب تو تم خوش ہو' تم نے جو کہا تھا' وہ میں نے کر دیا۔"

"ہاں' میں بہت خوش ہوں۔" لٹی نے اسے پیار بھری نظروں سے دیکھا۔ "میں نے جو کہا تھا' وہ تم نے کر دکھایا' اب تم جو چاہو گے' وہ ہو جائے گا۔"

"سچ؟" عامل نے خوش ہو کر کہا۔

"ہاں' بالکل سچ۔" لٹی نے اسے گہری نگاہوں سے دیکھا۔ "آؤ' دوسرے کمرے میں چلو۔"

"اس کمینے نے خواہ مخواہ یہاں آ کر ڈسٹرب کر دیا' مجھے تھکن کا احساس ہو رہا ہے۔"

"میں فریج سے دوسری بوتل نکالتی ہوں' تم بیڈ روم میں چلو' میں آج تمہیں اپنے ہاتھ سے پلاؤں گی۔" لٹی نے بڑی ادا سے کہا۔

"تمہاری ساری تھکن دور ہو جائے گی۔"

"قسم سے؟" عامل بے اختیار خوش ہوا تھا۔

"ہاں' قسم سے۔"

لٹی نے یہ کہہ کر کچن کا رخ کیا۔ عامل نے ڈرائنگ روم کا دروازہ بند کر کے بیڈ روم کی راہ لی۔ کامل کو قتل کر کے اسے شدید اعصابی تھکن ہو رہی تھی۔ وہ بیڈ پر کسی دیوار کی طرح گرا اور سوچنے لگا کہ یہ کیا ہو گیا؟

لٹی نے کچن میں داخل ہو کر سب سے پہلے گلاس میں خواب آور گولیاں ڈالیں' اس کے بعد اس نے فریج سے بوتل نکال کر شراب گلاس میں ڈالی اور اسے چمچے سے ملا دیا۔

جب وہ کمرے میں داخل ہوئی تو عامل آنکھوں پر ہاتھ رکھے لیٹا تھا۔ لٹی نے اسے بڑی محبت سے ہاتھ پکڑ کر اٹھایا اور اس کے ہونٹوں سے گلاس لگا دیا۔ عامل بڑی تیزی سے اپنی موت کو ڈکار گیا۔

خالی گلاس دیکھ کر لٹی کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔ شکار جال میں پھنس گیا تھا۔

پھر اس نے جلدی جلدی دو تین بار بوتل سے گلاس بھرے اور اسے پلا دیئے۔ وہ بڑی خوشی خوشی' جھوم جھوم کر پیتا گیا اور زندگی سے دور ہوتا گیا۔

خواب آور گولیوں نے اپنا اثر دکھانا شروع کر دیا تھا۔ اس کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہوتی جا رہی تھیں۔ وہ آپ ہی آپ بولے جا رہا تھا۔ "لٹی تم کتنی اچھی ہو' تمہیں شراب سے نفرت نہیں' تم میری بیوی بن کر اسی طرح مجھے پلاتی رہنا۔ آج میں بہت خوش ہوں۔" پھر اس نے جماہی لی۔ "میں بہت خوش ہوں' تم بہت اچھی ہو۔"

"ہاں' میں بہت اچھی ہوں' میں کتنی اچھی ہوں' یہ تمہیں صبح تک پتا چلے گا۔ اور جب تمہیں پتا چلے گا تو تم مجھے یہاں نہیں پاؤ گے۔"

عامل نے ایک اور زوردار جماہی لی اور بولا۔ "مجھے نیند آ رہی ہے۔"

"ہاں' تمہیں اب ایسی نیند آئے گی جس کا کوئی اختتام نہ ہو گا۔ اب تم ہمیشہ سوتے رہو گے' تمہیں کوئی اٹھانے والا نہ ہو گا۔

"ایں' کیا کہہ رہی ہو؟" عامل نے بمشکل آنکھ کھولتے ہوئے پوچھا۔ شراب اور نیند کی گولیوں نے اس کی بری حالت کر دی تھی۔

"میں جو کہہ رہی ہوں' اسے غور سے سنو' میں کوئی اخلاق باختہ لڑکی نہیں ہوں۔ مجھے شراب سے شدید نفرت ہے۔ مجھے تو اسے دیکھ کر ہی ابکائی آ رہی ہے' کسی کو پیش کرنا تو دور کی بات ہے۔ میں جو تم دونوں کے قریب آئی تو اس کا بھی ایک خاص مقصد تھا۔ میں نے تم دونوں کو محبت کا

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

فریب دیا۔ میں تو تم دونوں سے انتقام لینا چاہتی تھی۔"

انتقام کے لفظ پر عالم کے سوتے ذہن میں کہیں ہلکی سی سوئی چبھی۔ اس کے ہونٹ وا ہوئے' وہ غنودگی میں بولا۔ "انتقام' کیسا انتقام؟"

"اس لڑکی کو بھول گئے جس کی زندگی تم دونوں نے اسی فلیٹ میں برباد کی۔ اور وہ جینے کا حوصلہ ہار بیٹھی۔ وہ یہاں سے اپنے گھر جانے کے بجائے سمندر پر چلی گئی اور اس کی اونچی اونچی لہروں میں ہمیشہ کے لیے اپنا معصوم چہرہ چھپا لیا۔ ہاں' میں بدر احمد کی بات کر رہی ہوں' میں بدر احمد کی چھوٹی بہن لبنیٰ احمد ہوں۔ مجھے اس کی خودکشی پر کبھی یقین نہ آیا۔ مجھے کیا' کوئی بھی اسے خودکشی کا کیس تسلیم کرنے کو تیار نہ تھا' لیکن حالات اور واقعات ایسے تھے کہ کوئی کچھ نہ کر سکتا تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس نے خودکشی کی تھی' لیکن اس خودکشی کی وجہ تم دونوں تھے۔ تم دونوں جنہوں نے اس سے اس کی پاکیزگی کو چھین لیا تھا' اس کی روح کو زخمی کر دیا۔ اس شام میری بہن گھر نہیں آئی تھی بلکہ مسز کاظمی اسے یہاں لے آئی تھی' پھر وہ اسے یہاں چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ پھر وہ وقت مقررہ پر ہمارے گھر پہنچی' اس نے حسب معمول گاڑی کا ہارن بجایا اور تیزی سے نکل گئی۔ گاڑی میں میری بہن نہ تھی۔ میرے گھر والوں نے یہی سمجھا کہ مسز کاظمی' بدر احمد کو چھوڑ کر گئی ہے اور وہ گھر آنے کے بجائے یہاں سے واپس سمندر پر چلی گئی۔ ہمیں اصل حقائق کا زندگی بھر پتا نہ چلتا وہ تو بھلا ہو مسز کاظمی کے ضمیر کی خلش کا کہ اس نے اسے چین نہ لینے دیا اور ایک خط کے ذریعے اس نے اصل حقائق سے ہمیں آگاہ کر دیا۔ شاید وہ مسز کاظمی کے گناہوں کا کفارہ تھا' اس نے پوری زندگی بڑی سیاہ گزاری تھی۔ مگر آخری وقتوں میں وہ اپنی زندگی کچھ سفید کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ اس خط کے ملتے ہی میرے دل میں انتقام کی آگ بھڑک اٹھی۔ میں نے طے کر لیا کہ میں تم دونوں بھیڑیوں کو ٹھکانے لگا کر رہوں گی۔ میں اپنے مشن میں کامیاب ہو چکی ہوں۔ تم میری بات سن رہو' سمجھ رہے ہو؟" لبنیٰ نے عالم کا کندھا ہلایا۔

لیکن عالم تو کب کا سو چکا تھا' اب تو وہ خراٹے لے رہا تھا۔

پھر لبنیٰ نے جہاں جہاں اس کی انگلیوں کے نشان تھے' اپنے رومال سے انہیں صاف کیا۔ اپنا پرس اٹھایا اور اپنے منصوبے کو آخری ٹچ دینے کے لیے چند لمحوں کے لیے کچن میں گئی۔ پھر بڑے اطمینان سے وہاں سے باہر نکلی' فلیٹ کی کھڑکیوں پر نظر ڈالی' سب بند تھیں۔ اس کے بعد اس نے فلیٹ کا دروازہ کھولا' اس کے ہاتھ میں رومال تھا۔ باہر نکل کر اس نے دروازہ آہستہ سے بند کیا۔ دروازہ لاک ہو گیا۔ پھر وہ ہونٹوں پر فتح مندانہ مسکراہٹ لیے لفٹ کی طرف بڑھنے لگی۔ ساتویں منزل سے نیچے آتے ہوئے سوچ رہی تھی' اب عالم کو موت کے پنجے سے کوئی چھڑا سکے گا۔

اس نے کچن میں لگے' چاروں گیس کے چولہے پورے کھول دیئے تھے۔

☆.....☆.....☆

شیرنی

"کالی حویلی" کے پیچھے چھپا ہوا سنہرا سورج آہستہ آہستہ بلند ہو رہا تھا۔

یہ حویلی کنور جہاں زیب کی تھی۔ سفید رنگ کی اس حویلی کو "کالی حویلی" کیوں کہا جاتا تھا' یہ کسی کو معلوم نہ تھا۔ بس ایک بات مشہور ہو گئی تھی' غلط یا صحیح' وہ سینہ بہ سینہ چلی آ رہی تھی۔ ہو سکتا ہے' بظاہر سفید نظر آنے والی یہ حویلی اندر سے کالی ہو۔ حویلی کے ان سفید ستونوں میں جانے کتنی ظلم کی داستانیں چھپی ہوں۔ اس کی سفید پیشانی پر جانے کتنے کلنک لگے ہوں۔ ان سفید دیواروں نے سفاکی کے جانے کیا کیا مناظر دیکھے ہوں۔

ویسے جب کوئی بات مشہور ہوتی ہے تو وہ بے بنیاد نہیں ہوتی' اس کے پیچھے کچھ نہ کچھ ہوتا ہے۔ رائی کا پہاڑ بن سکتا ہے لیکن رائی کے بغیر نہیں۔ اس سفید حویلی کو "کالی حویلی" کا نام دینے والوں نے کہیں کچھ نہ کچھ ضرور دیکھا ہوگا۔ اگر دیکھا نہیں ہوگا تو محسوس کیا ہوگا۔ کہتے ہیں کہ کسی برائی کو چھپایا نہیں جا سکتا۔ جلد یا بدیر وہ ظاہر ہو کر رہتی ہے۔ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ دیواروں کی بھی آنکھیں ہوتی ہیں۔ ان دیواروں کے حصار میں جو کچھ ہوتا ہے وہ جوں کا توں ریکارڈ ہوتا جاتا ہے۔ آواز بھی اور صورت بھی اور وہ حرکتیں بھی جو انسان دیواروں کو اندھا سمجھ کر کرتا ہے۔ پھر یہ پکی اور کچی دیواریں' اونچی اور نیچی دیواریں' پتلی اور موٹی دیواریں حساس ذہنوں کو سب کچھ سنا اور دکھا دیتی ہیں۔

بعض مکانوں کو دیکھ کر اچانک پراسراریت کا احساس ہوتا ہے۔ اچھے بھلے جگمگاتے مکانوں پر تاریک چادر پڑے ہونے کا گمان ہوتا ہے۔ کنور جہاں زیب کی یہ حویلی بھی انہی مکانوں میں سے تھی۔ سفیدی کے باوجود سیاہی کا احساس ہوتا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے اندر کچھ ہو رہا ہے' اندر کچھ ہوا ہے یا اندر کچھ ہونے والا ہے۔ شاید اسی لیے اس حویلی کا نام "کالی حویلی" پڑ گیا تھا۔

حویلی کے پس منظر سے ابھرتا سورج اسے اس وقت واقعی "کالی حویلی" بنائے ہوئے تھا۔ پراسرار اور عجیب۔

کنور جہاں زیب صبح ہی اٹھنے کے عادی تھے۔ سب سے پہلے وہ اپنی گھوڑی پر بیٹھ کر ہوا خوری کے لیے نکلتے۔ گھنٹے آدھ گھنٹے کی سیر کے بعد جب وہ واپس پلٹتے تو سورج ان کی حویلی کے پیچھے سے سر ابھار رہا ہوتا۔

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

آج بھی جب انہوں نے اپنی چہیتی گھوڑی برق فشاں کی پیٹھ سے چھلانگ لگائی تو انہیں روز کی طرح حویلی پر اندھیرا چھایا دکھائی دیا۔ کنور جہاں زیب کو گھوڑی سے اترتے دیکھ کر ملازم تیزی سے آگے بڑھا اور اس نے برق فشاں کی لگام تھام لی۔ پھر وہ بڑے پیار سے اسے اصطبل کی طرف لے چلا۔

کنور جہاں زیب مضبوط قدموں سے چلتے ہوئے حویلی میں داخل ہوئے۔ حمام تیار تھا۔ وہ جدید آسائشوں سے آراستہ اس باتھ روم میں گھس گئے۔ باتھ روم میں نصب قد آدم آئینے میں اپنے سراپا کو دیکھتے ہوئے انہوں نے کپڑوں سے جان چھڑائی۔ اپنے کسرتی بدن کی خوبیوں اور خامیوں کو حسب معمول جانچا' پرکھا اور پھر ٹب میں اتر گئے۔

نہا دھو کر' ہشاش بشاش ہو کر وہ باتھ روم سے برآمد ہوئے تو سامنے بڑے مودبانہ انداز میں چھوٹی بیگم کی خاص ملازمہ کو کھڑا پایا۔

کنور جہاں زیب نے اسے محض سوالیہ نگاہوں سے دیکھا' منہ سے کچھ نہ بولے۔

"سرکار!" ملازمہ اتنا کہہ کر چپ ہو گئی۔ آگے بولنے کی ہمت نہ پڑی۔

"ہاں..... بولو کیا بات ہے۔" کنور جہاں زیب نے بولنے کی اجازت دی۔

"سرکار' چھوٹی مالکن آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔" ملازمہ نظریں نیچی کیے دھیرے سے بولی۔

"ٹھیک ہے' ہم آتے ہیں۔" وہ جانتے تھے کہ انہیں کیوں بلایا گیا ہے۔

یہ سن کر وہ تھوڑا سا ادب سے جھکی اور پھر الٹے قدموں نظریں جھکائے پردوں کے پیچھے گم ہو گئی۔

جہاں زیب کی دو بیویاں تھیں۔ ویسے باقاعدہ شادیاں تو انہوں نے چار کی تھیں۔ ایک ساتھ نہیں' یکے بعد دیگرے۔ اب تک دو بیویوں کو کفن پہنا چکے تھے۔ تیسری قریب المرگ تھی' کینسر کی مریض۔ گو ان کی عمر زیادہ نہ تھی' یہی ستائیس اٹھائیس سال رہی ہو گی لیکن سینے کے کینسر نے انہیں سانپ بن کر ڈس لیا تھا۔ اب وہ اس کینسر کے زہر کو اپنے جسم میں پھیلتا اور بڑھتا محسوس کر رہی تھیں۔ چوتھی بیوی یعنی چھوٹی بیگم ہی اب سارے سیاہ و سفید کی مالک تھیں۔

چار شادیاں کرنے کے باوجود وہ جاگیر کے وارث سے محروم تھے۔ بس پہلی بیوی سے ایک لڑکی تھی جو لاہور میں زیر تعلیم تھی۔ بعض لوگ اللہ کی بنائی اس زمین پر فرعون بن جاتے ہیں۔ اکڑ کر چلتے ہیں۔ خود کو بہت کچھ اور سامنے والے کو گھاس کوڑا سمجھتے ہیں۔ وہ بنانے والے کو بھول کر خود بنانے والے بن جاتے ہیں لیکن اللہ پھر اللہ ہے۔ وہ بہت کچھ دے کر بہت کچھ چھین لیتا ہے' اپنے ہونے کا احساس دلا دیتا ہے۔ یہ بتا دیتا ہے کہ بندہ کتنا مجبور ہے۔ اب کوئی سمجھے یا نہ سمجھے' یہ اس کی مرضی۔ آپ کروڑ پتی ہیں۔ آپ کی ڈائننگ ٹیبل پر خورد و نوش کی ہزارہا اشیاء سجی ہیں لیکن آپ کھا کیا رہے ہیں' ڈبل روٹی کا ایک سلائس جس کی قیمت پچیس پیسے بھی نہیں' کیا پی رہے ہیں'

بغیر شکر کی چائے کہ اس سے زیادہ کی اجازت نہیں' ڈاکٹر نے سختی سے منع کر دیا ہے۔ اب آپ لوگوں کو محض کھانا ہوا دیکھ سکتے ہیں' خود کچھ نہیں کھا سکتے۔ آپ کی ڈائننگ ٹیبل پر ہزار نعمتیں موجود' پر آپ کھانے سے مجبور۔ یہ ہے قدرت کا کھیل' آپ مانیں یا نہ مانیں۔

کنور جہاں زیب کا مسئلہ بھی کچھ اسی طرح کا تھا۔ اللہ نے انہیں اتنی زمین بخشی تھی کہ اگر کوئی گھڑ سوار صبح تڑکے زمین کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک گھوڑے پر سوار ہو کر پوری رفتار سے شام تک پہنچنے کی کوشش کرے تو نہ پہنچ پائے۔ زمین کے علاوہ ان کی کئی ملیں تھیں' پھر مختلف کاروبار میں سرمایہ کاری کر رکھی تھی۔ گویا اللہ نے دولت انہیں جی کھول کر بخش دی تھی لیکن اس دولت کے وارث سے انہیں محروم کر دیا تھا۔ یہ ہے قدرت' آپ جانیں یا نہ جانیں۔

ناشتے کی میز پر چھوٹی بیگم' کنور جہاں زیب کی منتظر تھیں جیسے ہی وہ کمرے میں داخل ہوئے چھوٹی بیگم اپنے مجازی خدا کے احترام میں کھڑی ہو گئیں۔ اپنی خوبصورت مسکراہٹ سے انہیں خوش آمدید کہا۔ ملازمہ نے آگے بڑھ کر کرسی پیچھے کھسکائی۔ انہیں بیٹھنے میں مدد دی۔ خوشبو میں بسا نیپکن ان کی گود میں پھلایا اور چند قدم پیچھے ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔ چھوٹی بیگم نے اسے آنکھ سے جانے کا اشارہ کیا تو وہ بے آواز کمرے سے نکل گئی۔

ملازمہ کے جانے کے بعد چھوٹی بیگم نے اپنے شیریں ہونٹوں سے انہیں وش کیا اور اپنی مخصوص کرسی پر بیٹھ گئیں۔

"آج شاپنگ کا ارادہ ہے؟" کنور جہاں زیب نے اپنی چوتھی پرکشش بیوی کو مسکرا کر دیکھا۔

"آپ نے کیسے جانا۔" چھوٹی بیگم حیران رہ گئیں۔

"بھئی' آپ ہماری بیگم ہیں' ہم آپ کے انداز نہیں سمجھیں گے تو اور کون سمجھے گا۔"

"لیکن میں تو روز جیسی ہوں۔"

"یعنی گلاب جیسی۔"

"نہیں' روزانہ جیسی۔ آپ بھی خوب بات سے بات نکالتے ہیں۔" چھوٹی بیگم نے انہیں بڑے پیار سے دیکھا۔

کنور جہاں زیب اس وقت پینتالیس کے پیٹے میں تھے' یہ اور بات ہے کہ وہ اپنی عمر سے دس سال چھوٹے لگتے تھے۔ صحت اچھی تھی۔ رنگ و روپ چمکتا ہوا تھا۔ سرخ سفید رنگت' گھنے سیاہ بال جن میں ایک بال بھی سفید نہ تھا۔ وہ درمیان سے مانگ نکالتے تھے۔ آنکھیں بڑی بڑی اور نیلگوں۔ یہ رنگت انہیں اپنے باپ سے ورثے میں ملی تھی اور یہ وراثت انہوں نے اپنی بیٹی کو منتقل کر دی تھی۔ انہوں نے دنیا دیکھی تھی اور اس دنیا میں انہوں نے عورتیں زیادہ دیکھی تھیں' ان کا خیال تھا کہ وہ عورتوں کی نفسیات سے بہت اچھی طرح واقف ہیں۔ ہو سکتا ہے' یہ بات ٹھیک ہو۔ جس مرد کا اوڑھنا بچھونا عورتیں ہوں' وہ اگر ان کی نفسیات سے واقفیت کا دعویٰ کرے تو مان لینے میں کیا ہرج

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہے۔ چھوٹی بیگم بڑی خوشامد پسند واقع ہوئی تھیں۔ جب انہیں اپنی کوئی بات منوانا ہوتی تو وہ کنور جہاں زیب کی اسمارٹنیس کی تعریف کرتیں یا پھر اس طرح وش کرتیں جس طرح آج انہوں نے کی تھا اور جب وہ ایسا کرتیں تو کنور صاحب فوراً تاڑ جاتے کہ آج کچھ دال میں کالا ہے۔

"جی بیگم صاحب! پھر فرمائیں' کیا ارادہ ہے؟" کنور جہاں زیب نے چائے کی پیالی سے اٹھتی ہوئی بھاپ کو گھورتے ہوئے کہا۔

"آپ یہ تو بتائیں کہ آپ نے کیسے جانا؟" چھوٹی بیگم نے حیرت ظاہر کی۔

"چھوڑیں اس بات کو۔ آپ مطلب پر آئیں۔" کنور جہاں زیب نے لہجے میں ذرا سی سنجیدگی پیدا کرلی۔

تب چھوٹی بیگم فوراً سنبھل گئیں۔ انہیں معلوم تھا کہ بحث سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ بات بگڑ جائے گی۔ تب وہ فوراً مطلب پر آ گئیں۔

"وہ جیولر کا فون آیا تھا۔" چھوٹی بیگم نے لہجے میں شہد بھرتے ہوئے کہا۔ "اس کے پاس کچھ نئے سیٹ آئے ہیں۔ پوچھ رہا تھا کہ بھجوادوں یا خود آ کر دیکھیں گی۔"

"آپ نے جواب دیا ہوگا کہ بھیجو نہیں' میں خود آؤں گی؟" کنور جہاں زیب کسی نجومی کی طرح بولے۔ "کیوں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا میں۔"

"کہیں مجھ سے غلطی تو نہیں ہوگئی۔" چھوٹی بیگم کچھ خوفزدہ سی ہوگئیں۔

"نہیں' غلطی تو نہیں ہوئی۔ اگر وہ جیولر سیٹ یہاں لے کر آجاتا تو کیا مزہ آتا۔ شاپنگ کا اپنا ایک مزہ ہوتا ہے۔ پھر وہ سارے سیٹ تو یہاں نہیں لاسکتا نا۔ آپ سوچتی رہتیں کہ کہیں اچھا سیٹ دکان پر نہ چھوڑ آیا ہو۔ شہر جائیں گی تو دو چار جیولروں کی دکان پر ضرور پھیرا ماریں گی۔ اس طرح شاپنگ میں مزہ آئے گا۔" کنور جہاں زیب چائے کا آخری گھونٹ لیتے ہوئے بولے۔

"کنور صاحب! آپ بہت گریٹ ہیں۔ تو پھر میں جاؤں۔"

"ہاں' جائیں۔" انہوں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"کون سی گاڑی لے جاؤں اور کس کس کو ساتھ لے جاؤں۔" چھوٹی بیگم نے پوچھا۔

جواب میں کنور جہاں زیب نے ایک ایک بات تفصیل سے بتادی۔ کون سی گاڑی جائے گی۔ کون کون ساتھ جائے گا۔ کب روانگی ہوگی اور کب واپسی۔ سارا شیڈول طے کرکے انہوں نے اسٹڈی کا رخ کیا۔

اسٹڈی میں شیشے کی ایک چھوٹی میز پر آج کے تمام اخبارات قرینے سے رکھے تھے۔ ایک ایک اخبار ترتیب سے دیکھتے گئے۔ یہ ترتیب ان کی پسند کے مطابق تھی۔ اخبارات وہ تفصیل سے نہ پڑھتے تھے لیکن دیکھتے وہ اخبار کا ہر صفحہ تھے۔ اشتہارات بطور خاص دیکھتے۔ اخباروں کے اداریے پڑھتے تو کچھ اخباروں کی خبروں پر نظر ڈالتے۔ اس طرح اخبارات کے مطالعے میں گھنٹا ڈیڑھ گھنٹا ضرور صرف ہو جاتا۔

ابھی وہ اخبارات کے مطالعے سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ یعقوب اسٹڈی میں داخل ہوا اور بغیر بولے' مودبانہ انداز میں ہاتھ باندھ کر کھڑا ہوگیا۔

"ہاں۔" کنور جہاں زیب نے نظر اٹھائی۔ "کیا بات ہے؟"

"سرکار' رانی آ گئی ہے۔" اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"اچھا۔" رانی کا نام سن کر ان کے چہرے پر کئی رنگ بکھر گئے۔ "ٹھیک ہے' تم چلو' میں آتا ہوں۔"

"جی' بہتر سرکار!" یعقوب نے الٹے قدموں لوٹتے ہوئے کہا۔

یعقوب ان کا سب سے پرانا ملازم تھا۔ وہ اس پر بڑا اعتماد کرتے تھے اور اس اعتماد کی ڈوریاں بہت دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ یعقوب جہاں ایک وفادار اور بھروسے کا ملازم تھا' وہاں اس میں ایک خوبی یہ بھی تھی کہ کنور صاحب اسے جو دکھاتے' وہ دیکھتا' جو سناتے' وہ سنتا۔ اگر اسے کچھ زیادہ دیکھنا اور سننا پڑ جاتا تو وہ پتھر کا بن جاتا۔

جب وہ اس مخصوص کمرے میں داخل ہوئے جہاں رانی کو آنا تھا تو انہوں نے دیکھا کہ وہاں یعقوب ہاتھ میں ہنٹر لیے کھڑا ہے۔ اس مخصوص کمرے میں صرف ایک اونچی سی کرسی پڑی تھی اور اس کرسی کے قریب مضبوط تپائیوں پر بڑے بڑے تھال رکھے تھے جو ریشمی کپڑوں سے ڈھکے تھے۔ یہ اونچی کرسی بالکل کمرے کے وسط میں رکھی تھی' نیچے دبیز قالین تھا۔

کنور جہاں زیب نے یعقوب کے ہاتھ سے ہنٹر لے لیا اور مضبوط قدموں سے چلتے ہوئے کرسی پر براجمان ہوگئے۔

"بلاؤ اسے۔" انہوں نے حکم دیا۔

حکم سن کر یعقوب کمرے کے بڑے دروازے کی طرف بڑھا۔ یہ دروازہ پیچھے باغ میں کھلتا تھا۔ دروازہ کھلتے ہی ایک پنجرہ گاڑی دکھائی دی۔ یعقوب کے اشارہ کرنے پر اس گاڑی کو آگے لایا گیا۔ گاڑی سے دروازے تک دو چوڑے تختے رکھے گئے اور پھر لوہے کی سلاخوں والا جنگلا اوپر کھینچ لیا گیا۔

جنگلا کھلتے ہی رانی تیر کی طرح باہر نکلی اور تختوں پر چلتی ہوئی کمرے میں آ گئی۔ کنور جہاں زیب کو دیکھ کر وہ ہلکا سا غرائی اور پھر ان کے قدموں میں یوں بیٹھ گئی جیسے کوئی پالتو بلی ہو۔

رانی پالتو بلی نہ تھی' شیرنی تھی شیرنی۔

کنور جہاں زیب نے اپنی چہیتی رانی کے سر پر ہاتھ پھیرا اور پوچھا۔ "کہو رانی' کیسی ہو؟"

رانی جواب میں ہلکا سا غرائی جیسے کہا ہو۔ "ٹھیک ہوں کنور صاحب۔"

تب کنور جہاں زیب نے تھال کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ یعقوب نے تھال سے ریشمی کپڑا ہٹایا۔ تھال میں گائے کا تازہ گوشت تھا۔ یعقوب نے گوشت کا ایک پارچہ اٹھا کر کنور صاحب کے

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہاتھ پر رکھا۔ کنور صاحب نے گوشت کے اس ٹکڑے کو اپنے ہاتھ میں پکڑ کر ہوا میں لہرایا۔ رانی اپنے پچھلے دو پاؤں پر کھڑی ہوگئی اور کنور صاحب نے جیسے ہی گوشت کا ٹکڑا چھوڑا' رانی نے اسے فوراً لپک لیا۔ اس طرح ایک ایک کر کے سارے تھال خالی ہوگئے۔

کنور جہاں زیب کا یہ روز کا مشغلہ تھا۔ رانی کو انہوں نے بچپن سے اسی طرح کھلایا تھا۔ وہ اب ان کے سامنے شیرنی نہ رہی تھی' بلی ہوگئی تھی۔ وہ ان سے اس قدر مانوس تھی کہ ایک دن کی ضروری کام سے کنور صاحب کو صبح ہی شہر جانا پڑا تو وہ یعقوب کو ہدایت کر گئے کہ وہ رانی کو گوشت کھلا دے اور جب یعقوب نے کنور جہاں زیب کی طرح کرسی پر بیٹھ کر گوشت کا ٹکڑا ہوا میں لہرا کر نیچے چھوڑا تو وہ سیدھا قالین پر گرا۔ رانی نے اسے لپکنے کی بالکل کوشش نہ کی۔ یعقوب نے دوبارہ وہی عمل دہرایا کہ شاید غلطی سے ایسا ہوگیا ہے لیکن دوبارہ بھی رانی نے گوشت کا ٹکڑا کیچ کرنے کی کوشش نہ کی۔ تب یعقوب نے گوشت کا تھال اس کے سامنے رکھ دیا مگر رانی نے اسے سونگھا بھی نہیں۔ یعقوب نے ساری ترکیبیں آزما ڈالیں' پر رانی ٹس سے مس نہ ہوئی۔ زبردستی گوشت کھلانے کی کوششوں پر رانی کو غصہ آ گیا۔ وہ یعقوب کو دیکھ کر غرانے لگی۔ اسے غصے میں دیکھ کر یعقوب کے پسینے چھوٹ گئے۔ ہنٹر پر اس کی گرفت مضبوط ہوگئی۔ وہ یہ بات اچھی طرح جانتا تھا کہ رانی اگر واقعی غصے میں آ گئی اور اس نے حملہ کر دیا تو اس کے ایک پنجے سے ہی اس کی کھال ادھڑ جائے گی۔ موت کو اتنے نزدیک دیکھ کر اس کے جسم پر کپکپاہٹ طاری ہوگئی۔ اس نے بڑی ہوشیاری اور آہستگی سے اسے پنجرے کی طرف جانے کا اشارہ کیا۔ یعقوب جیسے جیسے اسے پنجرے کی طرف جانے کا اشارہ کرتا' ویسے ویسے اس کی گھبراہٹ میں اضافہ ہوتا جاتا۔ یعقوب دھیرے دھیرے اب کرسی کی اوٹ میں چلا گیا تھا۔ لیکن اسے یہ بات اچھی طرح معلوم تھی کہ کرسی اسے بچا نہ سکے گی' کرسی نے کسی کو بچایا ہے۔ کرسی کہاں اتنی مضبوط ہوتی ہے۔

رانی اس کے ہاتھ سے گوشت نہیں کھا رہی تھی۔ واپس اپنے پنجرے میں بھی نہیں جا رہی تھی۔ اب سوائے اس کے کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ یہاں سے راہ فرار اختیار کرے۔ تب وہ غیر محسوس طریقے پر اس دروازے کی طرف بڑھنے لگا جو حویلی میں کھلتا تھا۔ وہ الٹے قدموں پیچھے ہٹ رہا تھا۔ نظریں رانی پر جمی تھیں۔ رانی اب بیٹھ گئی تھی اور بڑے غور سے یعقوب کو پیچھے ہٹتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

دروازے کو اپنے پیچھے محسوس کر کے اس نے ایک ہاتھ سے اس کا ہینڈل ٹٹولا اور چشم زدن میں دروازے سے باہر ہوگیا۔ پھر اس نے تیزی سے بھاگ کر پنجرہ گاڑی کے محافظ ہلاکو کو ہوشیار کر دیا اور ہدایت کر دی کہ جیسے ہی رانی گاڑی کی طرف آئے تو فوراً جنگلا گرا دیا جائے۔ اس کے علاوہ اس نے حویلی کے دوسرے محافظوں کو بھی چوکس کر دیا اور خود بھی اپنی ڈبل بیرل بندوق میں ایل جی کے دو کارتوس ڈال کر باغ میں ٹہلنے لگا..... لیکن کچھ بھی نہ ہوا۔

رانی پنجرہ گاڑی کی طرف نہ آئی۔ حتیٰ کہ دہاڑنے یا غرانے تک کی آواز نہ سنائی دی۔

کمرے میں مکمل سناٹا تھا جیسے رانی پاؤں پر سر رکھے سو گئی ہو اور واقعی وہ سو گئی تھی۔

جب دوپہر کو کنور جہاں زیب شہر سے واپس آئے تو گاڑی سے اترتے ہی انہیں یعقوب کی شکل دکھائی دی۔ اس کے چہرے پر زردی کھنڈی ہوئی تھی اور ایک ہاتھ میں بندوق تھی جس کی نال زمین کی طرف تھی۔ وہ نظریں نیچی کیے شرمندہ سا کھڑا تھا۔

"کیا ہوا؟" کنور صاحب کے چہرے پر تشویش کی لہر دوڑ گئی لیکن انہوں نے اپنے لہجے کو برہم نہ ہونے دیا۔

"مالک! رانی ابھی تک کمرے میں ہے۔" یعقوب نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"کیا مطلب؟" کنور صاحب کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔

"مالک' اس نے گوشت نہیں کھایا اور نہ ہی وہ پنجرے میں گئی۔ وہ کمرے میں ہے۔ مالک' میں نے کوشش کی وہ گوشت کھا لے یا پھر پنجرے میں چلی جائے مگر ایسا نہ ہوسکا۔ رانی غصے میں آنے لگی تو میں نے راہ فرار اختیار کی۔" یعقوب نے اپنی پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے روداد سنائی۔

"ارے!" کنور صاحب نے حیرت کا اظہار کیا۔ "آؤ میرے ساتھ۔" دروازے کے قریب پہنچ کر انہوں نے ایک ہاتھ کوٹ کی جیب میں ڈال کر ریوالور پر گرفت مضبوط کر لی اور دوسرے ہاتھ سے دھیرے سے دروازہ کھولا۔ پیچھے یعقوب بندوق لیے چوکس تھا۔ کمرے میں داخل ہوئے تو انہوں نے دیکھا کہ رانی اگلے دو پاؤں پر سر رکھے' آنکھیں بند کیے بیٹھی ہے۔ کنور صاحب کے داخل ہوتے ہی اس نے ان کی خوشبو محسوس کر لی۔ فوراً آنکھیں کھول دیں اور اٹھ کر ان کے قریب آ گئی۔ پہلے شکایتی نظروں سے کنور صاحب کو دیکھا' پھر ان کی ٹانگوں سے اپنا جسم رگڑنے لگی۔ وفا کے اس مظاہرے پر کنور صاحب سرشار ہوا ٹھے۔ انہوں نے جھک کر اس کی گردن تھپتھپائی اور پھر کرسی پر آ بیٹھے۔

یعقوب نے اندر کی فضا کو خوشگوار دیکھا تو الٹے قدموں پھرتی سے واپس لوٹا۔ اپنی بندوق باہر دیوار کے سہارے کھڑی کی اور پھر اندر آ گیا۔ اس نے تھال سے گوشت کا پارچہ اٹھا کر کنور صاحب کے ہاتھ پر رکھا۔ کنور صاحب نے اس ٹکڑے کو پکڑ کر ہاتھ اونچا کر کے ہوا میں لہرایا۔ رانی اپنے اگلے دونوں پاؤں پر جھک گئی۔ کنور صاحب نے جیسے ہی گوشت کا ٹکڑا ہاتھ سے چھوڑا اس نے فوراً لپک لیا۔ کنور صاحب نے بڑے فخر سے یعقوب کی طرف دیکھا۔ یعقوب نے احتراماً سر جھکا دیا۔ سارے تھال خالی ہونے پر کنور صاحب نے جب رانی کو پنجرے کی طرف جانے کا اشارہ کیا۔ جواب میں وہ تھوڑا سا غرائی اور پھر پنجرے کی طرف چلدی۔

پنجرے میں پہنچتے ہی محافظوں نے جنگلا نیچے گرا دیا اور گاڑی کو دھکیلتے ہوئے پیچھے لے گئے۔ یعقوب نے آگے بڑھ کر دروازہ بند کیا اور پھر لپک کر حویلی کی طرف کھلنے والا دروازہ کھولا۔ کنور جہاں زیب کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالے کمرے سے باہر نکلے۔ پھر وہ کئی دن تک اس واقعہ کا

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

بڑے فخر سے ذکر کرتے رہے' سننے والا بھی اس انوکھے واقعہ کو سن کر اپنی حیرت کا اظہار کیے بنا نہ رہتا۔

اس دن جب کنور صاحب' رانی کو گوشت کھلا کر نکلے تو انہوں نے اپنی تیسری بیگم شائستہ جبیں کو اپنے کمرے کے سامنے ٹہلتے ہوئے پایا۔ کنور صاحب' رانی کو گوشت کھلانے کے لیے صبح کو روز آتے تھے۔ وہ رانی تک پہنچنے کے لیے روز شائستہ بیگم کے کمرے کے آگے سے گزرتے لیکن اتفاق سے ہی وہ اپنی اس کینسر زدہ بیوی کے کمرے کا رخ کرتے۔ آج جب انہوں نے شائستہ بیگم کو اپنے کمرے کے آگے راہداری میں ٹہلتے پایا تو وہ ان کے پاس رک گئے۔ مقصد بظاہر ان کی خیریت معلوم کرنا تھا لیکن باطن رانی کی ان سے محبت کے اظہار کو چٹخارے لے کر سنانا تھا۔

"کیسے شائستہ بیگم' کیسی ہیں آپ۔" کنور صاحب نے مسکرا کر کہا۔

"ابھی ہم زندہ ہیں کنور صاحب۔" شائستہ بیگم نے اپنے لہجے کی تلخی کو چھپاتے ہوئے کہا۔

"اللہ آپ کو ہمیشہ زندہ رکھے۔ ایسی مایوسی کی بات کیوں کرتی ہیں آپ۔" کنور صاحب نے بات کی تہ تک جانے سے گریز کیا۔

"اس وقت آپ کا گزر ادھر سے کیسے ہوا؟" شائستہ بیگم نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ پھر وہ کمرے میں داخل ہوتے ہوتے رک گئیں اور کنور صاحب کو بغور دیکھتے ہوئے گویا ہوئیں۔ "اندر آئیے گا؟"

کنور صاحب کو اس بجھتی شمع سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ بس وہ مردنا کمرے میں داخل ہو گئے۔ بولے "چلیے' کچھ دیر بیٹھ جاتا ہوں۔"

"جی ..... شکریہ۔" شائستہ بیگم نے آنسو بھری آنکھوں سے انہیں دیکھا۔ یہ وہی کنور صاحب تھے' جنہیں کبھی انہیں دیکھے بغیر چین نہ آتا تھا۔

شائستہ بیگم نے اس گھڑی کو کوسا' جب وہ اپنی فلم کی شوٹنگ کے لیے کنور صاحب کے علاقے میں آ گئی تھیں۔ فلم کے پروڈیوسر خالق انصاری کی کنور صاحب سے دوستی تھی۔ اسی لیے انہوں نے اس علاقے کو شوٹنگ کے لئے منتخب کیا تھا۔ کنور صاحب نے اس فلم کے یونٹ کی بڑی پذیرائی کی۔ اپنی حویلی میں ٹھہرایا اور جن جن چیزوں کی فلم کی شوٹنگ کے لئے ضرورت تھی' وہ سب مہیا کیں۔

جب کھانے پر پہلی ملاقات شائستہ بیگم سے ہوئی تو کنور صاحب اس سنجیدہ اور شائستہ ہیروئن کو دل ہار بیٹھے۔ شائستہ بیگم' ان دنوں ستارہ خان کے نام سے مشہور تھیں۔ خوبصورت تو خیر وہ تھیں ہی' اداکارہ بھی غضب کی تھیں۔ ادھر کنور صاحب کی شخصیت اور شان و شوکت دیکھ کر شائستہ بیگم بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں۔

اس فلم کا یونٹ دس دن حویلی میں ٹھہرا۔ ان دس دنوں میں محبت کی سلگتی چنگاری شعلہ

بن گئی۔ کنور صاحب کے لب پر بس ایک ہی نام تھا۔ وہ ستارہ کو اپنی جبیں پر سجا لینا چاہتے تھے۔ خود ستارہ کا بھی یہی حال تھا۔ وہ ستارہ خان سے شائستہ جبیں بن جانا چاہتی تھیں۔

تب اس فلم کا ہدایت کار اور فلم ساز خالق انصاری درمیان میں کودا' ولن بن کر نہیں بلکہ دوست بن کر۔ اس نے کنور جہاں زیب کو ساری اونچ نیچ سمجھانے کی کوشش کی۔ کنور صاحب کوئی بچے تو نہ تھے۔ وہ ان اداکاراؤں کی نس نس سے واقف تھے۔ یہ کیسی ہوتی ہیں۔ کتنے ہاتھوں سے گزر کر پتھر سے ہیرا بنتی ہیں۔ انہیں سب معلوم تھا لیکن ستارہ خان کچھ اس طرح ان کی آنکھوں میں سمائی تھی کہ کوئی اسے نکال نہیں سکتا تھا۔ ویسے بھی کنور صاحب خاصے ضدی واقع ہوئے تھے' کسی پسند کی چیز کو چھوڑ دینا انہوں نے سیکھا ہی نہ تھا۔ یوں ستارہ خان کو انہوں نے شائستہ جبیں بنا دیا۔ ایک فلمی ہیروئن کو انہوں نے بیگم کنور جہاں زیب بنا کر ہی دم لیا اور اس طرح فلم کے یونٹ کو ستارہ خان کے بغیر ہی واپس جانا پڑا۔ خالق انصاری کو تو کوئی نقصان نہ پہنچا کیونکہ اس شوٹنگ کے بعد اس فلم میں ستارہ خان کا کام مکمل ہو گیا تھا۔ بچ ورک میں دو چار شاٹس نکلے بھی تو اس نے ڈپلیکیٹ سے کام چلا لیا۔

کنور جہاں زیب نکاح کے بعد شائستہ بیگم کو دنیا دکھانے لے گئے۔ دو ڈھائی مہینے کے بعد جب وہ واپس آئے تو ان فلمسازوں نے سکھ کا سانس لیا جن کی فلموں میں وہ بطور ہیروئن کام کر رہی تھی اور اس کا خاصا کام شوٹ ہو چکا تھا۔ ان تمام فلمسازوں نے خالق انصاری کو پکڑا کہ وہ مل کر ستارہ سے بات کرائے کیونکہ یہ مصیبت اسی کی نازل کردہ تھی' مجبور ہو کر خالق انصاری' کنور جہاں زیب کے پاس پہنچا اور انہیں ساری صورت حال سے آگاہ کیا۔

وہ خالق انصاری کی ساری بات سن کر مسکرائے اور بولے "انصاری' تم کیا چاہتے ہو؟"

"میں اپنے بھائیوں کو نقصان سے بچانا چاہتا ہوں۔"

"یعنی تم یہ چاہتے ہو کہ میں شائستہ بیگم کو فلموں میں کام کرنے کی اجازت دے دوں۔"

"فلموں میں کام کرنے کی اجازت نہیں۔ صرف ان فلموں میں جن کی شوٹنگ ہو چکی ہے اور وہ محض شائستہ بیگم کے کام کی وجہ سے ڈبوں میں بند ہیں۔"

"ہاں' میرا بھی یہی مطلب تھا۔" کنور صاحب نے اس کی بات سمجھتے ہوئے کہا۔ "اگر میں انکار کر دوں تو؟"

"تو بہت برا ہوگا۔ فلم انڈسٹری کو ناقابل تلافی نقصان پہنچے گا۔" خالق انصاری نے دانستہ کہا۔ "تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے' تم سمجھ دار آدمی ہو۔"

"میں سمجھ دار آدمی ہوں' تبھی تو ایسا کر رہا ہوں۔"

"تم اس مسئلے پر ذرا شائستہ بیگم سے بھی بات کر لو۔"

"تمہارا کیا خیال ہے کہ وہ میری اجازت کے بغیر فلموں میں کام مکمل کرانے چلی جائیں گی۔"

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

"نہیں' یہ خیال تو نہیں ہے میرا۔" خالق انصاری نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "شاید ہمارا موقف وہ زیادہ بہتر طور پر تمہیں سمجھا سکیں۔"

"چلو ٹھیک ہے۔ میں انہیں بلوا لیتا ہوں۔" کنور جہاں زیب نے سامنے کھڑے ایک ملازم سے شائستہ بیگم کو بلانے کا اشارہ کیا۔

"اگر اجازت ہو تو باہر بیٹھے دوسرے فلمسازوں کو بھی اندر بلوا لوں تاکہ جو بات ہو ان کے سامنے ہو' انھیں تسلی رہے۔" خالق انصاری نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"نہیں' انصاری! میں یہاں کسی کی تسلی کے لیے نہیں بیٹھا ہوں۔" کنور صاحب کی پیشانی شکن آلود ہو گئی۔ "تم میرے دوست ہو' اس لیے میں نے اس موضوع پر بات کرنا گوارا کر لیا ہے اور تمہاری خواہش پر شائستہ بیگم کو بھی بلوایا ہے۔ اگر تم میرے دوست نہ ہوتے تو اس وقت تم بھی وہیں بیٹھے ہوتے اور میرا کوئی ملازم تم سے بات کر رہا ہوتا۔ لہٰذا تم بیٹھ جاؤ۔ وہ جہاں بیٹھے ہیں انھیں بیٹھا رہنے دو۔ وہ کنور جہانزیب کی حویلی کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہیں' یہ ان کے لیے بڑا اعزاز ہے۔"

"بے شک' بے شک۔" خالق انصاری ان کا موڈ بدلتا دیکھ کر سٹپٹا گیا۔ وہ گھبرا کر بولا۔ "کنور جہاں زیب' پلیز ناراض نہ ہوں۔"

"انصاری' میرے لیے یہ بہت آسان ہے کہ ایک بلینک چیک تمہارے حوالے کر دوں تاکہ تم سب کا نقصان پورا کرو اور وہ ستارہ خان کو بھول جائیں لیکن میں ایسا کرنا نہیں چاہتا۔ میں فنکار لوگوں کی بہت عزت کرتا ہوں۔ شائستہ بیگم بھی ایک فنکارہ ہیں لہٰذا میں ان کی مرضی ضرور معلوم کر لینا چاہتا ہوں اور یہ بات میں ابھی تمہارے سامنے کروں گا۔ پھر جو بات طے ہو جائے وہ اپنے بھائیوں کو بتا دینا' ٹھیک ہے۔" کنور جہاں زیب نے آہستہ آہستہ اپنے غصے پر قابو پا لیا۔

"ٹھیک ہے۔" خالق انصاری انھیں نارمل ہوتے دیکھ کر خوش ہو گیا۔ اتنے میں شائستہ بیگم مسکراتی ہوئی اس خاص ڈرائنگ روم میں داخل ہوئیں جو صرف خاص لوگوں کے لیے بنایا گیا تھا۔

خالق انصاری' شائستہ بیگم کو دیکھتے ہی کھڑا ہو گیا اور بڑے ادب سے بولا۔ "میڈم' آپ کیسی ہیں؟"

"بہت اچھی۔ انصاری صاحب' آپ اپنا حال سنائیں...." شائستہ بیگم نے انھیں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"میڈم' لکھ کر سناؤں یا زبانی۔" خالق انصاری نے شگفتگی سے کہا۔

"یہ اپنی برادری دوسرے ڈرائنگ روم میں بیٹھی ہے۔ وہ سب آپ کو لینے آئے ہیں۔" شائستہ بیگم کی شادی کے وقت ان کا ستارہ عروج پر تھا۔ کوئی بیس پچیس فلمیں ان کے ہاتھ میں تھیں۔ کچھ فلمیں تو ایسی تھیں جن کے ابھی معاہدے ہی ہوئے تھے۔ لہٰذا ان فلموں کا

مسئلہ نہ تھا' جو رقم پیشگی لی گئی تھی۔ وہ واپس ہو سکتی تھی۔ کچھ فلمیں ایسی تھیں جن میں ستارہ خان کا تھوڑا بہت کام فلمبند ہوا تھا۔ ان کا بھی کوئی مسئلہ نہ تھا' وہ فلمساز ستارہ کو کٹ کر کے دوسری ہیروئن کا انتخاب کر سکتے تھے۔ مسئلہ صرف ان فلموں کا تھا جو تقریباً مکمل تھیں اور تھوڑا بہت کام ستارہ خان کا رہ گیا تھا۔

بہر حال طے یہ ہوا کہ جن فلموں میں ستارہ یعنی شائستہ بیگم کا کام ناگزیر ہے' ان تمام فلمسازوں کو دو مہینے کا نوٹس دے دیا جائے کہ وہ ان دو مہینوں میں اپنا کام فلم بند کرا لیں اور باقی لوگوں کو ان کی رقم واپس کر دی جائے۔

خالق انصاری بھی یہی چاہتا تھا۔ وہ کنور صاحب کے اس فیصلے سے بہت خوش ہوا۔ ویسے اسے امید نہ تھی کہ کنور صاحب' شائستہ بیگم کو فلمیں مکمل کروانے کی اجازت دے دیں گے۔

کنور جہاں زیب' شائستہ بیگم کو پا کر بہت خوش تھے۔ دو تین سال اسی طرح ہنستے مسکراتے گزر گئے۔ پھر دھیرے دھیرے ان کی دلچسپی کم ہونے لگی۔ کہاں تو یہ تھا کہ انھیں دیکھے بغیر چین نہ آتا تھا' پھر یہ ہونے لگا کہ وہ کئی کئی دن ان کے بغیر گزار دیتے۔ ان کی دلچسپی کم ہوتے دیکھ کر شائستہ بیگم ذہنی الجھاؤ میں مبتلا ہو گئیں۔ وہ ان کے مزاج سے واقف تھیں لہٰذا زبان پر حرف شکایت لانا فضول تھا۔ وہ کنور صاحب کو اپنے سے دور ہوتا محسوس کرتی رہیں۔ وہ تڑپتی اور سسکتی رہیں۔ اس محل نما حویلی میں راتیں عفریت بن کر انھیں ڈراتی تھیں لیکن اب کچھ ہو نہیں سکتا تھا' ان تنہائیوں کا کوئی مداوا نہ تھا۔ انھیں ایسا محسوس ہونے لگا تھا جیسے حویلی کی یہ اونچی دیواریں بالآخر ان کا مدفن بن جائیں گی۔ روشنیوں کی چکا چوند میں رہنے والی اداکارہ اب خود کو تاریکیوں میں گم ہوتا دیکھ رہی تھی۔ اس حویلی میں کوئی بھی ایسا نہ تھا جس سے وہ اپنا حال دل کہہ کر بوجھ ہلکا کر لیتی۔ وہ باہر کی دنیا سے کٹ کر رہ گئی تھی' اسے تو اندر کی دنیا کا حال بھی معلوم نہ تھا۔ وہ یہ بھی نہیں جانتی تھی کہ کنور جہاں زیب اپنے شب و روز کہاں گزارتے ہیں۔ وہ حویلی کے کس گوشے میں ہوتے ہیں۔ یہ سب جاننے کی اسے اجازت نہ تھی۔ ملازموں کے لبوں پر مہر لگی تھی۔ وہ کچھ نہ بولتے تھے۔ بس اب اس حویلی کی دیواریں تھیں اور وہ تھی۔

تب ایک دن شائستہ بیگم کے سینے میں بڑی شدت کا درد اٹھا۔ کنور جہاں زیب کو مطلع کیا گیا۔ ڈاکٹروں کو فون کیا گیا۔ پھر ڈاکٹروں کی ہدایت پر انھیں فوراً ہسپتال منتقل کیا گیا۔ دو تین دن وہاں مختلف ٹیسٹ ہوئے اور ڈاکٹروں نے وہ روح فرسا خبر سنائی کہ آپ کی بیگم سینے کے کینسر میں مبتلا ہیں اور یہ کینسر اتنا پھیل چکا ہے کہ وہ مشکل سے پانچ چھ ماہ زندہ رہ سکیں گی۔

کنور جہاں زیب نے اس دل ہلا دینے والی خبر کو بڑے اطمینان سے سنا جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔ یہ ان کی شخصیت کا عجیب روپ تھا۔ وہ پگھلتے تو موم ہو جاتے اور سخت ہوتے تو پتھر ہو جاتے۔ بے حس اور بے جان اور یہ کسی کو معلوم نہ تھا کہ وہ کس بات پر موم ہوں گے اور کس بات پر پتھر۔ ویسے بھی اب انھیں شائستہ بیگم سے کوئی دلچسپی نہ رہی تھی۔ وہ مرتیں یا زندہ رہتیں' ان کے لیے

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

برابر تھا۔

اب ان کی نگاہوں کا مرکز ایک کالج گرل تھی جو ان کی بیٹی سعدیہ کی دوست تھی۔ سعدیہ کو اگر معلوم ہوتا کہ وہ اس کی دوست کوثر کو مرکز نگاہ بنالیں گے تو وہ ہرگز ان سے نہ ملواتی۔ کوثر ایک متوسط گھرانے کی لڑکی تھی' اسے سعدیہ کے ٹھاٹ باٹ دیکھ کر بڑا رشک آتا تھا۔ وہ اکثر سعدیہ سے کہا کرتی کہ کاش میں بھی کسی جاگیردار کی بیٹی ہوتی تو تمھاری طرح ہوسٹل کے بجائے اس شاندار کوٹھی میں رہتی۔ آگے پیچھے نوکر گھومتے۔ گاڑی سیر کرنے کو ملتی۔ ہائے سعدیہ' تم کتنی خوش قسمت ہو۔ سعدیہ اس کی باتیں سن کر مسکرا دیتی۔ سعدیہ اس کے مقابلے میں بڑی سادہ مزاج لڑکی تھی۔ وہ عام لڑکیوں کی طرح زندگی گزارنا چاہتی تھی لیکن کنور جہاں زیب کو اپنی توہین منظور نہ تھی۔ آخر ان کا کوئی اسٹیٹس تھا' پھر سعدیہ ان کی اکلوتی اولاد تھی۔ وہ کس طرح برداشت کر لیتے کہ سعدیہ عام لڑکیوں کی طرح ہوسٹل میں رہے۔

کنور جہاں زیب مہینے میں ایک دو بار ضرور لاہور کا چکر لگا لیتے تھے۔ وہ لاہور آتے تو کسی اور چکر میں تھے لیکن سعدیہ سے یہی کہتے کہ وہ اس سے ملنے آئے ہیں۔ سعدیہ باپ کی اس محبت' اس توجہ پر ان کی بڑی ممنون ہوتی۔ ایک دن وہ اسی طرح آئے ہوئے تھے۔ اتفاق سے ان دن کوثر بھی موجود تھی۔ شام کو ان دونوں کا شاپنگ کا ارادہ تھا۔ کوثر بڑی بن ٹھن کر آئی تھی۔ ویسے بھی وہ خاصی پرکشش لڑکی تھی جو بھی اسے ایک نظر دیکھتا' دیکھتا رہ جاتا۔ اس کی جاذبیت اس کے چہرے سے زیادہ اس کے جسم میں تھی۔

کنور صاحب کو دیکھ کر سعدیہ بہت خوش ہوئی۔ اس مرتبہ وہ پورے ایک ماہ کے بعد آئے تھے۔ سعدیہ بھاگ کر اپنے باپ کے گلے لگ گئی اور شکایت آمیز لہجے میں بولی۔ "بابا جان' پورے ایک ماہ بعد آئے ہیں آپ؟"

ابھی کنور صاحب کوئی جواب نہ دے پائے تھے کہ کمرے میں کوثر داخل ہوئی۔ "کون آیا ہے سعدیہ؟"

"آؤ' آؤ۔ کوثر! میرے بابا جان سے ملو۔" سعدیہ نے اسے قریب کرتے ہوئے کہا۔ "اور بابا جان' یہ ہے کوثر' میری کلاس فیلو بھی ہے اور دوست بھی۔"

کوثر نے بڑے ادب سے انھیں سلام کیا۔

کنور جہاں زیب اسے دیکھ کر اس کے سلام کا جواب دینا بھی بھول گئے۔ بس اسے دیکھتے رہ گئے۔ بالکل اسی طرح جیسے شائستہ بیگم کو پہلی ملاقات پر دیکھتے رہ گئے تھے۔

"بابا جان! کوثر نے سلام کیا ہے؟" سعدیہ نے محویت توڑنے کی کوشش کی لیکن یہ اتنی محویت نہ تھی جو ٹوٹ جاتی۔ اس سلام کے جواب میں وہ پیغام دینا چاہتے تھے اور جو کام کنور صاحب کرنا چاہتے تھے' وہ کر گزرتے تھے' انھیں کوئی روکنے والا نہ تھا۔ وہ راہ میں حائل ہر دیوار کو گرانے کے اہل تھے۔

سعدیہ کو کچھ اندازہ نہ ہوا کہ کوثر کو دیکھ کر کنور صاحب پر کیا بیت گئی ہے۔ وہ اس مرتبہ خلاف توقع چار پانچ دن رہے جبکہ اس سے پہلے وہ ایک دو دن سے زیادہ کبھی نہ ٹھہرتے تھے۔ ایک خلاف توقع بات یہ ہوئی کہ کوثر بھی اس دن کے بعد سعدیہ سے ملنے گھر نہ آئی بلکہ وہ کالج سے بھی غائب ہوگئی۔ وہ کوثر کی خیریت معلوم کرنے اس کے گھر جانا چاہتی تھی لیکن کنور صاحب کے جانے کے بعد کوثر کے گھر پہنچی تو اسے ایک خوشگوار صدمے سے دوچار ہونا پڑا۔ وہاں پہنچ کر اسے معلوم ہوا کہ کوثر کی شادی ہوگئی ہے۔

"لیکن یہ سب کیسے ہوا؟ اتنی جلدی' اتنا اچانک۔ خالہ جان! وہ اتنی بے مروت نکلی' مجھے معلوم نہ تھا۔ اس نے اگر نہیں پوچھا تھا تو آپ کو تو مجھے شادی میں بلانا چاہیے تھا۔" سعدیہ نے کوثر کی ماں سے گلہ کیا۔

"بیٹا! ہم تم کو ضرور بلاتے لیکن کوثر نے ہماری ایک نہ سنی' اسے محلوں میں رہنے کا بڑا شوق تھا۔ قسمت کی بات کہ اس کا یہ خواب پورا ہوگیا۔ وہ محلوں میں رہنے چلی گئی۔ بڑی رازداری اور خاموشی سے اور ساتھ ہی ہماری زبانیں بند کر گئی۔ ہم کچھ کہنا بھی چاہیں تو کہہ نہیں سکتے۔ کچھ بتانا بھی چاہیں تو بتا نہیں سکتے۔ اس لڑکی نے ہمیں کہیں کا نہ چھوڑا۔ دولت کی چکاچوند نے اسے کیا سے کیا بنا دیا۔ کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ بس بیٹی' تم اسے معاف کر دو اور اسے بھول جاؤ۔ اس واقعے کو ایک ڈراؤنا خواب سمجھ کر قبول کر لو۔" اتنا کہہ کر کوثر کی ماں رونے لگیں۔

"کوئی بات نہیں خالہ جان' اس نے شادی میں نہ بلایا نہ سہی' آپ غم نہ کریں۔ میں نے اسے معاف کر دیا۔" سعدیہ اتنا کہہ کر پلٹی اور بوجھل قدموں سے گھر سے نکل آئی۔

کوثر کی اس بے رخی نے اسے بہت دکھی کر دیا تھا۔ سب سے زیادہ دکھ اسے اس بات کا تھا کہ کوثر کا اگر کسی سے افیئر تھا تو اس نے اس سے چھپایا کیوں؟ وہ کیسی دوست تھی اس کی۔

سعدیہ نے اس بے وفائی کو اپنی توہین سمجھا اور اتنا صدمہ لیا کہ وہ دو دن تک کالج نہ جا سکی۔ اسے بخار آ گیا۔ پھر اس نے اس واقعے کو ڈراؤنا خواب سمجھ کر قبول کر لیا اور طے کر لیا کہ آئندہ وہ کسی کو اپنا دوست نہ بنائے گی۔

یہ اس واقعے کے تقریباً ایک ماہ بعد کی بات ہے۔ سعدیہ کو کچھ سوٹ سلوانے تھے۔ وہ شادمان میں اپنے پسندیدہ ٹیلر کے پاس کپڑے دینے پہنچی۔ ابھی وہ گاڑی سے اتر ہی رہی تھی کہ اس نے کوثر کو ایک جیولر کی دکان سے نکلتے ہوئے دیکھا۔ وہ بہت قیمتی لباس میں تھی اور زیور سے لدی ہوئی تھی' پہلے سے اور خوب صورت ہوگئی تھی۔

کوثر کو دیکھ کر سعدیہ کے آگ لگ گئی۔ وہ گاڑی سے اترتے اترتے رک گئی۔ سیٹ پر بیٹھ کر اس نے جلدی سے گاڑی کے شیشے چڑھا لیے۔ شیشے رنگین تھے۔ گاڑی سائیڈ سے کھڑی تھی اس لیے اسے دیکھے جانے کا کوئی امکان نہ تھا۔۔۔۔ جہاں کوثر کو دیکھ کر دل میں نفرت ابھری تھی' وہاں ایک شوق بھی جاگا تھا۔ آخر وہ دیکھے تو اس کی کس کے ساتھ شادی ہوئی ہے۔ ایسا وہ کہاں کا

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

شہزادہ ہے کہ اس نے اسے بھی ہوا نہ لگنے دی۔ پھر اس نے سوچا' کیا ضروری ہے کہ اس کا شوہر بھی اس کے ساتھ ہو۔ ویسے ابھی شادی کو زیادہ دن نہیں ہوئے تھے۔ اسے قوی امید تھی کہ وہ اس کے ساتھ ضرور ہوگا۔ وہ جیولر کا حساب کرتا رہ گیا تھا۔ کیونکہ ابھی چند لمحے ہی ہوئے تھے کہ وہ دکان سے نکل کر تیزی سے اس کی طرف بڑھا۔

سعدیہ نے اسے دیکھا تو دیکھتی رہ گئی۔ اس کی آنکھیں پتھرا گئیں۔ دل کی دھڑکن چند لمحوں کو رک گئی۔ اس کی روح میں ایک چیخ گونجی۔ "اس لڑکی نے ہمیں کہیں کا نہ چھوڑا۔ دولت کی چکا چوند نے اسے کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ بس بیٹی' تم اسے معاف کر دو۔ اس واقعے کو ایک ڈراؤنا خواب سمجھ کر بھول جاؤ۔" کہیں سے سسکیوں کی آواز آ رہی تھی۔

"کمینی' ذلیل' میں تجھے کبھی معاف نہیں کروں گی۔ تجھے ڈراؤنا خواب سمجھ کر کبھی قبول نہیں کروں گی۔"

سعدیہ کی آنکھیں خشک تھیں لیکن دل اندر ہی اندر رو رہا تھا۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے گاڑی اسٹارٹ کی اور گھر پہنچ کر خوب بلک بلک کر روئی۔ یہ صدمہ بھی ایسا تھا کہ وہ جتنا روتی کم تھا۔ کوثر کیا سے کیا بن گئی تھی۔ وہ اگر اسے تہامل جاتی تو سعدیہ اس کا منہ نوچ لیتی۔ ہو سکتا تھا اسے گولی ہی مار دیتی۔ اتنا غصہ تھا اسے اس کی حرکت پر۔ بہرحال اسے نے یہ طے کر لیا تھا کہ وہ زندگی بھر کوثر کا منہ نہیں دیکھے گی۔ چاہے ایسا کرنے میں اسے حد سے ہی گزرنا کیوں نہ پڑے۔

ابھی اس بات کو اس حادثے کو دو تین ماہ ہی گزرے تھے۔ سعدیہ نے جیسے تیسے کر کے خود کو نارمل کر لیا تھا کہ ایک دن وہی ہوا جس کا اسے انتظار تھا۔ کالج سے آ کر اس نے کھانا وانا کھایا تھا اور وہ کچھ دیر آرام کرنے کا سوچ رہی تھی کہ کوٹھی کے گیٹ پر گاڑی کے ہارن کی آواز سنائی دی۔

یہ ہارن اس سے پہلے سنائی دیتا تو وہ خوشی سے اچھل پڑتی تھی۔ لیکن آج اس ہارن نے اس کے جسم میں کپکپی طاری کر دی تھی۔ غصے اور صدمے نے بیک وقت اس پر حملہ کیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔

اس نے لرزتی انگلیوں سے کھڑکی سے پردہ ہٹا کر دیکھا' اس امید پر کہ شاید باہر کوئی اور منظر ہو۔ منظر وہی تھا' دلخراش اور جان لیوا۔

اتنی دیر میں ملازم نے بھاگ کر گیٹ کھول دیا تھا۔ گاڑی اندر آ گئی تھی اور اب گاڑی کے دروازے بند ہونے کی آواز آ رہی تھی۔ سعدیہ کا جی چاہ رہا تھا کہ گھر کی دیواریں پھٹ جائیں اور وہ ان میں دفن ہو جائے۔ اس نے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا تھا۔ اور بیڈ پر اوندھے منہ پڑی سسک رہی تھی۔

"بی بی جی' کہاں ہیں؟" انھوں نے ملازم سے پوچھا۔

"ابھی تو یہیں تھیں' شاید بیڈروم میں ہیں۔" ملازم نے جواب دیا۔

"اچھا' ہم یہاں بیٹھتے ہیں' تم انھیں اطلاع کرو کہ ہم آئے ہیں۔" انھوں نے ایک

صوفے پر آرام سے بیٹھتے ہوئے کہا۔

"جی بہتر۔" ملازم اندر جانے لگا تو ساتھ آنے والی خاتون نے اسے روک دیا۔ "آپ ٹھہریں' میں خود جا کر اسے دیکھتی ہوں۔"

"ہاں' یہ ٹھیک ہے۔" وہ مسکرائے' انہیں یہ تجویز پسند آئی۔

انھوں نے بیڈروم کے دروازے کو آہستہ سے دھکا دیا لیکن وہ اندر سے بند تھا۔ انھوں نے دروازے پر دستک دی۔ ایک بار' دو بار' تین بار۔ اندر سے کوئی جواب نہ ملا۔ مکمل خاموشی طاری تھی۔

"سعدیہ' دروازہ کھولو' دیکھو' میں آئی ہوں' تمھاری دوست کوثر۔"

کوثر کی آواز سن کر سعدیہ کی روح میں کئی دھماکے ہوئے۔ وہ جیسے ریزہ ریزہ ہو گئی۔

"سعدیہ پلیز' دروازہ کھولو۔ میری ایک بات سن لو۔"

سعدیہ نے تو کوثر کی شکل نہ دیکھنے کی قسم کھا لی تھی۔ پھر وہ کیوں اس کے لیے دروازہ کھولتی' وہ کیوں اس کی بات سنتی۔ اس نے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں۔

پندرہ بیس منٹ تک کوثر دروازہ پیٹتی رہی' سعدیہ سے دروازہ کھولنے کی التجا کرتی رہی لیکن سعدیہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔

تب بھاری قدموں سے چلتے کنور جہاں زیب' کوثر کے نزدیک آئے اور اسے واپس چلنے کا اشارہ کیا۔ اب واپسی کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ کوثر آنسو بہاتی کنور صاحب کے ساتھ ہو لی۔

کنور صاحب کی گاڑی جانے کے بعد سعدیہ نے دروازہ کھول دیا۔ اس نے اپنے آنسو خشک کیے اور سر کو جھٹک کر کالج کا کام کرنے بیٹھ گئی۔ وہ آخر کنور جہاں زیب کی بیٹی تھی' اس کے باپ نے شیر نی پالی ہوئی تھی تو کیا وہ یہ چھوٹے موٹے غم نہیں پال سکتی تھی۔

غم سہنا تو شائستہ بیگم نے بھی سیکھ لیا تھا۔ ڈاکٹروں کے منع کرنے کے باوجود کنور جہاں زیب نے انھیں بتا دیا تھا کہ ان کی زندگی چند ماہ کی ہے کیونکہ وہ سینے کے کینسر میں مبتلا ہیں۔ آپریشن ہو سکتا تھا لیکن کامیابی کی امید محض دس فیصد تھی۔ کنور صاحب نے آپریشن کروانے کے لیے زور بھی دیا لیکن شائستہ بیگم نے سختی سے انکار کر دیا۔ جب مرنا ہی تھا تو وہ چیر پھاڑ کروا کے کیوں مریں۔

شائستہ بیگم میں کنور صاحب کی دلچسپی ویسے ہی کم ہو گئی تھی لیکن جب سے انھیں کینسر کا پتا چلا تھا تو پھر بالکل ہی ختم ہو گئی تھی۔ کئی کئی ہفتے تک ان کی صورت نظر نہ آتی۔ اگر کبھی بھولے بھٹکے اس کے پاس آ بھی جاتے تو محض دو چار منٹ ڈاکٹروں کی طرح رسمی بات کر کے چلتے بنتے۔ اس رویے کی وجہ سے شائستہ بیگم کی زندگی روز بہ روز گھٹتی جا رہی تھی۔

ابھی شائستہ بیگم سے یہی دکھ نہیں سمٹ رہے تھے کہ ایک دن پتا چلا' کنور جہاں زیب نے چپکی شادی کر لی ہے۔ اس خبر کو انھوں نے خلاف توقع بڑے حوصلے سے سنا اور تلخی سے مسکرا

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

دیں۔ کنور صاحب جیسے مرد سے بھلا اور کیا توقع کی جا سکتی تھی بلکہ انھوں نے شادی کرنے میں دیر کر دی تھی' یہ کام تو کافی پہلے ہو جانا چاہیے تھا۔

شادی کے تیسرے دن جب کنور صاحب نے شائستہ بیگم کو شرف بازیابی بخشا تو انھوں نے عام عورتوں کی طرح کسی طعن طنز سے کام نہ لیا۔ بڑے حوصلے سے انھیں مبارکباد دی اور ویسے بھی تخی پیدا کر کے وہ کنور صاحب کا کیا بگاڑ سکتی تھیں۔

کنور جہاں زیب ان کے اس رویے سے بہت خوش ہوئے۔ خوشی کے اظہار کے طور پر انھوں نے دوپہر کا کھانا ساتھ کھانے کی درخواست کی' جسے شائستہ بیگم نے فوراً قبول کر لیا۔

شادی کے تیسرے دن وہ شائستہ بیگم سے ملنے چلے آئے تھے تو اس میں ان کی مرضی کو بالکل دخل نہ تھا۔ دراصل کنور صاحب کو کوثر یعنی چھوٹی بیگم نے بھیجا تھا۔ وہ شائستہ بیگم سے ملنے کی خواہش مند تھی۔ شائستہ بیگم اس کی پسندیدہ ہیروئن تھی۔ اس نے ستارہ خان کی تمام فلمیں دیکھی تھیں۔ جب اسے پتا چلا کہ شائستہ بیگم دراصل ستارہ خان ہیں تو وہ اپنی پسندیدہ ہیروئن کو دیکھنے کے لیے مچل گئی اور اس طرح کنور صاحب نے شائستہ بیگم کو کھانے پر مدعو کر لیا۔

شائستہ بیگم کے لیے اگرچہ سوکن سے ملنا ایک ناگوار فریضہ تھا' اگر وہ زندگی سے مایوس نہ ہو چکی ہوتیں تو کبھی اس کے سامنے نہ آتیں۔ موت کے بلاوے نے انھیں جذبات سے عاری کر دیا تھا۔ اس لیے انھوں نے ملاقات کی ہامی بھر لی تھی۔ ویسے وہ یہ بھی دیکھنا چاہتی تھی کہ کنور صاحب اس مرتبہ کیا چیز لائے ہیں۔

شائستہ بیگم کو دیکھ کر کوثر کو خاصی مایوسی ہوئی۔ اسے ان میں ستارہ خان کہیں بھی نظر نہ آئی۔ نظر آتی بھی کیسے۔ وہ پہلی سی چمک دمک اب ان میں کہاں تھی۔ کنور صاحب کی بے رخی اور کینسر بھرے جسم نے اب ان میں کیا چھوڑا تھا۔

کوثر کو دیکھ کر شائستہ بیگم کے بھی کچھ اسی طرح کے تاثرات تھے۔ وہ انھیں ذرا بھی پسند نہ آئی۔ اپنی باتوں اور حرکات سکنات سے وہ انھیں بڑی چھچھوری سی دکھائی دی۔ اس میں متانت اور وقار نام کی کوئی چیز نہ تھی۔ وہ اس حویلی کی اہل نہ تھی لیکن کنور صاحب نے اسے اہل بنا دیا تھا۔ جانے کنور صاحب کو اس میں کیا چیز نظر آ گئی تھی کہ اس سے شادی کر بیٹھے۔ شائستہ بیگم کی نظر میں وہ کوئی خاص حسین بھی نہ تھی۔

شائستہ بیگم اور کوثر کے درمیان یہ پہلی اور آخری ملاقات تھی۔ اس کے بعد کسی نے ایک دوسرے سے ملنے کی خواہش ظاہر نہ کی۔ ویسے بھی اس کالی حویلی کا نظام کچھ عجیب سا تھا۔ یہاں اگر کوئی اپنی مرضی سے کسی سے ملنا چاہتا تو نہیں مل سکتا تھا۔ یوں کسی پر کوئی پابندی نہ تھی۔ بظاہر آزادی تھی۔ لیکن حویلی کو کچھ اس طرح بنایا گیا تھا کہ بوقت ضرورت حویلی کے ایک حصے کو دوسرے سے الگ کیا جا سکتا تھا اور اس نظام کی وجہ سے کنور جہاں زیب کو مکمل آزادی تھی کہ وہ بیگمات کے علم میں لائے بغیر جو چاہیں کرتے پھریں۔

شائستہ بیگم کے پاس تین کمرے تھے۔ ان تین کمروں میں دنیا کی ہر نعمت موجود تھی۔ بس ایک کنور صاحب نہیں تھے۔ کمروں کی دیواریں جب تنگ ہوتی محسوس ہوتیں تو وہ رہداری میں نکل کر ٹہلنے لگتیں۔ انھیں معلوم تھا کہ کنور صاحب روز اس راہداری سے رانی کو گوشت کھلانے جاتے ہیں۔ وہ چاہتیں تو روز دروازے پر کھڑے ہو کر ان سے مل سکتی تھیں لیکن انھوں نے کبھی اس موقع سے فائدہ نہ اٹھایا۔ اس وقت جب کنور صاحب کی آمد کا وقت ہوتا تو وہ اپنے کمرے بند کروا کر بیٹھ جاتیں۔

آج ان کا دل گھبرا رہا تھا تو وہ کمرے سے نکل کر راہداری میں آ گئیں' انھیں بالکل معلوم نہ تھا کہ اس وقت کنور صاحب ادھر آ نکلیں گے۔ بہرحال وہ اتفاق سے انھیں اس وقت مل گئے تھے تو وہ اس موقع سے فائدہ اٹھا لینا چاہتی تھیں۔

"آپ اس وقت کہاں سے آ رہے تھے کنور صاحب؟" کنور صاحب کے بیٹھنے کے بعد انھوں نے اپنا سوال دہرایا۔

"میں رانی کی طرف سے آ رہا تھا۔" کنور صاحب نے جواب دیا۔ "یہ شوق بھی آپ کا خوب ہے کنور صاحب!" شائستہ بیگم نے کہا۔

"کون سا شوق؟" کنور صاحب نے پوچھا۔

"یہی شیرنی پالنے اور اسے اپنے ہاتھ سے کھلانے کا۔" شائستہ بیگم نے وضاحت کی۔

"ویسے کنور صاحب' ہم سے اچھی تو وہ شیرنی رہی' جسے آپ بڑے اہتمام اور شوق سے گوشت کھلاتے ہیں۔"

"پر آج تو رانی نے کمال ہی کر دیا۔ اب میں سوچنے لگا ہوں کہ اگر آئندہ ایسا پھر ہوا تو بڑی مشکل پیش آئے گی۔"

"کیا ہوا؟"

"ہوا یہ کہ آج صبح میں ایک ضروری کام سے شہر گیا ہوا تھا۔ وہاں سے دوپہر کو واپس آیا تو یعقوب نے عجیب اطلاع دی کہ رانی نے اس کے ہاتھ سے گوشت نہیں کھایا۔ اس نے زبردستی کھلانے کی کوشش کی تو وہ غرانے لگی۔ اس نے اسے واپس پنجرے میں بھیجنے کی کوشش کی تو وہ وہاں بھی نہ گئی۔ بس وہ پرانے زمانے کی بیویوں کی طرح بغیر کھائے میرا انتظار کرنے لگی۔"

"ارے واقعی!" شائستہ بیگم حیرت زدہ رہ گئیں۔

"ہاں اور جب میں نے اسے جا کر گوشت کھلایا تو اس نے فوراً کھا لیا اور پھر بڑے آرام سے اپنے پنجرے میں چلی گئی۔"

"یوں تو میں بچپن سے اسے کھلاتا آیا ہوں لیکن پچھلے کئی مہینوں سے میں بلاناغہ اسے گوشت کھلا رہا تھا۔ وہ بھی اس بات کی عادی ہو گئی۔ یعقوب سے وہ خاصی مانوس ہے۔ اس نے بھی وقتِ ضرورت میری غیر موجودگی میں گوشت کھلایا ہے اور اس نے کھایا ہے لیکن آج اس نے قطعاً کھانے

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

سے انکار کر دیا۔ یہ بات اب میرے لیے الجھن کا باعث بن گئی ہے۔ اس طرح تو میں پابند ہو کر رہ جاؤں گا۔"

"کسی کے تو پابند ہو جایئے کنور صاحب۔" شائستہ بیگم نے بڑی معصومیت سے بڑی گہری بات کہی۔

"شائستہ بیگم! میں شیر ہوں اور شیر کبھی کسی کا پابند نہیں ہوتا۔" کنور صاحب نے شائستہ بیگم کی بات کا معقول جواب دیا۔

"بہت خوب۔" وہ مسکرا دیں۔ ان کا جی چاہا کہ وہ جواب میں کہہ دیں۔ "آپ شیر ضرور ہیں لیکن قالین کے۔" لیکن وہ کہہ نہ سکیں۔ احترام آڑے آ گیا۔

"اور سنائیں اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟"

"اب کچھ باقی نہیں رہا کنور صاحب۔" شائستہ بیگم یکا یک اداس ہو گئیں۔

"ابھی بہت کچھ باقی ہے۔ آپ مایوس نہ ہوں شائستہ بیگم میری مانیں' آپریشن کروالیں۔ یہاں کے ڈاکٹروں پر اعتبار نہیں تو لندن چلی جائیں۔"

"کیا کرنا آپریشن کرا کے۔ اب زندگی کے دن تو انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ لندن کے بجائے اب تو اوپر جانے کی تیاری کرنا چاہیے۔" کہتے کہتے ان کی آنکھوں بھر آئیں۔

"فضول باتیں نہیں کرو شائستہ بیگم۔" کنور صاحب نے شائستہ بیگم کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔

"کنور صاحب! کچھ عرض کروں' مانیں گے۔" اس کی آنکھوں میں التجا تھی۔

"کیا کہنا چاہتی ہیں' بولیں۔" وہ کچھ پریشان سے ہو کر بولے۔

"پریشان نہ ہوں' اب جاتے وقت میں آپ سے کوئی ایسی چیز نہ مانگوں گی کہ آپ دے نہ سکیں۔"

"جی بولیں۔ جو مانگنا چاہتی ہیں مانگیں۔" کنور صاحب نے جی کڑا کر کے کہا۔

"کنور صاحب! اس بات کو آپ میری وصیت سمجھ لیں۔ میں مر جاؤں تو میری میت کو گجرات بھیج دیجیے گا۔ میں اپنے والدین کے پہلو میں دفن ہونا چاہتی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ ضبط نہ کر سکیں' پھوٹ پھوٹ کر رو پڑیں۔

یہ ایک مشکل وصیت تھی۔ کالی حویلی سے ملحق کنور جہانزیب کا آبائی قبرستان تھا۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ آبائی قبرستان چھوڑ کر انہیں والدین کے پاس گجرات روانہ کر دیا جائے۔ والدین سے تو وہ ایک مرتبہ رخصت ہو آئی تھیں۔ وہ اب کنور جہاں زیب کی بیوی تھیں۔ اس حویلی کی عزت تھیں۔ وہ اپنی زندگی میں اپنے والدین کے شہر نہ جا سکیں تو مر کر وہاں جانے کی کیا تک تھی بھلا' یا شاید اسی بات نے انھیں وصیت کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ اس کالی حویلی کے فسوں سے نکل جانا چاہتی تھیں۔ اس حویلی نے انھیں دیا کیا تھا۔ کالی راتیں اور سنسان دن۔ ان اونچی دیواروں کے درمیان

ان کا سانس گھٹنے لگا تھا۔ اب وہ چاہتی تھیں کہ ان کا جسم اس کالی حویلی کی حدود سے نکل کر بابل کی چھاؤں میں پہنچ جائے۔ زندہ رہ کر تو وہ اس آزار سے نجات پا نہ سکیں' مر کر تو پا سکتی تھیں۔

اس وصیت نے کنور صاحب کی انا کو ٹھیس پہنچائی۔ انھوں نے اپنی توہین محسوس کی۔ ان کے آبائی قبرستان میں دفن ہونا بھی کنور صاحب کے لیے ایک اعزاز کی بات تھی جس سے شائستہ بیگم محروم ہونا چاہتی تھیں۔ وہ ان کی جگ ہنسائی کروانا چاہتی تھیں۔ آخر یہ کس طرح ممکن تھا۔

وہ دونوں ہاتھوں سے منہ چھپائے رو رہی تھیں۔ جب وہ کافی دیر تک اسی طرح روتی رہیں تو کنور صاحب نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا' نہ تسلی کے کلمات کہے تو انھوں نے روتے روتے اچانک سر اٹھایا کہ دیکھیں کنور صاحب کیا کر رہے ہیں۔

کنور صاحب وہاں نہ تھے' وہ کب کے جا چکے تھے۔

ان کی خالی کرسی دیکھ کر ان کے دل میں ٹیس سی اٹھی۔ سینے میں درد نے ایک نئی کروٹ لی۔ ان کی نگاہوں میں اپنوں کے چہرے گھومنے لگے۔ وہ گھر جہاں وہ پیدا ہوئیں۔ پلی بڑھیں' ان کی نگاہوں میں سمانے لگا۔ یہ ابو ہیں' یہ امی ہیں' یہ بھائی جان ہیں' وہ آپا جان ہیں' لو وہ ماموں آ گئے۔ ادھر وہ چچا بیٹھے ہیں۔ ان کی آنسو بھری آنکھوں میں ان کے اپنے ابھر اور ڈوب رہے تھے۔ وہ ایک ایک کر کے سب کو یاد کر رہی تھیں' زندوں کو بھی اور مردوں کو بھی۔ ان کی آنکھوں میں تاریکی بڑھ رہی تھی۔ سانس دھیرے دھیرے اور کھنچ کر آ رہی تھی۔ ہونٹوں پر ایک تلخ مسکراہٹ تھی۔ انگلیاں لرز رہی تھیں جسم میں کپکپی طاری تھی اور موت نزدیک سے نزدیک تر ہوتی جا رہی تھی۔

عصر کے وقت کنور جہاں زیب کو شائستہ بیگم کے انتقال کی خبر ملی۔ فوری طور پر تدفین کے انتظامات کیے گئے اور کوئی رات کے آٹھ بجے تک انھیں کالی حویلی سے ملحق کنور جہاں زیب کے آبائی قبرستان میں دفن کر دیا گیا۔ اس طرح کہ کوئی انھیں رونے والا تھا' نہ کندھا دینے والا۔

شائستہ بیگم کے والدین کا تو خیر انتقال ہو چکا تھا۔ لیکن ان کے بھائی' بہن' چچا' ماموں تو تھے۔ ان کو بھی اطلاع نہیں کی گئی اور اس طرح انھوں نے ان کی وصیت پر عمل درآمد کیا' گویا اس وصیت کا انتقام لیا۔ وہ مر کر بھی چین نہ پا سکیں۔

اگر لوگ اس کو کالی حویلی کہتے تھے تو ٹھیک ہی کہتے تھے۔ اس کی سفید دیواروں کے نیچے کتنا گھور اندھیرا تھا۔ کسی کو کچھ معلوم نہ تھا' کالی حویلی میں کیا ہو رہا ہے' کیا ہونے والا ہے اور کیا ہو چکا ہے' یہ کوئی نہیں جان سکتا تھا۔

اس وقت جب یعقوب مودبانہ چلتا ہوا ان کے سامنے پہنچ کر ہاتھ باندھ کر کھڑا ہوا تو وہ اپنے آفس میں بیٹھے کچھ فائلوں کی ورق گردانی کر رہے تھے۔ کالی حویلی کے ایک حصے میں انھوں نے اپنا دفتر بنا رکھا تھا۔

فائل دیکھتے دیکھتے انھوں نے نظر اٹھائی جس کا مطلب تھا' ہاں کہو' کیا بات ہے۔

"سرکار! تدفین ہو گئی ہے۔"

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

یعقوب یہ کہہ کر چند لمحے کھڑا رہا لیکن کنور صاحب نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ دوبارہ اسی انہماک سے فائلیں دیکھنے لگے۔ اب یعقوب کا مزید یہاں ٹھہرنا فضول تھا۔ وہ خاموشی سے الٹے قدموں واپس لوٹا اور دروازے میں گم ہو گیا۔

فائل دیکھتے دیکھتے اچانک انھیں ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی کمرے میں آیا ہو۔ انھوں نے چونک کر چاروں طرف دیکھا' کوئی نہ تھا البتہ کھڑکی کا پردہ ضرور ہل رہا تھا۔

''میں مر جاؤں تو میری میت کو گجرات بھیج دیجیے گا..... میں اپنے والدین کے پہلو میں دفن ہونا چاہتی ہوں۔''

ذہن کے کسی گوشے میں شائستہ بیگم کی آواز سنائی دی اور پھر ان کا چہرہ نگاہوں میں آ گیا۔ کچھ اس طرح جیسے وہ سامنے بیٹھی ہوں۔ کنور جہاں زیب بڑے مضبوط اعصاب کے آدمی تھے لیکن اس وقت انھیں کچھ الجھن سی ہونے لگی۔ دل میں خلش سی اٹھی تھی کہ مرنے والی کی وصیت کو ٹھکرا کر شاید انھوں نے غلطی کی تھی۔ ابھی ندامت کا احساس گہرا نہ ہو پایا تھا کہ کنور جہاں زیب نے اپنے سر کو جھٹک دیا۔ نہیں' انھوں نے کوئی غلطی نہیں کی تھی..... بلکہ شائستہ بیگم نے اس طرح کی وصیت کر کے ان کے وقار کو دھچکا پہنچایا تھا۔ غلطی انھوں نے کی تھی۔

ابھی وہ اسی ذہنی خلفشار میں تھے کہ چھوٹی بیگم کی ملازمہ خاص کمرے میں داخل ہوئی۔ ''ہاں' بولو۔''

''سرکار' چھوٹی بیگم آپ کا کھانے پر انتظار کر رہی ہیں۔''

''ان سے کہو کہ ہم کھانا نہیں کھائیں گے۔''

یہ سن کر وہ الٹے قدموں تیزی سے واپس چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد کنور صاحب کرسی سے اٹھے اور کھڑکی کے پاس آ کر کھڑے ہو گئے۔ باہر گہرا اندھیرا چھایا تھا۔

چند سیکنڈ اندھیرے کو گھور کر وہ واپس پلٹے۔ تب انھوں نے دیکھا کہ چھوٹی بیگم کی ملازمہ خاص کمرے میں موجود ہے۔

''ہاں۔'' کنور صاحب کی پیشانی شکن آلود ہو گئی۔

''بیگم صاحبہ نے پوچھا ہے' خدانخواستہ آپ کی طبیعت تو خراب نہیں۔''

''ان سے کہو کہ میں بالکل ٹھیک ہوں۔''

''جی بہتر۔'' وہ پھر الٹے قدموں واپس لوٹ گئی۔ کنور جہانزیب آہستہ آہستہ چلتے صوفے پر نیم دراز ہو گئے۔ ایک بے کلی سی تھی' بے چینی سی تھی۔ ابھی وہ اس بے کلی' بے چینی کے بارے میں سوچ ہی رہے تھے کہ وہ ملازمہ پھر وارد ہو گئی۔

''کیا ہے؟'' کنور صاحب کے لہجے میں سختی تھی۔

''سرکار' بیگم صاحبہ آنے کی اجازت طلب کر رہی ہیں۔'' ملازمہ کانپتے ہوئے بولی۔

''نہیں۔''

''بہتر' سرکار۔'' وہ ملازمہ لرزتے قدموں سے فوراً واپس ہو گئی۔

ملازمہ کے جانے کے بعد انھوں نے گھنٹی بجائی۔ تھوڑی دیر بعد یعقوب کمرے میں داخل ہوا اور ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔

''جی سرکار۔''

''یعقوب' میرا کمرہ کھولو اور باقی سب بند کر دو۔''

یہ ایک خاص جملہ تھا جس کا مطلب یعقوب خوب سمجھتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ کون سا کمرہ کھولنا ہے اور کیا بند کرنا ہے۔ اس نے حویلی سے آنے والے تمام دروازوں کو ایک ایک کر کے بند کر دیا۔ پھر وہ دروازہ کھولا جس میں ان کا مے خانہ تھا۔ ایک شیشے کی الماری میں دنیا بھر سے جمع کی گئیں خوب صورت بوتلیں سجی تھیں۔ جہاں ایک حسین خواب گاہ تھی۔ خوشبوؤں میں بسا نرم ملائم بستر تھا۔ چودہ سسٹم ٹیلی وژن تھا تو چودہ سسٹم وی سی آر تھا۔ ایک ریک پر رکھے وہ ویڈیو کیسٹ تھے جن میں بجلیاں بھری تھیں۔ ان کڑکتی مچلتی بجلیوں کا ان کے پاس بہت اچھا ذخیرہ تھا۔ دنیا کا اعلیٰ ترین ساؤنڈ سسٹم اس کمرے میں نصب تھا۔ بے شمار کیسٹ تھے۔ بعض کیسٹ تو ایسے تھے جنھیں سننے کا انھیں موقع ہی نہیں ملا تھا۔ سرسراتے پردے' قدِ آدم پینٹنگز' چھت میں جڑے ہوئے آئینے' جو سکون کے لمحات کو دوبالا کر دیتے تھے۔ غرض کمرہ کیا تھا' ایک چھوٹی جنت تھی اور یہ جنت حویلی کے ایک تہ خانے میں آباد تھی۔ اس تہ خانے کے بارے میں صرف دو ہی آدمیوں کو معلوم تھا۔ ایک کنور صاحب اور دوسرے یعقوب کو۔

یعقوب اس حویلی کا سب سے پرانا ملازم تھا۔ جتنا پرانا تھا' اتنا ہی وفادار تھا۔ اس کے سامنے کنور صاحب کی زندگی کھلی کتاب کی طرح تھی۔ لیکن ایسی کتاب جسے تکیے کے نیچے چھپا کر پڑھا جائے۔ وہ کنور صاحب کا رازداں تھا' جتنا رازداں تھا' اتنا ہی مہذب اور فرماں بردار تھا۔

کنور صاحب بیڈ پر بیٹھ گئے۔ یعقوب نے نرم ملائم تکیے ان کی کمر کے پیچھے رکھ دیے۔ کنور صاحب نے ان تکیوں سے ٹیک لگائی۔ پھر یعقوب نے دو تکیے کہنیوں کے نیچے رکھ دیے۔ کنور صاحب نے اپنے دونوں ہاتھ پھیلا لیے اور بولے۔ ''کپتان صاحب کی بھجوائی ہوئی چیز نکالو۔''

''بہتر سرکار۔'' یعقوب نے اپنے بندھے ہوئے ہاتھوں کو کھولا اور ایک چھوٹی سی شیشے کی میز بیڈ کے نزدیک لا کر رکھدی۔ پھر اس نے شیشے کی الماری میں سجی چمچماتی بوتلوں پر نظر ڈالی۔ تب اس کی ایک بوتل پر نظر ٹھہر گئی۔ کپتان صاحب کی بھجوائی ہوئی چیز وہی تھی۔

اس حکم کی تکمیل کے بعد یعقوب پھر ہاتھ باندھ کر مودبانہ کھڑا ہو گیا۔

''ذرا کیسٹ نکالو۔'' کنور صاحب نے مخمور نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا لیکن یہ ایک مبہم حکم تھا۔ کنور صاحب اس وقت وی سی آر پر کیا دیکھنا چاہ رہے تھے' کون سا کیسٹ نکلوانا چاہ رہے تھے' کچھ اندازہ نہ تھا۔ وہ ان کے مزاج سے اچھی طرح واقف تھا بہرحال وہ ان کا حکم سنتے ہی فوراً ریک کی طرف بڑھا اور یونہی کیسٹوں پر ہاتھ مارنے لگا۔ تب پشت سے آواز آئی۔ ''دوسری

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

قطار میں پانچواں کیسٹ۔" کنور جہاں زیب اس عمر میں بھی بہترین یادداشت کے مالک تھے۔

یعقوب نے دوسری قطار سے فوراً پانچواں کیسٹ نکالا اور وی سی آر میں لگا کر اسے آن کر دیا اور ریموٹ کنٹرول دائیں ہاتھ کے نزدیک تکیے پر رکھ دیا۔

"یعقوب!" کنور صاحب کی نظریں ٹی وی اسکرین پر تھیں۔

"جی سرکار۔"

"کچھ انتظام نہیں ہو سکتا۔"

"جی ہو سکتا ہے سرکار! نہ ہونے کی کیا وجہ ہے؟ یعقوب نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں ایک گھنٹے میں کچھ لے کر واپس آتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے' تم جاؤ۔" کنور صاحب نے ریموٹ کنٹرول ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔

یہ حویلی شہر سے تین چار گھنٹے کی مسافت پر واقع تھی۔ اس وقت شہر جانا اور وہاں سے کچھ لانا مشکل تھا' صبح ہو جاتی۔ اس نے عالم گڑھ کے علاقے سے ہی کچھ اٹھانے کا فیصلہ کیا۔ یہ حویلی عالم گڑھ کے وسط میں واقع تھی۔ اس کے چاروں اطراف میں گاؤں آباد تھے۔ اور ان دیہاتوں میں ہر طرف کنور جہاں زیب کے کارندے پھیلے ہوئے تھے۔

یعقوب نے گیراج سے جیپ نکالی اور گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے سوچنے لگا۔ کدھر جائے؟ تب اس نے شیر پور جانے کا فیصلہ کیا۔ جب وہ وقت مقررہ پر تہ خانے میں واپس داخل ہو تو مطلوبہ چیز اس کے ساتھ تھی۔ جو فاختہ کی طرح سہمی سمٹی' لرزتی کانپتی کنور جہاں زیب کے روبرو کھڑی تھی۔ یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ اس کالی حویلی سے وہ زندہ واپس جائے گی یا لاش کی صورت میں۔

کنور جہاں زیب نے اس لڑکی کو گہری نظروں سے دیکھا اور پھر ایک سفاک مسکراہٹ ان کے چہرے پر بکھر گئی۔ "کوڑا لاؤ۔"

"جی بہتر' سرکار۔"

کنور جہاں زیب بیڈ سے ایک عفریت کی طرح اٹھے۔ ان کا چہرہ ایک دم بھیانک ہو گیا۔ دانت جیسے باہر نکل آئے' زبان سانپ کی طرح لپلپانے لگی۔

یعقوب کوڑا دے کر بہت تیزی سے تہ خانے سے نکل گیا۔ تب کنور صاحب نے کوڑا فضا میں لہرایا۔ چند سیکنڈ بعد ایک چیخ تہ خانے میں گونجی اور پھر کوڑا بار بار فضا میں بلند ہوتا رہا۔ اس کے ساتھ ہی دردناک چیخیں بھی سنائی دیتی رہیں۔

کنور جہاں زیب کا یہ ایک خاص مشغل تھا۔ کوڑے مار مار کر نازک جسموں کو زخمی کرنا' پھر ان کو تڑپتا دیکھ کر آسودگی حاصل کرنا' سرشار ہونا۔ اس اذیت ناک کھیل میں انھیں بڑا لطف آتا تھا۔ کوڑے مارتے مارتے ان پر نشہ سا چھا جاتا' غنودگی طاری ہو جاتی اور وہ نڈھال ہو کر بیڈ پر پڑتے اور پرسکون ہو کر سو جاتے۔

کنور صاحب کی شکل وصورت دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ اس قدر سفاک ہیں۔ یہ بات تو صرف انھیں معلوم تھی یا تہ خانے کی ان دیواروں کو یا پھر وہ جانتی جس پر یہ قیامت گزرتی۔ اگر وہ یہ مار نہ سہہ سکتی' مر جاتی پھر تو کسی سے کچھ کہنے کا سوال ہی نہ تھا۔ اگر زندہ بھی رہتی تو بھی اس میں زبان کھولنے کی جرأت باقی نہ رہتی۔ یونوں کی اس بستی میں دیو سے ٹکر لینے والا کوئی نہ تھا۔ اگر کوئی کوشش بھی کرتا تو اسے چیونٹی کی طرح مسل دیا جاتا۔

صبح حسب معمول وہ اپنی چہیتی گھوڑی برق فشاں کی پیٹھ پر سوار ہو کر سیر کو نکلے۔ جب وہ واپس آئے تو آفتاب کالی حویلی کے پیچھے سے سر ابھار رہا تھا۔ ابھی وہ حویلی کے بڑے پھاٹک میں داخل ہوئے ہی تھے کہ اچانک ان کے سامنے ایک عورت آ گئی۔ اس نے بھاگ کر گھوڑی پر بیٹھے ہوئے کنور صاحب کا پاؤں پکڑ لیا اور انھیں دعائیں دینے لگی۔

کنور صاحب نے بڑی آہستگی سے اپنا پاؤں رکاب سے نکالا اور چھلانگ لگا کر نیچے آئے۔ ملازم نے برق فشاں کی لگام پکڑ لی۔ ایک اور ملازم نے اس عورت کو کھینچ کر پیچھے کرنا چاہا مگر کنور صاحب نے اسے روک دیا اور اس عورت کو سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگے۔

"سرکار' میں ایک غریب بیوہ ہوں۔ میری بیٹی کی شادی ہونے والی ہے مگر میرے پاس دینے کو ایک پھوٹی کوڑی بھی نہیں۔ میں بہت پریشان ہوں سرکار' میری کچھ مدد کریں۔" یہ کہہ کر اس ادھیڑ عمر عورت نے کنور صاحب کے پاؤں چھونے کی کوشش کی مگر کنور صاحب دو قدم پیچھے ہٹ گئے۔

"مائی' مجھے گناہ گار نہ کرو۔" پھر انھوں نے اپنے ایک ملازم کو آواز دی۔ "اسد!"

"جی سرکار!" اسد آواز سنتے ہی آگے بڑھا۔

"اس مائی کو اپنے پاس بٹھاؤ' منیجر صاحب آ جائیں تو ان سے اسے پچیس ہزار دلوا دو۔"

"جی' بہت بہتر سرکار۔"

"کیوں مائی' ٹھیک ہے؟"

"اللہ آپ کو خوش رکھے سرکار۔ آپ جیسے خدا ترس لوگوں سے یہ دنیا آباد ہے۔ آپ نہ ہوں تو دنیا' دنیا نہ رہے' جہنم بن جائے۔"

کنور صاب مسکراتے ہوئے آگے بڑھے پھر چند قدم چل کر رک گئے۔ پلٹ کر دیکھا اور اسد کو اپنے نزدیک آنے کا اشارہ کیا۔ اسد تقریباً دوڑتا ہوا ان کے نزدیک آیا۔ "جی سرکار!"

"اسد' یہ بڑھیا اندر کیسے آئی؟"

"سرکار' یہ غلطی مجھ سے ہوئی۔"

"اچھا۔" یہ کہہ کر کنور صاحب حویلی کی طرف بڑھ گئے۔ حسب معمول حمام تیار تھا۔ اس ایئر کنڈیشنڈ باتھ روم میں داخل ہونے سے پہلے انھوں نے ایک ملازم کو یعقوب کو بلانے کا حکم دیا۔

جب وہ باتھ روم سے باہر آئے تو انھوں نے یعقوب کو ہاتھ باندھے کھڑا دیکھا۔ وہ

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

یعقوب کو دیکھ کر مسکرائے۔ ''یعقوب' ہمیں اسد جیسے بے وقوف ملازموں کی ہرگز ضرورت نہیں' اس کی فوراً چھٹی کر دو۔ اس بڑھیا نے ہمارا موڈ آف کر دیا اور یہ سب اس احمق کی وجہ سے ہوا لیکن اس بڑھیا کو پیسے ضرور دلوا دینا۔''

''بہتر سرکار! میں سمجھ گیا۔ ابھی آپ کے حکم کی تعمیل ہوئی جاتی ہے۔'' یہ کہہ کر یعقوب الٹے قدموں واپس لوٹا اور پھر تیزی سے دروازے سے نکل گیا۔

کنور جہاں زیب کو غریب بیوہ سے ہمدردی تھی نہ غریب ملازم سے۔ وہ چاہتے تو اس بیوہ کو دھکے دے کر باہر نکلوا سکتے تھے لیکن وہ بے وقوف آدمی نہ تھے پچیس ہزار دے کر انھوں نے پچیس لاکھ کی پبلسٹی کمائی تھی۔ پچیس ہزار ان کے لیے پچیس سو جیسے تھے۔ وہ کروڑوں کی جائیداد کے مالک تھے۔ اس بیوہ نے اپنے علاقے میں جا کر کنور صاحب کی سخاوت کی تعریف کی اور یہ بات سینہ بہ سینہ ایک گاؤں سے پچیس گاؤں میں پھیل گئی لیکن یہ کتنوں نے جانا ہوگا اور کس نے یقین کیا ہوگا کہ پچیس ہزار دان دینے والے سخی نے اس بڑھیا کی وجہ سے اپنے ملازم کو نکال دیا۔ غریب ملازم کو نکال کر کنور صاحب نے دوسرے پہریداروں کی آنکھیں کھول دیں تاکہ یہ واقعہ پھر نہ دہرایا جا سکے۔

جب چھوٹی بیگم کی ملازمہ خاص کمرے میں داخل ہوئی تو اس نے کنور صاحب کو خلاف توقع وہاں نہ پایا۔ چھوٹی بیگم ناشتے کی میز پر ان کا انتظار کر رہی تھیں اور وہ کسی کو بتائے بغیر حویلی سے غائب تھے۔ وہ یعقوب کے ساتھ قبرستان میں گھوم رہے تھے۔ شائستہ بیگم کے جنازے میں شرکت نہ کر کے انھوں نے اپنے تئیں اپنی زخمی انا کو تسکین دے لی تھی۔ ساتھ ہی اپنی سفا کی کی نظیر قائم کر دی تھی۔ اب وہی کنور صاحب ایک دردمند دل لیے شائستہ بیگم کی قبر پر کھڑے پھولوں کی چادر ڈال رہے تھے۔

کنور صاحب کی شخصیت بڑی پیچیدہ تھی۔ کسی اور کی سمجھ میں تو وہ کیا خاک آتے' خود اپنے آپ انھیں صاف دکھائی نہ دیتا تھا۔

قبرستان سے فارغ ہو کر انھوں نے دو ملازمین کو اپنے ساتھ جیپ میں بٹھایا اور خود حویلی کی جانب روانہ ہو گئے۔ بہ نفس نفیس شائستہ بیگم کی موت کی اطلاع دینے۔

جب ملازمہ خاص نے کنور صاحب کے حویلی میں نہ ہونے کی اطلاع چھوٹی بیگم کو دی تو انھوں نے یعقوب کو طلب کیا۔ وہ رات بھر سو نہیں سکی تھیں۔ یہ پہلا موقع تھا کہ کنور صاحب نے نہ صرف ساتھ کھانے سے انکار کیا تھا بلکہ شرف بازیابی سے بھی محروم کر دیا تھا اور اب وہ ناشتے کے بغیر ہی حویلی سے نکل گئے تھے۔ رات وہ کہاں رہے' کسی کو معلوم نہ تھا۔

یعقوب نے اندر آ کر چھوٹی بیگم کو ادب سے سلام کیا اور دھیمے لہجے میں بولا۔ ''حکم بیگم صاحب۔''

''کنور صاحب کہاں چلے گئے؟''

''جی' وہ قبرستان تشریف لے گئے تھے اور وہاں سے گجرات چلے گئے۔'' یعقوب نے بتایا۔

''گجرات؟ آخر کیوں؟'' چھوٹی بیگم نے پوچھا۔

''وہ بڑی بیگم صاحب کے انتقال کی خبر دینے گئے ہیں۔''

''ارے! آخر خود جانے کی کیا ضرورت تھی۔ کسی ملازم کو بھیج دیا ہوتا۔''

''بس جی' سرکار کی مرضی' وہ خود چلے گئے۔''

''دیکھو یعقوب' میں تم سے ایک بات پوچھ رہی ہوں' سچ سچ بتانا' دیکھو' جھوٹ نہ بولنا۔''

''آپ فرمائیں جی' میں بھلا آپ سے جھوٹ کیسے بولوں گا۔''

''کنور صاحب کل رات کہاں تھے؟''

یہ سوال سن کر یعقوب ایک دم سٹپٹا گیا۔ کنور صاحب نے چار شادیاں کی تھیں۔ یعقوب نے ساری بیگموں کو دیکھا تھا۔ کسی نے آج تک کنور صاحب کے شب و روز کے بارے میں اس طرح سوال نہیں کیا تھا۔

یہی وجہ تھی کہ چھوٹی بیگم کا یہ سوال سن کر وہ چکرا گیا اور ابھی وہ جواب سوچ ہی رہا تھا کہ چھوٹی بیگم نے جلدی سے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ پر قرآن شریف رکھ دیا اور بولیں۔ ''اب بتاؤ۔''

یہ ایک کٹھن مرحلہ تھا۔ سچ بولتا تو مالک کا راز افشا ہوتا اور جھوٹ بولتا تو گناہ کبیرہ کا مرتکب ہوتا۔

''ایسا کیوں کر رہی ہیں بیگم صاحب' ایسا نہ کریں۔'' یعقوب نے انھیں حلف اٹھانے سے باز رہنے کی تلقین کی۔ اس تلقین میں ایک طرح کی تنبیہ شامل تھی۔ وہ انھیں ڈھکے چھپے لفظوں میں بتانا چاہتا تھا کہ اس طرح انھیں کہیں نقصان نہ پہنچ جائے۔

''میں نے جو پوچھا ہے اس کا جواب دو۔'' چھوٹی بیگم نے دوٹوک انداز میں کہا۔

''بیگم صاحب' وہ رات کو قبرستان میں رہے۔ بڑی بیگم صاحب کی قبر پر بیٹھے فاتحہ خوانی کرتے رہے۔ صبح تڑکے وہاں سے چلے۔''

''لیکن انھوں نے بڑی بیگم کے جنازے میں تو شرکت کی نہیں؟''

''وہ جی' کہتے تھے کہ میں بڑی بیگم صاحب کو دفن ہوتا نہیں دیکھ سکتا۔ انھیں بڑی محبت تھی جی ان سے۔'' یعقوب کو اچانک احساس ہوا کہ آخری جملہ اس نے غلط کہہ دیا ہے' اس لیے فوراً غلطی کے بھاری پن کو دور کرنے کے لیے بولا۔ ''بالکل ویسی ہی جیسی آپ سے ہے۔''

''اچھا' اچھا۔'' چھوٹی بیگم نے اسے مزید کچھ کہنے سے روک دیا۔ ''ایک بات غور سے سن لو۔ اس بات کا ذکر کسی اور تک نہ پہنچے۔ ''میرا مطلب سمجھ گئے تم۔''

''جی' میں کسی سے خاص طور' سے کنور صاحب سے اس کا ہرگز ذکر نہیں کروں گا۔''

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

یعقوب نے ان کا مطلب سمجھتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے' اب تم جا سکتے ہو۔" چھوٹی بیگم نے اس کے ہاتھ سے قرآن شریف لے لیا۔

یعقوب سر جھکائے' لرزتے قدموں سے ان کے کمرے سے نکلا۔ اس کے دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ طوفان اٹھ رہے تھے۔ جھوٹی قسم کھانے' جھوٹا حلف اٹھانے پر اس کا ضمیر اسے سرزنش کر رہا تھا۔ مالک کے کرتوت چھپانے کے لیے اس نے یہ سب کچھ کیا تھا۔ اس نے اپنے مالک سے وفا کی تھی مگر سب کے مالک سے دغا کی تھی۔ بہرحال اب جو ہونا تھا ہو چکا تھا۔

چھوٹی بیگم حلف اٹھانے کے باوجود اس کے بیان سے مطمئن نہ تھیں کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ شائستہ بیگم سے تو وہ کب کا ترکِ تعلق کر بیٹھے تھے۔ پھر رات کو اٹھ کر قبرستان جانا اور فاتحہ خوانی کرنا کیا معنی رکھتا تھا۔ لیکن یعقوب کے بیان کو جھٹلانے کے لیے بھی ان کے پاس کوئی ٹھوس دلیل نہ تھی۔ بس اندر سے دل نہ مانتا تھا۔

دوپہر کو کنور جہاں زیب شہر سے واپس لوٹے تو ان کے ساتھ شائستہ بیگم کی بہن اور بھائی تھے۔ دونوں سوگوار اور اداس' کنور صاحب بہ نفسِ نفیس انھیں شائستہ بیگم کی قبر تک لے گئے۔ وہاں سب نے فاتحہ پڑھی اور حویلی میں آ گئے۔ شام تک وہ دونوں حویلی میں رہے۔ اس حویلی میں انھیں دم گھٹنے کا احساس ہو رہا تھا۔

یہ حویلی ایک طرح کا محل تھی۔ زندگی کی ہر آسائش' جدید انداز میں یہاں موجود تھی۔ پھر بھی ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے ہر طرف کانٹوں بھرے تار پھیلے ہوں جو روح کو لہولہان کر رہے ہوں۔

وہ دونوں شام کو کنور صاحب سے اجازت لے کر اپنے گھر روانہ ہو گئے۔ ویسے بھی اب یہاں رہنے کا فائدہ کیا تھا۔ جس سے رشتہ تھا وہی نہ رہی تو اب کس کے لیے رکتے۔

یعقوب پورے دن عجیب کرب میں مبتلا رہا۔ اسے مہمانوں کے واپس جانے کا بے چینی سے انتظار تھا۔ وہ گئے تو اس نے سکھ کا سانس لیا۔ وہ فوراً کنور صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ یعقوب وہ واحد ملازم تھا جسے کنور صاحب نے ہر جگہ اور ہر وقت ملاقات کی اجازت دے رکھی تھی۔

اس وقت کنور صاحب دن بھر کے تھکے ہارے بستر پر لیٹے تھے۔ آنکھوں میں غنودگی چھا رہی تھی۔ سونا ہی چاہتے تھے کہ یعقوب کمرے میں وارد ہوا۔

کنور جہاں زیب کو اس وقت اس کی آمد سخت ناگوار گزری' اگر کوئی اور ملازم ہوتا تو اس کا آج ہی حساب صاف ہو گیا تھا۔ یعقوب اس وقت بے وقت آیا تھا لیکن کنور صاحب جانتے تھے کہ وہ ضرور کوئی اہم خبر لے کر آیا ہے ورنہ ہرگز اس وقت کنور صاحب کے آرام میں مخل نہ ہوتا۔

وہ لیٹے لیٹے ذرا تکیے پر اونچے ہو گئے اور سنجیدہ لہجے میں بولے۔ "یعقوب' تم اس وقت یہاں؟"

"معافی چاہتا ہوں سرکار۔ بے وقت مخل ہونے کی سو بار معافی چاہتا ہوں۔ پر میں آپ کا نمک خوار ہوں' آپ کے ساتھ نمک حرامی نہیں کر سکتا۔" یعقوب سینے پر ہاتھ باندھ کر ان کے سامنے آدھا جھک گیا۔

"ہوا کیا؟"

"سرکار' صبح مجھے چھوٹی بیگم صاحب نے طلب کیا تھا۔"

"تمھیں.... آخر کیوں؟"

"وہ جی' آپ کے بارے میں پوچھ رہی تھیں کہ رات آپ کہاں رہے؟"

"کیا؟" یہ سن کر ان کی نیند فوراً ہوا ہو گئی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئے اور غصے سے آنکھیں پھاڑ کر بولے۔ "وہ ہمارے بارے میں پوچھ رہی تھیں۔"

"جی سرکار' انھوں نے آپ کے بارے میں نہ صرف پوچھا بلکہ میرے ہاتھوں پر قرآن شریف رکھ دیا تاکہ میں جو کہوں' سچ کہوں۔"

"پھر تم نے سچ کہہ دیا؟"

"نہیں سرکار! ایسا نہیں ہو سکا۔ اللہ مجھے معاف کرے۔ میں نے انھیں بتایا کہ آپ قبرستان میں رہے رات بھر' بڑی بیگم صاحب کی قبر پر۔" یعقوب نے جو کہا تھا' بیان کر دیا۔

یہ بیان سن کر وہ ایک دم خاموش ہو گئے جیسے اندر ہی اندر ابل رہے ہوں' پھٹ رہے ہوں۔ بہہ رہے ہوں۔

"اچھا۔" کچھ دیر کے بعد وہ گویا ہوئے۔ "بعض عورتوں کو خوشی راس نہیں آتی۔ چھوٹی بیگم بھی انہی میں سے ایک ہیں۔ انھوں نے خود اپنے ہاتھوں میں خوش قسمتی کو بدقسمتی میں بدل لیا ہے۔ یعقوب' تم یوں کرو کہ حد بندی کر دو۔"

"جی' بہتر سرکار۔" یعقوب' کنور جہاں زیب کا فیصلہ سن کر الٹے قدموں پیچھے ہٹا اور پھر تیزی سے کمرے سے نکل گیا۔

کنور جہاں زیب کے اس فیصلے کا جب چھوٹی بیگم کو علم ہوا تو وہ تڑپ تڑپ کر روئیں مگر وہاں ان کی آہ' کراہیں سننے والا کوئی نہ تھا۔ تقدیر اپنا کھیل کھیل چکی تھی۔ تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ اب پچھتانا بیکار تھا کہ ہائے' میں نے کیوں یعقوب سے کنور صاحب کے بارے میں پوچھا۔ کاش' میں ایسا نہ کرتی۔

کنور صاحب کے فیصلے پر فوری طور پر عمل ہوا تھا۔ چھوٹی بیگم کو ان کے کمروں تک محدود کر دیا گیا۔ تمام دروازے بند کر دیے گئے۔ ایک ملازمہ کے علاوہ سب کے آنے جانے پر پابندی لگا دی گئی اور وہ بھی صرف ضروریات زندگی پہنچانے کی حد تک آ' جا سکتی تھی۔

اور یوں چھوٹی بیگم حویلی کی مالکن سے قیدی بن کر رہ گئیں۔ اور یہ سب ناتجربہ کاری کی وجہ سے ہوا۔ وہ کنور صاحب جیسے شاہانہ مزاج آدمی کو سمجھ نہ سکیں۔ ان کی کسی بیوی نے کبھی ان کی ٹوہ

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

لینے کی کوشش نہ کی تھی۔ وہ جانتی تھیں کہ ایسا کر کے محض اپنے آپ کو نقصان پہنچائیں گی۔ کو
صاحب بھلا کسی طرح باز آنے والے تھے۔ انھیں کون روکنے والا تھا؟ کوئی بھی نہیں۔
چھوٹی بیگم نے کتنی مرتبہ اس ملازمہ سے جو کھانا اور ضروریات زندگی مہیا کرنے پر مامور
تھی' کنور صاحب کو پیغام بھجوایا تھا کہ صرف ایک بار انھیں ملاقات کا شرف بخش دیں لیکن وہاں سے
ٹکا سا جواب ملا تھا۔
"نہیں' یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔"
جب وہ کنور صاحب سے مایوس ہو گئیں تو انھوں نے پندرہ بیس دن کے بعد پھر پیغام
بھجوایا۔ "چلیے آپ نہ ملیں لیکن مجھے تو اس قید تنہائی سے آزاد فرما دیں۔"
پھر وہی ٹکا سا جواب ملا۔ "نہیں' یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔"
پھر دو تین مہینے اسی طرح دیواروں سے سر ٹکراتے' بند دروازوں کو گھورتے' کبھی چیخ
چلاتے گزر گئے تو چھوٹی بیگم نے ایک فیصلہ کن پیغام بھیجا۔ "کنور صاحب! براہ کرم مجھے طلاق دے
دیجیے۔"
ادھر سے پھر وہی ٹکا سا جواب ملا۔ "نہیں' یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔"
کنور صاحب نہ ملتے تھے' نہ طلاق دیتے تھے اور نہ آزاد کرتے تھے۔ اب سوائے اس
کے کوئی چارہ نہ تھا کہ صبر کریں اور کسی معجزے کا انتظار کریں۔
خیر ان اونچی اونچی سنگی دیواروں کے درمیان معجزہ تو کیا ہونا تھا۔ ہاں' یہ ضرور ہوا کہ
کوثر کی تلاش میں کالی حویلی آ پہنچا۔ خود تو مصیبت میں گرفتار ہوا ہی' کنور صاحب کے دل میں چھوٹی
بیگم کے لیے جو تھوڑا بہت نرم گوشہ باقی تھا تو وہ بھی ختم ہو گیا اور کنور صاحب کسی شیر کی طرح
اٹھے۔
ایک دن کنور جہاں زیب حویلی کے خوب صورت باغ میں بیٹھے مشروب سے دل
رہے تھے۔ رانی ان کے دائیں جانب کرسی کے پاس پاؤں پھیلائے بیٹھی تھی۔ کنور صاحب گا
گاہے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے جاتے تھے اور گھونٹ گھونٹ کر کے زندگی کی تلخیوں کو پیتے جا
تھے۔
اچانک کچھ شور سا اٹھا۔
کنور صاحب نے نظر اٹھا کر دیکھا تو انھیں سامنے یعقوب نظر آیا جو ایک سوٹ پوش
دھکے دیتا ہوا لا رہا تھا۔ پھر قریب آ کر اس نے اس سوٹ پوش نوجوان کو اس طرح دھکا دیا کہ
رانی کے قدموں میں گرا۔ رانی اچھل کر غرائی۔ سوٹ پوش نوجوان کی شیرنی کو دیکھ کر سٹی گم ہو
اس نے تڑپ کر اٹھنا چاہا مگر یعقوب نے اس کے سینے پر بندوق رکھ دی۔
کنور صاحب نے رانی کے سر پر ہاتھ پھیرا تو وہ ذرا پیچھے ہٹ کر کسی پالتو بلی کی طر
بیٹھ گئی۔ یعقوب نے اس سوٹ پوش نوجوان کو گریبان سے پکڑ کر اٹھایا اور کنور صاحب کے قد

میں لا ڈالا۔
"کیا معاملہ ہے؟" کنور صاحب نے یعقوب سے پوچھا۔
"یہ بدمعاش آج صبح سے حویلی کے گرد مشکوک انداز میں چکر کاٹ رہا تھا۔"
"کون ہے یہ؟"
"یہ لاہور سے آیا ہے سرکار اور کیوں آیا ہے' یہ آپ اس سے خود معلوم کر لیجیے۔"
"اچھا تم ذرا اسے اٹھا کر کرسی پر بٹھاؤ اور بندوق کندھے پر ڈالو۔" کنور صاحب نے
حکم دیا۔
یعقوب نے فوراً اسے ایک کرسی پر بٹھایا اور اپنی بندوق کندھے پر لٹکا کر اس کی پشت پر
کھڑا ہو گیا۔
"ہاں صاحبزادے! کچھ بولیں' کیا معاملہ ہے آخر؟" کنور صاحب نے براہ راست
اس نوجوان سے سوال کیا۔
"مجھے بلاوجہ ان لوگوں نے پکڑ لیا ہے جی' میرا کوئی قصور نہیں۔" اس نوجوان نے رانی
کی طرف دیکھتے ہوئے سہمے سہمے انداز میں کہا۔
"تمھارا نام کیا ہے؟"
"فہد احمد۔ میں لاہور سے آیا۔ ہوں جی۔"
"کس سے ملنے؟"
"میں شیر پور آیا تھا جی' وہاں میرے ماما رہتے ہیں۔ اب میں واپس لاہور جا رہا تھا کہ
ان لوگوں نے مجھے پکڑ لیا' بالکل بے قصور۔"
"ابھی تو تم نے کچھ اور کہا تھا۔ یہ ایک ایک منٹ میں بیان بدلتا ہے۔ دیکھ' سچ بول ورنہ
چلاتا ہوں گولی۔" یعقوب نے کندھے سے بندوق اتار لی۔
"یعقوب! تم ذرا خاموش رہو۔" کنور صاحب نے فہد کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ "ہاں'
فہد صاحب' دیکھیں' میرے پاس وقت کم ہے' جلدی سے اصل بات بتا دیں۔"
"بس جی' اصل بات کیا بتاؤں' اصل بات تو یہی ہے' آپ شیر پور بھیج کر تصدیق کروا
لیں کہ میرے ماما وہاں رہتے ہیں کہ نہیں۔"
"تمھارے ماما وہاں ضرور رہتے ہوں گے' میں یقین کر لیتا ہوں مگر تم حویلی کے گرد چکر
کیوں کاٹ رہے تھے۔"
"نہیں تو جی' میں تو اسٹیشن جا رہا تھا کہ انھوں نے پکڑ لیا۔"
"سرکار' یہ ایسے نہیں مانے گا۔ اس نے کچھ دیر پہلے چھوٹی بیگم صاحب کا نام لیا تھا۔"
"اچھا!" یہ سن کر کنور صاحب کی تیوریوں پر بل پڑ گئے۔ "پھر اسے رانی کے آگے ڈالو'
شاید اس سے سچ اگلوائے گی۔"

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

شیرنی کے آگے ڈالنے کا حکم سن کر اس کے جسم پر کپکپی طاری ہو گئی۔ وہ گھبرا کر بولا۔"
ایسا نہ کریں جی' میں سب سچ بتائے دیتا ہوں۔"
اور پھر اس نے جو سچ بتایا' وہ چھوٹی بیگم کے تابوت میں آخری کیل ٹھونکنے کے مترادف تھا۔

فہد' کوثر کا پڑوسی تھا۔ دونوں گھرانوں میں بہت اچھے تعلقات تھے۔ بچپن ایک ساتھ کھیل کر گزرا۔ جوانی میں قدم رکھا تو کھیلنے کی عادت پھر بھی نہ گئی۔ بچپن اور جوانی کے کھیلوں میں جو فرق ہوتا ہے' وہ یہاں بھی تھا۔

محبت کا کھیل سب سے جدا ہوتا ہے اور جو لوگ یہ کھیل کھیلتے ہیں' وہ دنیا کو بھول جاتے ہیں۔ دنیا کو کیا خود اپنے آپ کو بھول جاتے ہیں' محبت وہ میٹھا زہر ہوتا ہے جو آہستہ آہستہ رگوں میں اترتا رہتا ہے اور پھر ایک دن بندہ اپنے آپ سے بھی چلا جاتا ہے' مر جاتا ہے اور جو مر جاتا ہے' وہی محبت کو پاتا ہے۔ فہد اور کوثر کے درمیان یہ کھیل بہت گہرا تھا۔ تعلیم سے فارغ ہو کر دونوں نے شادی کا پروگرام طے کر رکھا تھا کہ اتنے میں کنور جہاں زیب نے اپنی ٹانگ اڑائی اور سنہرے خواب دیکھنے والی کوثر سونے کی چلتی پھرتی کان کو دیکھ کر بت بن گئی۔ ایک طرف مفلس جوانی تھی اور دوسری طرف زردار بڑھاپا۔ اس نے آنکھ بند کر کے زردار بڑھاپے کا ہاتھ پکڑ لیا۔ یہ سوچ کر کہ مفلس جوانی سے جسم کی لو بڑھائے گی اور زردار بڑھاپے سے خواہشوں کا محل تعمیر کرے گی۔ اس نے بیک وقت اپنے ہاتھوں میں چاند اور سورج لینے کی تمنا کی اور یہ تمنا کچھ عرصے پوری بھی ہوتی رہی۔ کوثر مہینے میں ایک بار لاہور کا چکر ضرور لگاتی اور اس چکر میں فہد اس کے بہت قریب ہوتا۔ اب چھ مہینے سے فہد نے جو کوثر کی شکل نہ دیکھی تو وہ تڑپ گیا اور اسی نادانی میں عالم گڑھ آ گیا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ کسی نہ کسی طرح کوثر تک رسائی حاصل کر لے گا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ یہاں کالی حویلی کے چاروں طرف ایسا جال پھیلا ہوا ہے کہ پرندہ پر نہیں مار سکتا۔

فہد کی زبانی محبت کی یہ رنگین کہانی سن کر کنور صاحب نے کسی غصے کا اظہار نہ کیا۔ وہ بڑی سنجیدگی سے ان ذکر کو سنتے رہے۔ جب فہد اپنے اور کوثر کے بارے میں سب کچھ بتا چکا تو کنور صاحب نے ایک ٹھنڈی اور گہری سانس لی۔ "یعقوب!" انھوں نے یعقوب کو قریب آنے کا اشارہ کیا۔ فہد کی کہانی میں کیونکہ بار بار چھوٹی بیگم کا ذکر آ رہا تھا اور یہ ذکر کچھ اچھے انداز کا نہ تھا' اس لیے یعقوب از خود پیچھے ہٹ گیا تھا تاکہ کنور صاحب اچھی طرح اس کی بات سن لیں اور اس کی وجہ سے شرمندگی محسوس نہ کریں۔

"جی سرکار۔" یعقوب نے قریب آتے ہوئے کہا۔
"یعقوب' اسے اپنے ساتھ لے جاؤ۔ اس کا فیصلہ ہم کل کریں گے۔"
"اور ایسا کرو کہ ایک پیالہ تیار کرواؤ۔ ہم حویلی کے اندر جا رہے ہیں' تم چھوٹی بیگم کے پاس بھیج دو۔" یہ کہہ کر کنور جہاں زیب کھڑے ہو گئے۔

یعقوب نے بندوق کی نال فہد کے سینے پر رکھی اور اسے اٹھنے کا اشارہ کیا۔ فہد کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ یعقوب کے ساتھ خاموشی سے چل دے۔ اسے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ اگر اسے کچھ اندازہ ہوتا بھی تو وہ کیا کر لیتا۔ تقدیر نے اس کے لیے جو گڑھا کھود دیا تھا' اسے بھرنے والا کوئی نہ تھا۔

یعقوب نے حویلی کے باغ سے نکل کر فہد کو دو ملازمین کے حوالے کیا۔ ساتھ ہدایت دی۔ "اس کا فیصلہ کل ہوگا۔ اسے اپنی تحویل میں حفاظت سے رکھو' چاہو تو ہاتھ پیر باندھ دو یا جس طرح تم لوگ مناسب سمجھو کرو۔ بہرحال صبح مجھے یہ صحیح سلامت چاہیے۔"

فہد کو ملازمین کی تحویل میں دے کر وہ حویلی میں داخل ہوا۔ اس نے ایک ملازمہ سے چاندی کا وہ پیالہ منگوایا جو کبھی کبھی استعمال ہوتا تھا۔ یہ پیالہ چاندی کے روپوں سے بھرا شوکیس میں رکھا رہتا تھا۔ اس شوکیس میں سوائے اس پیالے کے کوئی اور چیز رکھنے کی اجازت نہ تھی۔

تھوڑی دیر میں ملازمہ نے روپوں سے بھرا یہ چاندی کا پیالہ یعقوب کے سامنے لا رکھا۔ یعقوب نے چاندی کے روپوں کو ملازمہ کے دوپٹے میں الٹ دیا اور پیالے کو ہاتھ میں لے کر اسے الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔

"ان روپوں کا کیا کروں؟" ملازمہ نے یعقوب نے پوچھا۔
"انہیں شوکیس میں رکھ دو' جب میں تمھیں یہ پیالہ واپس دوں تو ان روپوں سے پھر اس کو بھر دینا۔ سمجھ گئیں۔"
"جی' سمجھ گئی۔" ملازمہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "یعقوب صاحب' ایک بات پوچھوں' آپ نے اس پیالے کو کیوں نکلوا لیا ہے' کیا کریں گے اس کا؟"
"خاموش۔ بے وقوف عورت' اپنے کام سے کام رکھ۔ اسی طرح زندگی اچھی گزر سکتی ہے۔ جا بھاگ۔" یعقوب نے اسے جانے کا اشارہ کیا۔

وہ ملازمہ ڈری سہمی یعقوب کو عجیب نظروں سے دیکھتی فوراً وہاں سے غائب ہو گئی۔ ملازمہ کے جانے کے بعد اس نے حویلی کے تہ خانے کا رخ کیا اور وہاں بیٹھ کر اس نے پورے اطمینان سے وہ پیالہ تیار کیا۔

پھر اس پیالے کو اس نے کنور صاحب کے بیڈروم میں پہنچا دیا۔ یعقوب کے ہاتھ میں چاندی کا پیالہ دیکھ کر کنور صاحب بڑی سفاکی سے مسکرائے۔
"ادھر رکھ دو۔" کنور صاحب نے نزدیک پڑی ٹیبل کی طرف اشارہ کیا۔
یعقوب سرخ مشروب سے بھرے پیالے کو میز پر رکھ کر سیدھا ہوا تو کنور صاحب نے حکم دیا۔ "چھوٹی بیگم کو ہمارا پیغام دو۔"
"جی بہتر سرکار۔" یعقوب الٹے قدموں کمرے سے نکل گیا۔

کوثر کو قید ہوئے چھ ماہ گزر چکے تھے۔ اب وہ اس قید تنہائی کی عادی ہو چلی تھی۔ اس

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

نے سوچ لیا تھا کہ اب شاید اسے ان سنگی دیواروں سے نکلنا نصیب نہ ہو۔ شاید اب وہ کبھی کنور صاحب کی شکل نہ دیکھ سکے۔ کنور صاحب سے زیادہ اسے اپنے والدین یاد آتے تھے۔ بھائی بہن خیالوں میں آ کر اسے تڑپاتے تھے اور سب سے زیادہ تو اسے فہد یاد آتا تھا اور آجکل تو وہ ہر لمحہ اس کی آنکھوں میں سمایا رہتا تھا۔ وہ اس سے خوابوں میں ملتی' اپنا حال زار اسے سناتی اور سوتے چونک کر اٹھ بیٹھتی۔ پھر وہ پہروں روتی رہتی۔ اس وقت بھی جب یعقوب ایک ملازمہ کے ساتھ چھوٹی بیگم کے کمرے میں داخل ہوا تو وہ بستر پر اوندھی پڑی رو رہی تھی۔

"بیگم سرکار!" ملازمہ نے نزدیک جا کر انھیں آواز دی۔

چھوٹی بیگم نے آواز سن کر ذرا سا سر اٹھا کر دیکھا اور پھر وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھیں۔ اس ملازمہ کے ساتھ یعقوب بھی تھا۔ اس دن کے بعد سے یعقوب کی پہلی مرتبہ شکل دکھائی دی اور ظاہر ہے' یعقوب کی آمد خالی از علت نہ تھی۔ چھوٹی بیگم نے جلدی جلدی اپنی آنکھوں سے آنسو پونچھے اور کسی قدر ناراضگی سے بولیں۔ "یعقوب تم نے ہمارے ساتھ اچھا نہیں کیا۔ ہمارے منع کرنے کے باوجود تم نے کنور صاحب کو سب کچھ بتا دیا۔"

"چھوٹی بیگم صاحب! میں سرکار کا نمک خوار ہوں۔ میں ان سے کوئی چیز نہیں چھپا سکتا اور اس وقت میں آپ کے لیے ایک خوشخبری لے کر آیا ہوں۔"

"خوشخبری۔" چھوٹی بیگم نے فوراً اپنا دل تھام لیا۔ "جلدی سناؤ یعقوب' جلدی سناؤ۔"

"سرکار نے آپ کو یاد کیا ہے۔ وہ اس وقت اپنے بیڈ روم میں ہیں۔ آپ وہاں جلد از جلد پہنچ جایئے۔ اچھا اب میں چلتا ہوں۔"

"یعقوب' سنو تو!" چھوٹی بیگم نے تڑپ کر کہا۔

"جی۔" وہ جاتے جاتے رک گیا۔

"کیا کنور صاحب نے ہمیں معاف کر دیا ہے؟"

"اس کا جواب آپ کو سرکار ہی دے سکتے ہیں۔"

"تم نے ان کے موڈ سے کچھ اندازہ لگایا۔"

"ان کے موڈ سے کچھ اندازہ لگانا بہت مشکل ہے بیگم صاحب۔ جب وہ مسکرا رہے ہوں تو ضروری نہیں کہ اندر سے بھی مسکرا رہے ہوں۔ ہو سکتا ہے' انھیں اندر ہی اندر غصہ آ رہا ہو۔ جب ان کی پیشانی پر شکنیں پڑی ہوں تو ضروری نہیں کہ وہ ناراض ہی ہوں۔ وہ اندر سے خوش بھی ہو سکتے ہیں۔" یعقوب نے اپنے مالک کی شخصیت کا تجزیہ پیش کیا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو یعقوب' واقعی ان کا چہرہ دیکھ کر کسی نتیجے پر پہنچنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ تم جاؤ' میں ذرا تیار ہو کر آتی ہوں۔" چھوٹی بیگم نے کہا۔

"جی بہتر۔" یہ کہہ کر وہ کمرے سے نکل گیا۔

کوئی پندرہ بیس منٹ بعد جب چھوٹی بیگم جلدی جلدی تیار ہو کر کمرے سے باہر نکلیں [illegible]

انھوں نے حویلی کے تمام دروازے کھلے پائے۔ دروازوں کو کھلا دیکھ کر ان کے دل میں خوشی کی لہر اٹھی۔ شاید کنور صاحب نے انھیں معاف کر دیا ہے۔ شاید پھر سے بہار کے دن آ گئے ہیں۔

جب چھوٹی بیگم بیڈ روم میں داخل ہوئیں تو انھوں نے کنور صاحب کو بیڈ پر تکیوں کے سہارے بیٹھے دیکھا۔ چند لمحوں کے لیے چھوٹی بیگم کھلے دروازے کی چوکھٹ پر رکیں۔ انھوں نے پر شوق نگاہوں سے کنور صاحب کی طرف دیکھا۔ کنور صاحب نے بھی نظریں اٹھائیں لیکن ان نظروں میں کچھ نہ تھا۔ خالی اور ویران نظریں۔ وہ انھیں دیکھ کر ہلے تک نہیں۔ بس جس طرح بیٹھے تھے' ویسے ہی بیٹھے رہے۔ چھوٹی بیگم چھوٹے چھوٹے قدم اٹھا کر بیڈ تک آئیں اور کنور صاحب کو جھک کر آداب کیا۔

"آداب بیگم صاحب' آیئے' بیٹھیے۔" کنور صاحب نے بڑے نارمل انداز میں کہا جیسے یہ ملاقات چھ ماہ بعد نہ ہوئی ہو' چھ گھنٹے بعد ہو رہی ہو۔

"کنور صاحب' آپ کیسے ہیں؟" چھوٹی بیگم ان کے نزدیک بیٹھتے ہوئے بولیں۔

"اب ہمارا کیا پوچھتی ہیں۔" کنور صاحب نے بڑے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بات شروع کی۔ "ہم تو اس دن کو پچھتاتے ہیں جب ہم نے آپ کو پہلی بار دیکھا تھا۔ کاش' ہم نے آپ کو نہ دیکھا ہوتا۔"

"کیا ہوا کنور صاحب؟" چھوٹی بیگم یہ سن کر تڑپ اٹھیں دل دھک سے رہ گیا۔

"جو کچھ ہو چکا ہے' اب اس سے زیادہ کیا ہو گا؟"

"پھر بھی' کچھ بتایئے تو۔"

"ہم نے آپ کے لیے اپنی بیٹی سعدیہ کو چھوڑ دیا۔ جب سے آپ نے حویلی میں قدم رکھا اس نے حویلی میں قدم رکھنا خود پر حرام کر لیا۔ شادی کے بعد بس ایک ہی بار' وہ بھی آپ کی خواہش پر ہم لاہور گئے تھے اور وہاں جو کچھ ہوا' آپ اچھی طرح جانتی ہیں۔ اس کے بعد سے ہم نے کبھی لاہور کا رخ نہ کیا۔"

"جی' میں جانتی ہوں۔" چھوٹی بیگم نے کہا۔ "کیا سعدیہ کی طرف سے کوئی بات ہوئی ہے؟"

"نہیں' اس معصوم بچی کی طرف سے کیا بات ہو گی بھلا۔ وہ ہماری بیٹی ہے' بالکل ہماری طرح انا پرست۔ وہ ہمیں اس طرح بھول گئی ہے' جیسے ہم اس کے باپ ہی نہیں اور ہم بھی شاید اسے اسی طرح بھول گئے تھے۔" کنور صاحب کے لہجے میں بڑا دکھ تھا۔

"کنور صاحب! مجھے ایک بار لاہور بھیج دیجیے۔ اس مرتبہ میں اسے منا لاؤں گی۔" چھوٹی بیگم نے بڑے یقین سے کہا۔

"آپ اس سے کس منہ سے ملنے جائیں گی۔ اگر گئیں بھی تو اس مرتبہ وہ آپ کے منہ [illegible] دے گی۔" کنور صاحب کی آنکھوں میں جیسے بجلیاں سی چمکنے لگیں۔

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

"نہیں' ایسا نہیں ہوگا۔"

"ہاں' ایسا کہاں ہوگا بھلا۔ آپ لاہور سعدیہ سے ملنے کے بہانے جائیں گی اور وہاں جا ملیں گی فہد سے۔"

فہد کا نام سنتے ہی کوثر کو کرنٹ سا لگا۔ وہ ایک دم پیچھے کو ہوگئی۔ چہرے پر زردی پھیل گئی اور ہاتھ پاؤں کانپنے لگے۔ وہ سوچنے لگی۔ یہ فہد کا نام ان کے ذہن میں کہاں سے آیا! اس نے تو اس نام کو اپنے دل کے نہاں خانوں میں چھپا رکھا تھا۔ اس نے تو کبھی سعدیہ کو بھی نہیں بتایا تھا۔ پھر یہ نام کنور صاحب نے کہاں سے کھوج کیا۔ کیا وہ بے وقوف یہاں تک آ پہنچا ہے؟ شاید ایسا ہی ہوا ہے۔

"آپ میرے ملازمین سے میرے بارے میں حلف اٹھواتی ہیں۔ کیا آپ اس مسئلے پر حلف اٹھانا پسند کریں گی؟ میں جو کرتا ہوں' اس سے آپ کی عزت خراب نہیں ہوتی لیکن آپ نے جو کچھ کیا ہے' اس سے میری عزت دو کوڑی کی ہو کر رہ گئی ہے۔ بتایئے' اس کی کیا سزا دوں آپ کو؟"

"یہ فہد کا نام آپ کو کس نے بتایا؟"

"خود فہد نے۔"

"کیا وہ یہاں آیا تھا؟"

"آیا تھا نہیں' آیا ہوا ہے۔ وہ میری قید میں ہے اور اپنی قسمت کے فیصلے کا منتظر۔" کنور صاحب نے بہت تلخی سے کہا۔

"کنور صاحب' آپ مجھے جو چاہے سزا دے لیں لیکن اسے چھوڑ دیجیے۔" کوثر نے بڑے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

یہ سن کر کنور صاحب کے اندر کئی آتش فشاں پھٹے۔ وہ بیڈ پر سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔ ان کی آنکھیں لاوا اگل رہی تھیں اور دانت بھنچے ہوئے تھے۔ تب انھوں نے بیٹھے بیٹھے ایک فیصلہ کیا اور اس فیصلے پر فوری عملدرآمد کے لیے گھنٹی بجائی۔ چند لمحوں بعد ایک ملازمہ اندر داخل ہوئی۔ "جی سرکار۔"

"یعقوب....."

"جی بہتر سرکار۔" حکم سن کر وہ الٹے قدموں لوٹ گئی۔

"کوثر! میں نے اپنی زندگی میں ہر طرح کی عورتیں دیکھی ہیں لیکن تجھ جیسی کمینی عورت میں نے آج تک نہیں دیکھی۔ اب تو نہ صرف خود سزا بھگتے گی بلکہ اپنے یار کو بھی اپنی آنکھوں کے سامنے سزا پاتے دیکھے گی۔"

"جی سرکار۔" یعقوب نے حاضر ہو کر پوچھا۔

"فہد کو یہاں لاؤ اور ایک پیالہ بھی۔"

یعقوب نے خاموشی سے اثبات میں گردن ہلائی اور تیزی سے کمرے سے نکل گیا۔

یعقوب کے نکلتے ہی کوثر' کنور صاحب کے قدموں میں گر پڑی اور روتے ہوئے بولی۔ "کنور صاحب' مجھے معاف کر دیں۔"

کنور صاحب فوراً پیچھے ہٹ گئے اور بہت غصے سے بولے۔ "ذلیل عورت' خاموش بیٹھ۔"

کوثر نے اتنے غصے میں کنور صاحب کو کبھی نہ دیکھا تھا' وہ سہم کر پیچھے ہٹی اور سمٹ کر بیڈ کے ایک کونے پر بیٹھ گئی۔

یعقوب نے حکم بجا لانے میں بہت مستعدی کا ثبوت دیا۔ اس نے بلا تاخیر دونوں چیزیں پیش کر دیں۔

فہد کمرے میں داخل ہوا تو اس کی حالت بگڑی ہوئی تھی۔ چہرے پر کئی زخموں کے نشان تھے۔ کپڑے پھٹے ہوئے تھے۔ "کیا ہوا اسے؟" کنور صاحب نے پوچھا۔

"سرکار' اس نے فرار ہونے کی کوشش کی تھی۔"

"اچھا! اسے معلوم نہیں کہ یہ کس کی گرفت میں ہے؟"

"اسے بتا دیا گیا ہے سرکار۔"

"اسے تو ہم بتائیں گے۔" پھر وہ یعقوب سے مخاطب ہو کر بولے۔ "یعقوب' تم ٹھہرو' باقی لوگوں کو باہر بھیج دو۔"

یہ حکم سن کر وہ محافظ جو فہد کو گرفت میں لیے ہوئے تھے' فوراً باہر چلے گئے۔

"دروازہ بند....."

یعقوب نے حکم کی تعمیل کی۔ دروازہ بند ہو گیا۔

"بیٹھو فہد! ہم نے جب تمھارا ذکر کوثر سے کیا تو اس نے ہم سے تمھاری رہائی کی درخواست کی اور خود سزا بھگتنے کی آرزو۔ اس کی خواہش کے احترام میں ہم نے سوچا کہ تمھیں آزاد کر دیں۔ دنیا کی ہر فکر سے آزاد۔"

فہد نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کے حواس پہلے ہی گم تھے۔ بس اس نے ایک نظر کوثر کو دیکھا' اداسی اور بے بسی سے۔

کنور صاحب نے میز سے سرخ مشروب سے بھرا چاندی کا پیالہ اٹھانے کا حکم دیا۔ "پیالہ اٹھاؤ۔"

یہ حکم سن کر یعقوب تیزی سے آگے بڑھا۔

"نہیں' تم نہیں۔ تم' کوثر' یہ حکم میں نے تمھیں دیا ہے۔"

"اس پیالے میں کیا ہے؟" کوثر نے کانپتی آواز سے پوچھا۔

"زہر۔" بہت سچائی سے بتایا گیا۔

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

"نہیں' یہ زہر میں نہیں پلاؤں گی۔"

"پلانا ہوگا اور پھر خود پینا ہوگا۔ بس یہی نجات کا راستہ ہے۔"

"کنور صاحب' آپ بہت ظالم ہیں۔"

"میں جو کچھ ہوں' خوب جانتا ہوں۔ آپ کی تشریح کا محتاج نہیں۔ کوثر بیگم' پیالہ اٹھاؤ۔ میرے پاس وقت بہت کم ہے۔ اگر آپ نے فوراً میرا حکم نہ مانا تو مجھے منوانا بھی آتا ہے اور اس بات سے آپ اچھی طرح واقف ہوں گی۔"

کوثر کیا' یہ بات تو اب فہد کو بھی اچھی طرح معلوم ہو گئی تھی کہ اس کالی حویلی میں جو کہا جاتا تھا' وہ کر کے دکھا بھی دیا جاتا تھا۔ تب کوثر نے لرزتے ہاتھوں سے وہ چاندی کا پیالہ اٹھایا جس میں سرخ رنگ کی موت رقصاں تھی۔

کوثر کو ہاتھ میں پیالہ لیے اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر فہد کے جسم میں کپکپی طاری ہو گئی۔

"وہ' نہیں" کہہ کر دو قدم پیچھے ہٹا۔ کنور صاحب نے اشارہ کیا۔ یعقوب نے ریوالور کی نال اس کی کمر سے لگا دی اور بولا۔ "پیچھے نہیں' آگے بڑھو' اگر اب تم پیچھے ہٹے تو میں فوراً گولی چلا دوں گا۔"

موت کو پیچھے رقصاں دیکھ کر وہ فوراً آگے بڑھا۔

کوثر اب اس کے نزدیک آ چکی تھی۔ اس نے بہت گہری نظروں سے فہد کو دیکھا اور بہت میٹھے لہجے میں بولی۔ "فہد' میں تمہارے بغیر ادھوری ہوں' مرد بنو! اس زہر کو خوشی سے پی لو۔ ان سب کو بتا دو کہ تم بھی میرے بغیر ادھورے ہو۔ لو' اسے پی لو' اس میں تمہاری موت نہیں' ہماری زندگی ہے۔"

"لاؤ' میں اسے پی لیتا ہوں اور بتا دیتا ہوں کہ موت ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ لاؤ' پلاؤ مجھے۔"

کوثر نے آنسو بھری آنکھوں سے فہد کو دیکھا' مسکرائی اور بڑے پیار سے بولی۔ "مجھے تم پر فخر ہے فہد' لو لب وا کرو۔"

فہد نے ہونٹ کھولے تو کوثر نے جلدی سے آگے بڑھ کر اس کے ہونٹوں سے موت کا جام لگا دیا اور وہ غٹ غٹ کر کے موت کو گھونٹ گھونٹ پی گیا۔

پیالہ ختم ہوتے ہی وہ لڑکھڑا کر زمین پر گرا اور کسی زخمی پرندے کی طرح تڑپنے لگا۔

کوثر نے پیالہ پھینک کر اسے سنبھالنے کے لیے بڑھی تو کنور صاحب نے زور سے دھکا دے کر اسے بیڈ پر گرا دیا اور بولے۔ "اسے زہر پلایا ہے تو اسے تڑپتا ہوا بھی دیکھ۔"

کوئی دس منٹ تک فہد موت و زیست کی کش مکش میں رہا' کوثر سے اس کی یہ حالت دیکھی نہیں گئی۔ وہ بے ہوش ہو گئی۔ کچھ دیر بعد فہد بھی ٹھنڈا ہو گیا۔

کوئی آدھے گھنٹے کے بعد بڑی کوششوں سے کوثر کو ہوش آیا۔ اس نے آنکھیں کھول کر

دیکھا تو فہد اسے قالین پر بڑے پرسکون انداز میں لیٹا نظر آیا۔

"چلو اٹھو۔" کنور صاحب نے اسے ٹھوکر لگاتے ہوئے کہا۔ "وہ تو چلا گیا۔ اب تم بھی جاؤ۔ وہ تمہارا انتظار کرتا ہوگا' جس کے بغیر تم ادھوری ہو۔"

"ہاں' سفاک آدمی' میں اس کے بغیر ادھوری ہوں... میں بھی جاتی ہوں' میرا اب یہاں کیا ہے؟ لاؤ' دو پیالہ۔"

"میں نہیں دوں گا۔ یہ زہر تو تمہیں خود ہی اٹھا کر پینا ہوگا۔" کنور جہاں زیب نے کہا۔

کوثر' ہمت کر کے اٹھی۔ اس نے بڑے عزم سے چاندی کا پیالہ اٹھایا۔ چند لمحے فہد کی لاش کو دیکھا اور آنکھیں بند کر کے موت کو منہ لگا لیا۔

پیالہ ختم ہوتے ہی وہ چکرا کر قالین پر گری اور فہد کی طرح تڑپنے لگی۔ کنور صاحب نے اس کے تڑپتے جسم پر نظریں گاڑ دیں۔ ان کے ہونٹوں پر ایک سفاک مسکراہٹ پھیلتی جا رہی تھی۔ وہ اندر ہی اندر آسودہ ہوتے جا رہے تھے۔ انتقام کی آگ سرد ہوتی جا رہی تھی۔

جب کوثر کا جسم تڑپ تڑپ کر ٹھنڈا ہو گیا تو کنور صاحب نے یعقوب سے کہا۔ "یعقوب' فہد کی لاش کہیں دور جنگل میں لے جا کر گاڑ دو اور اس ذلیل عورت کو اس کے گھر پہنچانا ہے۔ ہمارے آبائی قبرستان میں ایسی عورتوں کی کوئی گنجائش نہیں' فہد کو ابھی ٹھکانے لگاؤ اور اسے صبح لے جانا۔"

"سرکار' اگر آپ اجازت دیں تو اسے بھی فہد کے ساتھ ٹھکانے لگا دوں۔" یعقوب نے ڈرتے ڈرتے رائے پیش کی۔

"نہیں۔ جیسا تم سے کہا گیا ہے' ویسا کرو' مجھے حیل و حجت بالکل پسند نہیں۔" کنور صاحب نے ذرا سخت لہجے میں کہا۔

لہجے کی سختی محسوس کر کے یعقوب ایک دم سیدھا ہو گیا اور گھگیاتے ہوئے بولا۔ "معافی چاہتا ہوں سرکار' آئندہ ایسی غلطی نہیں ہوگی۔"

"ٹھیک ہے۔ اب تم فوراً کام میں لگ جاؤ اور دیکھو' اپنے ساتھ بھروسے کے لوگوں کو رکھنا اور ذرا احتیاط سے کام لینا۔"

"آپ فکر نہ کریں سرکار' میں سب ٹھیک کر لوں گا۔"

"میں دوسرے بیڈ روم میں جا رہا ہوں' لاہور جانے سے پہلے مجھ سے مل لینا۔ میں سحریہ کے نام ایک خط دوں گا۔ وہ اسے پہنچا آنا۔" یہ کہہ کر وہ دونوں کی لاشوں پر نظر ڈالتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھے۔ یعقوب نے لپک کر دروازہ کھول دیا اور وہ بڑے اطمینان سے چلتے ہوئے کمرے سے نکل گئے جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو یا روز ہی ایسا ہوتا ہو۔

صبح کو وہ حسب معمول اپنی چہیتی گھوڑی پر سیر کو نکلے۔ جب وہ واپس لوٹے تب تک یعقوب روانگی کے تمام انتظامات مکمل کر چکا تھا۔ اب وہ کنور صاحب کا منتظر تھا کہ وہ ناشتا کر لیں تو

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

ان سے ملاقات کرے۔

ناشتے کے بعد خود ہی کنور صاحب نے اسے بلوالیا' یعقوب کو پیغام بھیجنے کی ضرورت پڑی۔ ان سے مل کر اس نے ساری باتیں اچھی طرح سمجھ لیں۔ پیسے لے لیے' خط لے لیا اور پھر اجازت لے کر حویلی سے نکل گیا۔

دونوں گاڑیاں تیار کھڑی تھیں۔ وہ جیپ میں بیٹھ گیا۔ پیچھے وین میں تابوت تھا اور چار آدمی ساتھ تھے' مستعد اور اسلحہ سے لیس۔ جیپ میں بھی یعقوب کے علاوہ تین آدمی موجود تھے۔

دونوں گاڑیاں تیزی سے کالی حویلی کے مین گیٹ سے باہر نکلیں اور لاہور کی جانب گامزن ہوگئیں۔ راستے میں کسی قسم کی کوئی دقت پیش نہ آئی۔ وہ بخیر وخوبی اپنی منزل پر پہنچ گئے۔ کوثر کا گھر سمن آباد میں تھا۔ جب دونوں گاڑیاں گھر کے سامنے رکیں تو گلی میں سناٹا طاری تھا۔

یعقوب کے لیے یہ ایک مشکل وقت تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کوثر کی موت کی کس طرح اطلاع دے۔ وہ سارے راستے یہی سوچتا آیا تھا کہ یوں کال بیل بجائے گا اور جب دروازہ کھلے گا تو وہ یوں گویا ہوگا لیکن وہ ابھی تک کسی ایک جملے پر متفق نہ ہو سکا تھا۔ اسے کنور جہاں زیب پر بھی غصہ تھا' انھوں نے خواہ مخواہ لاش پہنچانے کا چکر چلا دیا تھا۔ کنور صاحب بھی خوب آدمی تھے۔ شائستہ بیگم کی وصیت کے باوجود انھوں نے ان کی لاش ان کے شہر نہ بھجوائی تھی اور چھوٹی بیگم نے جبکہ ایسی کوئی خواہش ظاہر بھی نہ کی تھی تو انھیں کنور صاحب نے ان کے گھر بھیج دیا تھا۔ کنور صاحب کی کوئی کل سیدھی نہ تھی۔ یہی وجہ تھی کہ یعقوب اتنا عرصہ ان کے ساتھ رہنے کے باوجود انہیں بالکل نہ سمجھ پایا تھا۔ وہ مسکرانے کی بات پر غصہ کرتے تھے اور بعض وقت غصے کی بات پر مسکرا دیا کرتے تھے۔

گھر کے گیٹ پر پہنچ کر یعقوب نے کال بیل بجائی اور پیچھے ہٹ کر گیٹ کھلنے کا انتظار کرنے لگا۔ کچھ دیر کے بعد گیٹ کے پیچھے سے آواز آئی۔ ''کون ہے؟'' یہ کسی خاتون کی آواز تھی' غالباً وہ کوثر کی ماں تھیں۔

''ہم عالم گڑھ سے آئے ہیں جی۔'' یعقوب نے گیٹ کے نزدیک پہنچ کر دھیرے سے کہا۔

عالم گڑھ کا نام سن کر گویا ادھر زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ کھٹ کھٹ گیٹ کھلا اور ایک ادھیڑ عمر کی خاتون باہر نکل کر آئیں۔ ''آپ عالم گڑھ سے آئے ہیں' کنور جہاں زیب کی حویلی سے۔''

''جی ہاں۔'' یعقوب نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''کیا آپ چھوٹی بیگم کی امی ہیں؟''

''ہاں' میں کوثر کی ماں ہوں' کیسی ہے وہ۔ چھ مہینے ہو گئے اسے ادھر آئے ہوئے۔ آیئے آپ اندر آجایئے۔ آپ شاید یعقوب صاحب ہیں۔''

''جی ہاں' میرا نام یعقوب ہے۔ میں جی ایک بری خبر لے کر آیا ہوں۔ چھوٹی بیگم ہمارے ساتھ آئی ہیں۔ آپ ذرا ہمت سے کام لیجیے گا۔ موت اور زندگی تو اللہ کے ہاتھ میں...

''کیا ہوا میری بیٹی کو... کہاں ہے وہ؟'' کوثر کی امی میں اتنا حوصلہ نہ تھا کہ وہ پوری بات سن سکتیں۔ وہ چیخ کر بولیں! ارے بتاتے کیوں نہیں' میری بیٹی کو کیا ہوا؟''

''ہمارے ساتھ ان کی میت آئی ہے جی۔'' یعقوب نے ہڑبڑا جی کڑا کر کے کہا۔

میت کا نام سن کر کوثر کی امی کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ انھیں سکتہ سا ہو گیا اور پھر چند لمحے بعد انھیں چکر سا آیا اور وہ چکرا کر زمین پر آرہیں۔ کوثر کی امی کو کوثر کے بڑے بھائی نے سنبھالا جو گیٹ پر یہ دیکھنے آیا تھا کہ کون آیا ہے۔

گھر میں اس وقت ان دونوں کے علاوہ کوئی نہ تھا۔ کوثر کے والد کہیں گئے ہوئے تھے۔ کوثر کے بھائی محمود نے بڑے حوصلے سے کام لیا۔ پہلے اس نے ماں کو اٹھا کر بیڈ روم میں پہنچایا پھر تابوت اتروا کر صحن میں رکھا۔ تابوت لانے والوں کو ڈرائینگ روم میں بٹھایا اور یعقوب سے پوچھنے لگا۔ ''یہ سب کیسے ہوا؟''

''ہوا یہ جی۔'' یعقوب نے بتانا شروع کیا۔ ''کہ چھوٹی بیگم کل شام کو حویلی کے باغ میں ٹہل رہی تھیں کہ جھاڑیوں میں سے ایک کالا ناگ نکل آیا۔ اس نے چھوٹی بیگم کو ڈس لیا۔ میں نے فوراً دو تین گاؤں سے کئی سپیروں کو بلوایا لیکن وہ کچھ نہ کر سکے۔ ان کے پہنچنے سے پہلے ہی چھوٹی بیگم اللہ کو پیاری ہوگئیں۔ مرنے سے پہلے انھوں نے دو باتوں کی وصیت کی' ایک تو انھوں نے یہ کہا کہ مجھے انتقال کے بعد لاہور روانہ کر دینا۔ دوسرے میرے والدین کو پانچ لاکھ روپے بھجوا دینا۔ کنور صاحب نے ان کی وصیت کے مطابق انھیں اور ان کے ساتھ پانچ لاکھ روپے بھیج دیے ہیں۔ وہ خود ساتھ آنا چاہ رہے تھے لیکن چھوٹی بیگم کی موت کے صدمے نے انھیں نڈھال کر کے رکھ دیا ہے۔ وہ معذور ہو کر رہ گئے ہیں۔ اس لیے وہ نہ آسکے' انھوں نے مجھے بھیج دیا۔'' یعقوب نے ساری روداد سنا کر بریف کیس اٹھا کر میز پر رکھا اور اسے کھولنے لگا۔

بریف کیس کھلا تو اس میں لال لال نئے نوٹوں کی گڈیاں نظر آئیں۔ ان نوٹوں سے بھرا بریف کیس بھرا ہوا تھا۔

''آپ پیسے چیک کرلیں جی۔'' یعقوب نے محمود سے کہا۔

''ارے کمال کرتے ہیں آپ' بس اسے بند کر دیجیے۔''

یعقوب نے بریف کیس بند کر کے اس کی چابی محمود کے حوالے کی۔ محمود نے بریف کیس میز سے اٹھایا اور اسے لے کر اندر چلا گیا۔ وہ تیزی سے سیڑھیاں چڑھتا اوپر اپنے اسٹور نما کمرے میں پہنچا اور بریف کیس کو بیڈ کے نیچے چھپا دیا اور پھر ڈرائنگ روم میں واپس آگیا۔

کوثر کی میت آنے کی اطلاع فوراً ہی پاس پڑوس کے گھروں میں پہنچ گئی۔ عورتیں آنے لگیں۔ مرد جمع ہونے لگے۔ تب یعقوب وہاں سے یہ کہہ کر نکل لیا۔ ''ہم ذرا ایک کام سے گلبرگ جا رہے ہیں' دو ڈھائی گھنٹے میں واپس آتے ہیں۔ تب تک تدفین کی تیاری مکمل ہو چکی ہوگی۔ آپ جنازے میں شریک ہو جائیں گے۔''

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

"جی ٹھیک ہے۔" محمود گیٹ تک یعقوب کو چھوڑنے آیا اور اس وقت تک کھڑا رہا جب تک دونوں گاڑیاں گلی سے نکل نہ گئیں۔

گاڑیوں کے چلے جانے کے بعد اس نے ایک گہرا سانس لیا اور کچھ سوچتا ہوا اندر چلا گیا۔ محمود حال ہی میں کراچی سے آیا تھا۔ وہ ایک جرائم پیشہ لڑکا تھا۔ گریجویٹ ہونے کے بعد منفی رجحان کا مالک تھا۔ اسے بہن کی موت کا اتنا غم نہ ہوا تھا جتنی خوشی اسے پانچ لاکھ روپے کی تھی۔ یہ پانچ لاکھ اب اس کے اپنے تھے۔ اسے کیا ضرورت تھی کہ وہ گھر والوں سے ان روپوں کا ذکر کرے۔ کراچی میں وہ کئی بنک ڈکیتیوں میں ملوث تھا۔ اس کا چار پانچ لڑکوں پر مشتمل ایک گروپ تھا۔ کراچی میں ان دنوں پکڑ دھکڑ ذرا زیادہ ہو رہی تھی اس لیے محمود ادھر بھاگ آیا تھا۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو بھی کراچی چھوڑنے کا مشورہ دیا۔ پروگرام یہ تھا کہ کچھ آرام کر کے پھر نئے سرے سے واردات کا سلسلہ شروع کریں گے۔

یعقوب، کوثر کی میت پہنچا کر سیدھا گلبرگ پہنچا۔ اسے سعدیہ کو کنور صاحب کا خط دینا تھا اور زبانی حالات بتانے تھے۔

سعدیہ اتنے عرصے بعد یعقوب کو دیکھ کر حیرت میں پڑ گئی۔ یعقوب اس کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑا تھا اور خالی خالی نظروں سے سعدیہ کو دیکھ رہا تھا۔ "یعقوب صاحب، تشریف رکھیے۔" اس نے صوفے کی طرف بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا! آپ کی آمد کسی طوفان کا پیش خیمہ تو نہیں؟"

"نہیں چھوٹی سرکار! میں آپ کا نمک خوار ہوں۔ میں تو بڑے سرکار کا خط لے کر حاضر ہوں۔"

"آپ بابا جان کا خط لائے ہیں۔ انھوں نے مجھے خط لکھا ہے۔ کیسے ہیں میرے جان؟" خط کا ذکر سن کر وہ خوشی سے پھولی نہ سمائی۔ "لائیے دیجیے۔ کہاں ہے خط؟"

یعقوب نے جلدی سے اپنی جیکٹ کی جیب سے خط نکال کر سعدیہ کو ادب سے پیش کیا اور پھر صوفے پر بیٹھ گیا۔

سعدیہ نے بڑی بے قراری سے لفافہ چاک کیا اور خط پڑھنے لگی۔

"سعدیہ بیٹے!

میں نے وہ دیوار گرا دی ہے جو ہمارے درمیان حائل ہو گئی تھی۔ یعقوب تمھیں سب کچھ بتا دے گا۔ اس سے پوچھ لینا۔ اب آ کر مجھ سے مل جاؤ۔ تمھارا چہرہ دیکھے ایک عرصہ ہو گیا ہے۔

تمھارا منتظر۔ کنور جہاں زیب۔"

خط پڑھ کر سعدیہ کو بہت خوشی ہوئی۔ اس کی آنکھیں ایک دم چمک اٹھیں۔ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ "کوثر کو کیا ہوا یعقوب صاحب، کیا بابا جان نے اسے طلاق دے دی؟"

"چھوٹی سرکار، وہ عورت اس حویلی کے قابل نہ تھی۔ اس نے بڑے سرکار کو بڑا دکھ دیا۔" یعقوب نے تمہید اٹھائی۔

"ہاں، میں جانتی ہوں کہ وہ کس قابل تھی۔ پر بابا جان کو کیا کہوں۔ انھوں نے اس قدر داری برتی کہ میں کچھ نہ کر سکی۔ خیر پچھلی باتوں کا اب ذکر کیا۔ آپ بتائیں کہ اس نے کیا کیا۔"

"وہ جی، یہاں آ کر ایک لڑکے سے ملتی تھی۔ اس لڑکے کا نام فہد تھا جی۔ جب پچھلے چھ سے وہ لاہور نہ آ سکی تو وہ لڑکا اس سے ملنے حویلی پہنچ گیا۔ وہاں ہم لوگوں نے اسے مشکوک حالات میں گھومتے ہوئے پکڑ لیا اور بڑے سرکار کی خدمت میں پیش کر دیا۔ وہاں اس لڑکے نے سب کچھ صاف صاف بتا دیا۔ بس جی پھر بڑے سرکار کو طیش آ گیا لہٰذا نہ وہ لڑکا فہد رہا اور نہ وہ بیگم کوثر۔" یعقوب نے مختصراً ساری روداد بیان کر دی۔

"اوہ!" سعدیہ نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔

"میں اس وقت کوثر کی میت اس کے گھر پہنچا کر آ رہا ہوں۔ فہد کو ہم نے وہیں جنگل میں دبا دیا ہے۔ چھوٹی سرکار، یہ راز کی بات ہے۔ راز ہی رکھیے گا۔" یعقوب نے بہت دھیمے لہجے میں کہا۔

"میں جانتی ہوں یعقوب صاحب، سب سمجھتی ہوں۔"

"پھر آپ ہمارے ساتھ چلیں گی؟"

"نہیں، میں دو چار دن بعد آؤں گی، میرے ٹیسٹ وغیرہ ہو رہے ہیں۔" سعدیہ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

ویسے اس کا جی تو یہی چاہ رہا تھا کہ ابھی ان لوگوں کے ساتھ چلی جائے لیکن وہ ایاز کو ملے بغیر جانا نہیں چاہتی تھی۔ ایاز یہ سب سنے گا تو بہت خوش ہو گا۔ وہ اکثر اسے زور دیا کرتا تھا کہ جو ہونا تھا، وہ ہو گیا۔ اب وہ باپ سے ملنے چلی جائے مگر وہ ہمیشہ بڑی سختی سے انکار کر دیتی تھی کہ کوثر کی موجودگی میں وہ کبھی حویلی نہیں جائے گی۔

ایاز سے اس کی ملاقات کالجوں کے ایک انعامی مباحثے میں ہوئی تھی۔ وہ مباحثہ اگرچہ سعدیہ نے جیت لیا تھا لیکن وہ ایاز کو دل ہار بیٹھی تھی۔ ایاز بظاہر ایک عام سا، سیدھا سادہ لڑکا تھا لیکن اس میں کوئی ایسی بات ضرور تھی کہ آدمی کا دل اس کی طرف خود بخود کھنچتا تھا۔ شاید اس کے اندر کوئی مقناطیس لگا ہوا تھا۔ اس کی شخصیت میں انفرادیت تھی، سنجیدگی تھی، بردباری تھی اور اس کی ذہانت میں بڑی کشش تھی۔

ایاز کو بھی سعدیہ اچھی لگی اس لیے یہ پہلی ملاقات آخری نہ بنی۔ وہ ملتے گئے اور ایک دوسرے کے ہوتے گئے۔ اور جب محبت کی جڑیں بہت گہری ہو گئیں تو ایاز بڑا پچھتایا۔ اگر اسے پہلے یہ معلوم ہو جاتا کہ وہ ایک بہت بڑے جاگیردار کی بیٹی ہے تو وہ وہیں اپنی محبت کا گلا گھونٹ دیتا۔ سعدیہ اپنے رکھ رکھاؤ میں بہت سیدھی سادی تھی۔ اسے دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ اتنے

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

بڑے باپ کی بیٹی ہے۔ اس نے بہت بعد میں اپنے باپ کا حوالہ دیا۔

کنور جہاں زیب کا نام سن کر ایاز کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ تب وہ مزید پچھتایا کہ بیکار کی محبت کا آئندہ جو انجام ہونے والا تھا' وہ اس کے سامنے تھا۔ سعدیہ اگر آسمان تھی تو وہ زمین ان کا ملاپ ہوتا تو کیسے؟

اب ایاز کے لیے یہ ضروری ہو گیا تھا کہ وہ اپنے باپ کا حوالہ دے کر اصل صورت سامنے لے آئے اور اسے پوری سچائی سے بتا دے کہ وہ کس کا بیٹا ہے۔ تاکہ یہ سن کر کل جو ہونا ہے' وہ آج ہی ہو جائے۔

اور جب ایاز نے اپنے والد کا نام بتایا تو اس نے اس نام کو بہت بے پروائی سے سن مسکرا کر بولی۔ "مجھے اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ تم کس کے بیٹے ہو۔ میں تم سے تمہارے حوالے سے کرنا چاہتی ہوں۔ تم مجھے پسند ہو' مجھے اچھے لگتے ہو' بس اتنا ہی میرے لیے ہے' لیکن میں جانتی ہوں کہ میرے بابا جان اس طرح نہیں سوچیں گے۔ وہ اپنے ملازم کے بیٹے سے ہرگز میری شادی نہیں کریں گے۔ بلکہ اس طرح کی بات سن کر شعلے کی طرح بھڑک اٹھیں گے۔ تو بھڑک اٹھیں۔ وہ اپنے ملازم کے بیٹے کو اپنا داماد بنانا پسند نہیں کریں گے تو نہ کریں۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ وہ زیادہ سے زیادہ یہ کریں گے کہ مجھے عاق کر دیں گے۔ جائیداد سے محروم دیں گے' تو کر دیں۔ کیوں ٹھیک ہے نا' تمہیں جائیداد سے تو کوئی دلچسپی نہیں؟"

"نہیں بالکل نہیں۔" ایاز نے بڑے یقین سے کہا اور اس یقین میں بڑی سچائی تھی۔

"بس اب تم فکر ہی نہ کرو۔ آگے جو ہو گا' دیکھا جائے گا۔ ابھی تم اپنی تعلیم پر توجہ دو۔ اسی پر ہمارے مستقبل کا انحصار ہے۔"

سعدیہ کی یہ بات سن کر اسے بڑا اطمینان ہوا۔ وہ پہلے مرحلے سے بخیر و خوبی گزر گیا تھا۔ اب دوسرے اور آخری مرحلے سے گزرنا باقی تھا اور اس کی اسے کوئی خاص فکر نہ رہی تھی۔ سعدیہ اس کے ساتھ تھی۔

یعقوب کافی دیر بیٹھا سعدیہ سے باتیں کرتا رہا۔ اسے حویلی کے قصے سناتا رہا۔ ایاز بھی کئی بار ذکر آیا۔ اس شیرنی سے سعدیہ کو بھی بڑی دلچسپی تھی۔ وہ بڑے شوق سے اس کی باتیں رہی۔ اسی طرح کی باتیں کر کے اور سعدیہ سے حویلی آنے کا پکا وعدہ لے کر یعقوب اٹھ کھڑا ہوا۔

"اچھا چھوٹی سرکار اب میں چلتا ہوں۔" اس نے بندوق کو شانے پر لٹکاتے ہوئے کہا۔ "آپ آنے میں دیر مت کیجیے گا۔"

"نہیں یعقوب صاحب' ایسا نہیں ہو گا۔ میں بابا جان سے ملنے کے لیے خود حویلی ہوں۔"

"خدا حافظ۔" سعدیہ اسے چھوڑنے گیٹ تک آئی۔ معاً اسے خیال آیا کہ وہ یعقوب سے کہے کہ آپ اپنے بیٹے ایاز سے نہیں ملیں گے کیا۔ لیکن پھر فوراً ہی اس نے خود کو سنبھال

ایسی بات کر کے وہ خود کو الجھن میں ڈالنا نہیں چاہتی تھی۔ نہ ہی وہ یعقوب کو کسی عذاب میں مبتلا کرنا چاہتی تھی۔ ابھی یہ بات راز تھی تو اسے راز ہی رہنا چاہیے تھا۔

دوسرے دن جب سعدیہ کی ایاز سے ملاقات ہوئی تو وہ بہت خوش تھی۔ اور خوش کیوں نہ ہوتی۔ آخر اس کے درمیان حائل وہ دیوار گر گئی تھی۔ جس نے بابا جان کو اس سے دور کر دیا تھا۔ بابا جان سے ملاقات ہو گئی' تو وہ کسی نہ کسی طرح اپنے دل کی بات ان تک پہنچائے گی۔ یہی سوچ سوچ کر وہ خوش ہو رہی تھی۔

"کیا ہوا بھئی' کچھ بتاؤ تو آج تم ضرورت سے زیادہ خوش ہو۔" بالآخر ایاز سے نہ رہا گیا تو اس نے پوچھا۔

"ایاز' کوثر مر گئی۔"

"ارے! کیسے؟"

"اسے سانپ نے ڈس لیا۔"

"بالآخر وہ اپنے کیے کو پہنچی۔" ایاز نے گہرا سانس لیا۔

"ہاں' کل تمہارے والد آئے تھے' بابا جان کا خط لے کر۔ کیا وہ تم سے نہیں ملے؟"

"ہاں' آئے تھے وہ مجھ سے ملنے۔" ایاز نے بتایا۔

"پھر انھوں نے تم کو کچھ نہیں بتایا؟" سعدیہ نے پوچھا۔

"نہیں' بس اتنا کہا کہ وہ کسی کام سے لاہور آئے تھے تو مجھ سے بھی ملنے آ گئے۔ وہ بہت وفادار قسم کے آدمی ہیں۔ حویلی کی باتیں وہ ہر ایک سے نہیں کرتے۔" ایاز نے کہا۔

"تب ہی تو وہ بابا جان کے دستِ راست ہیں۔ میرا خیال ہے' شاید ہی حویلی کی کوئی بات ہو جو یعقوب صاحب کو معلوم نہ ہو۔" سعدیہ نے اس کو گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "کل رات میں تمہارا ذکر کرنے لگی تھی۔ بس تمہارا نام زبان پر آتے آتے رہ گیا۔"

"اس کا مطلب ہے کہ محبت میں وہ مقام آتے آتے رہ گیا کہ کسی کا نام لوں' لب پر تمہارا نام آئے۔"

"یہ مقام تو کب کا آ چکا۔ اب تو ہر وقت تمہارا نام ہی نوکِ زبان پر رہتا ہے۔ تمہاری ہی تصویر دل میں جگمگاتی رہتی ہے۔" سعدیہ نے بڑے پیار سے کہا۔

"آج تو بڑے موڈ میں ہو' اللہ رحم کرے۔"

"رحم کس پر کرے۔"

"ہم دونوں پر۔" ایاز نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اور خدا کرے کہ یہ موڈ تمہارا ہمیشہ ہمیشہ برقرار رہے۔ میں نے تمہیں بہت دنوں بعد خوش دیکھا ہے' میں تمہیں ہمیشہ خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔ مجھے تم سے بہت محبت ہے۔"

"میں تو جواب میں ایسا کہنے سے رہی۔" سعدیہ نے جھکی جھکی نظروں سے کہا۔

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

"کیا ایسا کہنے سے رہی؟"

"یہی' ابھی تم نے جو کہا۔"

"کیا کہا؟"

"مجھے تم سے محبت ہے۔" سعدیہ نے بڑی معصومیت سے کہا۔

یہ سن کر ایاز نے زور سے قہقہہ لگایا اور پھر بولا۔ "واقعی؟"

"چلو ہٹو... میں تم سے بات نہیں کرتی۔"

"میں نے کیا کیا۔"

"تم مجھے ہمیشہ بات کرتے کرتے بھٹکا دیتے ہو۔ میں بات کیا کر رہی تھی اور شروع کروا دی کیا۔"

"اچھا یہ بتاؤ' کنور صاحب نے خط میں کیا لکھا ہے۔"

"مجھے بلایا ہے۔" سعدیہ نے کہا۔ "وہ تو مجھے اپنے ساتھ ہی لے جانا چاہ رہے تھے مگر میں تم سے ملے بغیر کیسے چلی جاتی' لہٰذا میں نے بہانہ کر دیا۔"

"پھر اب کیا ارادہ ہے؟"

"کل جاؤں گی۔"

"یہ چھوٹی سرکار' وہاں جا کر ہمیں بھول تو نہ جائے گی۔"

"کیا کہہ سکتی ہوں' ابھی بچھڑی نہیں نا تم سے بچھڑوں گی تو پتا چلے گا۔"

"خوابوں میں تو ملو گی۔"

"نہیں۔"

"آخر کیوں۔"

"ہم حقیقت میں جو ملیں گے۔"

"خدا کرے ایسا ہی ہو۔"

"ہاں' ایسا ہی ہوگا۔ یہ میرا یقین ہے۔"

"کل جاؤ گی تو واپسی کب ہو گی؟"

"دو چار دن تو لگیں گے کم از کم۔"

"تب تک میں کیا کروں گا۔"

"کوئی اور سعدیہ ڈھونڈ لینا۔ تم مردوں کے لیے تو یہ کوئی مشکل کام نہیں۔" سعدیہ نے ہنستے ہوئے کہا۔ وہ اسی طرح چٹکی لیا کرتی تھی۔

"اچھا زیادہ بکواس نہ کرو۔" ایاز نے جوابی کارروائی کی۔ "جس طرح عورت اپنی پہلی محبت نہیں بھولتی ویسے ہی مرد اپنی آخری محبت نہیں بھولتا۔"

"تو میں تمہاری آخری محبت ہوں۔ اس سے پہلے آپ اور کہاں کہاں یہ گل کھلا چکے

ہیں۔"

"تم نے میری پوری بات نہیں سنی نا۔ میں یہ عرض کرنا چاہ رہا تھا کہ آخری کے ساتھ پہلی بھی ہو۔"

"اگر میں تمہاری پہلی اور آخری محبت ہوں' پھر تو ایاز تم نے کچھ بھی نہ کیا۔ زندگی گنوا دی ایسے ہی' ارے بندہ دو چار عشق تو کرے زندگی میں۔"

"اچھا' زیادہ فضول باتیں نہیں۔" ایاز نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ورنہ شرما جاؤ گے۔"

"ماشاء اللہ آج تو بڑی تیز جا رہی ہو۔"

"اچھا' اب مذاق چھوڑو آؤ کچھ سنجیدگی سے باتیں کریں۔ مجھے کچھ مشورہ دو۔ بابا جان سے میں کس طرح بات کروں؟"

پھر وہ دونوں بڑی دیر تک سر جوڑے آئندہ کی منصوبہ بندی کرتے رہے۔ کس طرح بات کرنا ہے؟ بات کا کیا نتیجہ نکلنا ہے اور اس نتیجے کو کس طرح قبول کرنا ہے؟

دوسرے دن جب وہ حویلی پہنچی تو کنور جہاں زیب باغ میں بیٹھے شغل فرما رہے تھے۔ قریب ہی گھاس پر رانی بیٹھی تھی۔

تب یعقوب نے آ کر اطلاع دی۔ "چھوٹی سرکار آ گئی ہیں۔"

"ٹھیک ہے' میں اندر حویلی میں چلتا ہوں۔ تم میز سے یہ چیزیں ہٹوا دو۔"

کنور صاحب کے جانے کے بعد یعقوب نے ایک ملازم کو آواز دی۔

"جی صاحب!" وہ دوڑا ہوا آیا۔

"یہ بوتلیں اور گلاس بہت احتیاط سے بڑے سرکار کے کمرے میں پہنچاؤ۔" یعقوب نے ملازم کو ہدایت دی۔ "اور ہلاکت خان سے کہو کہ وہ رانی کو اپنے ٹھکانے پر لے جائے۔"

"جی' ٹھیک ہے صاحب۔"

یعقوب پھر وہاں ایک لمحے بھی نہ رکا۔ وہ تیزی سے حویلی کی طرف گیا۔ ابھی اسے کئی کام کرنے تھے۔

ادھر سعدیہ اپنے کمرے میں یعقوب کا بے چینی سے انتظار کر رہی تھی تاکہ معلوم ہو کہ کنور جہاں زیب اس وقت کہاں ہیں۔ وہ فوراً اسے بلواتے ہیں یا اسے کچھ انتظار کرنا ہوگا۔

اس بے چینی' بے قراری میں بار بار اس کی نظریں دروازے پر اٹھ رہی تھیں کہ اچانک کنور جہاں زیب دروازے پر نمودار ہوئے اور وہیں رک گئے۔ سعدیہ نے کنور صاحب کو کمرے کے دروازے پر دیکھا تو خوشی سے دیوانی ہو گئی۔

"بابا جان۔" یہ کہہ کر وہ بھاگتی ہوئی اپنے باپ سے لپٹ گئی۔

"میری بیٹی۔" کنور صاحب نے سعدیہ کی پیشانی کو چوما اور اسے بازو میں لیے کمرے

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

میں داخل ہوئے۔ ''کیسی ہے میری سعدیہ؟''

''آپ کی سعدیہ بالکل ٹھیک ہے بابا جان۔'' سعدیہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اب تو ناراض نہیں۔''

''بس بابا جان۔ اب آپ مجھے شرمندہ نہ کریں۔'' سعدیہ نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

کنور صاحب نے فوراً اندازہ لگا لیا کہ سعدیہ ان سے اس موضوع پر کوئی بات کرنا نہیں چاہتی۔ وہ اسے بھیانک خواب سمجھ کر بھول جانا چاہتی تھی۔ کنور صاحب کو بھی کوثر کے ذکر سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ انھیں جو عذاب دے گئی تھی' اسے یادِ ماضی کی طرح بھول جانا چاہتے تھے۔

یہ کوئی حادثہ سا حادثہ تھا' کوئی توہین سی توہین تھی۔ کوئی ذلت سی ذلت تھی۔ اگرچہ انھوں نے اس ذلت کا بھرپور طریقے پر انتقام لے لیا تھا۔ پھر بھی فہد کا خیال آتے ہی ان کے تن بدن میں آگ بھڑک اٹھتی تھی۔

سعدیہ مشکل سے دو تین دن حویلی میں رہی۔ پھر اس نے لاہور جانے کی اجازت چاہی۔ ان دو تین دنوں میں ایاز سے دوری' اس کے لیے بڑی جان لیوا ثابت ہوئی۔ تب اسے اندازہ ہوا کہ ایاز کے بغیر یہ دنیا بے کار ہے۔

کنور صاحب کو اگرچہ پوری طرح تو یہ اندازہ نہ ہو سکا کہ ان کی بیٹی کسی کی محبت میں گرفتار ہے البتہ انھوں نے اسے کچھ الجھا الجھا' کچھ کھویا کھویا ضرور محسوس کیا۔

سعدیہ کے لاہور روانہ ہونے کے بعد انھوں نے یعقوب کو بلوا لیا اور بڑی رازداری سے بولے۔ ''یعقوب' جال لگانا ہوگا۔''

''لگ جائے گا سرکار' آپ حکم کریں' کہاں؟''

''سعدیہ پر۔'' کنور جہاں زیب نے بڑی سنجیدگی سے بتایا۔

''چھوٹی سرکار پر!'' یعقوب نے تصدیق چاہی جیسے اسے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا ہو۔ ''سرکار' یہی فرمایا نا' آپ نے؟''

''یعقوب' میں بات کو بار بار دہرانے کا عادی نہیں ہوں۔ تم اپنے کان ذرا کھلے رکھو۔''

کنور صاحب کی پیشانی شکن آلود ہو گئی۔ ''یعقوب' تمھیں خود لاہور جانا ہوگا' اپنے ساتھ دو تین ہوشیار بندے لے جانا۔ سمجھ گئے۔''

''جی سمجھ گیا سرکار۔ آپ فکر نہ کریں' کام آپ کی مرضی کے مطابق ہو جائے گا۔''

یعقوب نے بڑے اعتماد سے کہا۔

''بس پھر تم لاہور جانے کی تیاری کرو مجھے امید ہے کہ تین چار دن میں تم لوٹ کر واپس آ جاؤ گے اور تمھارے پاس مجھے سنانے کو بہت کچھ ہوگا۔''

یعقوب نے حکم کی تعمیل میں فوراً لاہور کے لیے رختِ سفر باندھا۔ اپنے ساتھ تین چار معتبر آدمی لیے اور کچھ ضروری سامان لیا۔ کچھ کنور جہاں زیب سے ہدایات لیں اور سعدیہ جس کوٹھی

میں رہائش پزیر تھی' وہاں جال لگا دیا۔

یہ جال دراصل سعدیہ کی خفیہ نگرانی کے لیے تھا۔ کنور صاحب کی ہدایت اور حکم کے مطابق سعدیہ کی نگرانی کا جال بڑی مہارت سے پھیلا دیا گیا۔

گھر سے کالج' کالج سے گھر یا ہوٹل۔ پھر واپسی' گھر پر کون ملنے آیا اور کتنی دیر بیٹھا' پھر شام کو سعدیہ کہاں گئی' کن لوگوں سے ملی' کس کے ساتھ شام گزاری اور پھر کب گھر واپس لوٹی' گھر میں کیا ہوتا رہا' کب سوئی؟

یعقوب کو پہلے ہی دن وہ خبر ہاتھ آ گئی جس کے کنور صاحب منتظر تھے لیکن یہ خبر بہت خوفناک تھی۔ یعقوب اس خبر کو کنور صاحب تک نہیں پہنچا سکتا تھا۔ وہ کیا منہ لے کر کنور صاحب کے پاس جاتا اور انھیں کیسے بتاتا کہ ''بڑے سرکار! آپ نے مجھ سے جو جال لگوایا تھا اس میں خود میرا بیٹا ہی پھنس گیا ہے۔ اب میں کیا کروں؟ کس طرح آپ تک یہ بات پہنچاؤں؟''

لیکن اسے آیا بہت غصہ۔ ایاز اس کا اکلوتا بیٹا تھا اور وہ سراسر خودکشی کے راستے پر گامزن تھا۔ کنور صاحب جب یہ سنیں گے تو ان کے سامنے اس کی کیا عزت رہ جائے گی... وہ یہی سوچیں گے کہ یعقوب نے جائیداد ہتھیانے کے لیے یہ نمک حرامی کی ہے۔

یعقوب نے اپنے بیٹے ایاز کو ساری اونچ نیچ سمجھائی اور اسے بتایا کہ وہ جو کچھ سوچ رہا ہے وہ ہرگز نہ ہو سکے گا۔ ہاں' یہ ضرور ہو سکتا ہے کہ ہم میں سے کسی ایک کو یا شاید دونوں ہی کو اس دل دہوس کی نگری سے آزاد کر دیا جائے۔

''بیٹا' تم نے ایسا کیوں کیا' کیا سوچ کر کیا؟'' یعقوب نے جھنجلا کر کہا۔

''ابا' میں نے کسی منصوبہ بندی کے تحت ایسا نہیں کیا۔ مجھے تو معلوم بھی نہیں تھا کہ یہ کنور صاحب کی بیٹی ہے۔ جب معلوم ہوا تو میرے ہاتھ سے وقت نکل چکا تھا۔ پھر بھی میں نے اپنے بارے میں اسے سب کچھ بتا دیا تاکہ وہ دھوکے میں نہ رہے اور کل علیحدہ ہونے سے بہتر ہے' ابھی الگ ہو جائے لیکن ابا' اس نے میری کسی بات کو سنجیدگی سے سنا ہی نہیں' جیسے اس کے لیے یہ کوئی بات ہی نہ ہو۔ ابا' وہ بہت سیدھی اور سچی لڑکی ہے۔ ایسی لڑکی کے لیے جان بھی دی جا سکتی ہے۔ اور اب میں آپ کو سچ بتا دوں کہ میں اس کے لیے جان پر کھیل جاؤں گا مگر اسے تنہا نہ چھوڑوں گا۔''

''بیٹا' تو اکیلا نہیں مارا جائے گا۔ ساتھ میں' میں بھی ہوں گا' یہ یاد رکھ۔'' یعقوب نے جھلا کر کہا۔

''لیکن اس میں آپ کا کیا قصور؟''

''جابر کا کام جبر کرنا ہوتا ہے' یہ دیکھنا نہیں کہ کون قصوروار ہے اور کون بے گناہ ہے۔''

''لیکن اس وقت کنور صاحب کو جابر نہیں' منصف بننا ہوگا۔ انھیں انصاف کرنا ہوگا ایک طرف ان کے وفادار ملازم کی اولاد ہے تو دوسری طرف خود ان کی اپنی اولاد اور ان

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

دونوں میں بکنے یا ٹوٹنے والا کوئی نہیں۔"

اس بات کے بعد' اب کون سی بات رہ گئی تھی جو یعقوب اس سے کرتا۔ لاہور سے پلٹ ہوئے اس نے پہلی اور آخری بار اس موضوع پر سعدیہ سے بھی بات کی۔

"انکل!" وہ یعقوب سے مخاطب ہو کر بولی۔ "مجھے بابا جان کی ذرہ بھر پروا نہیں۔ اگر پروا ہے تو صرف ایاز کی۔ وہ زیادہ سے زیادہ یہی تو کر سکتے ہیں کہ اپنی جائیداد سے مجھے محروم کر دیں تو وہ ایسا کر دیں۔ انھوں نے پوری زندگی خواہشوں کی غلامی میں گزار دی ہے اگر میں پوری زندگی میں ایک مرتبہ اپنی خواہش کی تابع ہو جاؤں گی تو کیا گناہ کروں گی۔ بولیں انکل۔"

اس بات کے بعد' اب کون سی بات رہ گئی تھی جو یعقوب اس سے کرتا' لہٰذا اس نے بڑی خاموشی سے دونوں کو ان کے حال پر چھوڑ کر خود بھی لاہور چھوڑ دیا۔

ان تین چار دنوں میں جب یعقوب حویلی میں نہ تھا' کنور صاحب کے حکم کی تعمیل پر لاہور گیا ہوا تھا تو کنور صاحب پر جانے کیا کیا بیت گئی۔ وہ واپس آیا تو اس نے کنور صاحب کو بڑے عالم میں دیکھا۔ وہ کانپتا لرزتا حویلی میں داخل ہوا تھا لیکن کنور صاحب کی حالت دیکھ کر اسے بڑا اطمینان سا ہوا۔

کنور صاحب چار شرعی بیویوں کے شوہر رہ چکے تھے۔ ان کے علاوہ بھی انھوں نے گنت عورتیں دیکھی تھیں۔ انھوں نے زندگی میں جو چاہا وہ حاصل کر لیا تھا' سوائے جائیداد کے وارث کے۔ وارث کے معاملے میں وہ کتنے بے بس تھے' اس کا اندازہ انھیں اچھی طرح تھا۔ قدرت کے آگے کس کی پیش چلی ہے۔ وہ اگر نہ چاہے تو اس سے کوئی نہیں چھین سکتا اور دینا چاہے تو اسے کوئی نہیں روک سکتا۔

کنور صاحب کی چاروں بیویاں ایک ایک کر کے اللہ کو پیاری ہو چکی تھیں۔ اس کوٹھی حویلی میں اب ہُو کا عالم تھا۔ بیٹی بھی دو تین دن رہ کر لاہور چلی گئی تھی۔ اس کے آنے سے تھوڑی بہت رونق حویلی پر آئی تھی' وہ اس کے جاتے ہی چلی گئی۔

ایک رات سوتے سوتے کنور صاحب کی آنکھ کھل گئی۔ دل پر عجیب بے چینی' بے قراری سی طاری تھی۔ انھوں نے گھڑی میں وقت دیکھا' تین بجے تھے۔ وہ ذرا اونچے ہو کر' بیڈ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے اور چھت میں لٹکے جھلملاتے فانوس کو غور سے دیکھنے لگے۔ انھیں اندھیرے میں کبھی نیند نہیں آتی تھی۔ لہٰذا یہ فانوس رات بھر روشن رہتا تھا۔

لیکن باہر کی روشنیوں سے بھی کبھی دل کا اندھیرا دور ہوا ہے۔ دل میں روشنی تو نیکی سے پیدا ہوتی ہے۔ ان نیکیوں سے ہوتی ہے جو کر کے دریا میں ڈال دی جاتی ہیں۔ کنور صاحب نے نیکی کرنا سیکھا ہی نہ تھا' انھوں نے تو جور و ستم کرنا سیکھا تھا اور اسی کو زندگی کا شعار بنا لیا تھا۔ رات وہ سارے مظلوم ایک ایک کر کے ان کے سامنے آ رہے تھے اور ان کی پیشانی عرق آلود جا رہی تھی۔ ان کی پوری زندگی گناہوں سے بھری تھی.... اندھیروں سے بھری تھی۔ اب

اندھیرے ان کے من کے اندر دور تک اترے ہوئے تھے۔ بے قراری اور بے چینی بڑھتی ہی جاتی تھی۔ وہ اب تک قریب ہی میز پر رکھا ہوا پانی سے بھرا جگ کئی گلاسوں کی صورت میں پی چکے تھے لیکن گلے کی خشکی دور ہی نہ ہوتی تھی۔ ان کے کردہ گناہ حلق میں کانٹے بن کر چبھ رہے تھے۔ مایوسی کی کیفیت طاری تھی۔ جی چاہتا تھا کہ انھیں' کوڑا نکالیں اور آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر خود پر برسانے لگیں۔

سوچتے سوچتے فجر کا وقت ہو گیا۔ ان کے کانوں میں اذان کی آواز پڑی۔ یہ کہیں دور سے آتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔ شاید آج ہوا کا رخ حویلی کی طرف تھا۔ یہ اذان ان کے عطا کردہ لاؤڈ اسپیکر سے آ رہی تھی۔ یہ وہی لاؤڈ اسپیکر تھا جسے بخشتے ہوئے انھوں نے کہا تھا۔

"مولوی جی' اس کا رخ حویلی کی طرف نہ ہو۔"

آج اسی لاؤڈ اسپیکر سے بڑی دھیمی دھیمی اذان کی آواز آ رہی تھی۔ اور ان کا جی چاہ رہا تھا کہ یہ آواز کسی طرح تیز ہو جائے تا کہ وہ پورے سکون کے ساتھ اسے سن سکیں۔

اذان ختم ہوئی تو وہ لمحہ آ پہنچا جو ہدایت سے پُر ہوتا ہے۔ جو روشنی سے بھرا ہوتا ہے اور اس لمحے انسان کی کایا پلٹ جاتی ہے۔ اس وقت کنور صاحب کے دل میں بے اختیار نماز پڑھنے کی خواہش جاگی اور یہ خواہش اتنی تیز تھی کہ انھیں محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی کھینچ کر باتھ روم کی طرف لے جا رہا ہو۔ کہتا ہو' چلو وضو کرو۔

کنور صاحب کو یاد نہیں تھا کہ پچھلی نماز انھوں نے کب پڑھی تھی؟ شاید بچپن میں پڑھی ہو کیونکہ جب سے انھوں نے ہوش سنبھالا تھا یعنی جوان ہوئے تھے' انھوں نے کبھی نماز نہ پڑھی تھی۔ نماز پڑھنے کھڑے ہوئے تو آنکھوں سے ندامت کا چشمہ جاری ہو گیا۔ جسم پر لرزہ طاری تھا اور آنسو تھے کہ روکے نہ رک رہے تھے۔ آنسو کے ہر قطرے کے ساتھ گناہ بہہ رہے تھے۔ ظلم پگھل رہے تھے اور ان کے اندر سے ایک نیا انسان نمودار ہو رہا تھا۔

اور جب یعقوب لاہور سے واپس آیا تو اسے وہ پرانے کنور صاحب کہیں نظر نہ آئے جو ذرا سی بات پر بلکہ بات بات پر انسان کی زندگی چھین لیا کرتے تھے۔ اسے زندہ درگور کر دیتے تھے اور کبھی پشیمان نہ ہوتے تھے۔ آج وہی کنور صاحب عصر کی نماز سے فارغ ہو کر باغ میں بیٹھے کوئی دینی کتاب پڑھ رہے تھے۔ رانی حسبِ معمول ان کے قدموں میں بیٹھی تھی۔ وہ گاہے گاہے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے جاتے تھے۔ اس میز پر جس پر اس وقت جام و مینا کو ہونا چاہیے تھا' خالی پڑی تھی۔ انھوں نے شراب پینے سے توبہ کر لی تھی۔

حویلی میں داخل ہوتے ہی اسے کنور صاحب کے بارے میں ساری تفصیل معلوم ہو گئی۔ یہ سب سن کر اسے بہت خوشی ہوئی۔

کتاب پڑھتے پڑھتے جب کنور صاحب نے سر اٹھایا تو سامنے یعقوب کو کھڑا پایا۔ "ارے یعقوب' کب آئے تم؟" کنور صاحب مسکراتے ہوئے بولے۔

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

"بس ابھی آیا ہوں سرکار۔" یعقوب نے بندھے ہاتھوں کو کھولا۔

"کیا خبر لائے؟"

"سرکار! آپ کا اندازہ صحیح تھا۔ وہاں ایک لڑکا پہلے ہی روز جال میں پھنس گیا۔" یعقوب کے ہونٹوں پر خشکی آنے لگی تھی۔ سچ تو بہرحال بولنا ہی تھا۔

"کون ہے وہ؟" کنور صاحب نے دینی کتاب ایک طرف میز پر رکھ دی اور آنکھوں سے انگارے برساتے ہوئے بولے۔

"خاموش کیوں ہو' بولتے کیوں نہیں۔ کون ہے وہ لڑکا؟"

یعقوب کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس طرح اپنے بیٹے ایاز کا ذکر کرے۔ کس منہ سے بتائے کہ وہ اس کا اپنا خون ہے جس نے حویلی کی عزت پر ہاتھ ڈالا ہے۔ وہ اپنے خشک ہونٹوں پر بار بار زبان پھیر رہا تھا۔ حلق میں کانٹے سے چبھ رہے تھے۔ وہ زیادہ دیر خاموش بھی نہیں رہ سکتا تھا اور سچ کو جھوٹ بنانے کی ہمت بھی نہ تھی۔ فوراً ہی کچھ کہنا تھا' کچھ بولنا تھا۔

"سرکار' چھوٹی بیگم کو یہاں بلوا کر ان سے پوچھیں تو زیادہ بہتر ہوگا۔"

"میں نے تمہیں کس لیے بھیجا تھا! بولو؟"

"میں اپنا کام کر آیا ہوں سرکار' آپ کے لیے معلومات اکٹھا کر لایا ہوں۔ سرکار' آپ مجھے بے شک گولی مار دیں لیکن اس لڑکے کا نام مجھ سے نہ پوچھیں۔" یعقوب نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔

کنور جہاں زیب کا غصہ تب حیرت میں بدل گیا۔ "تم اس کا نام بتاتے ہوئے کیوں ڈر رہے ہو؟ کیا تمہاری اس سے کوئی رشتے داری ہے؟" انھوں نے پوچھا۔

"رشتے داری سی رشتے داری۔" یعقوب نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ اور پھر وہ کنور صاحب کے قدموں میں بیٹھ گیا۔ "سرکار' وہ میرا خون ہے۔ بدبخت وہ میرا بیٹا ایاز ہے۔ سرکار' آپ اسے معاف کر دیں۔ میں اسے سمجھاؤں گا۔"

یہ سن کر کنور صاحب کھڑے ہو گئے۔ ان کے ہاتھوں کی مٹھیاں بھنچ گئیں۔ چہرہ سرخ ہو گیا۔ لگتا تھا جیسے آتش فشاں کی طرح پھٹ پڑیں گے' لیکن وہ ضبط کر گئے۔ منہ سے ایک لفظ نہ بولے اور یعقوب کو اپنے قدموں سے ہٹا کر حویلی کے اندر چلے گئے۔

حویلی میں پہنچ کر انھوں نے کسی کو ٹیلی فون کیا اور بڑی دیر تک اسے ہدایات دیتے رہے۔ پھر ریسیور رکھ کر کرسی پر نیم دراز ہو گئے۔ ان کی پیشانی پر اب بھی سلوٹیں پڑی تھیں اور چہرے پر انتہائی سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔ کچھ دیر اسی طرح بیٹھے رہنے کے بعد انھوں نے یعقوب کو بلا لانے کا حکم دیا۔ ملازم حکم سن کر خاموشی سے کمرے سے نکل گیا۔

تھوڑی دیر بعد یعقوب نظریں جھکائے کمرے میں داخل ہوا اور ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ "جی سرکار!"

"یعقوب! کل تک تمہارے بیٹے کی لاش تم تک پہنچ جائے گی۔ تم ہمارے پرانے ملازم ہو۔ اس لیے میں نے تمہاری جان بخش دی ہے۔ ویسے تمہارے بیٹے نے ہمارے ساتھ بہت برا کیا۔ ہم نے اپنے گناہوں سے توبہ کر لی' مگر اس بدبخت نے ہمیں وہیں پہنچا دیا' جہاں سے چلے تھے۔ شاید نیکی کے یہ دو چار دن ہمیں راس نہ آ سکے۔ خیر اب تم جاؤ۔ اس بیوقوف لڑکے کی لاش کا انتظار کرو۔ اس کی تجہیز و تکفین کا انتظام کرو۔"

ایسی دلخراش بات سن کر یعقوب کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ اسے در و دیوار گھومتے ہوئے محسوس ہوئے۔ وہ چکرا کر زمین پر گرا اور بے ہوش ہو گیا۔

کنور صاحب بڑے اطمینان سے کرسی سے اٹھے۔ انھوں نے کمرے میں لگی بیل کو بجایا۔ چند لمحوں بعد ایک ملازم اندر داخل ہوا۔ "امیر خان کو بلاؤ۔" کنور صاحب نے حکم دیا۔

امیر خان بھی ان کا ایک پرانا ملازم تھا۔ وہ یعقوب کی طرح اگرچہ کنور صاحب کی ذاتی زندگی سے واقف نہ تھا لیکن اتنا اجنبی بھی نہ تھا۔ اس نے بھی کنور جہاں زیب کے لیے بہت کچھ کیا تھا۔ امیر خان کمرے میں داخل ہوا تو سب سے پہلے اس کی نظر یعقوب پر گئی۔ اسے اس طرح بے ہوش پڑے دیکھ کر وہ اندر ہی اندر بہت خوش ہوا۔

"امیر خان! یعقوب کو یہاں سے اٹھاؤ اور اتنا یاد رکھو کہ یہ کسی طرح بھی حویلی سے نکلنے نہ پائے۔ اسے کل شام تک حویلی میں روکنا ہے' سمجھ گئے میری بات۔"

"جی' سرکار سمجھ گیا۔" امیر خان یہ کہتے ہوئے جھکا۔ اس نے یعقوب کو بڑی آسانی سے اٹھا کر اپنے کندھے پر ڈالا اور کمرے سے نکل گیا۔

کوئی آدھے گھنٹے کے بعد جب یعقوب کو ہوش آیا تو اس نے خود کو امیر خان کی قید میں پایا۔ وہ ہاتھ میں ریوالور لیے بیٹھا تھا اور مسکرا رہا تھا۔

"امیر خان! اس وقت میرے بیٹے کی زندگی خطرے میں ہے۔ وہ بے قصور ہے۔ اسے کنور صاحب مروا دیں گے۔ تم مجھے یہاں سے جانے دو۔ میں تمہارا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔" یعقوب گڑگڑا رہا تھا۔ رحم کی بھیک مانگ رہا تھا مگر امیر خان مسکرا رہا تھا۔ مسکرائے جا رہا تھا۔ یکایک اس کا چہرہ سنجیدہ ہو گیا۔ اور وہ تیکھے لہجے میں بولا۔

"یعقوب' تم نے نہ جانے کتنے بے قصور لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ جانے کتنی زندگیوں کو تباہ و برباد کروا دیا۔ اس وقت تمہیں کچھ خیال نہ آیا۔ اب بیٹے کی زندگی خطرے میں ہے تو تڑپ رہے ہو۔ ارے خاموشی سے بیٹھو۔ جو ہونا ہے اسے ہونے دو۔ آخر بے قصوروں کی آہ کب تک نہ لگے گی۔"

یعقوب کو اچھی طرح اندازہ ہو گیا تھا کہ امیر خان سے کوئی درخواست کرنا پتھر سے سر ٹکرانے کے مترادف ہے۔ اس نے جو کچھ زندگی میں کیا تھا۔ اب شاید وہ بھگتنے کا وقت آ گیا تھا۔ زمانے نے جو کچھ کیا تھا' کنور صاحب کے لیے کیا تھا۔ اپنے آقا کے حکم پر کیا تھا۔ وہ تو محض کٹھ

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

تلی تھا' اسے تو اشاروں پر ناچنا ہی تھا۔

ادھر امیر خان' یعقوب کے سر پر سوار تھا تو ادھر ایاز کے سر پر موت منڈلا رہی تھی۔ جب وہ کالج جانے کے لیے ہوسٹل کے گیٹ سے باہر آیا تو گیٹ کے نزدیک کھڑی ایک گاڑی سے اس پر فائرنگ کی گئی۔ ایاز گولیاں کھا کر زمین پر گرا اور چند لمحوں میں ٹھنڈا ہو گیا۔

فائرنگ کرنے والی گاڑی ایاز کے زمین پر گرتے ہی ہوا ہو گئی اور ایک دوسری گاڑی کے نزدیک آ کر رکی۔ اس میں سے چار آدمی نیچے اترے۔ انھوں نے ایاز کو اٹھا کر گاڑی میں اور گاڑی گولی کی طرح سنسناتی سڑک پر آ گئی۔

اب اس گاڑی کا رخ نور پور کی طرف تھا۔

سہ پہر تک اس گاڑی نے ایاز کی لاش کو اس کے گھر کے آنگن میں اتار دیا اور پھر وہ کا رخ کیا۔

ایاز کے قتل کی اطلاع کنور صاحب کو فون پر مل چکی تھی۔ اب وہ بے چینی سے کمرے میں ٹہل رہے تھے اور دوسری اطلاع کے منتظر تھے۔ بالآخر گاڑی کے ساتھ ہی دوسری بھی اطلاع آ گئی کہ ایاز کی لاش اس کے گھر بہ حفاظت پہنچا دی گئی ہے۔

یہ سن کر کنور صاحب کے ہونٹوں پر ایک سفاک مسکراہٹ ابھری اور قلب میں ٹھنڈک محسوس ہوئی۔ وہ دو چار دن جن میں کنور صاحب تھوڑے بہت انسان بن گئے تھے۔ نماز پڑھنے تھے۔ شراب چھوڑ دی تھی اور وہ سب بھی چھوڑ دیا تھا... جس سے ان کی زندگی عبادت تھی اب سب پھر سے لوٹ آیا تھا۔ ان کے اندر کی درندگی کسی زخمی شیر کی طرح بپھر اٹھی تھی اور اب انھیں نہیں دکھائی دے رہا تھا' سوائے آگ اور خون کے۔

تب انھوں نے ایک ملازم سے امیر خان کو بلانے کا اشارہ کیا۔ امیر خان آیا تو انھوں نے یعقوب کو اپنے ساتھ لانے کا حکم دیا۔ تھوڑی دیر بعد یعقوب سر جھکائے کمرے میں داخل اور رحم طلب نظروں سے کنور صاحب کو دیکھنے لگا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ہو سکتا ہے' کنور صاحب اس کی وفاداری اور خدمت گزاری کے عوض اپنا فیصلہ بدل دیا ہو۔

''یعقوب' ہم نے تم سے کیا وعدہ پورا کر دیا ہے۔ اس بے وقوف لڑکے کی لاش تمھارے گھر کے آنگن میں اتار دی گئی ہے' اب تمھیں جانے کی اجازت ہے لیکن اتنا یاد رکھنا کہ اس ملک کی پولیس چوکی میری زمین پر بنی ہوئی ہے۔ میرے بارے میں کسی سے کچھ کہنا' اپنی موت کو دعوت دینا ہو گا۔ میرا خیال ہے کہ اس واقعے کو بھول جانا ہی تمھارے حق میں بہتر ہے۔ اب تم جا سکتے ہو۔ حویلی کے گیٹ پر تمھیں ایک بریف کیس مل جائے گا۔ اس میں خاصی رقم ہے' اتنی کہ تم ساری زندگی آرام سے گھر بیٹھ کر کھا سکو۔ آج سے حویلی کے دروازے تم پر بند کیے جاتے ہیں۔'' کنور صاحب نے یہ کہہ کر امیر خان کو اشارہ کیا۔ ''لے جاؤ اسے امیر خان۔''

یعقوب کی عجیب حالت تھی۔ اس کی وفاداری اور خدمت گزاری کا یہ صلہ ملا تھا۔

بیٹا موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا اور اس حویلی کے دروازے ہمیشہ کے لیے بند کر دیے گئے تھے۔ اس میں اس کا کیا قصور تھا؟ شاید یہ کہ اس نے پوری سچائی سے اپنے بیٹے کے بارے میں بتا دیا تھا۔ اگر نہ بتاتا تو بھی کنور صاحب کو کسی اور ذریعے سے پتا چل جانا تھا۔ تب شاید وہ اسے بھی زندہ نہ چھوڑتے۔

کنور جہاں زیب کے سامنے وہ کتنا بے بس تھا۔ وہ کنور صاحب جیسے ہاتھی کے سامنے کسی چیونٹی کا طرح تھا لیکن کبھی کبھی چیونٹی بھی ہاتھی کی موت کا باعث بن جاتی ہے۔

اپنے بیٹے کی لاش کو قبر میں اتارتے ہوئے اس نے قسم کھائی کہ وہ ایاز کی موت کا انتقام لے کر رہے گا' چاہے اس کی جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔

حویلی میں اب یعقوب کی جگہ امیر خان نے لے لی تھی۔ کنور صاحب اس محل نما حویلی میں تنہا رہ گئے تھے۔ امیر خان کے فرائض میں کنور صاحب کی تنہائی دور کرنا بھی شامل تھا اور وہ اس فرض کو بخیر و خوبی نباہ رہا تھا۔

کروڑوں کی جاگیر کے مالک کنور جہاں زیب کی زندگی میں سکون نہ تھا۔ ہر وقت بے چینی اور بے قراری سی رہتی۔ بعض وقت طبیعت کسی طور نہ بہلتی۔ روپے سے اگر سکون خریدا جا سکتا تو وہ دگنے معاوضے پر خرید لیتے لیکن ایسا نہیں تھا کہ سکون بکنے والی جنس نہیں۔

ایاز کے قتل کے بعد ان کی یہ بے قراری دوچند ہو گئی تھی۔ ایک طرف انھوں نے ایک روپ سے اس کا بیٹا چھینا تھا تو دوسری طرف اپنی بیٹی سے اس کا محبوب۔ ان کا خیال تھا کہ یعقوب سعدیہ کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرے گا۔ امیر خان نے اس خیال کی تائید کی تھی۔ لہٰذا فوری طور پر کنور صاحب نے دو مستعد بندے سعدیہ کی چوبیس گھنٹے حفاظت کے لیے مامور کر دیے تھے اور یعقوب کی طرف سے بطور خاص چوکنا رہنے کی ہدایت کر دی تھی۔ کنور صاحب کا حکم تھا کہ یعقوب اگر سعدیہ کی کوٹھی کے آس پاس کہیں نظر آئے تو فوراً گولی مار دی جائے۔

سعدیہ کو ایاز کے ہوسٹل سے اس کی موت کی اطلاع مل گئی تھی۔ کیونکہ اس واقعے کو کئی لوگوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ تب سعدیہ کی سمجھ میں سارا کھیل آ گیا تھا۔ وہ جان گئی تھی کہ ایاز کو قتل کروانے والا کون ہے۔ ایک بڑا جاگیردار اپنے ادنے سے ملازم کے بیٹے کو بیٹی کس طرح دے سکتا ہے آخر۔

سعدیہ نے اس حادثے کو کسی طرح سہہ لیا اور ساتھ ہی یہ بھی طے کر لیا کہ وہ اب یہاں نہیں رہے گی' امریکا چلی جائے گی اور پھر کبھی لوٹ کر نہیں آئے گی۔

یعقوب پر اگرچہ حویلی کے دروازے بند کر دیے گئے تھے لیکن اسے اندر جانے سے روکنے والا کوئی نہ تھا۔ معطل ہو جانے کے باوجود حویلی کے ملازمین کی ہمدردیاں اس کے ساتھ تھیں... ان ملازمین سے وہ ہمیشہ اچھی طرح پیش آیا تھا۔ تقریباً سبھی پر اس کے کچھ نہ کچھ احسانات تھے۔ لہٰذا ایک دن وہ ہلاکت خان سے ملنے کے بہانے حویلی میں داخل ہو گیا۔

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

یہ وہ وقت تھا جب رانی کو گوشت کھلانے کے لیے کنور صاحب کے پاس لے جایا
تھا۔ رانی پنجرہ گاڑی میں بند تھی۔ کچھ دیر بعد پنجرہ گاڑی کو حویلی کی طرف دھکیلتا تھا اور یعقوب
اچھی طرح سوچ لیا تھا کہ اس نے کیا کرنا ہے۔

ادھر کنور صاحب بڑے مضبوط قدموں سے چلتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے
خان پیچھے پیچھے تھا۔ کنور صاحب آگے بڑھ کر اس اونچی کرسی پر براجمان ہو گئے جو کمرے
درمیان پڑی تھی۔ ''رانی کو بلاؤ۔'' کنور صاحب نے بڑے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے حکم

امیر خان بڑا دروازہ کھولنے کے لیے بڑی تیزی سے بڑھا۔ تب ہی کمرے کے
ایک فائر کی آواز سنائی دی۔ امیر خان نے جلدی سے دروازہ کھولا تو رانی دہاڑتی ہوئی کمرے
داخل ہوئی۔ اس کمرے میں داخل ہوتے ہی دروازہ باہر سے بند ہو گیا۔

کنور صاحب گھبرا کر کرسی سے کھڑے ہو گئے۔ وہ ابھی صرف اتنا ہی دیکھ پائے تھے
رانی کی ایک آنکھ سے خون بہہ رہا ہے کہ وہ دہاڑتی ہوئی کنور صاحب پر حملہ آور ہوئی اور دیکھتے
دیکھتے اس نے کنور صاحب کو چیر پھاڑ کر رکھ دیا۔ امیر خان نے چھوٹے دروازے سے جو حویلی
کھلتا تھا' بھاگنے کی کوشش کی لیکن رانی نے اسے پیچھے سے دبوچ لیا۔ اور اس کی گردن منہ میں
کر ایک جھٹکے سے توڑ دی۔ امیر خان رشتہ جاں سے چھوٹا۔ کنور صاحب پہلے ہی ایک کونے
ادھڑے پڑے تھے۔ حالت رانی کی بھی اچھی نہ تھی۔ اس پر گولی بہت قریب سے چلائی گئی تھی
اس کی آنکھ پھوڑتی ہوئی کھوپڑی سے نکل گئی تھی۔ وہ اب جھوم رہی تھی۔ جیسے نشے میں ہو۔ وہ
امیر خان کی لاش کو بھنبھوڑتی تھی تو کبھی کنور صاحب کے جسم کو کھینچنے لگتی تھی۔ قدم کسی طرف اٹھانا
تو پڑتا کہیں اور تھا۔ آخر وہ چکراتی ہوئی زمین پر گری اور وہیں ڈھیر ہو گئی۔ کمرے میں سناٹا
گیا۔

پانچ دس منٹ مزید گزرنے کے بعد یعقوب نے باہر سے دروازہ کھولا۔ اس کے
میں ریوالور تھا اور اس کا نشانہ بڑا سچا تھا۔ وہ ہر طوفان کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار تھا لیکن
صورتِ حال بڑی اطمینان بخش تھی۔ کنور صاحب اور امیر خان کی لاشیں ادھڑی پڑی تھیں
خون میں لت پت بے جان اپنے آقا کے برابر لیٹی تھی۔

تینوں لاشوں کو دیکھ کر یعقوب کے چہرے پر طمانیت آ گئی۔ اس نے فوراً ہی
دروازہ بند کر دیا اور ہلاکت خان کو اپنے ساتھ چلنے کے لیے کہا۔ یعقوب اس حویلی کے چپے
سے واقف تھا۔ اسے تہ خانے کا راز بھی معلوم تھا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ کہاں زیورات' کرنسی
جواہرات اور سونا رکھا ہے۔

اس نے پورے اطمینان سے ایک بریف کیس میں قیمتی اشیاء بھریں۔ ایسی اشیا
وزن میں کم اور قیمت میں زیادہ ہوں۔ تہ خانے سے نکل کر دونوں نے حویلی چھوڑنے کا فیصلہ
انھوں نے لوٹ کا مال ایک جیپ میں ڈالا اور حویلی سے نکلنے لگے۔

ابھی ان کی جیپ حویلی کے بڑے گیٹ کے نزدیک پہنچی تھی کہ انھوں نے اچانک
فائرنگ کی آواز سنی۔ فائرنگ کے ساتھ ہی دونوں محافظوں کو زمین پر تڑپتا پایا۔ یعقوب نے جیپ کو
فوراً بریک لگائے اور ریوالور جیب سے نکال لیا۔

اب فائرنگ کرنے والے سامنے آ چکے تھے۔ وہ جیپ پر سوار تھے اور تعداد میں چار
تھے۔ ان کے ہاتھ میں جدید اسلحہ تھا۔ ایک ریوالور ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ پھر بھی یعقوب نے
ہمت نہ ہارتے ہوئے ایک فائر کیا لیکن ہلاکت خان کی کہنی لگنے سے اس کا ہاتھ ہل گیا اور اس کا
نشانہ خطا گیا۔

بس پھر اس کے بعد اسے دوسرا فائر کرنے کی مہلت نہ ملی۔ گولیاں ان پر بارش کی
بوندوں کی طرح برسیں۔ وہ دونوں گاڑی میں ہی ڈھیر ہو گئے۔ یعقوب نے مرتے مرتے ان
چاروں ڈاکوؤں میں سے ایک کو پہچان لیا تھا اور حیران رہ گیا تھا۔ وہ کوثر یعنی چھوٹی بیگم کا بڑا بھائی
محمود تھا۔ محمود نے اسی دن جس دن کوثر کی میت گھر آئی تھی' حویلی میں ڈاکا ڈالنے کا ارادہ کر لیا تھا۔
پھر اس نے اپنے ساتھیوں کو اکٹھا کیا اور جدید ہتھیاروں سے لیس ہو کر یہاں آ گیا اور اسے وہ
سب کچھ حویلی کے باہر ہی جیپ میں مل گیا جس کی تلاش میں وہ یہاں تک آیا تھا۔ اس نے سارا
مال اپنے قبضے میں کیا اور اپنے ساتھیوں کو وہاں سے نکل چلنے کا اشارہ کیا۔

چند لمحوں بعد ہی ان کی جیپ حویلی کو پیچھے چھوڑ گئی۔

آج حویلی کے ملازمین پر بڑی افتاد پڑی تھی۔ پہلے انھیں رانی کے دہاڑنے کی آوازیں
سنائی دی تھیں' اس کے آدھے گھنٹے کے بعد حویلی کے باہر گولیوں کی تڑتڑ چلنے کی آوازیں آئی تھیں۔
وہ سب گھبرا کر باہر نکل آئے تھے اور باہر کا نقشہ دیکھ کر حیران رہ گئے تھے۔ گیٹ پر دو محافظ مردہ
پڑے تھے تو جیپ میں یعقوب اور ہلاکت خان کی لاشیں ان کا منہ چڑا رہی تھیں۔

ابھی وہ ملازمین صورتِ حال کو سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے کہ سعدیہ کی گاڑی گیٹ میں
داخل ہوئی اور وہیں رک گئی۔

سعدیہ نے امریکا جانے کا حتمی فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ اب کنور جہاں زیب سے آخری مرتبہ
ملنے آئی تھی۔ انھیں بتانے آئی تھی کہ وہ کیسے باپ ہیں' کیسے انسان ہیں۔ لوگ ان کے بارے میں
کیا سوچتے ہیں۔ کیا کہتے ہیں۔ اللہ کی اس زمین کو انھوں نے اپنی جاگیر سمجھ لیا ہے اور اس زمین پر
بسنے والوں کو غلام خیال کر لیا ہے۔ فرعون بن گئے ہیں۔ انھوں نے کیا بویا ہے اور کیا کاٹ رہے
ہیں۔ اس کے ذہن میں بہت کچھ تھا۔ ایک لاوا تھا جو اس کے ذہن میں پک رہا تھا۔ وہ پھٹ پڑنا
چاہتی تھی۔ وہ پھٹ پڑنے کے لیے یہاں آئی تھی لیکن یہاں تو ڈراپ سین ہو چکا تھا۔ اس کے اسٹیج
پر آنے سے پہلے ہی پردہ گر گیا تھا۔

تب اس نے امریکا جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ وہ جس سے بھاگ رہی تھی' اب وہ خود ہی
سفر ہو گیا تھا۔ کنور جہاں زیب جو اس کا باپ تھا' دراصل وہ ایک بُرا عہد تھا' بُرا زمانہ تھا۔ اب

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

یہ عہد یہ بُرا زمانہ ختم ہو گیا تھا۔

تب سعدیہ نے اپنے لوگوں کو جو اس کے باپ کی نظر میں غلام تھے اکٹھا کر کے یہ بات سنائی۔

"یہ دور تک پھیلی ہوئی زمین جس پر میرا باپ قابض تھا' جسے وہ اپنی کہتا تھا اور اسی لئے میں انسان کو انسان نہ سمجھتا تھا۔ اس پر اکڑ کر چلتا تھا' اب تم لوگوں کی ہے۔ میں اس حویلی میں ایک کالج کھولوں گی۔ ایک اسپتال قائم کروں گی اور خود بھی حویلی کے ایک کونے میں رہوں گی۔ اب میں کہیں نہیں جاؤں گی۔ یہیں رہوں گی۔ آپ لوگوں کے ساتھ' آپ لوگوں میں۔"

اس کے اس اعلان پر دیر تک اور دور تک تالیاں بجتی رہیں۔

☆.....☆.....☆

بے خبر

یہ نکاح کی ایک سادہ سی تقریب تھی۔

اس تقریب میں شریک لوگوں کو انگلیوں پر گنا جا سکتا تھا۔ سب لوگ بڑے دھیمے لہجے میں بات کر رہے تھے جیسے یہ شادی کی تقریب نہ ہو' کوئی مر گیا ہو۔ فضا میں بڑے اسرار چھپے تھے۔ سب ڈرے ڈرے سے بیٹھے تھے۔ دلوں میں یہ خوف بیٹھا ہوا تھا کہیں کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے۔

اس تقریب نکاح میں دولہا والوں کی طرف سے محض دو آدمی تھے اور وہ دونوں دولہا کے بہت اچھے دوست تھے دونوں سے رازداری کی پوری توقع تھی۔ وہ دونوں فرشتوں کی طرح دولہا کے دائیں بائیں کندھوں پر سوار تھے۔ بیٹھے تو وہ دونوں صوفے پر ہی تھے لیکن دولہا کا قد اتنا چھوٹا تھا کہ وہ دونوں بیٹھنے کے بجائے سوار محسوس ہو رہے تھے۔

دولہا کے قد کے بارے میں بہت سے لطیفے مشہور تھے۔ ان مشہور لطیفوں میں سے ایک لطیفہ کچھ زیادہ ہی شہرت پا گیا تھا۔ لطافت علی اپنے علاقے کے مشہور آدمی تھے۔ چرب زبانی ان کی وجہ شہرت تھی اور چھوٹا قد ان کی پہچان تھا۔ پیسے والے آدمی تھے۔ اس لئے انہیں ہر جگہ خوش آمدید کہا جاتا تھا۔

بلدیاتی انتخابات میں یار لوگوں نے انہیں بھی کھڑا کر دیا۔ انہوں نے آزاد امیدوار کی حیثیت سے انتخاب لڑا اور اپنی مقبولیت کے زعم میں کہیں کے نہ رہے' انہیں صرف ایک ووٹ ملا اور یہ ووٹ بھی ان کا اپنا تھا۔ یار دوستوں کی بات تو دوسری ہے انہیں ان کی اپنی بیٹیوں نے بھی ووٹ نہ دیا۔

الیکشن میں جلسے جلوسوں کی اجازت نہ تھی' بس کارنر میٹنگز ہو رہی تھیں۔ ایسی ہی ایک میٹنگ میں وہ تقریر کرنے کھڑے ہوئے' بولے "بھائیو اور بہنو"۔

"لطافت علی صاحب! ادھر بہن کوئی نہیں' سب بھائی ہیں" فوراً ایک آواز آئی۔

لطافت علی نے فوراً آنکھیں پھاڑ کر چاروں طرف دیکھا واقعی وہاں کوئی عورت نہ تھی۔ وہ محض روانی میں بہنوں سے مخاطب ہو گئے تھے۔ تب انہوں نے اپنے ایک سرگرم رکن کو اپنے پاس بلا کر اس کے کان میں ڈانٹتے ہوئے بولے "ابے' عورتیں کہاں ہیں؟"

"عورتیں گھروں میں ڈراما دیکھ رہی ہیں۔ میں نے آپ سے پہلے ہی کہا تھا کہ میٹنگ

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

نو بجے کے بعد رکھیں لیکن آپ مانے ہی نہیں"۔

"اچھا..... اچھا کوئی بات نہیں' میں ان عورتوں کے مردوں سے ہی گفتگو کے لیے جاتا ہوں' یہ جا کر اپنی عورتوں کو سمجھا دیں گے۔"

پھر لطافت علی نے اپنا گلا صاف کیا اور نئے سرے سے تقریر شروع کی "ہاں" تو میرے پیارے بھائیو! آپ جانتے ہیں کہ میں ایک آزاد امیدوار کی حیثیت سے الیکشن لڑ رہا ہوں' جانتے ہیں کیوں؟"

"یہ ہم بعد میں پوچھیں گے کیوں' فی الحال تو ہمیں آپ کی شکل نہیں دکھائی دے رہی۔ براہ کرم کھڑے ہو کر تقریر کیجئے" کسی نے کہا۔

"بھائی" میں کھڑا ہوا ہوں۔ لطافت علی نے بڑی مسکین صورت بنا کر کہا۔

"ہمیں نظر نہیں آ رہے' ایسا کریں' اسٹول پر کھڑے ہو جائیں" ادھر سے فرمائش ہوئی۔

"یار میں! اسٹول پر ہی کھڑا ہوں" ادھر سے جواب ملا۔

ان کے چھوٹے قد سے متعلق یہ لطیفہ اتنا چلا کہ وہ ہار کر بیٹھ گئے لیکن بہت دنوں تک یہ کے کانوں میں آوازیں آتی رہیں" اسٹول پر کھڑے ہو جاؤ۔

لطافت علی کا قد ہی چھوٹا نہ تھا' رنگ بھی کالا تھا۔ رنگ گورا کرنے والی کریم استعمال کر کے انہوں نے دل کی حسرت نکال لی تھی لیکن ان کا سیاہ رنگ ٹس سے مس نہ ہوا تھا۔

خیر سے ان کا رنگ ہی کالا نہ تھا بلکہ چہرے پر اتنے موٹے موٹے مہاسے تھے کہ انہیں رندے سے چھیل کر برابر کرنے کو جی چاہتا تھا۔ وہی لطافت علی اس وقت شرمائے ہوئے بیٹھے تھے۔

قاضی نے جب نکاح نامہ پر کرتے ہوئے ان سے ان کی عمر پوچھی تو انہوں نے از راہ مذاق کہا۔ "ابھی تو میں جوان ہوں"۔

"جی ہاں' وہ تو نظر آ رہے ہیں" قاضی نے سنجیدگی سے کہا۔ مجھے عمر بتایئے تاکہ نکاح نامہ مکمل ہو۔"

"پینتالیس سال" لطافت علی نے جھجکتے ہوئے کہا۔

قاضی نے ایک نظر ان کے چہرے کی طرف دیکھا' تھوڑا سا مسکرایا پھر ان کی بتائی ہوئی عمر نکاح نامے میں درج کر دی۔ قاضی کی عقابی نگاہوں نے پہچان لیا تھا کہ دولہا میاں نے اپنی عمر میں صرف دس سال کی ڈنڈی ماری ہے۔ دلہن کی عمر پچیس سال لکھائی گئی تھی' اگر لڑکی کی عمر پندرہ سال تصور کر لی جائے تو دولہا' دلہن کی عمروں میں صرف پچیس سال کا فرق تھا۔ قاضی صاحب کی سمجھ میں یہ بات بالکل نہیں آ رہی تھی کہ آخر یہ بے جوڑ شادی کس مجبوری کے تحت ہو رہی ہے۔ دولہا کے مقابلے میں کافی عمر کی تھی جبکہ دولہا نہ صرف معمر تھا بلکہ شکل بھی بہت مشکل تھی۔ پھر تقریب بھی انتہائی سادگی سے ہو رہی تھی دولہا کی طرف سے اگر اس کے دو دوست شامل ہوئے

تھے تو لڑکی والوں کی طرف سے بھی گھر کے لوگوں کے علاوہ کوئی نہ تھا۔ قاضی صاحب نے پھر اپنے بوڑھے دماغ پر زیادہ زور نہ دیا' انہیں کیا' انہیں تو اپنی فیس سے سروکار تھا اور فیس یہاں سے کچھ زیادہ ہی ملنے کی توقع تھی۔

نکاح نامہ پر کر کے انہوں نے ایجاب و قبول کروایا نکاح کے بعد حاضرین کے چہروں پر رونق آئی' ہونٹ مسکرائے' مبارک سلامت کا شور اٹھا۔ لطافت علی کے دوستوں نے اسے دبا دبا کر مبارک باد دی۔

دس پندرہ منٹ کے بعد منی بارات' کو کھانا کھلایا گیا اور بعد طعام دلہن کو ایک سوٹ کیس کے ساتھ رخصت کر دیا گیا۔ لطافت علی بڑی سادگی سے آیا تھا۔ اس کے سر پر سہرا نہ تھا بلکہ ٹوپی بھی نہ تھی گلے میں گلاب کے پھولوں کا ایک ہار پڑا تھا۔ یہی ہار اس کے دولہا ہونے کی نشاندہی کر رہا تھا۔ رخصت ہوتے وقت اس نے یہ ہار اپنے گلے سے اتار کر گاڑی کی پچھلی نشست پر ڈال دیا۔

دلہن آسیہ پورے میک اپ میں تھی۔ لال جوڑا زیب تن کر رکھا تھا وہ گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھنے کے بجائے اگلی سیٹ پر بیٹھی۔

دلہن کے گاڑی میں بیٹھنے کے بعد لطافت علی کے دوستوں نے نیک خواہشات کا اظہار کیا اور اس سے جانے کی اجازت چاہی "اچھا' بھئی لطافت' اب ہم چلتے ہیں"

"اچھا یار تم لوگوں کا بہت شکریہ"

"ارے' فضول باتیں نہ کرو' جاؤ گاڑی میں بیٹھو اور گھر جاؤ" ایک دوست بولا۔

"ہاں' رات کو کوئی مسئلہ ہو تو مجھے بلا جھجک فون کر لینا' میں فوراً حاضر ہو جاؤں گا دوسرے دوست نے ہنستے ہوئے کہا۔

"جی' بہت بہتر جناب" لطافت علی نے خوش دلی سے دونوں سے ہاتھ ملایا اور دروازہ کھول کر گاڑی میں آ بیٹھا۔ اس نے گہری نظر سے اپنے برابر بیٹھی ہوئی آسیہ کو دیکھا۔ آسیہ اسے دیکھ کر مسکرائی۔ لطافت علی نے گاڑی میں بیٹھے بیٹھے آسیہ کے گھر کے لوگوں سے ہاتھ ملایا اور گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

گاڑی کا رخ شہر کے ایک اچھے ہوٹل کی طرف تھا۔

☆.....☆.....☆

لطافت علی کو گھر سے نکلے ہوئے دس دن ہو چکے تھے۔ اس کا کہیں پتا نہ تھا۔ گھر میں دو لڑکیاں تھا تھیں اور پریشان تھیں۔ لطافت علی نے جاتے ہوئے نہ تو اپنی بیٹیوں کو کچھ بتایا تھا نہ دفتر والوں کو کچھ معلوم تھا۔ دفتر والے روز گھر ٹیلی فون کر کے اس کے بارے میں پوچھتے تھے۔ "آئے صاحب"؟

اور وہ دونوں دفتر ٹیلی فون کر کے پوچھتی تھیں "ڈیڈی کا کچھ پتا چلا؟"

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

دونوں طرف سے جواب نفی میں ملتا تو ہر طرف مایوسی پھیل جاتی۔

"اری صابرہ"۔

'ہاں بھئی بابرہ"۔

"یہ ڈیڈی آخر کدھر غائب ہو گئے؟"

"میرا خیال ہے کہ ناراض ہو کر چلے گئے"

"کس سے"

"تجھ سے"

"وہ کیوں"؟

"تو ہر وقت فرمائشیں کرتی رہتی تھی نا' ڈیڈی یہ لا دیں' وہ لا دیں۔"

"اری چل تو تو بے وقوف ہے' ہمارے باپ کے پاس پیسے کی کیا کمی ہے' وہ تو پیسے خرچ کرنے کے بہانے ڈھونڈتے ہیں"۔

"اری کہیں انہیں کسی نے اغوا تو نہیں کر لیا؟"

"یہ خیال بھی غلط ہے۔"

"وہ کیسے؟"

"وہ ایسے کہ اگر انہیں کسی نے اغوا کیا ہوتا تو اب تک گھر پر تاوان وصول کرنے کی چٹھی آ گئی ہوتی۔"

"ہاں' یہ بھی ٹھیک ہے"

"کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ ملک چھوڑ کر چلے گئے ہوں۔"

"وہ کیوں؟"

"وہ اس لئے کہ انہوں نے سرمایہ تو اچھا خاصا اکٹھا کر لیا ہے' اب بھی لوگ دفتر میں اپنا روپیہ جمع کرانے آ رہے ہیں۔ انہوں نے سوچا ہو کہ پیسے تو اب ٹھیک ٹھاک جمع کر لئے ہیں' اب یہاں سے نکل بھاگنا چاہئے۔"

"ہم اس گھر میں اکیلے کس طرح رہیں گے۔ اکیلے رہتے ہوئے ہمیں دس دن تو ہو گئے' سچی بھئی مجھے رات کو بہت ڈر لگتا ہے۔ اب ڈیڈی کا تو کچھ پتا نہیں' کب آئیں۔ ہم کیوں نہ حیدر آباد ماموں کے گھر چلے جائیں۔"

"اری' کیا فضول باتیں کرتی ہے' ہم اپنا گھر چھوڑ کر کہیں نہیں جائیں گے اور ڈر کس بات کا کیا گھر میں عورتیں تنہا نہیں رہتیں؟"

"ہم عورتیں نہیں' لڑکیاں ہیں اور اس معاشرے میں لڑکیاں تنہا نہیں رہ سکتیں۔"

"اگر ڈیڈی گھر واپس نہ لوٹے تو؟"

"ارے تیرے منہ میں خاک' ایسا تو نہ بول۔"

"مجھے غصہ آ رہا ہے ڈیڈی نے آخر یہ کیا مذاق کیا ہے' کہیں جانا تھا تو چلے جاتے' پر کہہ کر تو جاتے۔ انہوں نے یہ بھی نہ سوچا کہ گھر پر لڑکیاں اکیلی رہ جائیں گی۔"

"مجھے تو رونا آ رہا ہے۔"

"کس پر؟ ڈیڈی کے گم ہونے پر یا اپنی قسمت پر؟"

"تجھ پر"

"مجھ پر کیوں؟"

"مجھے اتنی دیر سے بھوک لگ رہی ہے اور تو کھانے کو پوچھتی نہیں۔"

"بھوک لگی ہے تو چل' کچن میں چل"

"اری صابرہ"

"بس' اب میں تیری کوئی بکواس نہیں سنوں گی' اب تو چل کر کھانا کھا"

"میں نہیں کھاتی' مجھے ڈیڈی یاد آ رہے ہیں"۔ یہ کہہ کر اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

☆.....☆.....☆

گیارہویں دن لطافت علی اور آسیہ ہنی مون کاٹ کر ہوٹل سے باہر نکلے' پھر وہ دونوں گاڑی میں بیٹھ کر گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ گھر جاتے ہوئے وہ کچھ خوفزدہ سے تھے۔ اندر ہی اندر ڈر رہے تھے۔ ایک مجرمانہ سا احساس ان کے دل پر چھایا ہوا تھا۔ وہ دس دن سے گھر سے غائب تھے۔ ان کی جوان بیٹیاں گھر پر تنہا تھیں۔ تنہائی کا احساس الگ' باپ کی گمشدگی کا احساس الگ' جانے انہوں نے کس طرح چین پایا ہوگا۔ دفتر والوں کو تو لطافت علی نے فون پر بتا دیا تھا کہ وہ کہاں ہے لیکن اس نے ساتھ ہی یہ تاکید کر دی تھی کہ صابرہ اور بابرہ کو کچھ نہ بتایا جائے لہذا دفتر والے وفا داری نبھاتے ہوئے صابرہ اور بابرہ کو کچھ نہ بتانے کے بجائے الٹا انہی سے پوچھتے رہے' صاحب آئے؟ دس دن تک لطافت علی کو کچھ ہوش نہ رہا کہ وہ کہاں ہے' بس اس کی نئی نویلی دلہن تھی اور وہ تھا اب ہوٹل سے نکل کر سڑک پر آیا تو اسے احساس ہوا کہ وہ اپنی بیٹیوں کا مجرم ہے۔

صابرہ اور بابرہ کی ماں کو مرے ہوئے ایک سال بھی نہ ہوا تھا' اس کی برسی بھی نہ منائی گئی تھی کہ باپ نے شادی کر کے اپنی زندگی میں چراغاں کر لیا۔ اس کی پہلی بیوی شمسہ نے لطافت علی کا زندگی میں ہر طرح ساتھ دیا۔ شادی ہوئی تو لطافت علی تھا ہی کیا۔ ایک سرکاری محکمے میں کلرک تھا۔ ایک کلرک کی تنخواہ چھلنی کی طرح ہوتی ہے جو گھر پہنچتے پہنچتے ختم ہو جاتی ہے۔ بہر حال' اسی تنخواہ میں شمسہ نے برسوں گزارے اور کبھی حرف شکایت زبان پر نہ لائی۔ شادی کے تقریباً دو سال بعد صابرہ اور بابرہ نے جنم لیا۔

دونوں جڑواں بہنیں تھیں۔ صابرہ اور بابرہ کی عمروں میں محض چار منٹ کا فرق تھا۔ صابرہ' بابرہ سے چار منٹ بڑی تھی۔ ان جڑواں لڑکیوں کے بعد [illegible] دو سال کے وقفے سے اور

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہوئے لیکن دونوں ہی زندہ نہ رہے۔ ایک چھ ماہ کا ہو کر مرا تو دوسرا نو ماہ کا ہو کر۔ ان چار بچوں کے بعد جیسے تالا بندی ہو گئی۔ باوجود خواہش کے کوئی بچہ نہ ہوا۔ صابرہ اور بابرہ بھائی کے لئے ترستی رہ گئیں۔ شمسہ اور لطافت علی بیٹے کے وجود کے لئے تڑپتے رہ گئے۔

لطافت علی ہمیشہ کا چرب زبان آدمی تھا۔ چیتوں کو دوست بنا لینا اس کے بائیں ہاتھ کا کمال تھا۔ بڑی لچھے دار گفتگو کرتا تھا۔ زیادہ پڑھا لکھا نہ تھا لیکن لگتا تھا۔ وہ ہمیشہ کمانے کے دھندے سوچتا رہتا تھا۔ پیسہ پاس نہ ہونے کے باوجود وہ کچھ نہ کچھ کرتا رہتا تھا۔ آمدنی بڑھے نہ بڑھے بہر حال' اس کا تجربہ بڑھتا رہتا تھا۔ پھر اس نے سارے دھندے چھوڑ کر چھوٹی چھوٹی بچتیں ڈالنے کا کام شروع کیا۔ آہستہ آہستہ اس نے اس کمیٹی کے دھندے کو سو ممبروں تک وسیع کر دیا۔ جو رقم جمع ہوئی اس سے اس نے ایک دکان کرائے پر حاصل کی اور قسطوں پر سامان دینے کا کاروبار شروع کر دیا۔ یہ کاروبار خوب چمک اٹھا۔ ملازمت چھوڑ کر اس نے پوری تندہی سے کام کیا۔ دوست احباب کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے سرمایہ جمع کرنا شروع کر دیا اور دو تین سال کے عرصے میں ایک کروڑ سے زائد رقم اکٹھا کر لی۔ وہ اپنے شراکت داروں کو پانچ فیصد منافع دیتا تھا۔ جب کہ وہ خود اس رقم سے دس فیصد منافع حاصل کرتا تھا۔ یہ رقم اس نے اسمگلروں کے ایک سنڈیکیٹ میں لگا رکھی تھی۔

جب پیسے کی ریل پیل ہوئی تو لطافت علی کی آنکھوں میں نشہ چڑھنے لگ۔ خوبصورت دفتر میں اس نے کئی حسین لڑکیاں ملازم رکھیں اور ان میں سب سے خوبصورت لڑکی کو اپنی سیکرٹری بنا لیا دفتر میں تو خیر وہ اس کو لئے بیٹھے ہی رہتے تھے پھر اسے لے کر باہر بھی نکلنے لگے۔ ایک دن شمسہ کی کسی رشتے دار نے لطافت علی کو اپنی سیکرٹری کے ساتھ شاپنگ کرتے دیکھ لیا۔ رشتے دار خاتون شمسہ کی دور کی خالہ لگتی تھیں۔ انہیں اکٹھا دیکھ کر ان کے پیٹ میں بڑے زور کا درد اٹھا۔ وہ بھاگی بھاگی شمسہ کے پاس پہنچیں اور بڑی راز داری سے بولیں "اللہ جھوٹ نہ بلوائے"۔

"کیا ہوا خالہ" اللہ بھلا تم سے کیوں جھوٹ بلوائے گا" شمسہ نے ہنس کر کہا۔

"ہائے' میں کیسے کہوں' آج میں نے طارق روڈ پر کیا دیکھا" خالہ سیدھی طرح بتانے کو تیار نہ تھیں۔

"کیا دیکھا خالہ' آخر کچھ کہو تو؟" شمسہ کا دل اچھلنا شروع ہوا

"میں نے لطافت میاں کو دیکھا' ایک زیورات کی دکان پر" آہستہ آہستہ راز سے پردہ سرکنا شروع ہوا۔

"ہاں' وہ میرے لئے نیکلس لینے گئے ہوں گے' میں نے ان سے کہا تھا لانے کو"

"کیا تم نے کوئی لڑکی بھی بھیجی تھی ان کے ساتھ؟" خالہ نے گویا دھماکا کرنے کی کوشش کی۔

"ارے خالہ' کیسی بات کرتی ہو' میں کیوں بھیجتی کیا ان کے ساتھ کوئی لڑکی تھی؟"

"ہاں' ایک لڑکی تھی' بڑی خوبصورت' صابرہ سے ایک دو برس بڑی ہو گی۔ وہ بڑی اٹھلا اٹھلا کر انہیں زیور پہن کر دکھا رہی تھی' خالہ یہ کہہ کر چند لمحوں کے لئے رکیں۔ شاید شمسہ کے تاثرات دیکھنا چاہتی تھیں۔ یہ سن کر شمسہ کی آنکھوں میں اندھیرا چھانے لگا لیکن اس نے فوراً اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ مضبوط بنی بیٹھی رہی "بیٹی! اس کا خیال رکھ۔ اچھا' اب میں چلتی ہوں" وہ بم گرا کر اٹھ گئیں۔

خالہ کے جانے کے بعد شمسہ جہاں بیٹھی تھی' وہیں لیٹ گئی اور سسک سسک کر رونے لگی۔

شمسہ نے لطافت علی سے اس مسئلے پر کبھی گفتگو نہ کی لیکن شوہر کی بے وفائی نے اسے کہیں کا نہ رکھا' وہ بڑی ہنس مکھ عورت تھی لیکن اس غم نے اسے دیمک کی طرح چاٹ لیا۔ وہ آئے دن بیمار رہنے لگی۔ شمسہ کی بیماری نے لطافت علی کو اس سے دور اور سیکرٹری کے قریب کر دیا۔ وہ شوہر کے بدلتے تیور دیکھتی رہی اور برداشت کرتی رہی۔ آخر کار اس کا دل جواب دے گیا۔

شمسہ کی موت نے لطافت علی کا مسئلہ اور آسان کر دیا۔ شادی کرنے کا جواز ہاتھ آ گیا اور اس طرح لطافت علی نے اپنی سیکرٹری سے شادی کر لی اور اس وقت وہ اسے ساتھ لئے گھر کی طرف بڑھ رہا تھا۔

وہ گھر جا تو رہا تھا لیکن ساتھ ہی خوفزدہ بھی تھا۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ صابرہ اور بابرہ آسیہ کو اپنی ماں تسلیم نہیں کریں گی۔ شادی سے پہلے لطافت علی نے یوں ہی اپنی بیٹیوں کا عندیہ لینے کے لئے کسی دوست کے حوالے سے اپنی شادی کا ذکر کیا تھا۔

"وہ بے وقوف ستار ہے نا لطافت علی نے بات کی ابتدا کی" "ہاں ڈیڈی' وہ آپ کے دوست۔"

"ہاں' وہی۔ آج مجھ پر بڑا زور دے رہا تھا کہ لطافت علی' دوسری شادی کر لو"۔

"اری صابرہ!" بابرہ نے اسے چونکایا۔

"سن رہی ہوں بھئی" صابرہ بولی۔

"یہ اپنے ڈیڈی کے دوست کیسے ہیں جو انہیں اس عمر میں شادی کا مشورہ دے رہے ہیں۔ ڈیڈی! آپ اس چکر میں مت پڑیئے گا' وہ تو ایسے ہی بکواس کیا کرتے ہیں" بابرہ بولی۔

"ڈیڈی! ہماری ایک ہی ماں تھی جو اب مر چکی ہے" صابرہ نے فیصلہ سنایا۔

"اب کسی اور ماں کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے" بابرہ نے اس فیصلے پر مہر ثبت کی۔

"ارے بیٹا' تم پریشان نہ ہو' یہ تو میں تمہیں ستار کی بات بتا رہا تھا' میرا شادی وادی کا کوئی ارادہ نہیں' مجھے تو اب تم دونوں کی فکر ہے" یہ سفید جھوٹ تھا جو اس نے اپنی بیٹیوں سے بولا تھا۔ اسے اپنی بیٹیوں کی قطعاً کوئی فکر نہ تھی' اسے محض اپنی فکر تھی' اس لئے اس نے بڑی راز داری سے شادی کر لی تھی۔

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

"آسیہ!" لطافت علی اس کی طرف دیکھے بغیر بولا۔

"جی" آسیہ نے اس کی طرف دیکھا۔

"تم مجھ سے ایک وعدہ کرو"۔

"آپ مجھ سے وعدہ نہ لیں' مجھے حکم دیں' میں آپ کی بیوی ہوں' آپ کی کنیز ہوں"۔

"بس' اسی فرماں برداری نے تو مجھ سے میرا آپ چھین لیا ہے"

"آپ مجھ سے کیا کہنا چاہ رہے تھے؟"

"ہاں' میں یہ کہنا چاہ رہا تھا صابرہ اور بابرہ کا خاص خیال رکھنا ہوگا۔ وہ دونوں ٹر
بہت ہیں' منہ پھٹ بھی ہیں' وہ میرے سامنے بھی کچھ کہنے سے نہیں چوکتیں' تمہیں ان کے لئے
اپنے دل میں وسعت پیدا کرنا ہوگی۔ وہ میری بہت چہیتی بیٹیاں ہیں' تمہیں ان کی سگی ماں بننا ہوگا"
لطافت علی نے سمجھایا۔

"آپ فکر نہ کریں' آپ کو اس سلسلے میں کبھی شکایت کا موقع نہیں ملے گا"

"شاباش آسیہ..... شاباش' گڈ گرل" لطافت نے خوش ہو کر کہا۔

کیسا خوش ہو رہا ہے بے وقوف آدمی۔ مردوں کو بے وقوف بنانا کتنا آسان ہے۔ آسیہ
نے خوش ہو کر سوچا پھر چہرے پر معصومیت طاری کرتے ہوئے بولی۔ "اب گھر کتنی دور اور ہے؟"

"بس ولی اب زیادہ دور نہیں ہے۔ تم اپنے ذہن کو تیار کر لو' ان دونوں بلیوں سے نپٹنے
کے لئے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میں خود بھی خوفزدہ ہو رہا ہوں"۔

"خوفزدہ ہونے کی کیا بات ہے' ہم نے کوئی گناہ تو نہیں کیا؟"

"لیکن شادی ہم نے کی اسی انداز میں ہے جیسے کوئی گناہ کیا ہو"۔

"یہ تو آپ ہی کی خواہش تھی" آسیہ نے کہا۔

"ہاں' میں شادی بتا کر کرتا تو مجھے صابرہ اور بابرہ کو فیس کرنا مشکل ہوتا۔ مشکل تو اب
بھی ہوگا لیکن اب ایک کام ہو چکا ہے۔ بالآخر وہ تھوڑا بہت غصہ کر کے تمہیں قبول کر لیں گی"۔

جب گھر کی گھنٹی بجی' اس وقت دن کے بارہ بجے تھے اور یہ قبولیت کی گھڑی ہرگز نہ تھی
دروازہ صابرہ نے کھولا۔ اس نے اپنے سامنے ایک سجی بنی ہم عمر لڑکی کو کھڑے پایا تو ایک لمحے
لئے چونکی پھر بولی۔ "جی فرمایئے' کون ہیں آپ؟"

سوال سن کر وہ سجی بنی لڑکی واپس مڑی' تب صابرہ کو اپنے ڈیڈی نظر آئے جو دروازے
کی آڑ میں کھڑے تھے۔ ڈیڈی کو دیکھ کر وہ خوشی سے چیخی "ارے ڈیڈی آپ!" پھر اس نے گر
پیچھے گھما کر بابرہ کو زور سے آواز لگائی۔ "اری بابرہ جلدی آ"

بابرہ دروازے تک پہنچی تو لطافت علی آسیہ کو لے کر اندر داخل ہو چکا تھا۔ بابرہ لطاف
کو دیکھ کر اس سے لپٹ گئی۔

ہائے ڈیڈی آپ کہاں چلے گئے تھے۔"

"صابرہ" لطافت علی اس سے مخاطب ہوئے پھر بابرہ کو انہوں نے اپنے سے الگ کیا
اور بولے "بابرہ! ان سے ملو' یہ تمہاری امی ہیں۔"

"اری صابرہ"

"ہاں بھئی بابرہ"

"کچھ سنا تو نے؟"

"ہاں' اگر میرے کان بج نہیں رہے تو ڈیڈی نے اس لڑکی کو ہماری امی بتایا ہے۔"

"کیا ایسا ممکن ہے؟"

چٹکی کاٹ کر دیکھ لے' یقین آ جائے گا"

"یقین آئے یا نہ آئے' اتنا مجھے ضرور معلوم ہے کہ یہ لڑکی ہمارے ڈیڈی کی بیوی ضرور
ہو سکتی ہے..... لیکن ہماری امی نہیں"

"ہاں' دیکھو بھلا امیاں ایسی ہوتی ہیں"

"صابرہ.....!" لطافت علی نے کچھ کہنا چاہا۔

"ڈیڈی! آپ نے یہ شادی کیوں کی' آپ تو ہماری فکر میں گھلے جا رہے تھے؟"

یہ سن کر لطافت علی کا سر جھک گیا۔ اس نے دھیرے سے کہا اب جو کچھ ہو چکا' اسے
بھول جاؤ' یہ شادی میں نے تم لوگوں کے لئے ہی کی ہے۔ تم دونوں گھر پر تنہا رہتی تھیں' اب آسیہ
تمہارے ساتھ رہے گی۔ یہ تمہارا ہر طرح سے خیال رکھے گی"

"اچھا تو ان کا نام آسیہ ہے"۔

"یہ نام تو کچھ سنا ہوا معلوم ہوتا ہے"

"ڈیڈی! یہ وہی تو نہیں جو آپ کی سیکرٹری تھیں؟"

"ہاں' یہ وہی ہیں" لطافت علی نے اقرار کیا۔

یہ سن کر دونوں بہنوں نے ایک دوسرے کو معنی خیز نگاہوں سے دیکھا۔ ان نگاہوں کے
معنی لطافت علی سمجھ سکا' نہ آسیہ۔

"صابرہ اور بابرہ!"

"جی ڈیڈی۔" دونوں نے بیک وقت کہا۔

"تم دونوں' میری ایک بات غور سے سن لو' انہیں اپنی ماں جیسی عزت دینا' مجھے کوئی
شکایت کا موقع نہ ملے" لطافت علی نے تلقین کی۔

"پھر ایک بات آپ بھی سن لیں ڈیڈی۔ ان سے کہہ دیں کہ یہ ہماری سوتیلی ماں بننے
کی کوشش نہ کریں' ہم ذرا مختلف قسم کی لڑکیاں ہیں' رعب میں آنے والی نہیں ہیں۔"

"نہیں' ایسا نہیں ہوگا۔" پہلی مرتبہ آسیہ نے اپنی آواز نکالی۔

"ٹھیک ہے پھر' آئیں اندر چلیں' صابرہ نے اسے اندر چلنے کا اشارہ کیا۔

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

لطافت علی یہ سن کر خوش ہو گیا کہ بیٹیوں نے اس کی بیوی کو قبول کر لیا ہے۔

"آسیہ! دیکھو میں نہ کہتا تھا کہ میری بیٹیاں کتنی پیاری ہیں"

"ہاں' واقعی یہ تو بہت پیاری ہیں' بالکل جاپانی گڑیوں جیسی" آسیہ نے خوشدلی کا اختیار کیا۔ وہ ہمیشہ آدمی کو زبان کی مار دینے کی قائل تھی۔ لیکن اسے صابرہ اور بابرہ کے بارے میں بالکل اندازہ نہ تھا کہ وہ کس قسم کی مار دینے کی قائل ہیں۔

"اری صابرہ"

"ہاں بھئی بابرہ"

"یہ ڈیڈی نے کیا کیا؟"

"شادی کر لی اور کیا کیا"

"لیکن شادی تو پہلے ہماری ہونا چاہئے"

"ہماری نہ سہی' ہمارے باپ کی ہو گئی' اس سے کیا فرق پڑتا ہے"

"اری تجھے معلوم نہیں' یہ آسیہ کون ہے؟"

"ہماری امی کی قاتل' اسی کی وجہ سے امی بیمار ہوئیں' ایسی بیمار کہ بالآخر چل بسیں"۔

"پھر اس کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟"

"اس نے ہماری ماں کی خوشیاں چھینی ہیں' ہماری خوشیاں چھینی ہیں' ہم اس سے اس کی خوشیاں چھینیں گے" صابرہ نے غصے سے کہا۔

"بالکل ٹھیک' یہ دس دن ہوٹل میں عیش کر کے آ رہی ہے' وہاں اس نے خوب کھایا پیا ہو گا' پہلے اس کا پیٹ نہ صاف کروا دیں" بابرہ نے فوراً تجویز پیش کی۔

"تجویز تو اچھی ہے" صابرہ نے ہنس کر کہا۔

"بس تو پھر کل سے کمانڈو ایکشن شروع ہو جائے گا۔ آؤ اب اطمینان سے سو جاؤ۔"

پھر وہ دونوں لحاف اوڑھ کر پورے اطمینان سے سو گئیں۔

صابرہ اور بابرہ دونوں بلا کی شریر لڑکیاں تھیں۔ جڑواں ہونے کی وجہ سے دونوں ہم شکل تھیں۔ ان دونوں میں ذرہ برابر بھی فرق نہ تھا۔ وہی ناک نقشہ وہی قد کاٹھ وہی رنگ و روپ حتیٰ کہ دونوں کی آوازوں میں بھی کوئی فرق نہ تھا۔ وہ اگر ایک جیسا لباس پہن لیتیں تو پھر یہ بتانا مشکل ہو جاتا کہ ان میں صابرہ کون ہے اور بابرہ کون۔ وہ خود ہی بتاتیں تو معلوم ہوتا۔

بچپن میں خود شمسہ چکرائی رہتی۔ بعض اوقات یہ پہچاننا مشکل ہو جاتا کہ ان میں صابرہ کون ہے۔ شروع میں تو اس نے اس مسئلے کا حل یہ نکالا کہ صابرہ کے گلے میں ایک کالی ڈوری ڈال دی جب یہ بڑی ہوئیں تو شمسہ کو ایک نشانی ایسی مل گئی جسے دیکھ کر فوراً معلوم ہو جاتا تھا کہ یہ بابرہ ہے اور یہ صابرہ' بابرہ کے ہونٹ کے نیچے ایک تل تھا جبکہ صابرہ کا چہرہ بالکل صاف تھا۔

جب وہ شرارت پر اتر آتیں اور صابرہ' بابرہ بننے کی کوشش کرتیں تو شمسہ فوراً پکڑ لیتی

یہ بابرہ ہے۔ لطافت علی بہت حیران ہوتا پھر شمسہ نے لطافت علی کو بھی وہ باریک سی پہچان بتا دی۔

جب تک وہ اسکول میں رہیں' ٹیچروں کا ناک میں دم رکھا۔ ان کی شرارتوں سے عاجز آ کر کئی مرتبہ شمسہ کو بلا کر ان کی شکایت کی گئی۔ کئی مرتبہ دونوں کو اسکول سے نکالنے کی نوبت آئی لیکن وہ ذہین بہت تھیں اس لئے ہر مرتبہ اچھے ریکارڈ کی وجہ سے بچ جاتیں۔ جب وہ میٹرک کر کے سکول سے نکلیں تو ہیڈ مسٹریس نے سکھ کا سانس لیا۔ اس نے شریر لڑکیاں بہت دیکھی تھیں لیکن ایسی شریر لڑکیاں کبھی نہیں دیکھی تھیں۔

دونوں بہنیں کیونکہ بہت خوبصورت تھیں' اس لئے گھر سے نکلتے ہی لڑکوں کی نگاہوں کا محور بن جاتیں۔ سڑک پر' بس سٹاپ پر انہیں عجیب عجیب جملے سننے کو ملتے۔ کچھ دن تو وہ دونوں یہ سب دیکھتی رہیں' سنتی رہیں پھر انہوں نے اس مسئلے کے حل کے لئے جوڈو کراٹے کلب میں داخلہ لے لیا پھر جلد ہی انہوں نے اس لڑکے کو پکڑ لیا جو اکثر بس اسٹاپ پر دونوں بہنوں پر جملے کستا رہتا تھا۔ وہ دبلا پتلا لڑکا جب ان دونوں کے نرغے میں آیا تو پناہ مانگ گیا۔ ان دونوں نے جب تک سب کے سامنے اسے مرغا نہ بنا دیا' نہ چھوڑا۔ وہ دن اور آج کا دن پھر کسی لڑکے نے انہیں چھیڑنے کی جسارت نہ کی..... یا اگر کوئی منچلا انہیں چھیڑنے کی جسارت کرتا تو وہ ان کے اور اپنے درمیان اچھا خاصا فاصلہ ضرور قائم رکھتا۔

ایک دن یہ دونوں بہنیں اپنی ایک دوست کے گھر سے واپس آئیں تو رات ہو چکی تھی دوست نے کھانے پر روک لیا تھا یہ کھانا کھا کر نکلیں تو رات کے نو بج رہے تھے۔ اتنی رات ہو جانے کی وجہ سے ان کی دوست نے کہا بھی کہ میں اپنے بھائی کو ساتھ کر دیتی ہوں لیکن وہ نہ مانیں اور ایک رکشا میں بیٹھ کر اپنے گھر کی طرف چل دیں راستے میں وہ رکشا ڈرائیور انہیں ایسی ویسی لڑکیاں سمجھ کر الٹے سیدھے سوالات کرتا رہا۔ یہ دونوں برداشت کرتی رہیں' جب گھر آ گیا اور وہ دونوں رکشا سے اتریں تو رکشا ڈرائیور نے اپنے دانت نکالتے ہوئے کہا "اچھا یہاں رہتی ہیں آپ لوگ؟"

"کیوں آپ کو کوئی اعتراض ہے؟" بابرہ نے پوچھا۔

"نہیں جی' بس آپ اپنے فلیٹ کا نمبر بتا دیں" اس نے بے تکلف ہونے کی کوشش کی۔

"ارے" یہ سن کر تو دونوں کے جیسے آگ لگ گئی۔

"اری صابرہ؟"

"ہاں بھئی بابرہ"

"یہ صاحب ہمارے گھر کا نمبر مانگ رہے ہیں' انہوں نے ہمیں کیا سمجھ لیا ہے؟"

"ایسی ویسی لڑکیاں" صابرہ نے جواب دیا۔

"پھر انہیں اپنے گھر کا نمبر بتا دیں؟"

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

"ہاں بتا دینا چاہئے اور اس طرح بتانا چاہئے کہ یہ زندگی بھر نہ بھول سکے"

پھر بابرہ نے رکشا والے کی طرف ہاتھ بڑھایا' وہ سمجھا شاید ہاتھ ملانے کے لئے آگے بڑھایا ہے۔ اس نے فوراً اپنا ہاتھ آگے کیا بابرہ نے اس کا ہاتھ تھام کر ایک جھٹکا دیا تو وہ اٹھا۔ اس کا بازو اتر گیا تھا۔

تب ان دونوں نے دس روپے کا نوٹ اس کے منہ پر مارا اور اسے کراہتا ہوا چھوڑ اپنی بلڈنگ کی سیڑھیاں چڑھنے لگیں۔

اس طرح کے واقعات اور اس طرح کی شرارتوں سے ان کا نصاب زندگی بھرا پڑا تھا۔

اب آسیہ ان کے گھر ماں بن کر آ گئی تھی۔ وہ آسیہ جو ان کی ماں کی قاتل تھی۔

صبح کو کمانڈو ایکشن شروع ہوا۔ ناشتے میں صابرہ نے اپنی نئی ماں کے لئے بڑے سے سوجی کا حلوا تیار کیا۔ میوے سے بھرے حلوے کو اس نے الگ الگ پلیٹوں میں نکالا اور ایک پلیٹ سب کے سامنے رکھ دی۔ لطافت علی کو یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی کہ اس کی دونوں بیٹیاں نئی ماں کی آؤ بھگت میں لگی ہوئی ہیں۔ وہ حلوا کھاتے ہوئے انہیں محبت پاش نظروں سے دیکھنے لگے۔

"واہ بھئی واہ' بہت زبردست حلوا بنایا ہے۔ یہ ہماری کس بیٹی نے بنایا ہے؟"

"ابو' میں نے" صابرہ نے کہا۔

"شاید انہیں اچھا نہیں لگ رہا"۔ بابرہ نے آسیہ کی طرف اشارہ کیا۔

"لو' کیوں نہیں۔ مجھے تو بہت اچھا لگ رہا ہے' بڑا لذیذ ہے۔" آسیہ نے تعریف کرتے ہوئے کہا۔

"پھر تو پوری پلیٹ کھانا ہوگی۔" صابرہ نے شوخی سے کہا۔

"کھالوں گی' کیوں نہیں کھاؤں گی" آسیہ نے محبت دکھاتے ہوئے کہا۔

پھر اس نے واقعی پوری پلیٹ کھالی۔ حلوا کھاتے ہوئے اسے ہلکی سی تلخی کا احساس ہوا۔ اس نے سوچا' شاید کوئی کڑوا بادام حلوے میں شامل ہو گیا ہے۔ اس کڑواہٹ کا اس نے احساس ہونے دیا۔ وہ دونوں بہنوں کو مسکراہٹ بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے پوری پلیٹ صاف کر گئی۔

ناشتہ کرنے کے بعد لطافت علی نے دفتر کا رخ کیا لطافت کو رخصت کرنے کے بعد آسیہ فوراً باتھ روم کی طرف بھاگی ادھر وہ باتھ روم سے نکلتی آ کر بیٹھتی کہ پیٹ میں پھر مروڑ شروع ہو جاتی۔ شام تک اسی طرح باتھ روم میں آنا جانا لگا رہا۔ آخر میں تو آسیہ کی یہ حالت ہو گئی کہ باتھ روم میں اپنے پاؤں پر جانا مشکل ہو گیا۔ اس کا چہرہ زرد ہو چکا تھا۔ آنکھیں اندر دھنس گئی تھیں انتہائی نقاہت محسوس کر رہی تھی۔

آسیہ کے کہنے پر صابرہ نے لطافت علی کو فون کیا اور اس کی حالت کے بارے میں بتایا۔ لطافت علی فوراً دفتر سے گھر پہنچا اور آسیہ کو لے کر ہسپتال گیا۔ آسیہ کی زندگی تھی جو بچ گئی' ورنہ صابرہ اور بابرہ نے اسے مارنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔

ڈاکٹروں نے لطافت علی کو بتایا کہ اگر آپ آدھا گھنٹہ اور لیٹ ہو جاتے تو آپ کی بیوی کی زندگی خطرے میں پڑ جاتی۔ جسم کا پانی بس ختم ہونے کو تھا۔

لطافت علی کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی کہ آسیہ کی حالت بگڑی کیسے۔ اگر حلوا کھانے سے پیٹ خراب ہوا تو وہ سب نے کھایا تھا۔ لیکن یہ بات تو صرف صابرہ اور بابرہ کو معلوم تھی کہ کس پلیٹ میں کس چیز کی ملاوٹ کی گئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ حلوا پلیٹوں میں الگ الگ نکالا گیا تھا۔

بہر حال' جب ہسپتال سے لطافت علی نے گھر فون کر کے بتایا" آسیہ کی حالت بہت خراب ہے" تو دونوں بہنیں سر جوڑ کر بیٹھیں۔

"اری صابرہ"

"ہاں بھئی بابرہ"

"سنا کچھ تو نے؟"

"ہمارا دشمن موت کے منہ میں پہنچ گیا ہے' یہی نا؟" صابرہ نے کہا۔

"اری' دعا کر" بابرہ گھبرا کر بولی۔

"مرنے کی یا زندگی کی"

"زندگی کی"

"یہ تو کیا کہہ رہی ہے؟"

"میں ٹھیک کہہ رہی ہوں' ابھی تو ہم نے کمانڈو ایکشن شروع کیا ہے' اگر وہ اتنی جلدی مر گئی تو کیا خاک مزہ آئے گا۔ ابھی اسے زندہ رہنا چاہئے۔ ہماری ماں کو اس نے سسکا سسکا کر مارا تھا ہم بھی اسے سسکا سسکا کر ماریں گے۔"

"بات تو ٹھیک ہے۔"

آسیہ تین چار دن ہسپتال رہ کر گھر واپس آ گئی۔ طبیعت اس کی ٹھیک تھی لیکن نقاہت باقی تھی۔ صابرہ اور بابرہ نے اس کی خوراک کی طرف خصوصی توجہ دی' اسے خوب کھلایا پلایا چند روز میں اس نے پھر سے شکل نکال لی۔ وہ اپنی دونوں بیٹیوں کی بڑی ممنون تھی۔ پہلے جب وہ ہسپتال سے آئی تھی تو صابرہ' بابرہ کی طرف سے کچھ مشکوک ہو گئی تھی۔ سوچتی تھی' کہیں ان لڑکیوں نے حلوے میں کچھ ملا نہ دیا ہو پھر یہ سوچ کر چپ ہو جاتی کہ حلوا تو سبھی نے کھایا تھا' گھر آنے کے بعد جب صابرہ بابرہ نے اس پر خصوصی توجہ دی اور اس کے کھانے اور آرام کا خاص خیال رکھا تو وہ دونوں کو اپنا ہمدرد سمجھنے لگی۔ اسے کیا معلوم تھا کہ وہ دونوں اس کے ساتھ بکرے جیسا سلوک کر رہی ہیں۔ آخر بکرے کو بھی تو قربانی سے پہلے خوب کھلایا پلایا جاتا ہے۔

آسیہ جب پہلے جیسی سرخ و سفید ہو گئی تو بابرہ بولی

"اری صابرہ!"

"ہاں بھئی بابرہ"

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

"ہمارا شکار تو تندرست ہو گیا"

ٹھیک ہے' پھر اس کے لئے کوئی جال بنتے ہیں"

"اچھا ایسا کرتے ہیں" بابرہ نے فوراً ایک تجویز پیش کی

پھر وہ دونوں اس منصوبے پر بحث کرتی رہیں آخر کار انہوں نے ایک لائحہ عمل تیار کر لیا۔

صبح اٹھ کر جب لطافت علی دفتر جانے کی تیاری کر رہا تھا تو صابرہ اور بابرہ کمرے میں داخل ہوئیں۔

"ہاں بھئی لڑکیو! کسی شرارت کی تیاری ہے" لطافت علی نے دونوں کے چہرے پر شریر مسکراہٹ دیکھ کر پوچھا۔

"نہیں تو ڈیڈی' ایسی تو کوئی بات نہیں' بس ہم آپ کے ساتھ چلنا چاہ رہے تھے" صابرہ بولی۔

"بیٹے میں تو دفتر جا رہا ہوں"

"ہاں ڈیڈی' ہمارا بھی یہی پروگرام تھا" بابرہ نے کہا۔

"تم لوگ میرے ساتھ دفتر جاؤ گی؟" لطافت علی نے حیرت سے پوچھا۔

"جی ڈیڈی! نہ صرف ہم آپ کے ساتھ دفتر جائیں گے بلکہ دوپہر کا کھانا بھی ہم وہیں کھائیں گے پھر وہاں سے شاپنگ کے لئے نکلیں گے' اس کے بعد رات کا کھانا کسی چائنیز ریستوران میں' اس کے بعد گھر واپسی' بات دراصل یہ ہے کہ اتنا عرصہ ہو گیا آپ کو کاروبار کرتے ہوئے لیکن ہم نے آج تک آپ کا دفتر نہیں دیکھا۔"

"چلو' ٹھیک ہے' آسیہ کو بھی ساتھ لے لیتے ہیں" لطافت علی نے کہا۔

"ہاں ظاہر ہے' انہیں ہم گھر پر اکیلا کیسے چھوڑیں گے" صابرہ نے بڑی محبت سے کہا۔

لطافت علی کے دفتر میں دس بارہ افراد ملازم تھے۔ ان میں تین لڑکیاں تھیں۔ ایک لطافت علی کی سیکرٹری تھی اور دو ٹائپسٹ تھیں۔ لطافت علی کے کمرے کے باہر جو کیبن تھا اس میں لطافت علی کی سیکرٹری بیٹھتی تھی۔ اس کے کیبن کے برابر منیجر کا کمرا تھا۔ منیجر کا نام صادق قریشی تھا' اس نے لطافت علی کا سارا کاروبار سنبھالا ہوا تھا' صادق قریشی ایک خوبصورت نوجوان تھا۔

اور یہ ہینڈسم نوجوان ہی ان دونوں کے لئے کارآمد تھا۔ یہ اس منصوبے کی ایک کڑی تھی جو صابرہ اور بابرہ کے دماغوں میں گھوم رہا تھا۔ صابرہ اور بابرہ نے دفتر پہنچ کر ایک ایک شخص کا طرح جائزہ لیا تھا پھر دونوں نے یہی طے کیا کہ صادق قریشی ہی وہ موزوں شخص ہے جس کے سے فائدہ اٹھایا جا سکتا تھا۔

آسیہ شادی ہونے کے بعد کیونکہ پہلی مرتبہ دفتر گئی تھی' اس لئے سبھی نے اس سے مزاج پرسی کی۔ آسیہ کچھ جھینپی جھینپی سی تھی' جیسے اس نے لطافت علی سے شادی کر کے کوئی جرم

صابرہ اور بابرہ کو اپنا مطلوبہ شخص جلد ہی مل گیا تھا' اس لئے انہوں نے اپنا پروگرام تبدیل کر لیا۔ دفتر میں دوپہر تک ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا۔ صابرہ نے لطافت علی سے کہا۔ "اچھا ڈیڈی! اب ہم چلتے ہیں۔ دوپہر کا کھانا ہم کسی ہوٹل میں کھائیں گے' اس سے پہلے شاپنگ کر لیں گے' آپ ڈرائیور ہمارے ساتھ کر دیجئے۔"

لطافت علی کو دفتر میں کوئی خاص کام نہ تھا۔ اس نے سوچا' بیٹیوں کو خوش کرنے کا یہ بہترین موقع ہے لہٰذا اس نے کہا۔

"بیٹے! میں آپ کے ساتھ خود چلوں گا' جتنی چاہے شاپنگ کیجئے اور جہاں چاہے کھانا کھایئے۔"

لطافت علی کا خوشگوار موڈ دیکھ کر صابرہ' بابرہ نے خوب فائدہ اٹھایا۔ جی کھول کر شاپنگ کی اور پیٹ بھر کر کھانا کھایا بلکہ گنجائش سے کچھ زیادہ ہی کھا لیا۔

پھر یہ بات بیس پچیس دن بعد کی ہے۔

صابرہ اور بابرہ کو پوسٹ مین کا شدت سے انتظار تھا۔ ان کے خیال کے مطابق آج اس لفافے کو ضرور پہنچ جانا چاہئے تھا جسے انہوں نے صدر کے پوسٹ آفس میں ڈالا تھا۔ یہ خط آسیہ کے نام تھا اور اسے صادق قریشی کی طرف سے لکھا گیا تھا۔ ایسے جعلی محبت نامے تیار کرنے میں انہیں ید طولیٰ حاصل تھا۔

صابرہ اور بابرہ کو اس دن دفتر کے لوگوں کا جائزہ لیتے ہوئے پورا یقین تھا کہ ڈیڈی سے شادی سے قبل آسیہ کے صادق قریشی سے خوشگوار تعلقات رہے ہوں گے۔ ہو سکتا ہے' انہوں نے شادی کرنے کے خواب بھی دیکھ لئے ہوں لیکن پھر درمیان میں ان کا کروڑ پتی ڈیڈی آ گیا ہو گا۔ پیسے کی مار بڑی بری ہوتی ہے۔ اس پیسے نے مقناطیس کا کام کیا ہو گا اور آسیہ' لطافت علی کی طرف کھنچی چلی گئی ہو گی' یہ ایک مفروضہ تھا۔ ہو سکتا ہے' ایسا نہ ہوا ہو۔ صادق اور آسیہ کے درمیان محبت کا کوئی رشتہ نہ ہو لیکن ان دونوں کے درمیان محبت کا یہ رشتہ پیدا کیا جا سکتا تھا اور یہ بات لطافت علی کے دل میں تیر کی طرح لگتی کیونکہ یہ بات فطرت کے عین مطابق تھی۔

پوسٹ مین اس دن دو خط دے گیا۔ ان میں ایک خط صابرہ کی ایک سہیلی کا تھا اور دوسرا لفافہ ان دونوں کی مشترکہ کاوش کا نچوڑ تھا۔ گھر میں آسیہ نہ تھی' وہ میکے گئی ہوئی تھی اس لئے بابرہ نے اس خط کو بڑے اطمینان سے کھولا اور وہ دونوں اسے اس طرح پڑھنے لگیں جیسے یہ خط انہوں نے نہ لکھا ہو بلکہ واقعی صادق قریشی نے آسیہ کے نام لکھا ہو اور ان کے ہاتھ اتفاق سے لگ گیا ہو۔

"اری صابرہ!" خط پڑھتے پڑھتے بابرہ بولی۔

"ہاں بھئی بابرہ۔"

"تجھے امی کا چہرہ یاد ہے؟"

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

"ہاں' یاد ہے۔"

"کتنے دکھ تھے ان کے چہرے پر اور یہ سب دکھ آسیہ کے عطا کردہ تھے۔ انہوں نے سوکن کے دکھ کو کس حوصلے سے جھیلا" وہ مرتے مر گئیں لیکن کبھی حرف شکایت نوک زبان پر نہ لائیں۔ بس کبھی کبھی وہ ہمیں اپنے دکھ میں شریک کر لیتی تھیں' وہ بھی اس وقت جب ان کا کلیجا پھٹنے کو ہوتا۔"

"اب وہی دکھ ہم نے آسیہ کو لوٹانے ہیں' تبھی ہماری ماں کی روح کو سکون پہنچے گا۔"

شام کو لطافت علی' آسیہ کو اپنے ساتھ لیتے آئے۔ جب صابرہ اور آسیہ کچن میں کھانا پکانے میں مصروف تھیں تو بابرہ موقع غنیمت جان کر لطافت علی کے پاس پہنچ گئی۔ وہ اپنے کمرے میں بیٹھے وی سی آر پر کوئی موسیقی کا پروگرام دیکھ رہے تھے' بابرہ کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر انہوں نے ریموٹ کنٹرول کے ذریعے ٹی وی کی آواز کم کر دی اور بابرہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولے "آؤ بیٹا۔"

بابرہ نے اپنے چہرے پر بڑی اداسی طاری کی ہوئی تھی۔ وہ بڑی خاموشی سے بیڈ پر بیٹھ گئی اور گردن جھکا لی پھر پلکیں اٹھائیں' اپنے باپ کو دیکھا اور پھر نظریں جھکا لیں۔

"کیا ہوا بھئی' خیر تو ہے' یہ ہنستے مسکراتے چہرے پر گھٹا سی کیسی؟" لطافت علی نے شفقت بھرا لہجہ اختیار کیا۔

"ڈیڈی' مجھ سے غلطی ہو گئی ہے ایک" بابرہ نے نظریں جھکائے جھکائے کہا۔

"بتاؤ' کیا ہوا" وہ فکرمندی سے بولے۔

"آج دو خط آئے تھے' ایک صابرہ کی سہیلی کا تھا' ایک امی آسیہ کا تھا۔ میں نے امی کا خط کو اپنا سمجھ کر کھول لیا' پڑھا تو بعد میں بڑی شرمندگی ہوئی' میں نے اسے فوراً لفافے میں بند کر دیا" بابرہ نے بتایا۔

"لو' یہ بھی کوئی بات ہوئی بھلا' آسیہ کا خط تم نے پڑھ لیا تو ایسا کیا گناہ ہو گیا' ماں کا خط بیٹی نہیں پڑھ سکتی کیا؟" انہوں نے فراخدلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

"ڈیڈی' وہ بڑا ذاتی قسم کا خط ہے' مجھے اسے نہیں پڑھنا چاہئے تھا۔" بابرہ نے ضد چھوڑا۔

"کیا تم نے وہ خط آسیہ کو دے دیا۔؟"

"نہیں' میرے پاس ہے' مجھ سے خط پڑھنے کی غلطی ضرور ہوئی ہے لیکن ان سے ملنے سے بھی بڑی غلطی سرزد ہوئی ہے' اس لئے میں نے وہ خط ان کے حوالے نہیں کیا۔ آپ کے پاس لائی ہوں' پہلے آپ پڑھ لیں پھر ان کے حوالے کریں۔"

"ارے ایسا کیا خط آ گیا' لاؤ دکھاؤ مجھے۔ آسیہ کہاں ہے؟"

وہ بیڈ پر اٹھ کر بیٹھ گئے۔ انہوں نے ریموٹ کنٹرول کے ذریعے پہلے وی سی آر بند

پھر ٹی وی آف کر دیا۔

بابرہ نے مٹھی میں دبا خط لطافت علی کے ہاتھ پر رکھا اور بولی "وہ باورچی خانے میں ہیں"

بابرہ جب واپس جانے کے لئے مڑی تو لطافت علی نے لفافے سے خط نکالتے ہوئے کہا "ٹھہرو"

لیکن جب انہوں نے خط کی دو تین سطریں پڑھیں تو وہ بولے "اچھا بابرہ تم جاؤ"

"جی بہتر ڈیڈی" یہ کہہ کر وہ بڑی سعادت مندی سے کمرے سے نکل آئی۔

اس خط کو پڑھ کر لطافت علی کی حالت غیر ہو گئی۔ اس خط میں وہ کچھ تھا جسے کوئی شوہر برداشت نہیں کر سکتا۔ انہیں شدید غصہ آیا۔ جی چاہا کہ کچن میں جا کر آسیہ کے کپڑوں پر مٹی کا تیل چھڑکیں اور آگ لگا دیں' یہ نہ کر سکیں تو کم از کم اسے کھڑے کھڑے طلاق دے دیں۔

ان کی جگہ کوئی اور شوہر ہوتا تو وہ اس قسم کا خط پڑھ کر فوراً طلاق دے دیتا لیکن لطافت علی کوئی عام شوہر نہ تھے وہ بنیادی طور پر کاروباری آدمی تھے۔ وہ جانتے تھے کہ اس عمر میں آئندہ ایسی خوبصورت اور کم سن لڑکی ملنا مشکل ہے پھر سب سے اچھی بات یہ تھی کہ ان کی بیٹیوں نے بھی ماں کو خوشی خوشی قبول کر لیا تھا' اس لئے انہوں نے سوچا کہ جوش سے زیادہ ہوش سے کام لینے کی ضرورت ہے۔

شادی سے پہلے انہوں نے صادق اور آسیہ کے بارے میں سنا تھا کہ وہ ایک دوسرے سے بے تکلف ہیں لیکن انہیں یہ معلوم نہ تھا کہ وہ اس قدر بے تکلف ہیں اور یہ بے تکلفی ابھی تک برقرار ہے۔ اس مسئلے کا آسان حل یہ تھا کہ صادق قریشی کو دفتر سے نکال دیا جائے بے روزگار ہو کر عشق کا بھوت فوراً اس کے سر سے اتر جائے گا اور آسیہ کو آئندہ اس سے نہ ملنے کی سختی سے تنبیہ کر دیا جائے اور ساتھ دھمکی دی جائے کہ اگر دوبارہ اس سے اس قسم کی غلطی کا اعادہ ہوا تو اسے طلاق دے دی جائیگی یہ دھمکی اس کے لئے کافی ہو گی۔ ایسی پر آسائش زندگی اسے بھلا اور کہاں مل سکتی ہے۔

رات کو جب وہ بستر پر سونے کے لئے لیٹے تو لطافت علی نے بات شروع کی۔

"آسیہ! میں پچیس دن پہلے جب تم لوگ دفتر گئی تھیں تو کیا تمہاری ملاقات صادق سے ہوئی تھی؟"

"جی ہاں ہوئی تھی' آپ کے پاس اس وقت کچھ لوگ آ گئے تھے تو ہم لوگ صادق کے کمرے میں چلے گئے تھے۔ وہیں میں نے صابرہ اور بابرہ کا تعارف کرایا تھا لیکن یہ بات آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

"تمہاری تنہائی میں بھی اس سے کوئی بات ہوئی؟"

"جی نہیں' ہم سارا وقت اکٹھے ہی رہے۔ میں سمجھی نہیں' آپ آخر کیا پوچھنا چاہ رہے

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہیں؟"

"صادق قریشی کیسا آدمی ہے؟" لطافت علی نے پوچھا۔

"بہت اچھا' مہذب اور نہایت شریف" آسیہ نے صاف دلی سے اس کی تعریف کی۔

"اگر وہ تمہاری نظر میں اتنا ہی اچھا تھا تو پھر اس سے شادی کیوں نہیں کر لی؟"

"اگر آپ درمیان میں نہ آتے تو میں اس سے ضرور شادی کر لیتی۔"

"ٹھیک ہے' میں تمہیں طلاق دے دیتا ہوں' تم اس سے شادی کر لو۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں' مجھے اگر آپ سے طلاق لینا ہوتی تو شادی ہی کیوں کرتی؟"

"گویا تم یہ کہنا چاہتی ہو اب اس سے تمہارا کوئی تعلق نہیں؟"

"تعلق تو خیر اس وقت بھی اس سے کوئی خاص نہ تھا' آپ سے شادی کے بعد تو کسی سے تعلق کا تصور بھی محال ہے۔ ویسے آج آپ کو ہوا کیا ہے۔؟ یہ صادق قریشی آپ کے سر پر کیوں سوار ہے؟"

"آسیہ' ایک مرتبہ اور سوچ لو' ہو سکتا ہے' تمہارا اس سے کوئی تعلق ہو۔ اب بھی تم سے ملتی ہو' تم لوگوں نے کوئی خفیہ ٹھکانا دیکھ رکھا ہو۔"

"توبہ..... توبہ' آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں!! آپ اپنی بیوی پر شک کر رہے ہیں!"

"آسیہ! میں جذباتی آدمی بالکل نہیں ہوں' میرے اعصاب بھی فولاد کے بنے ہوئے ہیں۔ اس وقت اگر میری جگہ کوئی اور آدمی ہوتا تو تمہیں تمہاری بے وفائی پر قتل کر دیتا۔"

"میری سمجھ میں نہیں آ رہا' آپ کیا کہہ رہے ہیں"

"تمہاری سمجھ میں آئے گا بھی نہیں۔ ٹھہرو میں دکھاتا ہوں تمہیں ایک چیز..... پھر تمہاری سمجھ میں سب کچھ آ جائے گا۔" یہ کہہ کر لطافت علی نے تکیے کے نیچے سے ایک لفافہ نکالا اور اس کی طرف بڑھاتا ہوا بولا" ذرا پڑھو اسے"

آسیہ نے اس خط کو پریشانی سے دیکھتے ہوئے اپنے ہاتھ میں لے لیا" کیسا خط ہے؟"

لطافت علی نے خاموشی اختیار کی۔

جب آسیہ نے خط کی ابتدائی اور آخری سطروں پر نظر ڈالی تو ایک دم چونک کر اٹھی' جیسے کسی بچھو نے ڈنک مارا ہو لطافت علی اس کے چہرے کے تاثرات کا بہ غور مشاہدہ کر رہے تھے۔ خط پڑھ کر آسیہ ایک دم آگ بگولا ہو گئی۔

"یہ جھوٹ ہے"

"یہ خط صادق قریشی نے تمہارے نام لکھا ہے۔ ڈاک کے ذریعے آیا ہے۔ تم اسے کیسے جھٹلا سکتی ہو۔"

"یہ جعلی خط ہے' کسی نے میری خوشیاں چھیننے' مجھے تباہ و برباد کرنے کی خاطر لکھا ہے

ں میں جو کچھ لکھا ہے' اس کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں' شادی سے پہلے اور شادی کے بعد' میں کبھی صادق قریشی سے تنہائی میں نہیں ملی۔ میری بات پر یقین کرو' میرا صادق قریشی سے کسی قسم کا کوئی رابطہ نہیں' نہ پہلے تھا نہ اب ہے۔ یہ میرے خلاف کسی نے سازش کی ہے' کوئی میری خوشیوں کا دشمن ہو گیا ہے' میرا گھر اجاڑنا چاہتا ہے" وہ گلوگیر آواز میں بولی۔

"میں صادق قریشی کو کل دفتر سے نکال دوں گا۔"

"ضرور نکال دیں' مجھے اس سے کوئی ہمدردی نہیں۔"

"اور تمہیں طلاق دے دوں گا۔"

"ایسا نہ کہیں' میں بے قصور ہوں اور مجھے یقین ہے کہ یہ خط صادق قریشی نے ہرگز نہیں لکھا آپ خود سوچیں' اگر واقعی میرے اس سے اس قسم کے تعلقات ہوتے تو وہ خط لکھ کر انہیں کیوں دیتا اور مجھ سے ملنے کے لئے اسے خط لکھنے کی کیا ضرورت تھی۔ ظاہر ہے یہ خط کسی کے بھی ہاتھ لگ سکتا تھا اور جیسا کہ پڑ گیا۔ اس لفافے پر میرا نام لکھا ہوا ہے لیکن اسے آپ نے کھول لیا۔ ایسا خط تو کوئی بے وقوف ہی مول لے سکتا ہے۔ اس نے اگر مجھے ملنے کا وقت دینا تھا تو وہ یہ کام ٹیلی فون پر بھی کر سکتا تھا۔ آپ ایسا کریں' اس خط کو اپنے ساتھ کل دفتر لے جائیں' وہاں جا کر اس کی تحریر ملائیں پھر آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ یہ خط اس نے لکھا ہے یا نہیں۔"

"کیا تم صادق قریشی کی تحریر پہچانتی ہو؟"

"جی نہیں"

"پھر تمہیں یہ کیسے یقین ہے کہ یہ صادق قریشی کی تحریر نہیں؟"

"اس لئے کہ اس میں جو کچھ لکھا ہے' اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔"

یہ بات لطافت علی کے دل کو لگی۔ خط پڑھ کر آسیہ نے جس رویے کا اظہار کیا تھا' اس سے وہ بالکل چور ثابت نہ ہوتی تھی۔ اگر یہ خط واقعی صادق قریشی کا ہوتا تو وہ اب تک کئی مرتبہ ہاتھ جوڑ کر معافی مانگ چکی ہوتی' اس کے پاؤں پڑ چکی ہوتی۔ یہ بات بھی سمجھ میں آتی تھی کہ جس مقصد کے لئے یہ خط لکھا گیا ہے' وہ مقصد ٹیلی فون کے ذریعے بھی پورا ہو سکتا تھا اور اس میں پکڑے جانے کا کوئی خطرہ بھی نہ تھا' اگر یہ خط واقعی صادق قریشی کا لکھا ہوتا تو وہ ہرگز اس کی تحریر ملانے کو نہ کہتا۔

پھر لطافت علی کو اپنے ردعمل پر بھی خوشی ہوئی۔ اس نے جذبات کے بجائے دانش مندی سے کام لیا اور اس کی زندگی برباد ہوتے ہوتے رہ گئی۔ پچاس فیصد اسے آسیہ کے بے گناہ ہونے کا یقین ہو گیا تھا' بقیہ پچاس فیصد یقین کے لئے اس نے کل کا انتظار کرنا مناسب سمجھا۔

ادھر صابرہ اور بابرہ ان کے بیڈ روم کے دروازے سے اپنے کان لگائے بیٹھی تھیں۔ انہیں پورا یقین تھا کہ اس کارروائی کے بدلے میں آسیہ کو فوری طور پر طلاق مل جائے گی۔ دونوں میں خوب لڑائی جھگڑا ہو گا' ہو سکتا ہے مار کٹائی تک نوبت آ جائے۔ مگر ادھر تو کچھ نہ ہوا۔ زمین پر

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

بیٹھے بیٹھے ان کی کمر اکڑ گئی' کان سن ہو گئے' پر تماشا نہ ہوا' آخر کمرے کی بتی بجھ گئی اور تھوڑی
میں خراٹوں کی آوازیں آنے لگیں۔

"اری صابرہ! بابرہ زمین سے اٹھتے ہوئے آہستہ سے بولی۔

"ہاں بھئی بابرہ"

"چلو' اپنے کمرے میں چلیں۔"

کمرے میں پہنچ کر دونوں نے ایک دوسرے کو بڑی حیرت سے دیکھا' بابرہ بولی "یہ
ہوا؟"

"میری خود کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔"

"میرے خیال سے اس کمینی نے ڈیڈی پر جادو کر رکھا ہے ورنہ اتنا خطرناک خط پڑھ
بھی انہوں نے اسے کچھ نہ کہا۔" بابرہ کو بڑا شدید غصہ آ رہا تھا۔

"بات یہ ہے بابرہ کہ ڈیڈی اب جس عمر میں ہیں' وہاں وہ زیادہ رسک نہیں لے سکتے
ایسی خوبصورت بیوی بار بار کہاں ملتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ انہوں نے اسے حمیہ کر کے چھوڑ دیا
گا" صابرہ نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

"اللہ بہتر جانتا ہے" بابرہ بولی۔

"مجھے لگتا ہے' اپنا یہ وار خالی گیا' اب کچھ اور کرنا ہو گا" صابرہ نے کچھ سوچتے ہو
کہا۔

"تو کر لیں گے۔"

پھر وہ دونوں سر جوڑ کر بیٹھ گئیں اور آئندہ کی منصوبہ بندی میں مصروف ہو گئیں۔

صبح لطافت علی معمول سے کچھ پہلے ہی دفتر پہنچ گئے۔ ابھی جمعدار جھاڑو لگا رہا تھا چپ
نے لطافت علی کو دیکھ کر جلدی جلدی ان کا کمرا صاف کیا اور پھر جمعدار کو ڈانٹنے لگا۔ "اتنی دیر
کیوں آتا ہے؟"

'ابے کبڑے! زیادہ بک بک نہ کر' ابھی جھاڑو چھوڑ کر چلا جاؤں گا' پھر تو خود کرنا
صفائی" نشا مسیح نے اپنی بھاری جھاڑو کندھے پر رکھتے ہوئے کہا۔

"اچھا میرے باپ' تو اسی وقت آیا کر' مجھ سے غلطی ہو گئی۔" چپڑاسی دلدار حسین
ہاتھ جوڑے۔

"ہاں تو ایسا بول' صاحب کو دیکھ کر تڑی لگاتا ہے مجھے۔" اس سے پہلے کہ دلدار حسین
کوئی جواب دیتا' لطافت علی کے کمرے کی گھنٹی بجی' وہ فوراً اس طرف لپکا اور نشا مسیح اپنے کام
لگ گیا۔

"جی صاحب" دلدار حسین نے کمرے میں داخل ہو کر پوچھا۔

"کوئی آیا؟"

"نہیں سر' ابھی تو کوئی نہیں آیا"

"اچھا' یہ صادق قریشی کب آتا ہے؟" لطافت علی نے گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

"بس جی' وہ آنے والے ہی ہوں گے

"وہ جیسے ہی دفتر میں قدم رکھے اسے فوراً میرے پاس بھیجو" لطافت علی نے بڑی نرمی
سے کہا۔

لطافت علی کو کوئی دس منٹ انتظار کرنا پڑا۔

جب صادق قریشی کمرے میں داخل ہوا تو اس نے دیوار گیر گھڑی پر نظر ڈالی۔ وہ ٹھیک
ن پر دفتر پہنچ گیا تھا۔ لطافت علی کے ہاتھ سے کھنچائی کا ایک موقع نکل گیا ورنہ اس نے سوچا تھا
کہ وہ سب سے پہلے اس کی دیر سے آنے پر ڈانٹ ڈپٹ کرے گا۔

"جی سر' آپ نے یاد کیا" اس نے مودبانہ انداز میں کہا۔

"ہاں بیٹھو" لطافت علی نے سرد مہری سے کہا۔

وہ بیٹھ گیا تو لطافت علی نے اسے پھر اٹھایا "ایسا کرو اپنا رائٹنگ پیڈ اور قلم لے آؤ' میں
ب خط لکھوانا چاہتا ہوں۔"

"جی بہتر" وہ بڑی فرمانبرداری سے بولا اور کمرے سے اٹھ کر چلا گیا۔

پھر وہ دو منٹ کے بعد لوٹا تو اس کے ہاتھ میں مطلوبہ چیزیں موجود تھیں' پھر وہ لکھنے کے
ئے تیار ہو کر آہستہ سے بولا "جی سر۔"

"ہاں لکھیں" لطافت علی نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا "میری پیاری
آسیہ

آسیہ کا نام سن کر صادق قریشی نے ذرا چونک کر اسے دیکھا پھر اس کے چہرے پر انتہائی
گی دیکھ کر اس نے اندازہ لگایا کہ وہ مذاق نہیں کر رہا ہے لیکن یہ اپنی بیوی کے نام مجھ سے خط
یں لکھوا رہا ہے؟ کئی سوال اس کے ذہن میں ابھرے اور پھر معدوم ہو گئے۔ وہ اس دفتر کا ملازم
اس کا کام حکم بجا لانا تھا۔ اس نے میری پیاری آسیہ لکھ کر کہا "جی سر"

"کیا لکھا؟" لطافت علی نے پوچھا۔

"میری پیا....." صادق قریشی کہتے کہتے رک گیا۔ وہ آخر کس طرح دہراتا۔

"رک کیوں گئے' ہاں بتاؤ کیا لکھا ہے؟ لطافت علی کے لہجے میں بڑا زہر تھا۔

"میری پیاری آسیہ" صادق قریشی نے اس کے اصرار کرنے پر دہرا دیا۔

"یوں' ہمیں تنہائی میں ملاقاتیں کرتے ایک عرصہ ہو گیا....." لطافت علی یہ کہہ کر رکا۔

صادق قریشی کا قلم تیزی سے کاغذ پر چل رہا تھا۔ اس پر مذبذب کی کیفیت طاری تھی
ہ کوشش سے لکھے جا رہا تھا۔

"جی سر"

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

"یوں ہمیں تنہائی میں ملاقاتیں کرتے ایک عرصہ ہو گیا لیکن پھر بھی میرا دل تم سے ملنے کے لئے اس طرح بے قرار رہتا ہے۔ جیسے ہمیں ملاقات کئے صدیاں بیت گئی ہیں۔"

"جی سر۔"

"تم نے اس بڈھے سے شادی کر کے مجھ پر بڑا ظلم کیا یا شائد تم نے ایسا کر کے مجھ پر احسان کیا ہے۔ ظاہر ہے' میں ایسی پر آسائش زندگی تمہیں نہیں دے سکتا تھا۔ تمہیں زندگی کی ہر آسائشیں میسر آ گئیں اور میں بھی تمہاری عنایتوں سے محروم نہ رہا۔ آسیہ' تم بہت عقل مند لڑکی ہو' تم نے سب کو خوش کر دیا ہے' خدا تمہیں خوش رکھے۔" لطافت علی نے اس کے بعد چار پانچ جملے اور لکھوائے پھر بولا" بس لاؤ' یہ کاغذ مجھے دے دو۔"

صادق قریشی نے بلا جھجک کاغذ اس کے حوالے کر دیا۔

"یہ لیجئے۔"

لطافت علی نے ایک نظر کاغذ پر ڈالی اور بولا" اب تم جا سکتے ہو۔"

"جی بہتر" پھر وہ دروازے تک جاتے جاتے پلٹا" سر وہ عارف صاحب کو کیا جواب دینا ہے؟"

"کل دیکھیں گے" لطافت علی نے بڑے خشک لہجے میں جواب دیا" بات سنو"

"جی سر" وہ واپس پلٹ آیا۔

"صادق قریشی' جب تم اس دفتر میں آئے تھے تو تمہاری کیا تنخواہ تھی؟"

"جی ایک ہزار روپے"

"اور اب تمہیں کیا ملتا ہے؟"

"جی' چار ہزار روپے"

"کیا تم اس تنخواہ سے مطمئن نہیں ہو؟"

یہ ایک ایسا سوال تھا جس کا جواب بہت مشکل تھا لطافت علی کا آج کا موڈ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اگر وہ یہ کہہ دیتا کہ جی میں مطمئن ہوں تو ہو سکتا ہے کہ وہ اس کی تنخواہ میں اضافہ کرنا چاہتا ہو لیکن یہ سن کر وہ اضافہ روک دے اور اگر وہ یہ کہہ دے کہ مطمئن نہیں ہوں تو وہ ہو سکتا ہے' وہ ناراض ہو جائے کیونکہ تین سال کے عرصے میں یہ ایک شاندار اضافہ تھا۔

تب اس نے درمیان کا راستہ اختیار کیا" سر! میں تو کوئی حرف شکایت زبان پر نہیں لایا"

"صادق قریشی' اگر تمہیں یہ دفتر چھوڑنا پڑ جائے تو تم کیا کرو گے؟"

"میں خاموشی سے اس دفتر سے چلا جاؤں گا مجھے یقین ہے کہ رزق دینے والا خدا ہے ایک در بند ہوتا ہے تو ستر دروازے کھلتے ہیں لیکن یہ سب آپ مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہیں کیا مجھ سے کوئی غلطی سرزد ہو گئی ہے' اگر ہو گئی ہے تو براہ کرم بتا دیجئے دل میں نہ رکھیے" وہ بڑی عاجزی

سے بولا۔

"صادق قریشی' میں دل میں کوئی بات نہیں رکھتا' بتا دوں گا اب تم جاؤ"

اس کے جانے کے بعد لطافت علی مسکرایا اس نے آسیہ کے نام آیا ہوا خط نکالا اور صادق قریشی سے لکھوائے ہوئے خط کے برابر رکھ کر دونوں تحریروں کا موازنہ کرنے لگا۔

دونوں تحریروں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ آسیہ کے نام موصول ہونے والے خط کی تحریر بڑی بچگانہ سی تھی۔ وہ خط بابرہ نے لکھا تھا اور لکھتے ہوئے اپنے خط کو مزید بگاڑ دیا تھا تاکہ اگر کسی وقت اس کی تحریر سے ملایا جائے تو وہ پکڑ میں نہ آ سکے۔ صادق قریشی کا خط بڑا پختہ اور خوشنما تھا۔

لطافت علی چکر میں پڑ گیا کہ یہ کیا ماجرا ہے خط لکھواتے ہوئے اس نے بڑے غور سے صادق قریشی کے چہرے کے تاثرات نوٹ کئے تھے۔ شروع میں تو وہ ضرور چونکا لیکن یہ چونکنا رنگے ہاتھوں پکڑے جانے والے انداز کا نہ تھا' یہ حیرت اس بات کی تھی کہ لطافت علی اپنی بیوی کے نام ایسا خط کیوں لکھوا رہے ہیں۔

صادق قریشی بے قصور تھا۔ رات کو ان کو آسیہ کے پچاس فیصد بے قصور ہونے کا یقین آیا تھا لیکن اب انہیں سو فیصد یقین ہو گیا تھا کہ آسیہ بے خطا ہے۔

اب سوال یہ تھا' اس خط کو کس نے لکھا' کیوں لکھا' آخر ان کا ایسا دشمن کون ہے جو ان کے درمیان شک کا زہر پھیلا کر فاصلے بڑھانا چاہتا ہے۔ لطافت علی نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس خط کو پڑھ کر انہوں نے جذباتی پن کا مظاہرہ نہیں کیا' غصے میں اندھے نہیں ہو گئے' ورنہ خواہ مخواہ ان کا گھر اجڑ جاتا اور اس وقت وہ کرسی پر بیٹھے پچھتا رہے ہوتے۔

کوئی ایک گھنٹے بعد آسیہ کا ٹیلی فون آیا۔" ہاں' میں بول رہی ہوں۔"

"یس بولے جایئے' آپ کا بولنا مجھے بڑا اچھا لگتا ہے" لطافت علی نے اس کی آواز سن کر خوشی کا اظہار کیا۔

"ماشاءاللہ' بڑے خوشگوار موڈ میں ہیں۔"

"ہاں' وہ تو میں ہوں لیکن آپ فرمائیں' آپ نے خادم کو کیسے یاد کیا؟"

"میں' اس خط کے بارے میں پوچھ رہی تھی' آپ نے صادق قریشی کی تحریر ملا کر

"ہاں' جناب! میں نے دیکھ لی وہ خط صادق قریشی نے نہیں لکھا اس کا مجھے یقین

"اے اللہ تیرا شکر ہے' تو نے مجھے تباہ ہونے سے بچا لیا۔"

"تمہیں ہی نہیں' مجھے بھی بچا لیا۔"

"آپ کا کیا ہے' مرد ہیں' آپ کو کوئی اور آسیہ مل جاتی۔"

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

"آسیہ اس دنیا میں بس اکلوتی ہے' وہ کھو جاتی تو پھر مجھے کبھی نہ ملتی۔"

"ایک بات بتائیں؟"

"جی فرمائیں"

"یہ خط آپ کو کس نے دیا تھا؟"

"بابرہ نے"

"لیکن یہ خط تو میرے نام تھا' اصولی طور پر اسے مجھے دینا چاہئے تھا' اس نے آپ کو کیوں دیا؟"

"دراصل وہ خط اس نے کھول لیا تھا' اپنی کسی سہیلی کا سمجھ کر۔ پھر جب اس نے خط پڑھا تو اسے تحریر کی سنگینی کا احساس ہوا اور اس نے وہ خط میرے حوالے کر دیا۔"

"پھر بھی اسے وہ خط آپ کے حوالے نہیں کرنا چاہئے تھا مجھے دکھانا چاہئے تھا' مجھ سے پوچھنا چاہئے تھا۔ یہ اس نے بڑی نادانی کا ثبوت دیا۔"

"بس اب چھوڑو اس ذکر کو' تمہیں اس سے کیا فرق پڑا بلکہ ہمارے تمہارے درمیان رشتہ اور مضبوط ہو گیا۔ کیوں غلط تو نہیں کہا میں نے؟ لطافت علی ہنستے ہوئے بولا۔

"ہاں' اتفاق ہے کہ آپ نے بڑی دانش مندی کا ثبوت دیا' جذبات میں نہیں آئے۔ کوئی اور مرد ہوتا تو مجھے کھڑے کھڑے طلاق دے کر گھر سے نکالا دیتا۔ وہ خط ہی اتنا خطرناک تھا اور جس آدمی کی طرف سے بھیجا گیا تھا' وہ فوراً دل کو لگنے والا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ حرکت کس نے کی ہے؟ کون ہماری خوشیوں کا دشمن ہو گیا ہے؟" آسیہ نے بڑے دکھ سے کہا۔

"تمہارے رشتے داروں میں تو کوئی تمہارا امیدوار نہ تھا؟" لطافت علی نے پوچھا۔

"مجھے نہیں معلوم' دراصل مجھے اپنے گرد و پیش دیکھنے کی کبھی مہلت نہ ملی۔ میں ہیڈ مسائل کا شکار رہی' مشکلات کے بوجھ تلے دبی رہی' کبھی سر اٹھا کر نہ دیکھ سکی' وہ تو خدا کا شکر ہے کہ آپ نے مجھے اپنا شریک سفر کر لیا ورنہ میں آج بھی گردن جھکائے کولھو کے بیل کی طرح وقت کے چکر میں پھنسی گھوم رہی ہوتی۔"

"چلو چھوڑو اس مسئلے کو' یوں کرو شام کو تم تیار رہو پھر کہیں باہر نکلیں گے۔"

"صابرہ اور بابرہ کو بھی لینا ہے؟" آسیہ نے پوچھا۔

"نہیں' ہم تم اکیلے چلیں گے" لطافت علی نے جواب دیا۔

"جی اچھا" یہ سن کر آسیہ بہت خوش ہو گئی۔

شام کو جب آسیہ خوب سج بن کر لطافت علی کے ساتھ گھومنے باہر نکل گئی اور اس نے صابرہ اور بابرہ کو جھوٹے منہ بھی نہ پوچھا تو ان دونوں کے پیٹ میں ایک دم مروڑ اٹھی۔

"اری صابرہ!"

"ہاں بھئی بابرہ"

"یہاں تو تعلقات خراب ہونے کے بجائے مزید اچھے ہو گئے' آج تو دونوں میں سے کسی نے ہمیں ساتھ چلنے کے لئے بھی نہیں پوچھا۔" بابرہ نے افسردہ لہجے میں کہا۔

'میری سمجھ میں خود یہ بات نہیں آ رہی' ایسا خطرناک خط پڑھ کر بھی ڈیڈی کے کان پر جوں نہیں رینگی" صابرہ نے جلے کٹے لہجے میں کہا۔

"کیا خیال ہے' ایک خط اور لکھا جائے؟" بابرہ بولی۔

"اری نہیں' کوئی فائدہ نہیں ہو گا' کچھ اور سوچنا ہو گا۔"

"ابھی وہ یہ باتیں ہی کر رہی تھیں کہ گھر کی گھنٹی بجی صابرہ نے دروازہ کھولا۔ پڑوس سے راشدہ آئی تھی' وہ دونوں کی مشترکہ دوست تھی۔ راشدہ کا نام سن کر بابرہ' آسیہ کے کمرے سے نکل آئی پھر وہ تینوں اپنے کمرے میں بیٹھ کر گپ شپ کرنے لگیں۔

آسیہ سمندر کی سیر اور رات کے کھانے کے بعد گھر آئی تو سب سے پہلے اس نے کمرے میں آ کر ٹیپ ریکارڈ کو دیکھا وہ ابھی تک آن تھا۔ آسیہ نے بڑے غیر محسوس طریقے سے ٹیپ کا بٹن آف کر دیا اور پھر کپڑے وغیرہ تبدیل کر کے اس نے صابرہ' بابرہ کے کمرے میں جھانکا۔

"آیئے' آسیہ" بابرہ نے اسے خوش آمدید کہا۔

وہ دونوں اسے آسیہ کہتی تھیں۔ ہاں' البتہ لطافت علی کے سامنے وہ اسے امی آسیہ کہہ لیتی تھیں۔ آسیہ کہنے کی اصل وجہ تو ان کے دلوں کی وہ نفرت تھی جو ان کی امی' ان کے دلوں میں اتار گئی تھی' وہ آسیہ کو امی کہہ کر اپنی ماں کی توہین کرنے کی روادار نہ تھیں لیکن آسیہ کو انہوں نے امی نہ کہنے کا جواز یہ بتایا تھا کہ کیونکہ وہ تقریباً ان کی ہم عمر ہے' اس لئے وہ اسے امی کہہ کر بوڑھا بنانا نہیں چاہتیں' وہ اسے دوست سمجھنا چاہتی ہیں' اس لئے امی کے بجائے آسیہ کہنا زیادہ مناسب رہے گا۔ آسیہ کو بھلا اس پر کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ اس نے خوشی سے ان کا آسیہ کہنا قبول کر لیا۔

"ہاں جی! آج کہاں کہاں کی سیر کی"؟ صابرہ نے پوچھا۔

تب آسیہ نے مزے لے لے کر' انہیں جلانے کی خاطر باہر گزارے ہوئے وقت کی ایک ایک کی روداد سنائی۔ صابرہ اور بابرہ اس کی باتیں سن کر جلتی اور کڑھتی رہیں لیکن ہونٹوں پر مسکراہٹ سجی رہی جیسے وہ اس کی تفریحات سے بہت خوش ہوئی ہوں۔

آسیہ نے ٹیپ ریکارڈر سے وہ کیسٹ نکال کر بڑی حفاظت سے الماری کے لاکر میں رکھ لیا۔ وہ اسے فوراً سننا چاہتی تھی لیکن سننے کا کوئی موقع نہ تھا۔ اب یہ کام کل لطافت علی کے دفتر جانے اور صابرہ' بابرہ کے پڑوس میں چکر لگانے پر ہو سکتا تھا۔

آسیہ کو پوری توقع تھی کہ اس کیسٹ میں ضرور کچھ نہ کچھ ہو گا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ بلاؤ گھر سے اکیلی جا رہی ہے' اس لئے وہ اس کے جانے کے بعد ضرور جلی کٹی باتیں کریں گی۔ شاید انہیں وہ سننا چاہتی تھی۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اتفاقیہ طور پر لگائے گئے اس جال کو خط ارسال کرنے والے مجرم بھی پھنس جائیں گے۔ دوسرے دن جب اس نے موقع پا کر کیسٹ

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

سنا تو وہ حیرت زدہ رہ گئی۔

بابرہ کا یہ جملہ بار بار اس کے سر پر ہتھوڑے کی طرح برسنے لگا۔

"کیا خیال ہے' ایک خط اور لکھا جائے؟"

دیکھنے میں معصوم لگنے والی لڑکیوں کے یہ لچھن ہیں۔ اس بات پر بھلا کون یقین کرے گا' خود اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ آخر اس نے ان کا کیا بگاڑا تھا۔ اس نے تو اس گھر میں آ کر اپنے ماں ہونے کا بھی احساس نہیں دلایا تھا۔ وہ ان کے ساتھ' ان کی دوست کی طرح رہتی تھی۔ جہاں جاتی انہیں اپنے ساتھ لے کر نکلتی' اگر اپنے لئے کوئی چیز خریدتی تو وہ چیز انہیں بھی دلواتی۔ اس محبت کا یہ نتیجہ نکلا کہ انہوں نے اسے گھر سے نکالنے کا سامان کر دیا۔ اب اسے احساس ہوا کہ یہ دونوں اس دن دفتر کیوں گئی تھیں۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ وہاں ایسا کون شخص ہو سکتا ہے جس کے نام سے خط لکھا جا سکے اور انتخاب بھی انہوں نے خوب کیا۔ اس دفتر میں صادق قریشی ہی ایسا موزوں آدمی تھا جس کی طرف سے اسے خط لکھا جا سکتا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ تیر نشانے پر نہ بیٹھا۔ وہ اگر چاہتی تو اس کیسٹ کو جس میں اقرار جرم موجود تھا لطافت علی کو سنا کر صابرہ اور بابرہ کو ان کے چہیتے باپ کے ذریعے ذلیل کروا سکتی تھی لیکن یہ مسئلے کا مستقل حل نہ تھا۔ اس نے اس کیسٹ کو لطافت علی کو نہ سنایا اور سوچنے لگی کہ اب کیا کرنا چاہئے۔

ادھر آسیہ ان کے بارے میں ابھی کوئی لائحہ عمل تیار کر رہی تھی کہ بابرہ اور صابرہ نے ایک اور ایکشن دکھایا۔

آسیہ چھپکلی سے بہت ڈرتی تھی۔ چھپکلی کو دیکھ کر اس کی روح فنا ہوتی تھی۔ باورچی خانے یا کمرے میں کبھی اسے چھپکلی دکھائی دے جاتی تو وہ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگتی اور اس وقت تک وہاں قدم نہ رکھتی جب تک اسے یقین نہ ہو جاتا کہ چھپکلی ماری جا چکی ہے۔ صابرہ اور بابرہ کو چھپکلی سے قطعاً ڈر نہ لگتا تھا' وہ دونوں اسے بڑے مزے سے جھاڑو سے مار دیا کرتیں۔

آسیہ کو شادی کے بعد' دوپہر کا کھانا کھا کر کچھ دیر سونے کی عادت پڑ گئی تھی۔ ویسے بھی اس گھر میں اس کے کرنے کے لئے کچھ نہ تھا۔ اوپر کے کام کے لئے ایک ملازمہ رکھی ہوئی تھی۔ جو صبح شام آتی دوپہر کا کھانا صابرہ اور بابرہ نے اپنے ذمے لے رکھا تھا' رات کا کھانا آسیہ پکاتی تھی۔

صابرہ اور بابرہ نے سوچا کہ ایکشن دکھانے کا موزوں ترین وقت وہی ہے' جب آسیہ اپنے کمرے میں دوپہر کا کھانا کھا کر سونے چلی جاتی ہے۔

کئی دن سے وہ چھپکلی کی تلاش میں تھیں لیکن چھپکلی انہیں کہیں نہیں دکھائی دے رہی تھی۔

"اری صابرہ!"

"ہاں بھئی بابرہ"

"ان کم بخت چھپکلیوں کو کیا ہوا' ایک بھی نظر نہیں آ رہی؟"

"شاید انہیں معلوم ہو گیا ہے کہ ہمیں ان کی ضرورت ہے"

"چلو کوئی بات نہیں انہیں بھی نخرے دکھا لینے دو' آخر کب تک چھپیں گی ہم سے"

"ہائے کتنا مزہ آئے گا۔"

"کس بات کا؟"

"جب چھپکلی کو دیکھ کر آسیہ چیخے گی۔"

"اری' کہیں وہ مر مرا نہ جائے۔"

"یہ تو اور بھی اچھی بات ہو گی۔"

"لیکن وہ ہے نہیں مرنے والی بڑی سخت جان ہے۔"

آسیہ واقعی سخت جان تھی۔ وہ چھپکلی سے جس قدر ڈرتی تھی' اگر اس کی جگہ کوئی اور عورت ہوتی تو وہ چھپکلی کو اپنے اتنے قریب دیکھ کر ضرور اللہ کو پیاری ہو جاتی۔

بالآخر صابرہ اور بابرہ کی مراد بر آئی۔ انہیں باورچی خانے کی دیوار پر ایک موٹی' کالی سی چھپکلی نظر آ گئی۔ صابرہ اور بابرہ دونوں نے اسے مل کر مارا۔ چھپکلی بہت اچھے موقع پر ان کے ہاتھ لگی تھی۔ آسیہ اپنے کمرے میں سونے کے لئے جا چکی تھی۔ بابرہ نے اس چھپکلی کو ایک گتے پر اٹھا لیا اور صابرہ سے بولی "جا اندر دیکھ کر آ' وہ سو رہی ہے یا جاگ رہی ہے؟"

"اچھا ٹھیک ہے" صابرہ دبے پاؤں اس کے کمرے کی طرف بڑھی۔ آہستہ سے اس کے کمرے کا دروازہ کھولا' اندر داخل ہوئی۔ آسیہ بے خبر سو رہی تھی۔ صابرہ فوراً الٹے قدموں واپس لوٹی۔

"سو رہی ہے۔" اس نے آ کر رپورٹ دی۔

"اسے کہاں رکھیں' سینے پر یا شلوار کے پائنچے میں؟"

"شلوار کے پائنچے میں رکھنا مشکل ہو گا' سینے پر رکھو گی تو وہ کہیں فوراً نہ اٹھ جائے' اس طرح ہم رنگے ہاتھوں پکڑے جائیں گے۔"

"پھر کہاں رکھیں؟"

"اس وقت وہ کروٹ لے کر سو رہی ہے۔ میرا خیال ہے کہ تکیے پر رکھ دو' جیسے ہی اس کی آنکھ کھلے گی' فوراً نظر اس کی چھپکلی پر پڑے گی۔"

"چلو' یہ ٹھیک ہے"

تکیے پر کافی جگہ خالی پڑی تھی۔ بابرہ نے بڑی احتیاط سے چھپکلی کو گتے سے پرا تار دیا۔ چھپکلی کا منہ اور آسیہ کا منہ آمنے سامنے تھا اور ان دونوں کے درمیان مشکل سے چار پانچ انچ کا فاصلہ ہو گا۔

وہ دونوں کارروائی کر کے فوراً کمرے سے نکل آئیں۔

"اری صابرہ!"

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

"ہاں بھئی بابرہ"

"کیا دروازہ باہر سے بند کر دیں۔"

"جی تو یہی چاہتا ہے لیکن اس طرح ہم لوگ مشکوک ہو جائیں گے۔ اب تو یہ ہوگا کہ چھپکلی چھت سے گری اور تکیے پر آ رہی۔ اس میں ہمارا کوئی قصور نہیں۔"

"نہیں ہمارا قصور کیسے ہو سکتا ہے۔ ہم تو ویسے بھی معصوم صورت لڑکیاں ہیں۔"

"اس میں کیا شک ہے۔"

پھر بابرہ نے دروازہ کس کر بند کر دیا تاکہ اسے فوراً ہی فرار کا راستہ نہ ملے۔

آسیہ دوپہر کو ایک گھنٹے سے زیادہ نہ سوتی تھی لیکن آج وہ ایک گھنٹا بھی نہ سو سکی۔ اس نے ایک عجیب سا خواب دیکھا۔ اس نے دیکھا کہ وہ جنگل میں ہے اور اکیلی ہے۔ وہ خوفزدہ سی دھیرے دھیرے قدم اٹھا رہی ہے اور سوچ رہی ہے کہ اس جنگل سے وہ باہر کس طرح نکلے گی۔ تبھی اسے شیر کی دہاڑ سنائی دی۔ وہ گھبرا کر درخت کے ایک تنے سے چمٹ گئی۔ شیر اچانک سامنے آ گیا اور غرا کر اس نے آسیہ کی طرف چھلانگ لگائی۔ آسیہ نے خوف کے مارے چیخ ماری لیکن آواز اس کے گلے میں گھٹ کر رہ گئی۔ تبھی اس کی آنکھ کھل گئی۔

اس نے خود کو اپنے کمرے میں پایا۔ سکون کا سانس لیا لیکن یہ سکون کا سانس آدھا گلے میں اٹکا رہ گیا..... اس کی نظر یہ موٹی' کالی اور انتہائی گھناؤنی چھپکلی پر پڑی جو اس سے صرف ایک مٹھی دور تھی۔ آسیہ نے تڑپ کر چیخ ماری۔ یہ ایک فلک شگاف چیخ تھی۔

پھر وہ مسلسل چیختی چلی گئی۔ خوف کے مارے اس کی آنکھیں ابل آئی تھیں۔ جسم پر لرزہ طاری تھا۔ اس نے بستر سے اٹھ کر باہر بھاگنا چاہا لیکن گھبراہٹ میں دروازہ بھی نہ کھول سکی۔ اسے یوں لگا جیسے چھپکلی نے اس کے اوپر چھلانگ لگا دی ہے۔ اس تصور نے اسے بے حال کر دیا۔

وہ بے ہوش ہو کر زمین پر گری اس کا سر بڑے زور سے دیوار سے ٹکرایا۔

صابرہ اور بابرہ دوازے کے باہر اس کی چیخیں سن رہی تھیں اور محظوظ ہو رہی تھیں پھر اچانک اندر خاموشی چھا گئی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

"اری صابرہ!"

"ہاں بھئی بابرہ"

"اندر سے کوئی آواز نہیں آ رہی۔"

"اری کہیں مر مرا تو نہیں گئی۔"

"ایسا ہو گیا تو کوئی برا نہ ہوگا' ہماری امی کی روح کو سکون مل جائے گا۔"

"چل پھر اندر چل' دیکھیں کیا ہوا۔"

جب وہ دروازہ کھول کر اندر آئیں تو انہوں نے آسیہ کو زمین پر بے سدھ پڑے دیکھا وہ بے ہوش تھی اور اس کی پیشانی سے خون بہہ رہا تھا۔

"اب کیا کریں؟" دونوں سوچنے لگیں۔

اسی وقت ٹیلی فون کی گھنٹی بجی فون صابرہ' بابرہ کے کمرے میں تھا۔

"دیکھ بابرہ' فون پر کون ہے؟"

"اچھا" بابرہ اپنے کمرے کی طرف بھاگی۔

اس نے ریسیور اٹھایا تو ادھر لطافت علی تھے۔ "بیٹا' ذرا آسیہ کو فون دو۔"

"ڈیڈی..... ڈیڈی" لطافت علی کی آواز سن کر بابرہ کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ کیا کہے۔ اتنے میں صابرہ کمرے میں آ گئی' اس نے فوراً ریسیور بابرہ کے ہاتھ سے لے لیا اور بولی "ڈیڈی! آپ فوراً گھر آ جائیں' امی آسیہ چھپکلی سے ڈر کر بے ہوش ہو گئی ہیں۔"

"ارے" لطافت علی یہ سن کر پریشان ہو گئے۔ "اچھا' میں آ رہا ہوں۔"

پھر لطافت علی اسے گاڑی میں ڈال کر ہسپتال لے گئے۔ صابرہ اور بابرہ ساتھ تھیں۔

آسیہ چھپکلی سے کچھ اس طرح خوفزدہ ہوئی تھی کہ تین دن تک اس کے حواس بحال نہ ہوئے۔ وہ تھوڑی دیر کے لئے ہوش میں آتی۔ آنکھیں کھولتی ڈر کر چیخ مارتی اور بے ہوش ہو جاتی۔

صابرہ اور بابرہ بظاہر اس کی تیمار داری میں لگی تھیں لیکن اس کی کیفیت دیکھ کر اندر ہی اندر وہ خوش ہو رہی تھیں۔ اسی خوشی میں وہ اس کے بیڈ کے نزدیک بیٹھی بہت سی باتیں کرتی رہتیں۔

چوتھے دن شام کو جب آسیہ کے حواس مکمل طور پر بحال ہوئے تو اس نے لطافت علی سے بڑے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ "ان دونوں کو یہاں سے لے جاؤ۔"

"کیوں' خیریت تو ہے؟" لطافت علی نے چونک کر کہا۔

"ان بے چاریوں کو یہاں رہتے ہوئے کئی دن ہو گئے' پھر گھر بھی اکیلا ہے اور یہاں مجھے ان کی کوئی خاص ضرورت نہیں ہے۔ ہر وقت ڈاکٹر' نرسیں موجود ہوتی ہیں پھر ان لوگوں کو پریشان کرنے کا کیا فائدہ' میری تیمار داری کرتے کرتے ان بے چاریوں کے کیسے منہ نکل آئے ہیں۔" آسیہ نے بڑی ہمدردی سے کہا۔

وہ دونوں ہسپتال سے چلی تو آئیں' لیکن دل میں ایک کھٹک سی پیدا ہو گئی۔

"اری صابرہ!"

"ہاں بھئی بابرہ"

"یہ آسیہ نے ہمیں ہسپتال سے کیوں بھیج دیا۔"

"کہیں اس نے ہماری باتیں تو نہیں سن لیں' ہم بھی تو وہاں بیٹھ کر بڑی غیر محتاط گفتگو کرتے تھے۔"

"لیکن اس وقت تو وہ بے ہوش پڑی تھی۔"

"اری کیا پتا وہ بڑی گھنی ہے۔ ہو سکتا ہے' کسی وقت اسے ہوش آ گیا ہو اور وہ مکر کیے ہاں رہی ہو۔" صابرہ نے کہا۔

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

"ہاں' یہ ہوتو سکتا ہے۔" بابرہ نے گردن اثبات میں ہلائی۔

"بس' سمجھ لو یہی ہو گیا ہے' ہم وہاں بیٹھے' جانے کیا کیا بکواس کرتے رہے تھے نے ضرور کچھ سن لیا ہے تبھی تو اچانک اس نے ہمیں ہسپتال سے روانہ کروا دیا۔"

"کوئی بات نہیں' تم فکر مت کرو' اگر ڈیڈی ہم سے چھپکلی کے متعلق پوچھیں گے اس یقین سے جھوٹ بولیں گے کہ آسیہ ہماری شکل دیکھتی رہ جائے گی۔"

"ہاں' معصوم صورتوں کا یہی فائدہ ہے' جتنا چاہے جھوٹ بولو لیکن لوگ سچ سمجھتے ہیں اور یہ حقیقت تھی۔ آسیہ نے واقعی صابرہ اور بابرہ کی گفتگو سن لی تھی۔ اسے نہ صرف معلوم ہو گیا تھا کہ ان دونوں نے چھپکلی بیچے پر ڈالی تھی بلکہ وہ یہ بھی جان گئی تھی کہ دونوں لڑ اس سے سخت نفرت کرتی تھیں۔ ان کی ماں' ان کے دلوں میں جو زہر بھر گئی تھی' اب وہ اس کے میں انڈیل دینا چاہتی تھیں۔ یہ ایک خطرناک صورت حال تھی۔ وہ لطافت علی سے کچھ نہیں کہہ تھی۔ لطافت علی کو اپنی بیٹیوں سے بہت محبت تھی۔ انہوں نے اس گھر میں داخل ہونے سے ..... اس سے وعدہ بھی لیا تھا اور وہ وعدہ کر بھی چکی تھی۔ اس نے اب تک اپنے وعدے کو نبھایا تھا۔ اب اگر وہ ان کی برائیاں شروع کرتی تو لطافت علی حقائق سمجھتے یا نہیں لیکن یہ ضرور ہوتا کہ آ کی طرف سے ان کے دل میں بال پڑ جاتا۔ ایسا خطرہ وہ مول لینے کے لئے تیار نہ تھی۔ لہذا نے سوچا' جو کچھ کرنا ہے' اپنے طور پر کرنا ہے لیکن کیا کرنا ہے اور کس طرح کرنا ہے' یہ بات تک اس کی سمجھ میں نہ آئی تھی۔

آسیہ ایک دو دن مزید ہسپتال میں رہ کر گھر آ گئی۔ چھپکلی نے اس کی آدھی جان نکال تھی وہ بالکل زرد ہو گئی تھی۔ ہاتھ پیروں میں جان نہ رہی تھی۔ دس پندرہ دن کی کھلائی پلائی دواؤں کے استعمال سے اس کے اندر جان آئی۔

اب آسیہ' صابرہ اور بابرہ کے درمیان وہ محبت نہ رہی تھی جو ابتدا میں تھی۔ آسیہ کچھ کھنچی سی رہنے لگی تھی۔ ان کے درمیان ایک سرد جنگ کا آغاز ہو گیا تھا۔ یہ تبدیلی ان دونوں محسوس کر لی تھی لیکن ان میں آسیہ سے اس مسئلے پر گفتگو کرنے کی ہمت نہ تھی۔ ان کے دل میں جو تھا۔

پھر ایک دن گھر کی گھنٹی بجی۔ بابرہ نے جا کر دروازہ کھولا اور واپس آ کر آسیہ سے بو

"آسیہ! تمہارا کوئی خالہ زاد بھائی ہے باہر وقار نام ہے۔"

"اچھا وقار آیا ہے' اسے اندر بلا لو۔" آسیہ نے چہک کر کہا۔

بابرہ نے اسے باہر جا کر اندر بلا لیا۔ ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور خود باہر چلی آئی۔

آسیہ نے وقار کو فون کر کے بلایا تھا۔ ویسے وہ اس قماش کا لڑکا تھا کہ اسے کسی قیمت گھر نہیں بلایا جا سکتا تھا۔ آسیہ' وقار کے تمام کرتوتوں سے واقف تھی۔ اسی لئے وہ اس سے دور دور رہی تھی۔ وہ کبھی کبھار اس کے گھر آ جاتا تو آسیہ اس سے سیدھے منہ بات نہ کرتی۔ وقار

ہم نہیں کرتا تھا پھر بھی کوئی ایسا کام نہ تھا جو اس نے نہ کیا ہو۔ وہ جیل تک کی ہوا کھا آیا تھا۔ آسیہ نے اسے کچھ سوچ کر بلایا تھا۔

وقار نے بابرہ کو جب پہلی بار دروازے پر دیکھا تو بس دیکھتا رہ گیا۔ پھر وہ بہانے بہانے سے آئے دن چکر لگانے لگا۔ آسیہ نے بابرہ اور صابرہ سے اس کا تعارف کرایا۔ اسے ایک کاروباری شخص بتایا۔ اس کی بہت تعریفیں کیں لیکن صابرہ اور بابرہ پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔

"اری صابرہ!"

"ہاں بھئی بابرہ"

"یہ کیا چیز روز روز ہمارے گھر آنے لگی ہے۔"

"مجھے تو شکل سے کوئی غنڈہ لگتا ہے۔"

"اری ایسا نہ کہہ آسیہ کی نظر میں تو وہ بہت بڑا آدمی ہے۔"

"بکواس کرتی ہے' اگر ایسا ہوتا تو خود اس سے شادی کر لیتی۔ ہمارے ڈیڈی کے گلے بھی نہ پڑتی۔"

"ہاں یہ بھی تو ٹھیک کہتی ہے' اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس نے ہماری ڈیڈی سے شادی ں پیسے کے چکر میں کی ہے۔"

"صاف ظاہر ہے' یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔"

"اچھا' یہ وقار کا کیا چکر ہے بڑی پابندی سے یہاں آنے لگا ہے اور آسیہ بھی دو دو گھنٹے اس سے باتیں کرتی رہتی ہے" بابرہ اسے مشکوک نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

"اللہ ہی جانے۔"

"ڈیڈی کو بتائیں؟"

"نہیں' ابھی نہیں۔ ڈیڈی کو بتائیں گے بلکہ دکھائیں گے' تھوڑا صبر کرو۔" صابرہ نے کر کہا۔

لیکن وہ لطافت علی کو کچھ نہ دکھا سکیں۔ آسیہ نے البتہ وقار کو اسے دکھا دیا۔ تعارف نے کے بعد اس نے لطافت علی سے کہا۔ "آپ صادق قریشی کو نکالنے والے تھے۔"

"لیکن وہ بات تو ختم ہو گئی۔ صادق قریشی بہت کام کا آدمی ہے۔"

"میں یہ کہنا چاہ رہی تھی کہ اگر آپ اسے نکالنا چاہتے ہیں تو نکال دیں' اس کی جگہ وقار کو لیں' یہ گریجویٹ ہے' ملازمت نہ ملنے کی وجہ سے بھٹک رہا ہے' بہت شریف لڑکا ہے۔"

"تم اگر انہیں ملازمت دلوانا چاہ رہی ہو تو میں صادق کے ساتھ انہیں لگا دیتا ہوں' یہ کھ لیں پھر دیکھیں گے کہ صادق قریشی کے ساتھ کیا کیا جا سکتا ہے۔"

"آپ کا بہت شکریہ" آسیہ نے بڑی ممنون نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"ارے کیا فضول بات کر رہی ہو' یہ تو میرے لئے معمولی بات ہے۔"

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

دوسرے دن سے وقار دفتر جانے لگا۔ لطافت علی نے صادق قریشی کے کمرے میں اس کے لئے میز ڈلوا دی صادق قریشی تیز آدمی تھا۔ اس نے بھانپ لیا کہ آئندہ کیا ہونے والا ہے۔ ابھی اس کا کمرا ہی آدھا ہوا تھا' کل کو ملازمت بھی آدھی ہو سکتی ہے۔ ادھر وقار بھی کم ہوشیار نہ تھا' اس نے صادق قریشی پر یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ وہ یہاں عارضی طور پر ملازم ہوا ہے' اور امریکہ جانے کے چکر میں ہے۔

جب صابرہ اور بابرہ کو یہ معلوم ہوا کہ آسیہ نے اسے دفتر میں ملازم کروا دیا ہے تو وہ بڑی پریشان ہوئیں۔ دونوں سر جوڑ کر بیٹھیں۔

"اری صابرہ!"

"ہاں بھئی بابرہ"

"یہ کیا ہوا' ہم تو کسی اور چکر میں تھے' یہ آسیہ تو ہم سے ایک ہاتھ آگے نکلی۔"

"سوال یہ ہے کہ وقار کو ملازمت کی کیا ضرورت پڑ گئی' وہ تو خود کاروباری آدمی تھا۔"

"اری' سب بکواس' وہ تو ہم پر رعب ڈالنے کے لئے کہا ہوگا۔"

"یہ کر کیا رہی ہے' کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا' ادھر ڈیڈی بھی اس پر اس قدر لٹو ہوئے ہیں کہ جو کچھ وہ کہتی ہے' اسے فوراً مان لیتے ہیں۔"

"مجھے تو لگ رہا ہے' جیسے یہ ڈیڈی کے خلاف کوئی جال بن رہی ہے" اندیشوں نے ابھارا۔

"سوال یہ ہے کہ وقار کے مسئلے پر ہم کوئی بات بھی تو نہیں کر سکتے۔"

"اری تو فکر نہ کر' ابھی اسے کرنے دو' بات کو ذرا واضح ہونے دو۔"

"ہمیں بھی تو کچھ کرنا چاہئے۔ آج کل وہ بڑی خوش خوش جا رہی ہے۔"

"چلو' ابھی کچھ کر دیتے ہیں' وہ نہانے گئی کیا؟"

"نہیں' ابھی تو وہ سو رہی ہے' سو کر اٹھے گی تو پھر نہانے جائے گی۔"

"آ جاؤ پھر ایک کام کرتے ہیں۔"

وہ دونوں اٹھ کر باتھ روم کی صفائی میں لگ گئیں' انہوں نے فرش کو خوب اچھی طرح صاف کیا۔ فرش اچھی طرح صاف کرنے کے بعد انہوں نے اپنی کارروائی کی اور خاموشی سے واپس آ گئیں۔

آسیہ سو کر اٹھی تو اس کا سر کچھ بھاری بھاری سا ہو رہا تھا۔ اس نے سوچا' نہانے سے پہلے سر میں تیل لگا لے۔ وہ تیل کی شیشی اٹھا کر کمرے سے نکلی۔ بابرہ نے اس کے ہاتھ میں شیشی دیکھی تو بڑی محبت سے بولی۔ آسیہ! لاؤ میں تمہارے سر میں تیل لگا دوں۔"

آسیہ خود بھی یہی چاہ رہی تھی کہ کوئی اس کے سر میں ڈھیر سارا تیل تھوپ کر مالش کر دے۔ اس نے فوراً تیل کی شیشی بابرہ کے ہاتھ میں تھما دی۔ "لو کر دو"

"نہانے جا رہی ہیں؟"

"ہاں' ارادہ تو ہے۔"

"اری صابرہ!" بابرہ نے اس کے سر میں تیل انڈیلتے ہوئے آواز لگائی۔

"ہاں بھئی بابرہ"

"اری' ذرا آسیہ کے لئے پانی گرم ہونے کے لئے رکھ دے۔"

"اچھا رکھتی ہوں" ادھر سے آواز آئی۔

"یہ تم لوگ ایک دوسرے سے مخاطب خوب ہوتی ہو۔ اری صابرہ' ہاں بھئی بابرہ' ایسا لگتا ہے' جیسے کوئی مجمع لگا رہا ہو۔ تم کون معمول' میں کون عامل" آسیہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

"بس عادت پڑ گئی ہے' پہلے امی بھی ہمیں ٹوکا کرتی تھیں۔" بابرہ نے بتایا۔

"آپ کتنی اچھی ہیں آسیہ! ہماری امی تو لگتی ہی نہیں"

"اچھا پھر کیا لگتی ہوں؟" وہ ذرا چونکی

"دوست' ہم لوگ کتنے خوش قسمت ہیں۔" اس نے وضاحت کی۔

"خیر خوش قسمت تو میں بھی ہوں' جسے برابر کی دو جوان بیٹیاں مل گئیں' تم لوگ میرا کس قدر خیال رکھتی ہو۔"

یہ سن کر بابرہ نے دل ہی دل میں قہقہہ لگایا' احمق عورت! ہم اور تیرا خیال رکھیں گے' مارا تو بس نہیں چلتا کہ تجھے زندہ دفن کر دیں۔

ادھر آسیہ بھی اپنی منافقت پر مسکرائے بنا نہ رہ سکی۔

"اچھا بھئی بابرہ بس" آسیہ نے اس کے ہاتھ پکڑ لئے۔ "تم بہت اچھی مالش کرتی ہو" پھر وہ نہانے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"لائیے' میں آپ کا پانی باتھ روم میں رکھ آؤں" بابرہ نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ اسے خدشہ تھا کہ کہیں وہ ہاں نہ کہہ دے۔ ویسے اسے یقین تھا کہ آسیہ اس سے یہ خدمت لینا مناسب نہ سمجھے گی۔ اس نے تو یہ بات بظاہر اخلاقاً اور بہ باطن مصلحتاً کہی تھی۔

"ارے نہیں' اب مجھے سچ مچ امی نہ بناؤ' میں تمہاری دوست ہی رہنا چاہتی ہوں۔"

آسیہ نے کچن میں جا کر بھگونے کا ڈھکن ہٹا کر دیکھا' پانی ابل رہا تھا۔ اس نے چولہا بند کیا' صافی سے بھگونے کو پکڑ کر اٹھایا اور باتھ روم کی طرف چل دی۔

صابرہ اور بابرہ اسے بڑی دلچسپی سے جاتے ہوئے دیکھ رہی تھیں۔ ان دونوں کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک تھی۔ ایسی چمک جو شکاری کی آنکھوں میں شکار کو شکار ہوتے ہوئے دیکھ کر آتی ہے۔

آسیہ ابلتا پانی اٹھائے باتھ روم میں ابھی ایک دو قدم ہی چلی تھی کہ قیامت آ گئی۔ اس کا پاؤں پھسلا' ہاتھ سے بھگونا چھوٹا' وہ کولہے کے بل زمین پر گری' اس کا سر دروازے سے ٹکرایا اور

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

ابلتا ہوا پانی جسم پر گرا۔

چیخ سن کر صابرہ اور بابرہ نے ایک دوسرے کو آنکھ ماری۔

آسیہ پھر ہسپتال پہنچا دی گئی۔ سر میں پانچ ٹانکے آئے۔ ٹانگوں کی جلد متاثر ہوئی۔ ٹانگوں کے علاوہ ابلتا پانی جسم کے جس حصے پر بھی پڑا' اس نے متاثر کیا۔

آسیہ کو یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ معصوم صورت بہنوں نے اس مرتبہ کیا گل کھلایا ہے۔ آسیہ بظاہر تو جلی ہی تھی' زخمی بھی ہوئی تھی لیکن اس کے اندر بھی ایک الاؤ بھڑک اٹھا تھا۔ روح تک زخمی ہو گئی تھی۔ اسے بڑا غصہ تھا۔ دماغ میں شعلے ناچ رہے تھے' دل میں نفرت ابل رہی تھی لیکن وہ بڑے صبر سے کام لے رہی تھی۔ اس نے کسی پر ظاہر نہ ہونے دیا تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ اس نے لطافت علی سے بھی اتنا ہی کہا تھا۔ ''میرا پاؤں پھسل گیا تھا۔''

اس نے نہیں بتایا تھا کہ پاؤں کیوں پھسلا تھا۔ چکنے فرش پر اگر شیمپو پھیلا دیا جائے تو پیر گرنے سے نہیں بچا جا سکتا۔ اس صورت میں کہ ہاتھ میں ابلتے پانی سے بھرا برتن بھی ہو۔ آسیہ نے صابرہ اور بابرہ سے بھی نظریں نہیں پھیری تھیں' وہ ان سے بڑے نارمل انداز میں ملی تھی وہ انہیں ہوشیار نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن اس کا دماغ اب بہت تیزی سے کام کر رہا تھا' وہ اب کچھ کر گزرنا چاہتی تھی اور کیا کرنا تھا' یہ وہ سوچ چکی تھی۔

آسیہ نے صحت یاب ہو کر پکنک کا پروگرام بنایا۔ اس نے دو تین جگہوں کے نام لئے۔ صابرہ اور بابرہ نے جھیل پر جانے کی خواہش ظاہر کی۔ دیگر جگہوں پر تو وہ آئے دن جاتی رہتی تھیں۔ اس مرتبہ ذرا کچھ دور چلنے کا پروگرام بنایا۔ آسیہ بھی یہی چاہتی تھی کہ جھیل پر جایا جائے۔

لطافت علی کو بھلا پکنک پر جانے پر کیا اعتراض ہو سکتا تھا' وہ خوشی سے راضی ہو گیا' وہ تو آسیہ کو خوش کرنے کے بہانے ڈھونڈا کرتا تھا لیکن ایک مسئلہ تھا۔ کیونکہ معاملہ دور کا تھا لہٰذا اس نے طے کیا کہ کسی ایسے آدمی کو ساتھ لیا جائے جو ڈرائیونگ بھی جانتا ہو تا کہ لطافت علی کو لمبی مسافت کی وجہ سے ڈرائیونگ کرتے ہوئے تھکن نہ ہو جائے۔

لطافت علی کسی ڈرائیور کو ساتھ لے جانا چاہتے تھے لیکن آسیہ نے اس کی مخالفت کی ''وہ نہیں آئے گا' گاڑی میں کوئی غیر آدمی بیٹھا ہو تو گفتگو میں احتیاط کرنا پڑتی ہے۔ صابرہ اور بابرہ بھی بندھی بیٹھی رہیں گی۔ آپ کو معلوم ہے کہ انہیں بولے بغیر چین کہاں؟''

''ہاں' یہ بات تو تم ٹھیک کہہ رہی ہو' غیر آدمی کے سامنے ایک تکلف سا پیدا ہو جاتا ہے پھر کیا کریں۔ ویسے ایک آدمی کا ہونا ہمارے ساتھ ضروری ہے۔ ٹائر پنکچر ہو جائے' گاڑی میں کوئی خرابی پیدا ہو جاتے تو میں تم لوگوں کو کس پر اکیلا چھوڑوں گا پھر اتنی لمبی ڈرائیونگ سے مجھے تھکن ہو جائے گی۔'' لطافت علی نے کہا۔

''تو وقار کو ساتھ لے لیتے ہیں'' آسیہ نے تجویز پیش کی۔

''ارے ہاں' اس بات پر تو میں نے غور ہی نہیں کیا' اس کو کہتے ہیں بچہ بغل میں

''آپ یوں کریں'' وہ لطافت علی کی بات کاٹ کر بولی۔

''اسے کہہ دیں کہ وہ رات کو ادھر ہی آ جائے۔ صبح ہی نکلنا ہے۔ تو اسے گھر سے آنے میں دقت ہو گی''

''ٹھیک ہے' میں کہہ دوں گا' تم بھی اس سے فون پر بات کر لینا۔''

جب آسیہ کی زبانی ان دونوں کو معلوم ہوا کہ وقار بھی ساتھ چل رہا ہے تو وہ حسب معمول سر جوڑ کر بیٹھیں اور مکالمہ شروع ہوا۔

''اری صابرہ!''

''ہاں بھئی بابرہ''

''کچھ سنا تم نے' وہ وقار بھی ہمارے ساتھ جا رہا ہے۔''

''اس کی کیا وجہ ہے؟'' صابرہ نے سوال کیا۔

''اس کی بظاہر وجہ تو ہمارے ڈیڈی ہیں' وہ ڈرائیونگ میں اپنی مدد کے لئے ایک آدمی اپنے ساتھ رکھنا چاہتے تھے۔'' بابرہ نے جواب دیا۔

''تو کوئی ڈرائیور لے لیتے۔''

''آسیہ نے منع کر دیا کہ اس کی موجودگی سے خواہ مخواہ تکلف پیدا ہو جائے گا' اس وجہ سے وقار کو لیا گیا ہے۔''

''تو وقار سے ہماری ایسی کون سی بے تکلفی ہے' ہمارے لئے تو وقار اور ڈرائیور ایک جیسے ہیں۔''

''لیکن ان کی بے تکلفی تو ہے۔'' وہ ہنسی' اس ہنسی میں ہزار معنی پنہاں تھے۔

''یہ آسیہ کیا کھیل' کھیل رہی ہے' کہیں کوئی شادی وادی کا چکر تو نہیں چلا رہی؟''

''کس کی شادی؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''وقار کی شادی؟''

''تو ہمیں کیا پریشانی ہے' ضرور کروائے''

''پریشانی کا تو اس وقت تک پتا چلے گا' جب اس کی شادی ہم میں سے کسی کے ساتھ ہو گی۔''

''اوہ.....!'' تب اچانک بابرہ کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں۔ ''اس طرف تو میں نے دھیان ہی نہیں دیا۔ اچھا تو اس لئے انہوں نے وقار کو ساتھ لیا ہے کہ وہ اسے ہم سے بے تکلف کرنا چاہتی ہیں اوہ مائی گاڈ! یہ عورت کتنی لومڑی ہے' اس نے ہمارے باپ کو پھنسایا' اب ہمیں پھنسانے کے چکر میں ہے' خیر کوئی بات نہیں' ہم نمٹ لیں گے آسیہ سے بھی اور اس کے بھتیجے وقار سے بھی۔''

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

لیکن یہ کام اتنا آسان نہ تھا۔ کہنے اور کرنے میں بڑا فرق ہوتا ہے' جو گرجتے ہیں وہ برستے نہیں اور جو برستے ہیں' وہ گرجتے نہیں' آسیہ نے طے کر لیا تھا کہ وہ گرجے گی نہیں برسے گی' وہ ڈنٹنے کی دھمکی نہیں دے گی' ڈنٹ کر دکھائے گی۔

پکنک کی تیاری بڑے زور و شور سے کی گئی' پھر صبح ہی صبح یہ چھوٹا سا قافلہ جھیل کی سیر کو نکل پڑا۔

ڈرائیونگ سیٹ وقار نے سنبھال لی۔ لطافت علی نے منع بھی کیا کہ ابھی کچھ دیر میں گاڑی چلاتا ہوں مگر وہ نہ مانا اور بولا۔

"ارے نہیں' میرے ہوتے آپ کو گاڑی چلانے کی کیا ضرورت ہے۔"

لطافت علی وقار کی اس سعادت مندی سے بہت خوش ہوا۔ صابرہ اور بابرہ نے ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ وہ دونوں پچھلی سیٹ پر تھیں' ان کے ساتھ آسیہ تھی اور آگے وقار کے برابر والی سیٹ پر لطافت علی براجمان تھے۔

سفر ہنسی خوشی باتیں کرتے گزر گیا۔ لطافت علی کو سیکڑوں لطیفے یاد تھے۔ وہ راستے بھر لطیفے سناتے رہے۔ ہنس ہنس کے سب کے پیٹ میں بل پڑ گئے۔ ہلکی آواز سے کیسٹ پلیئر بھی چلتا رہا۔ صابرہ اور بابرہ اپنی پسند کے گانے سنتی رہیں۔ راستے میں آسیہ نے کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ وہ گھوم پھر کر وقار پر آ جاتی اور اس کی اچھائی کا کوئی نہ کوئی پہلو اجاگر کرنے کی کوشش کرتی۔ لطافت علی فوراً آسیہ کی تائید کرتے۔ باپ کو گردن ہلاتے دیکھ کر صابرہ' بابرہ کے کہنی مارتی اور وہ دونوں ایک دوسرے کو ہنس کر دیکھتیں اور خاموش ہو جاتیں۔

ان کے ذہنوں میں یہ بات پختہ ہوتی جا رہی تھی کہ آسیہ' وقار کی شادی کا چکر چلا رہی ہے۔ وہ آہستہ آہستہ لطافت علی کو شیشے میں اتارتی جا رہی تھی اور وہ شیشے میں اترتے جا رہے تھے کئی مرتبہ انہوں نے خود بھی وقار کے اخلاق اور کام کی تعریف کی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ وہ اگر اسی لگن اور محنت سے کام کرتا رہا تو بہت جلد صادق قریشی کی جگہ لے لے گا۔

لیکن ان دونوں نے بھی سوچ لیا تھا کہ اگر ڈیڈی نے ان میں سے کسی کی شادی وقار سے کرنے کی کوشش کی تو وہ بہت صفائی سے انکار کر دیں گی وہ کہہ دیں گی "ہم اس غنڈے سے ہرگز شادی نہیں کریں گے" وقار ان دونوں کو شکل ہی سے غنڈہ دکھائی دیتا تھا۔ وہ اس سے کسی قیمت پر شادی کرنے کو تیار نہ تھیں۔

تین چار گھنٹے کے سفر کے بعد آخر وہ لوگ منزل مقصود پر پہنچ گئے۔ ایک مناسب جگہ تلاش کر کے انہوں نے وہیں اپنا ڈیرا جمایا۔ گاڑی سے کھانے پینے کا سامان نکال کر رکھا۔ سب کو بھوک لگ رہی تھی۔ چولہا جلایا گیا اور جلدی جلدی کباب گرم کئے گئے۔

پھر کھانے سے فارغ ہو کر آسیہ' بابرہ کے انداز میں صابرہ سے مخاطب ہوئی۔

"اری صابرہ!"

صابرہ یہ سن کر مسکرائی اور بولی "جی"

"بھئی' کشتی کی سیر نہیں کرنی؟"

"کرنی ہے"

"تو پھر تم لوگ جاؤ"

"کیوں' آپ نہیں کریں گی سیر؟"

"نہیں بھئی' مجھے پانی سے بڑا ڈر لگتا ہے" آسیہ نے لرزتی آواز میں کہا۔ "ہاں اپنے دیدی کو ساتھ لے جاؤ۔"

جب بیگم نے جانے سے انکار کر دیا تھا تو وہ کشتی میں بیٹھنے کی ہامی کیسے بھرتے۔ فوراً بولے "نہیں بھئی' میں یہیں ٹھیک ہوں' میں تم لوگوں کو سیر کرتا ہوا دیکھوں گا۔"

"کشتی کون چلائے گا؟"

"وقار کو لے جاؤ"

"انہیں آتی ہے کشتی چلانا۔"

"ہاں' کیوں نہیں' یہ تو کشتی چلانے کا بڑا ماہر ہے' اس نے اس سلسلے میں کئی انعام....."

اس سے پہلے کہ آسیہ' وقار کی شان میں کوئی لمبی چوڑا قصیدہ پیش کرتی' بابرہ اس کی بات کاٹ کر وقار سے مخاطب ہوئی "آیئے وقار بھائی۔"

وقار فوراً اٹھ گیا اور جھیل کی طرف چل دیا۔ وہاں کئی کشتیاں کنارے پر کھڑی تھیں۔ ان سے دو چار قدم آگے ہوا تو بابرہ آہستہ سے بولی

"اری صابرہ!"

"ہاں بھئی بابرہ"

"ہم کشتی میں بیٹھ کر کیوں نہ اس کا ذہن صاف کر دیں.....؟" بابرہ بولی۔

"میں بھی یہی سوچ رہی ہوں' اس لئے تو میں فوراً کشتی کی سیر کو تیار ہو گئی تھی۔"

"کہیں گے کیا؟"

"کسی طرح اس کو یہ بتا دینا ہے کہ ہم اس منحوس صورت سے کسی قیمت پر شادی نہیں کریں گے' اگر اس طرح کا کوئی خواب یہ یا اس کی بہن دیکھ رہی ہے تو فوراً جاگ جائے۔"

کشتی میں بیٹھ کر وہ یہ سب باتیں نہ کر پائیں۔ ان کا خیال تھا کہ وقار کشتی کی سیر کے دوران ان سے بے تکلف ہونے کی کوشش کرے گا تو وہ اسے صاف صاف لفظوں میں سمجھا دیں گی لیکن خلاف توقع وقار نے ان سے ایک لفظ بھی نہ کہا بلکہ کشتی چلاتے ہوئے اس کی نگاہیں بھی ان دونوں سے نہ ٹکرائیں حالانکہ وہ اس کے سامنے تین فٹ کے فاصلے پر بیٹھیں ہوئی تھیں۔

وقار کی نگاہیں سامنے ہی تھیں لیکن وہ افق کے اس پار دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کا چہرہ کچھ عجیب سا ہو رہا تھا۔ چہرے پر کچھ الجھن سی تھی۔

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

اب کشتی جھیل کے درمیان میں تھی۔ صابرہ اور بابرہ بار بار ایک دوسرے کو دیکھتی تھیں مگر ان میں وقار سے کچھ کہنے کی ہمت پیدا نہیں ہو رہی تھی وہ بھی الجھی ہوئی تھیں۔ تب پھر وہ ہوا جس کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھیں۔

وہ کشتی چلاتے ہوئے اچانک کھڑا ہو گیا اس کے کھڑے ہونے سے چھوٹی سی کشتی ڈول گئی۔ صابرہ اور بابرہ نے خوفزدہ ہو کر کشتی کے کنارے پکڑ لئے۔ بابرہ بولی "وقار بھائی! کیا کر رہے ہیں' کشتی بیٹھ کر چلائیں۔ کہیں ہم گر نہ جائیں۔"

"پریشان مت ہو' کشتی الٹے گی تو میں بھی تمہارے ساتھ گروں گا' تم لوگوں کو تیرنا تو آتا ہو گا؟"

"نہیں' ہمیں تیرنا نہیں آتا' آپ بیٹھ جائیں۔" بابرہ نے گھبرا کر کہا۔

"کشتی کھڑے ہو کر اچھی طرح چلتی ہے' اب میں تمہیں کشتی کو اسپیڈ سے چلا کر دکھاتا ہوں۔"

"خدا کے واسطے وقار بھائی' آپ بیٹھ جائیں' آرام سے کشتی چلائیں' ہم آپ کی مہارت کے ویسے ہی قائل ہو گئے ہیں" صابرہ نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

"نہیں' ابھی تم لوگ میری مہارت کے کیسے قائل ہو سکتے ہو' جب تک میں کشتی کو اسپیڈ سے چلا کر نہ دکھاؤں" یہ کہہ کر اس نے دونوں ہاتھوں میں چپو اٹھائے اور جھک کر پانی میں ڈالے تبھی کچھ ہوا۔

دیکھنے والوں نے دیکھا کہ وقار کا توازن بگڑا اور وہ کشتی سے پانی میں جا گرا پانی میں گرتے ہوئے اس نے سنبھلنے کی خاطر کشتی کا کنارہ پکڑا۔ کنارا پکڑتے ہی کشتی بھی غیر متوازن ہوئی اور ایک طرف کو جھکتی چلی گئی۔ کشتی جھکنے سے صابرہ اور بابرہ بھی اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکیں۔

وہ دونوں ایک ساتھ چیخیں۔ ان کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں اور وہ موت کو اتنا نزدیک دیکھ کر اپنے حواس کھو بیٹھیں۔

وہ دونوں اچھل کر پانی میں گریں۔ کشتی الٹ چکی تھی اور ایک سنگین حادثہ پیش آ چکا تھا۔

اس المناک واقعہ میں صابرہ اور بابرہ دونوں جاں بحق ہو گئیں وقار بچ گیا اگرچہ اس نے ان دونوں بہنوں کو بھی بچانے کی کوشش کی لیکن یہ کوشش اس وقت شروع ہوئی جب اچھا خاصا پانی ان کے پیٹوں میں جا چکا تھا۔ جب تک وہ ان دونوں کو ایک ایک کر کے جھیل سے نکال کر لایا تب تک ان کی روحیں پرواز کر چکی تھیں۔

صابرہ اور بابرہ کی لاشیں دیکھ کر بظاہر آسیہ بے اختیار ان کی لاشوں سے لپٹ گئی اور خوب دھاڑیں مار مار کر روئی لیکن وہ اندر ہی اندر خوب دھاڑیں مار مار کر ہنس رہی تھی۔

پھر یہ بات دو ماہ بعد کی ہے۔ لطافت علی کا غم ہلکا ہو چکا تھا اس نے اس المناک حادثے کو مقدر سمجھ کر صبر کر لیا تھا۔ وہ اپنے بیڈ روم میں لیٹا ہوا سونے کی کوشش کر رہا تھا۔ آسیہ اس

کے برابر بیٹھی سائڈ لیمپ جلائے کوئی رسالہ پڑھنے میں مشغول تھی۔

اچانک اس نے اس رسالے کو دور پھینکا اور لطافت علی سے مخاطب ہوئی کر بولی۔ "سنو"

لطافت علی نے فوراً کروٹ بدلی اور اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ہوں"۔

"یہ جو پچھلے زمانے میں ضرب المثال اور کہاوتیں بنتی تھیں تو ان کے پیچھے صدیوں کا تجربہ ہوتا تھا' یونہی تو کوئی بات مشہور نہیں ہو جاتی۔"

"کیا کہنا چاہ رہی ہو' میں سمجھا نہیں"

"تم نے وہ ضرب المثل سنی ہے' سو سنار کی ایک لوہار کی۔"

"ہاں سنی ہے۔"

"بے چارہ سنار ٹھک ٹھک کر کے ضربیں لگاتا رہتا ہے۔ تو کسی کا کچھ نہیں بگاڑ پاتا۔ کچھ لوگ زندگی میں بھی اسی طرح کا رویہ اختیار کر لیتے ہیں' وہ نہیں جانتے کہ سنار کی سو ضربوں کے برابر لوہار کی ایک ضرب ہوتی ہے۔ جب لوہار اپنی ضرب لگاتا ہے تو پھر کچھ باقی نہیں بچتا۔" یہ کہہ کر آسیہ ہنسنے لگی۔"

بات لطافت علی کی سمجھ میں نہ آئی لیکن انہوں نے اس سے کچھ نہ پوچھا۔ خود ہی اندازہ کر لیا کہ آسیہ نے رسالے میں کوئی کہانی پڑھی ہے' اسی کے حوالے سے بات کر رہی ہے' وہ اس وقت کہانی سننے کے موڈ میں نہ تھے' اس لئے انہوں نے بات آگے نہ بڑھائی اور پھر کروٹ لے کر سونے کی کوشش کرنے لگے۔

لیکن بات بہت آگے جا چکی تھی۔ آسیہ اور وقار نے خوشگوار زندگی گزارنے کی منصوبہ بندی کر لی تھی۔ اب وہ دونوں اس منصوبے پر تیزی سے عمل پیرا تھے۔

لطافت علی کو کچھ پتا نہ تھا کہ کیا' ہو رہا ہے اور آگے کیا ہونے والا ہے۔

☆.....☆.....☆

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

وہ دِن

فائزہ جب نہا کر گنگناتی کمرے میں داخل ہوئی تو طارق اس کی تصویر کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا جو سامنے دیوار پر لگی ہوئی تھی۔ اس کی یہ محویت فائزہ کی گنگناہٹ سے بھی نہ ٹوٹی۔

وہ ایک دلہن کی تصویر تھی جو سر جھکائے' پلکوں میں خواب سجائے' ہونٹوں پر زندگی رچائے' ہلکا سا گھونگھٹ نکالے اندیشے اور وسوسے چھپائے سنہری فریم میں جڑی ہوئی تھی۔

فائزہ بالوں کو جھٹکتے جھٹکتے ایک دم رک گئی۔ مسکرا کر پہلے اپنی تصویر کو دیکھا پھر طارق کو دیکھا۔ تب اسے احساس ہوا کہ طارق کی نظریں ضرور اس کی تصویر پر گڑی ہیں' لیکن دماغ کہیں اور ہے۔

یہ طارق کی پرانی عادت تھی۔ وہ اسی طرح چیزوں کو دیکھتے دیکھتے غائب ہو جاتا۔ بات کرتے کرتے بھول جاتا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ کیسٹ پر گانے سنتے سنتے سوچ کے پنجرے میں بند ہو جاتا۔

"طارق۔" فائزہ نے آئینے میں اسے دیکھتے ہوئے' پیار بھرے لہجے میں پکارا۔

"ہوں۔" طارق نے مسکرا کر کہا۔

"دیوار والی دلہن کیا مجھ سے اچھی ہے؟" فائزہ نے تولیہ کندھے پر پھیلایا۔

"آؤ میرے پاس۔" طارق کی آنکھوں میں رنگ بھرنے لگے۔

"اچھا۔ زیادہ بدتمیزی پر نہ اترو۔" یہ فائزہ کا ایک خاص جملہ تھا' وہ اس جملے کو ہمیشہ ایسے وقت بولتی جب طارق کو یہ بتانا مقصود ہوتا کہ وہ اس سے کتنی محبت کرتی ہے۔

محبت کی کوئی زبان نہیں ہوتی۔ بعض وقت لفظوں کا تیکھا پن اور لہجے کی بدتہذیبی پیار کا سر بن جاتی ہے۔

"آج کا پروگرام کیا ہے؟" طارق نے پوچھا۔

"سنو' آج دفتر سے چھٹی کیوں نہیں کر لیتے۔" فائزہ بولی۔

"نہیں' دفتر جانا ضروری ہے۔ ویسے میں ایک بجے تک آ جاؤں گا۔ کھانا باہر سے لیتا آؤں گا۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟"

"نہیں میں کھانا خود بناؤں گی۔" فائزہ نے بالوں میں برش کرتے کرتے اسے گہری

نظروں سے دیکھا۔

طارق نے فائزہ کی بات نہیں سنی' وہ ان کالی آنکھوں کی گہرائی میں ڈوب گیا اور سوچنے لگا کہ عورت کتنی گہری ہوتی ہے' اس کی وفا' اس کی بے وفائی' اس کی محبت' اس کی مکاری' اس کا چلتر سمجھ جانے کے لیے مرد کو ہزاروں سال چاہئیں۔ عورت' مرد کو آسانی سے دھوکا دے سکتی ہے' کیونکہ مرد کو عورت کی آنکھ کی پہچان نہیں ہوتی۔ جب کہ مرد کا دھوکا دینا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ عورت نہ صرف مرد کی نظریں پہچانتی ہے بلکہ اس کے جسم سے اٹھتی پرائی خوشبوئیں بھی محسوس کر لیتی ہے۔ وہ بیوی تو شوہر کے ایک ایک تیور سے واقف ہوتی ہے۔

طارق نے جانے کیا سوچ کر ایک گہرا اور ٹھنڈا سانس لیا۔

"کیوں' میرے ہاتھ کا کھانا پسند نہیں۔" فائزہ نے اس کے گہرے اور ٹھنڈے سانس کا کچھ اور ہی مطلب نکالنا چاہا۔

"ہاں' جب شہد میں مرچیں شامل کر دی جائیں تو پھر شہد کیسے اچھا لگے۔" طارق کا بے اختیار جی چاہا کہ وہ یہ بات بہ آواز بلند کہہ دے' لیکن اس نے کہا نہیں۔ بڑے ضبط سے کام لیا' صورت کا تقاضا یہی تھا۔

"نہیں' یہ بات نہیں..... تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میں تمہارے ہاتھوں کو کس قدر پسند کرتا ہوں' پھر ان ہاتھوں سے پکے کھانے کو کس طرح ناپسند کروں گا۔" طارق نے اپنے لہجے میں حواس بھر کر کہا۔

تب اسے احساس ہوا کہ اداکاری دراصل مکاری کا دوسرا نام ہے۔ اپنے وجود پر دوسرے وجود کو طاری کر کے جو کچھ کہا جائے وہ اداکاری ہو جاتی ہے۔

باتھ روم کا دروازہ بند ہونے کی آواز سن کر فائزہ اپنے اصل روپ میں آ گئی۔ اس نے آئینے میں اپنی مکار آنکھوں کو دیکھا' شاطرانہ انداز میں مسکرائی اور زیرلب بولی۔ "گدھا۔"

تب اسے احساس ہوا کہ اداکاری دراصل روپ بدلنے کا نام ہے۔ اپنے چہرے سے کردار اتار کر اصل چہرے کے ساتھ سامنے آنے کا نام۔

طارق باتھ روم سے نہا کر نکلا' تب تک فائزہ ناشتا تیار کر چکی تھی۔

دونوں نے ناشتا خاموشی سے کیا' کوئی بات نہ ہوئی۔ طارق نے ایک دو بار اس کے چہرے کو دیکھا' وہ کیتلی سے چائے پیالی میں ڈال رہی تھی۔ اس کے کھلے بال چہرے پر پڑے ہوئے تھے۔ گھنے سیاہ ریشمی بال' گوری رنگت' ہونٹوں پر دھیمی دھیمی مسکراہٹ' چہرے پر دل موہ لینے والی معصومیت۔ طارق نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے سوچا۔ کاش اس وقت یہ جتنی معصوم نظر آ رہی ہے' ویسی ہی ہوتی تو اسے یہ سب کچھ نہ کرنا پڑتا۔ ایک انتہائی قدم جو وہ اٹھانے جا رہا تھا' وہ نہ اٹھاتا۔

فائزہ حسب معمول اسے دروازے تک چھوڑنے آئی۔ میٹھی آواز میں "خدا حافظ" کہا۔

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

پھر اسے سیڑھیاں اترتے دیکھتی رہی۔ زینے کے موڑ پر طارق نے اسے پلٹ کر دیکھا۔ ہاتھ ہلایا اور پھر سیڑھیوں میں گم ہو گیا۔

فائزہ نے ایک ٹھنڈا اور گہرا سانس لیا اور اپنی زلفوں کو جھٹک کر دروازہ بند کر لیا۔

پھر اس نے جلدی جلدی گھر کے کام نبٹائے۔ ٹوکری اٹھائی۔ پرس ہاتھ میں پکڑا اور دروازے کو تالا لگا کر زینہ اترنے لگی۔

سودے سلف سے فارغ ہو کر اس نے کیسٹ کی دکان کا رخ کیا۔

"فون کرنا تھا۔" فائزہ نے اپنی مسکراہٹ کا جال پھینکا۔ "کر لیں۔" دکاندار نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

فائزہ نے دھڑکتے دل سے نمبر ڈائل کیے اور ریسیور کو مضبوطی سے پکڑ لیا تاکہ انگلیوں کی لرزش پر قابو پایا جا سکے۔

"ہیلو۔" ادھر سے جواب آیا۔ فائزہ نے آواز پہچاننے کی کوشش کی۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ فون پر وہی ہے تو اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"میں بول رہی ہوں۔"

"ارے فائزہ تم..... بھئی تم نے بڑے اچھے وقت پر فون کیا' میں تمہیں یاد ہی کر رہا تھا۔"

"اسے کہتے ہیں سفید جھوٹ۔"

"ارے نہیں۔ کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے۔ اچھا یہ بتاؤ ٹیلی فون کہاں سے کر رہی ہو۔"

"جہاں سے کیا جا سکتا ہے۔" فائزہ نے دکاندار کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جو دوائیں رکھنے میں مصروف تھا۔

"کسی دکان سے۔"

"ظاہر ہے۔"

فائزہ نے جواب دیا۔

"آج تمہاری شادی کی سالگرہ ہے؟" ادھر سے پوچھا گیا۔

"ہاں۔"

"مبارک ہو۔"

"اچھا' فضول بات مجھے پسند نہیں۔" فائزہ نے دھیرے سے کہا۔ "تمہیں کیسے پتا چلا؟"

"کس بات کا۔"

"جس بات کی تم مبارک باد دے رہے ہو۔"

"بھئی' تمہارے صاحب نے بتایا تھا۔ کل ہوئی تھی ان سے فون پر بات۔"

"اچھا' یہ بات ہے!"

"صاحب تو آج گھر پر ہی ہوں گے۔" ادھر سے سوال ہوا۔

"نہیں۔"

"کیا آج کے دن بھی وہ بے وقوف دفتر گیا ہے!"

"ہاں۔" فائزہ نے اپنے لہجے میں مٹھاس بھرتے ہوئے کہا۔

"ارے! کیوں؟"

"ضروری کام تھا۔ ایک بجے تک واپس آ جائیں گے۔"

"اچھا' یہ بات ہے..... پھر تمہارا کیا پروگرام ہے؟"

"تم جانتے ہو۔"

"میں آؤں؟" ادھر سے پوچھا گیا۔

"صاف ظاہر ہے۔"

"ٹھیک ہے' پھر میرا انتظار کرو۔" یہ کہہ کر دوسری طرف سے ریسیور رکھ دیا گیا۔

فائزہ نے مسکراتے ہوئے ریسیور کریڈل پر رکھا۔ کال کے پیسے ادا کیے اور تیز تیز قدموں سے اپنے گھر کی طرف چل دی۔

☆.....☆.....☆

دروازے پر جب مخصوص دستک ہوئی تو فائزہ کو یہ اندازہ کرنے میں دیر نہ لگی کہ آنے والا کون ہے؟ اس نے بھاگ کر دروازہ کھولا۔

آنے والا وہی تھا جس کا اسے انتظار تھا۔

"جلدی اندر آؤ۔" فائزہ نے اس کے لیے راستہ چھوڑتے ہوئے کہا۔

"کیوں' باہر کوئی طوفان آنے والا ہے؟"

"کوئی اگر دیکھ لے تو" فائزہ نے دروازہ بند کرتے ہوئے اسے مسکرا کر دیکھا۔

"پڑوسیوں کو ان باتوں کی کہاں پروا ہے۔"

"یہ تم ٹھیک کہتے ہو۔ ہر شخص اپنی ذات میں مگن ہے۔ سمٹ کر رہ گیا ہے۔ اتنا مصروف کہ اسے ادھر ادھر دیکھنے کی فرصت ہی نہیں۔"

"اچھا ہی ہے ورنہ ہم جیسے لوگوں کا کیا بنتا ہے۔"

"ایک بات بتاؤ' دفتر میں کچھ بندوبست کر کے آئے ہو؟"

"کس چیز کا؟"

"طارق اگر تمہیں ٹیلی فون کرے تو؟" فائزہ نے تشویش سے کہا۔

"میں اپنی سیکرٹری کو سمجھا آیا ہوں کہ اس نے کس کو کیا جواب دینا ہے۔ تم مطمئن رہو۔ وہ ہرگز اس بات کا اندازہ نہیں ہو گا کہ میں یہاں ہوں۔"

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

"اور اگر وہ کسی وجہ سے جلد گھر آ جائے تو؟" فائزہ نے اندیشہ ظاہر کیا۔

"اس کی ذمے دار تم ہو گی۔" اس نے بڑے اطمینان سے بیڈ پر نیم دراز ہوتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے' تم فکر نہ کرو' میں سنبھال لوں گی۔"

"اچھا' اب وہ بات کرو جس بات کے لیے تم نے مجھے یہاں بلایا ہے۔"

"جانے آج مجھے کیوں ڈر لگ رہا ہے۔" وہ بیڈ سے اٹھتے ہوئے بولی۔

تب ہی دروازے پر لگی گھنٹی کے بٹن پر کسی نے ہاتھ رکھا۔

گھنٹی کی آواز سن کر دونوں کے ہوش اڑ گئے۔ چہرے فق ہو گئے۔

"اب کیا ہو گا؟"

"تم ایسا کرو' باتھ روم میں چلے جاؤ۔ میں دیکھتی ہوں' دروازے پر کون ہے؟"

"اگر طارق ہوا؟"

"اگر طارق ہوا تو میں اسے باتوں میں لگا لوں گی۔ باہر کا دروازہ کھلا چھوڑ دوں گی۔ تم باتھ روم کا دروازہ کھول کر آرام سے نکل جانا۔"

ایک بار پھر گھنٹی بجی اور وہ فکرمند چہرہ لیے باتھ روم میں چلا گیا۔

فائزہ نے اپنی گھبراہٹ پر کنٹرول کیا اور مسکراتے ہوئے دروازہ کھولا۔

دروازے پر ایک سیلز گرل کھڑی تھی۔ کسی اور وقت سیلز گرل آئی ہوتی تو وہ بڑی خفگی پیشانی سے اس سے ملتی جو چیز فروخت کر رہی ہوتی' ضرور لے لیتی' لیکن اس وقت' اس نازک وقت میں سیلز گرل کو دروازے پر دیکھ کر اندر ہی اندر اس کے آگ لگ گئی۔

"کہو بی بی۔" فائزہ نے خود پر قابو پانے کی کوشش کی پھر بھی لہجے کی درشتی کو وہ چھپا نہ سکی۔

"آپ مکھن کون سا استعمال کرتی ہیں؟" سیلز گرل نے سوال کیا۔

"ہم کوئی مکھن استعمال نہیں کرتے۔ بغیر مکھن کے کام چلا لیتے ہیں۔" اس نے چڑ کر جواب دیا۔

"پھر تو آپ بڑی ذہین خاتون ہیں۔" سیلز گرل نے اس کی بات کا جانے کیا مطلب لیا۔

"آپ کے پاس جو مکھن ہے وہ مجھے دے دیں اور پیسے بتائیں۔" فائزہ نے اسے زیادہ بات کرنے کا موقع نہ دیا۔

سیلز گرل بھی اتنی آسانی سے سودا پٹتے دیکھ کر خوش ہو گئی۔

اس نے فوراً مکھن کے پیکٹ اس کے ہاتھ پر رکھے اور پیسے بتائے۔

"ایک منٹ۔" یہ کہہ کر اس نے دروازہ بند کر دیا۔

پھر اس نے باتھ روم کے دروازے پر دستک دی' اس نے ڈرتے ڈرتے دروازہ کھولا

"کون تھا؟"

"کوئی نہیں..... تم بیڈ روم میں چلو' میں آ کر بتاتی ہوں۔"

فائزہ نے پرس سے پیسے نکالے' دروازہ بند کر لیا۔

پھر وہ مسکراتی ہوئی بیڈ روم میں داخل ہوئی۔

"ایک سیلز گرل تھی' مکھن فروخت کرنے آئی تھی۔"

"پھر تم نے لے لیا۔"

"ہاں' جلدی سے جان چھڑا لی۔"

"لیکن ہمیں تو مکھن کی ضرورت نہیں۔" اس نے کہا۔

"اب تو لے لیا' پڑا رہے گا۔ وقت بے وقت کام آ جائے گا۔ اچھا یہ بتاؤ' تمہارے لیے بناؤں' چائے یا کافی؟"

"کچھ مت بناؤ..... بس مجھے بے وقوف بناؤ۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

"بنے بنائے کو میں کیا بے وقوف بناؤں گی۔" فائزہ نے ہنس کر کہا۔

تب اس نے فائزہ کے بال مٹھی میں بھر لیے اور انہیں کھینچتے ہوئے بولا۔ "تو میں بے وقوف ہوں۔"

"بنا بنایا۔" فائزہ نے شرارت سے کہا "اچھا میرے بال تو چھوڑو۔"

پہلے میری طرف دیکھو"

"تو فائزہ نے اس کی طرف دیکھا۔ پھر بولی..... "آج صبح معلوم ہے کیا ہوا؟"

"ہوں۔"

"وہ اس تصویر کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ کچھ عجیب انداز تھا اس کے دیکھنے کا۔" فائزہ تصویر کو دیکھتے ہوئے بولی۔

"اسے تم سے بڑی محبت ہے شاید۔"

"ہاں' شاید۔" پھر فائزہ نے فوراً رخ بدلا۔ "تمہیں بھی مجھ سے محبت ہے یا نہیں؟"

"نہیں' بالکل نہیں"

"دیکھو' میں سنجیدہ ہوں۔"

"میں کب مذاق کر رہا ہوں۔"

"تو پھر بتاؤ نا۔"

"یہ کوئی بتانے والی بات ہے..... کیا تم نہیں جانتیں؟"

"میں تو بس اتنا ہی جانتی ہوں کہ فریب دے رہی ہوں اور فریب کھا رہی ہوں۔ اب سے ڈرنے لگی ہوں' کانپنے لگی ہوں۔ جانے میرا کیا انجام ہونے والا ہے۔ تم ایسا کیوں نہیں

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

کرتے' مجھ سے شادی کیوں نہیں کر لیتے۔"

"تم جانتی ہو کہ میں پہلے سے ہی شادی شدہ ہوں۔"

"وہ تو میں بھی ہوں۔"

"میرے بچے ہیں۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا اس بات سے؟"

"دیکھو فائزہ تم یہ کیا فضول بحث لے کر بیٹھ گئیں۔ لائف کو انجوائے کرو۔"

"میں تم سے ایک بات پوچھ رہی ہوں۔ مجھے اس کا صاف صاف جواب چاہئے۔ اب میں زیادہ فریب نہیں کھا سکتی۔ تم اپنی بیوی کو طلاق دو گے یا نہیں؟"

"فائزہ' فائزہ..... یہ آج تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ اچھا یہ بتاؤ' آج تم اپنی شادی کی سالگرہ کس طرح منا رہی ہو؟" اس نے بات کو ٹالنا چاہا۔

"میں نے تم سے جو پوچھا ہے' اس کا جواب دو۔" فائزہ نے بات نہ ٹالنے دی۔

"ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ میری بیوی میرے کاروبار کی مالک ہے' میں نے اسے طلاق دے دی تو میں کہیں کا نہیں رہوں گا۔ دیکھو فائزہ' یہ سب کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ہمیں ویسے ہی سب کچھ حاصل ہے۔"

"یہ میری بے وقوفی تھی جو تمہیں سب کچھ حاصل ہو گیا۔ میں تمہاری چکنی چپڑی باتوں میں آ گئی۔ میں نے اپنے معصوم شوہر کے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی۔ اسے فریب دیا اور اب تک دیتی رہی ہوں' آج کے دن تک جب کہ ہماری شادی کی سالگرہ ہے۔ میں کتنی ذلیل ہوں' کمینی ہوں اور کچھ کم ذلیل تم بھی نہیں۔ تم نے اپنے دوست کی بیوی پر جال پھینکا۔ کتنے کمینے ہو تم' نکل جاؤ یہاں سے' میں کہتی ہوں فوراً نکل جاؤ یہاں سے' ورنہ میں تمہارا خون کر دوں گی۔" فائزہ ایک شیرنی کی طرح بپھر اٹھی۔

وہ ایک دم سٹپٹا گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ اچانک فائزہ کو ہوا کیا۔ وہ ہکا بکا اسے دیکھ رہا تھا۔

"ٹھہرو' تم اس طرح نہیں جاؤ گے۔" یہ کہہ کر وہ باورچی خانے میں گئی اور وہاں سے چمکتی ہوئی بڑی سی چھری اٹھا لائی۔ "چلو نکلو یہاں سے کمینے۔"

اس نے چھری کے اشارے سے اسے دروازے کی طرف دھکیلا۔

اب اس کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ خاموشی سے سر جھکائے اس گھر سے نکل جائے اور آئندہ اس طرف کا کبھی رخ نہ کرے۔

وہ ہارے ہوئے جواری کی طرح بہ مشکل اٹھا۔ اس کی سخت توہین ہوئی تھی۔ اس کے جسم سے جیسے جان نکل گئی تھی۔ وہ ڈگمگاتے قدموں سے گھر سے باہر نکل گیا۔ ایک بار اس کا جی چاہا کہ وہ فائزہ کو سمجھائے' اسے رام کرنے کی کوشش کرے' لیکن اس کے ہاتھ میں چھری دیکھ کر سمجھا

بولنے سے باز رہا اور خود ہی سمجھ بوجھ کر گھر سے باہر آ گیا' پھر کبھی نہ لوٹنے کے لیے۔

اس کے جانے کے بعد فائزہ گم صم سی کھڑی رہی۔ کبھی وہ اس لمبی سی چھری کو دیکھتی جو اس کے ہاتھ میں تھی' کبھی اس خالی دروازے کو دیکھتی جہاں سے وہ ابھی گزرا تھا' کبھی اپنی تصویر کو دیکھتی۔ پھر اس نے چھری بیڈ پر پھینکی۔ باہر کا دروازہ ایک جھٹکے سے بند کیا اور بیڈ پر گر کر سسکنے لگی۔

سسکتے سسکتے آنسوؤں کا بند ٹوٹ گیا۔ ضبط کی دیوار گر گئی۔ جذبات بادلوں کی طرح برسنے لگے۔ وہ چیخ چیخ کر رونے لگی۔

"یہ میں نے کیا کیا..... یہ میں نے کیا کیا۔"

پتا نہیں اس کے جانے کا پچھتاوا تھا یا یہ پچھتاوا کہ وہ اب تک ایسا کیوں کرتی رہی۔ شوہر کے ہوتے ہوئے ایک غیر کو اپنا کیوں بنا لیا۔ ایک نا آشنا کو آشنا کیوں کر لیا۔

روتے روتے' چیختے چیختے وہ بے سدھ سی ہو گئی۔

تب اچانک طارق کا چہرہ اس کی نگاہوں میں ابھرا۔

"آہ' طارق! میں تمہاری مجرم ہوں۔ میں نے تمہاری عزت کو بے عزت کیا۔ تمہیں دھوکا دیا' تمہارے احسانوں کو بھی بھول گئی۔ اس وقت کو بھی بھول گئی جب تم نے میرے باپ کی عزت کو بچانے کے لیے مجھ جیسی لڑکی سے شادی کرنے کی حامی بھری تھی۔ تم بہت عظیم ہو اور میں بہت ذلیل ہوں۔ میں آج اس بات کا عہد کرتی ہوں کہ اب میں تمہیں سچی محبت دوں گی' ہمیشہ تمہاری ہو کر رہوں گی اور تمہاری رہ کر ہی مروں گی۔"

یہ عہد کر کے اسے دل کو کچھ سکون سا ہوا' وہ روتے روتے سو گئی۔

فائزہ کے والد احمد میاں' طارق کے سگے ماموں تھے۔ طارق بچپن سے ہی اپنے ماموں کے گھر پلا بڑھا۔ انہوں نے ہی اسے پڑھایا' لکھایا اور برسرروزگار کرایا۔ طارق اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھا۔ یہ تین افراد پر مشتمل گھرانہ خاصا خوشحال تھا۔

تب ایک دن بیٹھے بٹھائے اس گھر کی تقدیر پھوٹی۔ گھر کی خوشیوں کو آگ لگ گئی۔ سکون غائب ہو گئی۔ جہنم بنی۔ ہوا کیا؟

ہوا یہ کہ طارق کے والد امان خاں نے حسب معمول فجر کی نماز سے فارغ ہو کر تلاوت کلام پاک کی اور مسکراتے ہوئے ناشتے کی میز پر آئے اور تازہ اخبار دیکھنے لگے۔ اتنے میں طارق بھی سکول کے لیے تیار ہو کر آ گیا۔ طارق کی امی ابھی باورچی خانے میں تھیں' ناشتے کی تیاری میں مصروف۔

"ابو جی..... السلام علیکم۔"

"آؤ بیٹا..... وعلیکم السلام۔" امان خاں نے اخبار سے نظریں ہٹا کر اپنے بیٹے کو محبت بھری نظروں سے دیکھا' پھر بولے "سکول کے لیے تیار؟"

"جی ابو۔"

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

"اچھا طارق' ایک بات بتاؤ۔"

"جی ابو۔" طارق نے امان خاں کی طرف توجہ سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"لو بھئی' تمہاری امی بھی آ گئیں' گرم گرم ناشتا لے کر۔" امان خاں نے اخبار ایک طرف ڈالتے ہوئے کہا۔ "اب یہ سوال میں تمہاری امی کے سامنے کروں گا۔"

"کون سا سوال؟" امی نے توس پر مکھن لگاتے ہوئے پوچھا۔

"ابو' کچھ پوچھنا چاہ رہے تھے مجھ سے۔"

"اچھا' پھر پوچھیں..... لو بیٹے یہ کھاؤ۔" امی نے اس کے سامنے پلیٹ کھسکائی۔

"شکریہ امی۔" طارق نے کہا۔

"بیٹے' بڑے ہو کر تم کیا بنو گے؟" اس سے پہلے کہ طارق کوئی جواب دیتا' امان خاں دوبارہ بولے۔ "لیکن بیٹے' ڈاکٹر یا انجینئر بننے کی بات مجھ سے نہ کرنا۔ بچوں سے اس طرح کے جواب سن کر مجھے ہرگز خوشی نہیں ہوتی۔"

"کیوں' ڈاکٹر بننا کوئی جرم تو نہیں۔" امی نے مداخلت کی۔

"نہیں..... ڈاکٹر بننا کوئی جرم نہیں' لیکن یہ جواب مجھے بہت آسان لگنے لگا ہے' رٹا رٹایا سا....."

"اچھا' چلیے پھر آپ خود بتائیے کہ بیٹے کو کیا بنانا چاہتے ہیں؟"

"میں ابو' پائلٹ بنوں گا۔"

"ہاں' پائلٹ بننا برا نہیں' لیکن میں تمہیں قوم کے جہاز کا پائلٹ بنانا چاہتا ہوں۔"

"وہ کیا ہوتا ہے ابو؟"

"بیٹے' میں تمہیں صحافی بنانا چاہتا ہوں۔ جہاز کا پائلٹ تو ایک چھوٹا سا جہاز اڑاتا ہے جس میں چند سو مسافر ہوتے ہیں' لیکن صحافی جو ہوتا ہے وہ پوری قوم کا پائلٹ ہوتا ہے۔ بعض اوقات تو لیڈر حضرات بھی اس سے رہنمائی پاتے ہیں۔"

"ابو یہ صحافی کیا ہوتا ہے؟"

"صحافی وہ ہوتا ہے بیٹے جو سچ کو سچ اور جھوٹ کو جھوٹ لکھتا ہے۔"

"اجی' کیا بات کرتے ہو۔ خود تو ہوا کاؤ تینٹ اور بیٹے کو بنانا چاہتے ہو صحافی۔ آخر تمہیں سوجھی کیا۔" بالآخر امی سے رہا نہ گیا۔ "بھئی ہمارا بیٹا صحافی وحافی کچھ نہیں بنے گا۔ اسے تو بزنس مین بناؤں گی۔"

"اپنے بھائی کی طرح!"

"ہاں' دیکھ لو بھائی احمد میاں کے ٹھاٹ۔ اگرچہ بزنس زیادہ بڑا نہیں پھر بھی گھر خوب خوشحالی ہے۔"

"گھر تو تمہارا بھی ویران نہیں بیگم۔"

"ہاں' ماشاء اللہ..... میرا گھر بھی خوب اچھا ہے۔ اللہ آپ کو سلامت رکھے' میں کوئی بھکاری تو نہیں ہوں۔"

"ہاں' بس اللہ سلامتی ہی رکھے۔ ورنہ اس شہر میں تو ہر سڑک پر قاتل دندناتے پھرتے ہیں۔ کوئی دن ہی ایسا خوش نصیب ہوتا ہے جب اخبار میں کسی ٹریفک کے حادثے کی خبر نہیں ہوتی۔"

اتنے میں گاڑی کے ہارن کی آواز سنائی دی۔

"جاؤ' بیٹا تمہاری سکول بس آ گئی۔" امی نے کہا۔

طارق تیزی سے اٹھا' منہ ٹشو پیپر سے صاف کرتے ہوئے اس نے بیگ کندھے پر ڈالا اور حسب معمول دونوں کو "خدا حافظ" کہہ کر دروازے کی طرف بڑھا۔

"طارق بیٹے" امان خاں نے آواز دی اور تیزی سے دروازے کی طرف لپکے۔

طارق دروازے پر رک گیا۔ گاڑی کے ہارن کی پھر آواز آئی۔

"کیا ہوا؟" طارق کی امی نے شوہر کی طرف حیرت سے دیکھا۔

امان خاں' طارق کے نزدیک پہنچے' اسے گلے لگا کر پیار کیا اور بولے "بیٹے' گاڑی میں احتیاط سے بیٹھا کرو۔"

"جی ابو..... اچھا ابو خدا حافظ۔"

"کیا ہوا' خیر تو ہے آج تو بیٹے پر بڑا لاڈ آ رہا تھا؟" طارق کے جانے کے بعد امی نے پوچھا۔

"بس جی چاہا کہ اسے پیار کروں تو کر لیا۔" امان خاں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "آپ کو کوئی اعتراض؟"

"بھلا..... مجھے کیوں اعتراض ہونے لگا۔"

"بیگم' یہ جو زندگی ہے نا..... کتنی مختصر سی ہے۔ اس مختصر سی زندگی میں ہم کیا کیا کرتے ہیں' کتنے گناہ کرتے ہیں۔ کتنے ظلم کرتے ہیں' کتنے دکھ پہنچاتے ہیں۔ اپنے سکھ کی خاطر دوسروں کو راحت ملیامیٹ کرنے پر تلے رہتے ہیں اور نہیں جانتے کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں اسے موت ایک لمحے میں برابر کر کے رکھ دے گی۔" امان خاں بڑے جذب کے عالم میں بولے چلے جا رہے تھے۔ "بیگم' یہ جو موت ہے نا' جس سے ہم سب ڈرتے ہیں' دراصل وہی زندگی ہے۔ یہ دنیا تو محض ایک سراب ہے۔ فریب نظر ہے۔ اصل تو وہی ہے جہاں ہم نے جانا ہے' جس پر اس مکار زندگی نے پردہ ڈال رکھا ہے۔"

"ارے' یہ کیا آپ صبح ہی صبح موت کا ذکر لے بیٹھے! سچ بتاؤں امان' مجھے موت سے ڈر لگتا ہے۔ میں جب اندھیری قبر کا تصور کرتی ہوں تو میرا رواں رواں تھرا اٹھتا ہے۔"

"اچھا..... لیکن مجھے موت سے بالکل ڈر نہیں لگتا۔ موت تو بہت اچھی چیز ہے۔"

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

"ارے' کچھ خدا کا خوف کرو امان! تمہیں آج یہ کیا ہو گیا؟"

امان خاں نے جواب میں کچھ نہ کہا۔ محض مسکرا کر رہ گئے۔

جب وہ دفتر جانے کے لیے گھر سے نکلے تو حسب معمول بیگم دروازے تک آئیں اور ان سے کچھ پھل وغیرہ ساتھ لانے کے لیے کہا۔

"میرا کوئی بھروسا نہیں بیگم۔" امان خاں نے بیگم کو گہری نظر سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیا مطلب؟"

"ہو سکتا ہے' میں بھول جاؤں' تم یہیں سے لے لینا۔ اچھا میں چلتا ہوں۔ خدا حافظ۔"

"خدا حافظ۔"

امان خاں کے جانے کے بعد وہ کچھ دیر یونہی دروازے پر کھڑی رہیں۔ یہ بات ان کے تصور میں بھی نہیں آ سکتی تھی کہ امان خاں نے انہیں ہمیشہ کے لیے خدا حافظ کہہ دیا ہے۔ اب کے گئے وہ کبھی واپس نہ پلٹیں گے۔

گھر سے نکل کر انہوں نے رکشا پکڑا۔ حسب معمول رکشا ڈرائیور کو آہستہ چلنے کی تلقین کی اور اللہ کا نام لے کر رکشا میں بیٹھ گئے' رکشا والا شریف تھا' وہ مناسب رفتار سے رکشا چلا رہا تھا۔

تب ایک روٹ کی دو بسوں میں ایک دوسرے سے آگے نکلنے کے لیے ریس شروع ہو گئی۔ امان خاں کے رکشا کے بائیں جانب ایک بس تھی اور دائیں جانب دوسری۔ بس کے دونوں ڈرائیور اس وقت ملک الموت کے روپ میں تھے۔ انہیں نہ اپنی فکر تھی' نہ اپنے بیوی بچوں کی۔ مسافروں کا بھلا وہ کیا خیال کرتے۔ بس خیال تھا تو صرف یہ کہ دوسری بس آگے نہ نکلنے پائے چاہے جان نکل جائے۔

بس پھر کیا ہونا تھا۔ وہی ہوا جو دو پاٹن کے بیچ کسی چیز کا ہو سکتا ہے۔ دو پاٹن کے باقی بچا نہ کوئے۔ ایک دھماکہ ہوا۔ چیخ پکار' ایک کہرام مچ گیا۔ بسوں کے دونوں ڈرائیور ہلاک ہو گئے۔ رکشا ڈرائیور مرا اور امان خاں بھی موقع پر ہی اللہ کو پیارے ہوئے اور جانے کتنے زخمی ہوئے۔

پولیس' ایمبولینس' ہسپتال جانے والے جا چکے تھے' پیچھے بس یہ چکر رہ گئے تھے۔ امان خاں کی جیب میں دفتر کا شناختی کارڈ تھا۔ ان کے دفتر فون پر اطلاع دی گئی۔ اس خبر نے دفتر میں سناٹا طاری کر دیا۔ ایک اچھے انسان کی موت پر سب کی آنکھوں میں آنسو تھے اور یقین کرنے کو کوئی نہیں چاہ رہا تھا۔ دفتر والے ہسپتال بھاگے۔

جب رات کے اندھیرے میں ایمبولینس سائرن بجاتی گھر کے دروازے پر رکی تو امان خاں کی بیگم کا دل دھک سے رہ گیا۔

"کیا ہوا امان کو؟" وہ چیختی ہوئی آگے بڑھیں۔

تب پڑوس کی عورتوں نے انہیں سنبھالا اور ایک عورت ان کے ہاتھ میں پڑی سرخ چوڑیوں کو ایک ایک کر کے توڑنے لگی۔

وہ ٹوٹتی چوڑیوں کو خاموشی سے دیکھنے لگیں۔ دیکھتے دیکھتے ان کی آنکھیں بند ہونے لگیں' بے ہوش ہو گئیں۔

طارق کی اس وقت عجب حالت تھی۔ کبھی وہ اپنی بے ہوش ماں کو دیکھتا' کبھی چادر سے ڈھکی اپنے باپ کی لاش پر نظر ڈالتا۔ اس کے ننھے ذہن میں کوئی چیز واضح ہو کر نہیں آ رہی تھی۔ ابھی وہ زندگی سے بھی واقف نہ تھا' پھر بھلا وہ موت کو کیا جانتا۔

امان خاں کی موت کے بعد احمد میاں نے اپنی بہن کو سہارا دیا' وہ اسے اپنے ساتھ لے گئے۔ طارق کی امی جوان تھیں۔ ان کی بہ آسانی دوسری شادی ہو سکتی تھی۔ ایک دو سال کے بعد احمد میاں نے ان سے اشارتاً بات کرنا بھی چاہی' لیکن انہوں نے اس تجویز کو سختی سے مسترد کر دیا۔ امان سے انہیں بہت محبت تھی' اس محبت کو وہ بانٹنا نہ چاہتی تھیں۔ انہوں نے کہا

"میں اب اپنے بیٹے کے لیے زندہ رہنا چاہتی ہوں بھائی صاحب۔"

وہ اپنے بیٹے کے لیے زندہ رہنا چاہتی تھیں۔ واقعی ایسی ہی بات تھی۔ انہوں نے طارق کو اپنے گلے کا تعویز بنا لیا تھا جو ہر وقت ان کی نظروں کے سامنے ہوتا۔ ان کے ہاتھوں میں رہتا۔

پر اوپر والے کے فیصلے بڑے عجیب ہوتے ہیں۔ اس کی حکمت کو کوئی نہیں پہنچ سکتا' اس کی مصلحت کو کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ اوپر والے نے کچھ اور ہی فیصلہ کر لیا تھا۔

بس صرف چار برس لگے۔

چار برس میں اچھی خاصی تندرست عورت سوکھ کر کانٹا ہو گئی۔ احمد میاں نے اپنی بہن پر توجہ دی' بہت علاج کرائے مگر سب ڈاکٹروں نے ایک ہی جواب دیا' انہیں کوئی مرض نہیں' اگر ایسا ہو تو شادی کر دیجیے۔

جب احمد میاں انہیں ڈاکٹروں کا فیصلہ سناتے تو وہ پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ منہ پھیر لیتیں اور دھیرے سے کہتیں۔

"بھائی صاحب! آپ بھی بڑے بھولے ہیں' خواہ مخواہ ڈاکٹروں کے چکموں میں آ جاتے ہیں۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی۔"

"دیکھو بہنا' امان تو چلا گیا۔ اب تو طارق کی فکر کر۔ دیکھ' اس کو اکیلا مت چھوڑ جانا۔"

"بھائی صاحب..... طارق کے لیے ہی تو یہ زندگی کی قید کاٹ رہی ہوں۔" انہوں نے اپنے بھائی کو گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "اور یہ آپ نے کیا کہا بھائی صاحب' میں اگر چلی جاؤں تو اس سے کیا فرق پڑے گا۔ آپ جو طارق کے ساتھ ہیں۔ آپ کی موجودگی میں کبھی وہ خود کو یتیم محسوس نہیں کرے گا۔"

شاید یہی سوچ کر طارق اپنے ماموں کی پناہ میں ہے' انہوں نے زندگی کو اپنا دشمن بنا لیا

ایک صبح انہوں نے طارق کو اپنے پاس بلا کر خوب بھینچ بھینچ کر پیار کیا۔ اب طارق دس

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

برس کا ہو چکا تھا۔ وہ کافی سمجھدار ہو گیا تھا۔ موت اور زندگی کچھ کچھ اس کی سمجھ میں آنے لگی تھیں۔

"طارق' آج خواب میں مجھے تمہارے ابو دکھائی دیئے تھے۔"

"اچھا امی..... کیا کہہ رہے تھے وہ؟"

ابھی وہ کچھ جواب بھی نہ دے پائی تھیں کہ احمد میاں کی آواز آئی "طارق' بیٹے' بھی کہاں ہو' چلو سکول۔"

جب وہ کمرے میں داخل ہوئے تو فائزہ بھی ان کے ساتھ تھی' وہ دونوں کو اپنی گاڑی میں سکول چھوڑا کرتے تھے اور لاتے بھی خود ہی تھے۔

"اچھا' لاڈ ہو رہا ہے....." احمد میاں نے طارق کو اپنی ماں سے لپٹا دیکھ کر کہا۔

"بس ہو چکا..... جاؤ بیٹا' خدا حافظ۔"

جب طارق سکول سے واپس لوٹا تو اسے اپنی امی نہیں ملیں۔ وہاں ایک لاش ضرور تھی جو چادر سے ڈھکی تھی۔ امی کو اس حالت میں دیکھ کر اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ اس نے بستہ ایک طرف پھینکا اور اپنی امی کی لاش سے لپٹ گیا۔

"نہیں امی..... میں آپ کو نہیں جانے دوں گا۔"

طارق کے ماموں احمد میاں نے اسے کھینچ کر اپنے سینے سے لگا لیا اور روتے ہوئے بولے۔ "تو میرا بیٹا ہے طارق' تو میرا بیٹا ہے۔"

"ماموں جان' امی بھی مجھے اکیلا چھوڑ گئیں۔"

"نہیں بیٹا' تو اکیلا نہیں' میں ہوں تیرا' تیری ممانی ہیں' تیری ایک چھوٹی بہن فائزہ ہے۔ ہم سب تیرے ہیں۔ تو غم نہ کر۔"

خود احمد میاں کو اپنی بہن سے بے انتہا محبت تھی۔ یہ صدمہ ان کے لیے بھی سخت تھا' لیکن موت کے آگے کس کی چلی ہے۔ موت اندھیرے کا تیر ہے جس کو لگ جائے' اسے پناہ نہیں ملتی' پناہ ملتی ہے تو بس اوپر' جہاں سے یہ تیر چلتے ہیں اور کسی کو نظر نہیں آتے۔

وقت دکھوں کی بہترین مرہم ہے۔ یہ گزرتا ہے تو اپنے ساتھ دکھوں کو ہلکا کرتا جاتا ہے۔ احمد میاں کے دل کو بھی قرار آ گیا۔ طارق بھی صبر کی منزلوں سے گزر گیا۔ اس نے اپنی ساری توجہ پڑھائی کی طرف مرکوز کر دی' جس کے نتیجے میں اس نے میٹرک میں بہت اچھے نمبر لیے۔ پھر جانے کیا ہوا کہ یہ میٹرک کا امتحان ہی اس کے لیے آزمائش بن گیا۔ پڑھائی سے اچانک اس کا دل اچاٹ ہو گیا۔

طارق' احمد میاں کی آنکھ کا تارا تھا۔ وہ جتنی دیر گھر میں رہتے اسے اپنے دائرہ شفقت میں لیے رہتے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ گھر میں رہتے ہی کتنی دیر تھے۔ ایک بزنس مین کا گھر سے ہی واسطہ رہ جاتا ہے۔ وہ چاہے بھی تو اپنی مرضی سے گھر میں وقت نہیں گزار سکتا۔ مرد چاہے طارق پیشہ ہو یا بزنس مین' گھر سے اس کا واجبی سا تعلق ہوتا ہے۔ واجبی سا ان معنی میں کہ گھر اس کے

لیے شب بسری کا ذریعہ ہو کر رہ جاتا ہے۔

گھر اصل میں ہوتا ہے بیگمات کا۔ احمد کا گھر بھی ان کی بیگم شائستہ کے ہاتھ میں تھا۔ شائستہ بھانجے میں اپنے شوہر کی بڑھتی ہوئی محبت کو دیکھ رہی تھیں۔ انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ یہ بات کہاں جا کر ختم ہو گی۔ ویسے احمد میاں اس انتہا کا ایک آدھ بار اشارتاً ذکر بھی کر چکے تھے' لیکن شائستہ کسی قیمت پر فائزہ کو طارق کے حوالے نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ وہ فائزہ کے لیے کسی اور لڑکے کو طے کر چکی تھیں۔ احمد میاں اپنی بیوی کے اس انتخاب سے ناواقف تھے۔ وہ یہی سمجھ رہے تھے کہ ان کی بیگم کو اس رشتے پر بھلا کیا اعتراض ہو گا' جبکہ وہ انہیں دن رات طارق پر نچھاور ہوتے دیکھتے تھے۔

بیگم شائستہ مگر اس ہاتھی کی طرح تھیں جس کے کھانے کے دانت اور ہوتے ہیں اور دکھانے کے اور۔ طارق ایک حساس لڑکا تھا' ماں باپ کی موت نے اسے اور زود حس بنا دیا تھا۔ وہ گھر میں زیادہ تر خاموش ہی رہتا۔ ممانی کی طنز آمیز باتیں اس کے دل پر چھری کی طرح لگتیں۔ وہ اسے باتوں ہی باتوں میں بہت سی باتیں کہہ جاتیں۔ فائزہ کا بھی کچھ اسی طرح کا حال تھا' شاید شائستہ نے اسے بھی سمجھا دیا تھا' وہ اس سے سیدھے منہ بات نہ کرتی۔

ماموں کے گھر سے نکلتے ہی طارق کی روح پر سناٹا طاری ہو جاتا۔ قوت گویائی مفلوج ہو جاتی۔ شائستہ ممانی کی گھورتی آنکھیں اسے ڈرانے لگتیں۔ فائزہ کے رویے کی سختی اس کے جسم میں کپکپاہٹ کراترنے لگی۔ طارق کی حیثیت جیسے اچھوت جیسی ہو کر رہ جاتی۔

وہ اندر ہی اندر کڑھتا اور جلتا رہتا۔ اس آگ بھرے ماحول میں اس نے بچپن سے گزر کر جوانی میں قدم رکھا۔ اس نے بی اے کر لیا' لیکن گھٹتے ہوئے۔ وہ اچھے نمبروں سے پاس نہ ہو سکا۔ احمد میاں کو اپنے بھانجے کی ذہنی کیفیت کا بالکل اندازہ نہ تھا اور ہوتا بھی کیسے۔ وہ تو ہر وقت اپنی بیوی کو اس پر نچھاور ہوتے دیکھتے تھے اور یہی حال فائزہ کا تھا جس کا منہ "طارق بھائی' طارق بھائی" کہتے نہ تھکتا اور ان کے اوجھل ہوتے ہی یہ "بھائی" دشمن میں تبدیل ہو جاتا۔

فائزہ نے کالج میں قدم رکھا تو اس کے چرچے عام ہوئے۔ لڑکیوں میں تو وہ اپنی شوخ طبیعت کی بنا پر مقبول تھی اور لڑکوں میں اپنی بے جھجک گفتگو کی بنا پر۔ اس کی باتوں میں بڑی لگاوٹ تھی' آنکھوں میں بلاوا اور لہجے میں کشش ہوتی۔ اسے لڑکوں کو غلط فہمی میں مبتلا کرنے کا خبط تھا۔ وہ ہر لڑکے کو اپنے دام میں الجھا ہوا دیکھنا چاہتی تھی۔ اسے شمع محفل بننے کا بڑا شوق تھا اور یہی شوق اسے لے ڈوبا۔

یہ دل لگی' دل کی لگی بن گئی۔

فیضان آگے بڑھا اور اس نے اس چنچل تتلی کو اپنے دام فریب میں الجھایا۔ بظاہر وہ فائزہ کے لیے شکار بن گیا' اصل میں وہ شکاری تھا۔ فائزہ نے اسے بھی اپنی زلف کا اسیر کیا' اسے یہ اندازہ ہی نہیں ہوا کہ وہ خود اسیر ہو رہی ہے۔

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

فیضان..... شطرنج کا ایسا کھلاڑی تھا جس نے ہارنا سیکھا ہی نہیں تھا۔

ایسی باتیں پر لگا کر اڑتی ہیں۔ آگ کی طرح پھیلتی ہیں۔ جلد ہی فائزہ کا نام فیضان کے ساتھ لیا جانے لگا اور کیوں نہ لیا جاتا' انہیں ساتھ ساتھ کہاں نہیں دیکھا گیا۔ ہوٹلوں میں' پارکوں میں' سمندر کے کنارے' گاڑی میں آئس کریم کھاتے تو کبھی سڑکوں پر پیدل گھومتے۔

احمد میاں کو کچھ پتا نہ تھا کہ ان کی بیٹی کالج میں کیا گل کھلا رہی ہے۔ وہ کالج جاتی بھی ہے یا نہیں۔ اگر نہیں جاتی تو کالج کے نام پر کہاں جاتی ہے۔ سہیلیوں کا بہانہ بنا کر کہاں گھومتی ہے۔ اس بات سے تو اس کی امی بھی بے خبر تھیں۔ طارق کی شخصیت کو مکمل کر وہ بڑے اطمینان سے تھیں۔ انہیں یقین تھا کہ وقت آنے پر وہ کسی نہ کسی طرح اپنی بہن کے بیٹے اخلاق سے اسے منسوب کرنے میں کامیاب ہو جائیں گی۔

اخلاق کا اس گھر میں خاصا آنا جانا تھا۔ فائزہ اور اس کی بے تکلفی بھی تھی۔ یہ بے تکلفی طارق کو جلانے کے لیے بھی تھی۔ اخلاق کو اس کی خالہ نے اپنے ارادے سے آگاہ کر دیا تھا' لیکن فائزہ کو اپنی امی کے منصوبے کا پتا نہ تھا۔ پتا ہوتا بھی تو کیا ہوتا۔ جو ہونا تھا وہ ہو رہا تھا اور جو نہیں ہونا چاہئے وہ بھی ہو رہا تھا۔

بیگم شائستہ کا منصوبہ فائزہ نے بڑی ناشائستگی سے ناکام بنا دیا۔ نادانستگی میں اس کا پاؤں پھسلا اور وہ ذلت کے کنویں میں جا گری' جب یہ چھپی بات ظاہر ہوئی تو گھر میں زلزلہ سا آ گیا۔

شائستہ نے فائزہ کے بال پکڑ کر اسے اچھی طرح جھنجوڑا' اپنا ماتھا پیٹا' چیخی چلائیں' بے سود۔ اس بات کو اب احمد میاں سے چھپانا فضول تھا۔

باپ کے سامنے جب بیٹی کا کارنامہ آیا تو ان کی آنکھوں میں اندھیرا سا اتر گیا۔ وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ جسم پر لرزہ طاری ہو گیا۔

اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ فائزہ کو فیضان کے ساتھ فوراً بیاہ دیا جائے۔ اس لیے کہ یہ دونوں کا مشترکہ کھیل تھا۔

احمد میاں نے فیضان سے ملاقات کی اور انتہائی رقت آمیز لہجے میں بولے۔ "اب کیا ارادہ ہے بیٹے؟"

"فیضان ان کی بات سن کر چونگم چباتے چباتے رک گیا اور سپاٹ انداز میں بولا۔

"آپ کیا چاہتے ہیں؟"

"شادی۔" احمد میاں بمشکل بولے۔

"پھر میرے والدین سے بات کر لیجئے۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

احمد میاں اور شائستہ نے اسی دن فیضان کے والدین سے ملاقات کی اور انہیں ساری صورتحال سے آگاہ کیا۔ یہ ساری باتیں سن کر فیضان کے والدین بھڑک اٹھے۔

"شادی..... شادی کو مذاق سمجھ لیا ہے آپ لوگوں نے۔ میں پوچھتی ہوں' آخر یہ سب کچھ ہوا کیسے؟"

"اپنے بیٹے سے پوچھیے۔ وہ آپ کو بتائے گا۔" احمد میاں نے نرم لہجے میں کہا۔ میں اپنے بیٹے سے کیوں پوچھوں؟ آپ لوگوں سے کیوں نہ پوچھوں۔ پہلے اپنی بیٹیوں کو کھلا چھوڑ دیتے ہیں۔ نہیں پوچھتے کہ وہ کہاں جا رہی ہے' کہاں سے آ رہی ہے۔ اور جب وہ کسی سیدھے' شریف اور اچھے گھرانے کے لڑکے کو اپنے دام فریب میں الجھا لیتی ہے تو پھر مسکین صورت بنائے آ جاتے ہیں آپ لوگ' لڑکے کے والدین کے پاس۔ کان کھول کر سن لیجئے۔ میں اپنے بیٹے کے مستقبل سے آپ لوگوں کو نہ کھیلنے دوں گی۔ ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے۔ وہ پڑھ رہا ہے اور یہ بھی سن لیجئے کہ یہ ایک شریف اور اعلیٰ روایات کا گھرانہ ہے۔ ہم اپنے بیٹے کو صرف اسی لڑکی سے منسوب کریں گے جو اس گھر کے شایان شان ہو گی۔ اب آپ لوگ جا سکتے ہیں۔"

فیضان کی امی اور جانے کیا کیا بولتی رہیں۔ فیضان کے ڈیڈی خاموشی سے اس سارے ڈرامے کو دیکھتے رہے۔ احمد میاں نے کچھ کہنے کی کوشش کی' شائستہ نے بھی منہ کھولا پر کسی کی کوئی بات نہ سنی گئی۔ چوری اور سینہ زوری والی مثل صادق آتی رہی۔

تب احمد میاں نے شائستہ کا ہاتھ پکڑا اور اس شاندار بنگلے کے پرتعیش ڈرائنگ روم سے باہر نکل آئے۔ گیٹ پر کھڑی اپنی چھوٹی سی گاڑی میں بیٹھے اور اپنے مکان کی طرف چل پڑے۔

دونوں راستے بھر خاموش رہے۔ شائستہ بار بار اپنی آنکھوں سے آنسو پونچھتی رہی جبکہ احمد میاں اندر ہی اندر اپنے آنسو پیتے رہے۔ فیضان سے مل کر وہ خاصے پرامید تھے لیکن اس کے ماں باپ نے تو بساط ہی الٹ دی تھی' اب ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کریں؟ فائزہ کے سینے میں گولی اتار دیں یا اپنے سر کو نشانہ بنا لیں تاکہ وہ بار بار دنیا والوں کے سامنے جھکنے کے بجائے ایک ہی مرتبہ جھک جائے اور ایسا جھکے کہ پھر اسے کوئی اٹھانے والا نہ ہو۔

فائزہ نے جب اپنے والدین کو اوپر کی کھڑکی سے گاڑی سے غم زدہ اترتے دیکھا تو وہ سمجھ گئی کہ بات بنی نہیں۔ وہ تیزی سے نیچے اتر کر آئی اور سیدھی اپنی امی کے پاس پہنچی۔ اس کی امی بیڈ پر بیٹھی دروازے کو خالی خالی نگاہوں سے گھور رہی تھیں۔ احمد میاں دوسرے کمرے میں تھے۔ فائزہ اندر داخل ہوئی تو شائستہ نے دوسری طرف منہ پھیر لیا۔

"کیا ہوا امی؟" وہ ان کے قدموں میں بیٹھ گئی۔

"اب ہونے کو کیا رہ گیا ہے کمینی تو نے تو ہمارے منہ پر کالک مل دی۔ جیسا کتا وہ ہے' ویسے ہی کتے اس کے ماں باپ ہیں۔"

"ہائے! امی انہیں کتا تو نہ کہیں۔" فائزہ ابھی تک اس کے سحر میں گرفتار تھی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ اس کے ماں باپ کیا عذاب جھیل کر آئے ہیں۔ اور اس کے پیارے کے گھر ان کے ساتھ کیا سلوک ہوا ہے' انہیں کس طرح دھتکارا گیا ہے۔ اس طرح تو کوئی اپنے گھر کے کتوں کو بھی

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

نہیں دھتکارتا ہوگا۔

یہ سن کر شائستہ کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ انہوں نے پاس پڑی ہوئی جوتی اٹھائی اور بے تحاشا اس کے سر پر برسانے لگیں۔

احمد میاں دوسرے کمرے میں سر پکڑے بیٹھے تھے۔ ان کا دماغ سن ہو چکا تھا۔ آنکھوں میں اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ فائزہ نے بیٹھے بٹھائے انہیں عذاب میں مبتلا کر دیا اور یہ عذاب سا عذاب تھا' بیٹی کا باپ ہونا بھی یارب کسی عذاب سے کم نہیں۔

شور وغل کی آواز سن کر وہ دوڑے ہوئے کمرے میں پہنچے۔ دیکھا کہ شائستہ' فائزہ پر جوتے برسا رہی ہیں اور وہ زمین پر سر جھکائے بیٹھی پٹ رہی ہے اور کہہ رہی ہے۔

"امی' مجھے خوب ماریں' اتنا ماریں کہ میں مر جاؤں۔ میں اسی قابل ہوں' میں نے واقعی آپ لوگوں کا دل دکھایا ہے۔"

احمد میاں کچھ دیر کھڑے اس منظر کو دیکھتے رہے۔ پھر الٹے قدموں لوٹ گئے۔

فائزہ' ماں سے ساری روداد سننے کے بعد بھی مایوس نہیں ہوئی۔ اسے فیضان پر بڑا اعتماد تھا۔ اسے یقین تھا کہ جب وہ فیضان کے سامنے آنسو بھری آنکھیں لے کر جائے گی تو وہ ضرور اس کا ہاتھ تھام لے گا۔ وہ اس کے لیے اپنے ماں باپ سے لڑ جائے گا' اس طرح اس کے والدین کی جو سبکی ہوئی ہے وہ سرخروئی میں بدل جائے گی۔

وہ بڑی امید لیے کالج پہنچی۔ فیضان کو اس نے کالج میں ان تمام ٹھکانوں پر تلاش کیا جہاں وہ مل سکتا تھا' پر وہ کہیں نہ ملا۔ وہ کالج آیا ہوتا تو ملتا بھی۔ وہ بزنس مین کا بیٹا تھا' ایسی چھوٹی موٹی ڈیلنگ تو خود بھی بہ آسانی کر سکتا تھا۔

جب فائزہ کو وہ کالج میں نہ ملا تو اس نے اس کے گھر فون کیا' فون اس کی ماں نے اٹھایا۔ پوچھنے پر جواب ملا کہ وہ لاہور گیا ہوا ہے۔

لاہور کا نام سن کر فائزہ نے اپنا دل تھام لیا۔

نہیں' ایسا نہیں ہو سکتا..... فیضان اتنا بداخلاق نہیں ہو سکتا۔ وہ اسے اس طرح چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔ اس نے تو اس سے شادی کا وعدہ کیا تھا..... ساتھ مرنے جینے کی قسمیں کھائی تھیں۔ کیا ہوئے وہ وعدے' کیا ہوئیں وہ قسمیں! وہ اتنی آسانی سے دامن جھٹک کر نکل جائے گا' اسے امید نہ تھی۔

پھر فائزہ نے فیضان کے ایک دوست تنویر کو فون کیا۔ تنویر کو فیضان اور فائزہ کے بارے میں سب کچھ پتا تھا' اتفاق سے ٹیلی فون تنویر نے ہی اٹھایا۔ "تنویر بھائی..... میں فائزہ بول رہی ہوں۔ آپ کی طرف فیضان تو نہیں آئے؟"

"فائزہ آپ تھوڑا لیٹ ہو گئیں..... فیضان ابھی یہاں سے اٹھ کر گیا ہے۔"

"اچھا..... مجھے کسی نے بتایا تھا کہ وہ آج صبح لاہور چلے گئے۔"

"نہیں..... ایسی تو کوئی بات نہیں۔ کسی نے مذاق کیا ہوگا۔" تنویر نے خوش دلی سے کہا۔ "آپ اگر بات کرنا چاہیں تو میں نمبر دے دوں۔ اس وقت وہ آپ کو شاہد حسن کے ہاں ملے گا آپ شاہد حسن کو جانتی ہیں' نہیں آپ کہاں جانتی ہوں گی۔ خیر آپ نمبر نوٹ کر لیجیے۔"

فائزہ نے نمبر نوٹ کر کے فوراً اس نمبر پر ڈائل کیا۔ تیسری گھنٹی بجنے کے بعد کسی لڑکی نے دوسرے ریسیور اٹھایا۔ فائزہ نے نمبر کی تصدیق کے بعد فیضان کے بارے میں پوچھا۔ "یہاں فیضان صاحب ہوں گے؟ براہ کرم ان سے بات کروا دیجیے۔"

"جی ہاں' ہیں۔" ادھر سے آواز آئی۔ "فیضان بھائی' آپ کا فون۔"

کچھ دیر کے بعد ریسیور پر جو آواز سنائی دی' وہ فیضان کی نہ تھی' کسی اجنبی کی تھی۔ "کون بات کر رہا ہے؟"

"میں فائزہ بول رہی ہوں۔ فیضان سے بات کرائیے۔"

"فیضان تو ابھی باہر نکلے ہیں۔ کوئی پیغام ہو تو بتا دیجیے۔"

اب فائزہ کی سمجھ میں ساری بات آ گئی تھی۔ فیضان اس سے منہ چھپا رہا تھا۔ منہ کیا' وہ اس سے آواز بھی چھپا رہا تھا۔ تب فائزہ کے تن بدن میں جیسے آگ لگ گئی۔ اس نے غصے میں بھر کر کہا۔

"ہاں' اس کتے کے لیے ایک پیغام ہے۔ اس سے کہنا کہ جیسا تو نے میرے ساتھ کیا ہے خدا کرے تیری بہنوں کے ساتھ بھی ایسا ہی ہو۔ میرے ماں باپ جس صدمے سے دوچار ہیں' تیرے ماں باپ کو بھی ایسا ہی عذاب جھیلنا پڑے۔ تیری بہن بھی اسی طرح تڑپے جس طرح میں تڑپ رہی ہوں۔"

یہ کہتے کہتے اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور وہ سسک سسک کر رونے لگی۔ اس کی دوست بینا نے ریسیور ہاتھ سے لے کر کریڈل پر ڈالا اور اسے بیڈ پر بٹھا کر اس کی پیٹھ تھپکنے لگی۔

تب فائزہ اس کی گود میں سر رکھ کر بلک بلک کر رونے لگی۔

"بینا بتا' اب میں کیا کروں؟" کچھ دیر کے بعد فائزہ بولی۔

"میری خود کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا' کیا بتاؤں تجھے۔" بینا نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "بلاؤں سے اللہ بچائے۔ تجھے میں اسی دن کے لیے ٹوکا کرتی تھی کہ ذرا اپنا دامن بچا' اس طرح ایک سے بے تکلف ہونا ٹھیک نہیں۔"

"ہاں بینا' مجھ سے غلطی ہو گئی میں نے خواہ مخواہ فیضان پر اعتماد کر لیا۔"

فائزہ کچھ دیر اور بینا کے پاس بیٹھی۔ پھر تھکے قدموں سے اس کے گھر سے نکلی اور رکشا کر کے اپنے گھر پہنچ گئی۔

جب وہ گھر میں داخل ہوئی تو اس کا سر جھکا ہوا تھا اور اس کا جھکا ہوا سر بتا رہا تھا کہ

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

فائزہ کو کیا جواب ملا ہے۔

شائستہ نے اسے مایوس کن نگاہوں سے دیکھا' جیسے کہہ رہی ہو' بیٹی میں جانتی ہوں' مردوں میں وفا کہاں ہوتی ہے۔ تو نے اپنا سب کچھ گنوا دینے سے پہلے کچھ تو سوچا ہوتا۔

طارق کئی روز سے گھر میں ایک نامعلوم سی کھچڑی پکتے ہوئے دیکھ رہا تھا' ہر شخص کی آنکھوں میں اداسی تھی۔ خوف کے سائے لہرا رہے تھے۔ حتیٰ کہ ماموں جان کی بھی یہی حالت تھی۔ شام کو وہ نڈھال نڈھال سے گھر آتے اور منہ لپیٹ کر پڑ جاتے۔ طارق ان سے کچھ پوچھنا چاہتا تھا' ان سے کچھ سننا چاہتا تھا کہ وہ انہی سے کچھ پوچھ اور سن سکتا تھا۔ شائستہ اور فائزہ تو اس سے سیدھے منہ بات کرنا بھی پسند نہ کرتی تھیں۔

آخر ایک رات جب ماموں احمد میاں گھر کے صحن میں بے چینی سے ٹہل رہے تھے اور شائستہ اور فائزہ کہیں گئی ہوئی تھیں' رات کے گیارہ بج رہے تھے' لیکن وہ ابھی تک لوٹ کر نہیں آئی تھیں۔ پتا نہیں وہ ان کے انتظار میں ٹہل رہے تھے یا کوئی اور فکر انہیں بے چین کر کے ٹہلا رہی تھی۔

اس رات طارق ہمت کر کے ماموں کے قریب آیا اور بولا

"ماموں جان' دو تین دن سے میں محسوس کر رہا ہوں کہ پورا گھر پریشان ہے' کیا پریشانی ظاہر نہیں ہو پا رہی ہے' اگر مجھے کسی قابل سمجھیں تو بتائیں' شاید میں کسی کام آسکوں۔"

احمد میاں نے ٹہلتے ٹہلتے ایک نظر طارق کو دیکھا۔ پھر رک گئے۔ اسے اپنے قریب بلایا اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پھر ٹہلنا شروع کر دیا۔

"تمہارا ماموں بھنور میں پھنس گیا ہے۔"

"اللہ نہ کرے' آپ بات تو بتائیں۔"

"طارق' تمہیں فائزہ کیسی لگتی ہے؟"

"فائزہ آپ کی بیٹی ہے ماموں جان..... ظاہر ہے' مجھے اچھی لگے گی۔" طارق نے بالکل سیدھے اور صاف لہجے میں کہا۔

"بیٹے' کیا یہ ممکن ہے کہ تم فائزہ سے شادی کر لو۔" احمد میاں نے جھجکتے ہوئے سوال کیا۔

"جی' یہ ممکن ہے۔"

اس جواب پر بے اختیار احمد میاں کا جی چاہا کہ وہ طارق کو اپنے سینے سے لگا لیں' لیکن وہ ایسا کرتے کرتے رک گئے۔ انہیں معلوم تھا کہ جب وہ ساری صورتحال اس کے سامنے رکھیں گے تو طارق فوراً کہے گا۔

"ماموں جان..... یہ کیسے ممکن ہے! آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں' احمد میاں اس کے کندھے پر ہاتھ رکھے رکھے کمرے میں آ گئے اور بولے۔ "بیٹھو طارق..... میں تمہیں بتاتا ہوں کہ ہم سب

کیوں پریشان ہیں۔ میں بہرحال تمہیں مجبور نہیں کروں گا' لیکن تم نے سب کچھ جاننے کے باوجود فائزہ کو قبول کر لیا تو میں زندگی بھر تمہارا ممنون رہوں گا۔"

"ماموں جان..... آپ بتائیں تو آخر ہوا کیا؟"

تب احمد میاں نے فائزہ پر جو بیتی' وہ صاف صاف لفظوں میں طارق کو کہہ سنائی۔ وہ کوئی بات ڈھکی چھپی نہیں رکھنا چاہتے تھے تاکہ طارق جو فیصلہ کرے' سوچ سمجھ کر کرے اور آئندہ یہ نہ کہے' ماموں جان آپ نے تو یہ بتایا ہی نہ تھا۔

فائزہ کا دکھ بیان کرتے کرتے ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور گلا رندھ گیا۔ آواز حلق میں اٹکنے لگی۔

طارق نے اٹھ کر انہیں ایک گلاس پانی پلایا۔ پھر وہ کرسی سے اتر کر ان کے قدموں میں بیٹھ گیا اور بڑی اپنائیت سے بولا۔ "ماموں جان' میں آپ کا ہوں۔ میں آپ کا دکھ بانٹ لوں گا۔ آپ فکر نہ کریں۔"

یہ سن کر احمد میاں نے اسے فوراً اپنے قدموں سے اٹھایا اور برابر بٹھاتے ہوئے بولے۔

"بیٹے' میں تمہارا شکر گزار ہوں اور اس احسان کے بدلے میں ہمیشہ تمہارا ممنون رہوں گا۔"

اور جب یہ بات شائستہ اور فائزہ نے سنی تو وہ ایک دوسرے کا منہ دیکھتی رہ گئیں۔ سکتے میں آ گئیں۔ ارے نہیں' ایسا نہیں ہو سکتا' جس لڑکے کو ہم نے کبھی گھر کے ملازم سے زیادہ عزت نہ دی' ہمیشہ حقیر جانا' ہمیشہ ٹھوکروں میں رکھا' اسی نے ہمیں جب ہم خود ٹھوکروں میں تھے تو اٹھا کر سر پر بٹھا لیا!

شائستہ اور فائزہ دونوں احسان مندی سے اس کے آگے جھک گئیں تو طارق نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "یہ سب میں نے فائزہ کے لیے کیا ہے اور نہ آپ کے لیے۔ یہ میں نے اپنے ماموں کے لیے کیا ہے۔ میں انہیں دکھی نہیں دیکھ سکتا۔ ان کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتا۔ ان کے مجھ پر بہت احسانات ہیں۔ یہ احسان تو ان کے آگے کچھ بھی نہیں۔"

احمد میاں نے آناً فاناً شادی کی تیاری کی۔ فائزہ ان کی اکلوتی بیٹی تھی۔ اس گھر میں جو کچھ تھا' اسی کا تھا۔ شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔ احمد میاں نے اپنی بیٹی کو بہترین جہیز دیا ساتھ ہی ایک فلیٹ بھی دیا۔ طارق کو انہوں نے اپنے بزنس میں شامل کرنا چاہا' لیکن اس نے اسے مناسب نہ سمجھا۔ اپنی ملازمت کو ہی عزیز جانا' تب احمد میاں نے زیادہ ضد نہ کی۔

شادی کو ابھی مشکل سے دو تین ماہ ہوئے ہوں گے کہ ایک دن فائزہ باتھ روم میں پھسل گئی۔ اتفاق سے وہ چھٹی کا دن تھا۔ طارق گھر پر ہی موجود تھا۔ فائزہ کی چیخ سن کر وہ باتھ روم کی طرف بھاگا۔

فائزہ کی بری حالت تھی۔ اسے فوراً ہسپتال پہنچانا ضروری تھا۔ طارق نے ہسپتال فون کر

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

کے ایمبولینس منگوائی۔ ساتھ ہی احمد میاں کو بھی اطلاع دے دی۔

فائزہ دس بارہ گھنٹے موت و زیست کی کش مکش میں مبتلا رہی۔ اس کے بطن سے مردہ بچہ پیدا ہوا' بچے کی پیدائش میں اس قدر پیچیدگیاں بڑھیں کہ اسے ہمیشہ کے لیے ماں بننے سے محروم کر دیا گیا۔ بس اس کی جان بچ گئی۔ یہی غنیمت تھا۔ فائزہ نے اپنے گھر میں طارق کو کبھی قابل اعتنا نہ سمجھا تھا۔ وہ اپنی ماں کی طرح ہمیشہ توہین آمیز سلوک روا رکھتی تھی' لیکن طارق نے اس سے اپنے گھر میں اس کی تمام تر آوارگیوں کے باوجود اچھا سلوک کیا' رفتہ رفتہ اسے فائزہ سے محبت ہوتی گئی۔

فائزہ شادی کے بعد ایک سال تک ٹھیک رہی۔ خوفزدہ اور ڈری سہمی سی رہی۔ پھر جب اسے طارق کے نرم مزاج کا اندازہ ہو گیا اور اس نے سمجھ لیا کہ طارق کے گھر میں وہ قطعی محفوظ ہے اس سے وہ محبت کرنے لگا ہے اور اس نے اس کی سنگین غلطی کو نوعمری کی نادانی سمجھ کر بھلا دیا ہے تو اس کے اندر کی فائزہ نے انگڑائی لی' اس کی پوشیدہ فطرت عیاں ہونے لگی۔ جان محفل بننے کی خواہش' مردوں کو دیوانہ بنانے کا ارمان ایک دم جاگ پڑا۔

طارق ایک نیک طینت اور سوشل مرد تھا۔ اس کے دوستوں کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ کئی دوستوں کا گھر میں بھی آنا جانا تھا۔ تاش کی محفل جمتی اور اس محفل میں فائزہ بھی شامل ہوتی۔

رفتہ رفتہ وہ اس کے ایک دوست کی مرکز نگاہ بن گئی۔ اس کی آنکھوں میں خمار بادل بن کر چھا گیا۔ آرزوئیں بجلی کی طرح کڑکیں' جذبات کے دریا بہہ نکلے اور وہ دونوں اس جذبات کے طوفان میں ڈوب گئے۔

فائزہ جس آگ کے دریا سے گزر کر آئی تھی' وہ سب عذاب بھول گئی۔ اس کی ہرجائی فطرت نے شوہر کا اعتبار لوٹا۔ والدین کی عزت اچھالی مگر وہ مدہوش رہی۔

طارق کو کچھ معلوم نہ تھا کہ فائزہ نے کیا لائن اختیار کر لی ہے۔ اب اس کا کون سا دوست اس کی موجودگی میں کم آتا ہے اور غیر موجودگی میں زیادہ۔

جانے کتنے دن اور یہ بے وفائی جاری رہتی' جانے کب تک یہ فریب کا ڈراما چلتا کہ وہ لمحہ آ گیا۔ کہتے ہیں کہ نیکی اور بدی میں صرف ایک لمحے کا فرق ہوتا ہے۔ ایک لمحے میں آدمی شیطان سے فرشتہ اور فرشتے سے شیطان بن جاتا ہے اور آج وہی لمحہ فائزہ کا مقدر ہو گیا تھا۔

وہ دوست جو دوستی کے نام پر بدنما دھبا تھا' اسے فائزہ نے خوب ذلیل کر کے گھر سے نکال دیا تھا اور دل ہی دل میں یہ عہد کیا تھا کہ اب وہ بے وفائی نہیں کرے گی۔ اسے سچی محبت دے گی اور ہمیشہ اس کی ہو کر رہے گی۔

وہ روتے روتے اور سوچتے سوچتے سو گئی تھی۔

وہ بچپن سے ایک خواب دیکھا کرتی تھی۔ یہ خواب اسے بڑے تسلسل سے نظر آتا تھا۔ وہ دیکھتی کہ کوئی پراسرار سی عمارت ہے۔ اس عمارت کا اسے صرف ایک حصہ نظر آتا' پرانے طرز کی

اس عمارت میں اسے بے شمار کھڑکیاں اور روشن دان دکھائی دیتے۔ عمارت کے پس منظر میں بادل چھائے ہوتے۔ تب اچانک ایک دروازہ کھلتا اور اس میں انسانی ہیولے نمودار ہونے لگتے۔ ایسا لگتا جیسے انہیں اوپر سے ایک ایک کر کے تیزی سے پھینکا جا رہا ہے۔ ان انسانی ہیولوں کے گرنے کے ساتھ ہی فضا میں چیخوں کی آوازیں آنے لگتیں۔ یہ بڑی دلدوز چیخیں ہوتیں۔ پھر اچانک اس عمارت کے ایک جانب سے ایک بڑا سا چہرہ ابھرتا۔ یہ ایک مکار عورت کا چہرہ ہوتا۔ فائزہ کو یوں محسوس ہوتا جیسے وہ کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھ رہی ہے' دیکھتے ہی دیکھتے اس کی آنکھوں سے دو زہریلے سانپ نمودار ہوتے اور اپنا پھن لہرانے لگتے۔

فائزہ اس خواب کو دیکھ کر چیخ مار کر اٹھ جاتی۔ یہ خواب وہ سات سال کی عمر سے دیکھ رہی تھی۔ اب خوبصورت مکار عورت کو جس کی آنکھوں سے دو زہریلے سانپ برآمد ہوتے تھے' فائزہ نے پہچان پائی تھی۔

پھر جوں جوں وہ بڑی ہوتی گئی اس کے خدوخال میں تبدیلی آتی گئی' تو وہ اس عورت کو پہچاننے لگی۔

یہ عورت وہ خود تھی' جب اسے یہ خواب نظر آتا تو وہ سہم کر رہ جاتی۔ اس کی روح کانپ اٹھتی۔ جسم سے جیسے آدھی جان نکل جاتی' یہ بھیانک خواب کبھی مسلسل دو تین دن تک نظر آتا۔ کبھی تین دو مہینے بعد اور کبھی اس خواب کو دیکھے سالوں ہو جاتے۔

وہ اس خواب کی جزئیات پر بڑا غور کرتی مگر کچھ سمجھ میں نہ آتا۔ بچپن میں شائستہ نے اس کے لیے دو ایک تعویذ بھی لیے تھے' لیکن ان تعویذوں کا مذاق اڑاتے۔

سوتے سوتے اچانک اس کی آنکھ کھلی۔ ایک لمحے کو اس کی سمجھ میں ہی نہ آیا کہ وہ کہاں ہے پھر رفتہ رفتہ اسے ساری باتیں یاد آ گئیں۔ وہ فوراً اٹھ کر بیٹھ گئی۔ گھڑی پر نظر ڈالی' پونے بارہ بج رہے تھے۔ طارق ایک ڈیڑھ گھنٹے کے بعد آنے والا تھا۔ وہ فوراً کھڑی ہو گئی' ابھی اس نے کھانا بھی پکانا تھا۔

باتھ روم میں جا کر اس نے جلدی جلدی منہ پر چھینٹے مارے اور دوپٹے سے ہی منہ صاف کرتی باورچی خانے میں داخل ہو گئی۔

وہ خواب اس نے آج بھی دیکھا تھا۔ وہی پراسرار عمارت کا ایک گوشہ اوپر سے گرتے ہوئے کچھ انسانی ہیولے' دلدوز چیخیں' عمارت کے ایک جانب سے ابھرتا ہوا اس مکار عورت کا چہرہ۔ کن انکھیوں سے دیکھنا۔ سب کچھ وہی تھی' لیکن آج تھوڑی سی تبدیلی ہو گئی تھی۔ آج فائزہ نے اس کی آنکھوں سے سانپ نکلتے نہیں دیکھے تھے۔ آج اس نے اس کی آنکھوں میں سانپوں کے بجائے شمع روشن ہوتے دیکھی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ اس خواب کو دیکھ کر وہ بالکل نہ کانپی تھی۔ نہ اس کی جان نکلی تھی' اس کی آنکھوں میں شمع روشن دیکھ کر اس کی روح پر ایک اطمینان سا چھا گیا تھا۔

"وہ بڑے خوشگوار موڈ میں کھانا پکانے میں مصروف تھی' روح پر سرشاری سی طاری تھی۔

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

نمک چکھ کر وہ باورچی خانے سے نکلی اور کیسٹوں کے ریک سے ایک خوبصورت گانوں کا کیسٹ نکا
اور اسے کیسٹ پلیئر میں لگا کر آواز خاصی اونچی کر دی۔ پھر وہ جھومتی ہوئی کچن میں آئی اور پھر
روٹی میں لگ گئی۔

ڈیڑھ بجے کے قریب گھنٹی کی مخصوص آواز آئی' طارق آ گیا تھا۔ اس نے بھاگ کر
دروازہ کھولا اور مسکراتے ہوئے بولی "اتنی دیر لگا دی۔"

"اتنی دیر کہاں؟..... ایک بجے دفتر سے اٹھا تھا۔ بس سیدھا چلا آ رہا ہوں' ہاں وہ کھانے
کا کیا ہوا؟ طارق نے پلٹ کر دروازہ بند کرتے ہوئے پوچھا۔

"کھانا تیار ہے جناب۔" فائزہ نے بڑی مینھی آواز میں کہا۔

"بس ٹھیک ہے' کھانا نکالو..... میں منہ دھو کر آتا ہوں۔"

طارق جب فارغ ہو کر کھانے کی میز پر آیا تو فائزہ اس وقت کھانا چن چکی تھی۔ فائزہ
نے آج بڑا دل لگا کر کھانا تیار کیا تھا۔ یہی شوق کھانے میں لذت بن کر تحلیل ہو گیا تھا۔

طارق نے کھانے میں یہ لذت بطور خاص محسوس کی' اس نے پوری دلچسپی سے کھانا کھا
اور ساتھ ہی کھانے کی تعریف بھی کرتا رہا۔ پھر چائے پینے کے بعد بولا۔

"میں تھوڑا آرام کر لیتا ہوں۔ تم جب تک نہا دھو کر تیار ہو جائے' پھر گھر سے نکلتے
ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ ویسے پروگرام کیا ہے؟" فائزہ نے پوچھا۔

"پروگرام یہ ہے کہ پہلے چلیں گے تمہاری امی کے گھر۔ ایک آدھ گھنٹہ وہاں بیٹھ کر
گھومنے نکل جائیں گے' تمہاری کسی پسند کی جگہ۔ رات کو کسی چائنیز ریستوران میں کھانا' اس کے
بعد فلم کا آخری شو اور پھر گھر۔ یہ ہے پروگرام۔"

"شاندار۔" فائزہ نے خوش ہو کر کہا۔ "امی کے گھر جانا کیا ضروری ہے؟"

"ہاں ضروری ہے۔ ماموں جان سے پورے ایک ہفتے سے ملاقات نہیں ہوئی۔
سے ملنے کو جی چاہ رہا ہے۔"

"پر ابو..... اس وقت گھر پر کہاں ہوں گے۔"

"گھر پر ہی ہیں' میں نے انہیں فون کیا تھا' اپنی آمد کی اطلاع بھی دے دی ہے۔"

"گھر پر وہ کیا کر رہے ہیں؟ وہ تو کبھی ہوتے نہیں اس وقت!"

"کچھ سر وغیرہ میں درد تھا' لہٰذا آرام کر رہے ہیں۔"

"اچھا..... پھر تو جانا ضروری ہے۔" فائزہ نے کھانے کی میز سے برتن سمیٹتے ہوئے
فائزہ کی خوبصورتی میں کوئی کلام نہ تھا' وہ ساری میں کچھ اور دلکش ہو جاتی۔ ساری
بہت اچھی لگتی تھی' ویسے بھی اسے ساری باندھنے کا سلیقہ تھا۔ اس وقت بھی جب وہ تیار ہو کر
کے سامنے آئی تو وہ چند لمحے دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ کالی اور سرخ ساری میں دلفریب لگ رہی تھی۔

"کیا دیکھ رہے ہیں اتنے غور سے۔" فائزہ نے ساری کا پلو درست کرتے ہوئے کہا۔

"فائزہ کا حسن دیکھ رہا ہوں۔" طارق کھوئے ہوئے انداز میں بولا۔ "تم کس قدر حسین
ہو فائزہ۔"

"ہاں' وہ تو میں ہوں۔" فائزہ نے دلبری سے کہا۔ طارق اس جواب پر مسکرا پڑا۔

"پھر چلیں؟"

"جی بالکل۔" فائزہ نے گھر سے نکلنے کے لیے قدم آگے بڑھائے۔

طارق نے گھر کو لاک کیا' فائزہ کا ہاتھ تھاما اور دونوں آہستہ آہستہ سیڑھیاں اترنے
لگے۔

نیچے اترے تو اتفاق سے ایک خالی ٹیکسی مل گئی جو ابھی ابھی خالی ہوئی تھی' وہ فوراً اس میں
بیٹھ گئے۔

ٹیکسی جب احمد میاں کے دروازے پر رکی تو ٹیکسی کی آواز سن کر شائستہ باہر نکل آئیں'
انہوں نے اپنی بیٹی اور داماد کو بڑے چاؤ سے ٹیکسی سے اترتے دیکھا۔ فائزہ اندر آئی تو اسے بھینچ کر
گلے سے لگایا۔ طارق کے سر پر ہاتھ پھیرا اور ڈھیر ساری دعائیں دیں۔

"ابو کہاں ہیں امی؟" فائزہ نے پوچھا۔

"میں یہاں ہوں بیٹی۔" احمد میاں نے کمرے سے نکلتے ہوئے کہا۔ "ارے ماشاء اللہ
آج تو ہماری بیٹی کمال کی لگ رہی ہے۔"

"کمال کی نہیں ابو..... احمد میاں کی۔" فائزہ نے جلدی سے جواب دیا۔

اس جملے پر سب نے زوردار قہقہہ لگایا۔

پھر شائستہ نے دونوں کو سالگرہ کی مبارک باد دی۔ فائزہ نے اپنے ابو کا حال پوچھا جس
پر انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ارے کوئی بات نہیں بیٹی۔ ایسے ہی سر میں درد تھا۔ تمہاری امی کو
فون کیا گیا اور یوں ہماری چھٹی ہو گئی۔"

"امی نے آپ کو کہیں لے جانا ہو گا۔" فائزہ نے شائستہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
"کہیں امی کہاں جانا ہے؟ شاپنگ یا ہوٹلنگ یا پھر پکنک؟ بولیں"

"یہ آپ نے بہت اچھا کیا۔" طارق نے کہا۔

"اور بیٹے طارق' تم سناؤ کیا حال ہیں' پورے ایک ہفتے بعد تمہاری شکل دکھائی دی
ہے۔"

"ابو جان..... یہی بات یہ بھی کہہ رہے تھے کہ ماموں جان سے ملے ایک ہفتہ ہو گیا'
فائزہ بھی چاہ رہا تھا یعنی دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی۔"

"طارق تمہاری یہ بات مجھے بہت پسند ہے کہ تم شادی کی سالگرہ گھر پر موم بتی بجھا
کر نہیں مناتے بلکہ پورے دن گھومتے پھرتے ہو۔ بیگم' کیا خیال ہے' ہم بھی کیوں نہ آج اپنی شادی

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

کی سالگرہ باہر جا کر منالیں۔"

"آپ کون سی شادی کی سالگرہ منائیں گے۔ آپ سے میری شادی تو جنوری میں ہوئی تھی۔ ادھر ابھی اکتوبر شروع ہوا ہے ہاں اکتوبر میں کوئی شادی ہو تو مجھے معلوم نہیں۔" شائستہ نے احمد میاں کو چھیڑتے ہوئے کہا۔

اسی طرح کی خوش گپیوں میں ایک گھنٹہ گزر گیا۔ تب طارق نے ان سے اجازت چاہی۔ احمد میاں دونوں کو باہر تک چھوڑنے آئے اور انہیں رخصت کرتے ہوئے بولے۔

"بیٹے باہر زیادہ دیر تک نہ رہنا۔"

"ماموں جان آپ فکر نہ کریں۔ اچھا خدا حافظ۔"

یہاں سے انہوں نے سمندر کی طرف رخ کیا۔ فائزہ کو سمندر بہت اچھا لگتا تھا اس کا جی چاہتا کہ وہ گھنٹوں سمندر کے کنارے بیٹھی آتی جاتی لہروں کو گنتی رہے۔ فائزہ سے زیادہ طارق سمندر سے عشق تھا۔ سمندر کے کنارے پہنچ کر یہ ناممکن تھا کہ وہ بغیر نہائے وہاں سے واپس چلا جائے۔ سمندر کے نیلے پانی کو دیکھتے ہی اسے بے چینی سی ہونے لگی۔ لہریں جیسے اس کا نام لے کر پکارتیں اور وہ ان سے ہم آغوش ہونے کے لیے سمندر میں کود پڑتا۔

وہ شام تک سمندر کی لہروں سے کھیلتے رہے ایک دوسرے پر پانی اچھالتے رہے۔ قہقہے لگاتے رہے۔ سورج غروب ہونے پر انہوں نے وہاں سے کوچ کیا اور شہر کے ایک مشہور چائنیز ریستوران میں ڈنر کیا۔

ریستوران کی مدھم مگر خوشگوار فضا میں وہ بیتے دنوں کو دہراتے رہے۔ طارق ماضی کی یادوں کو راکھ میں دبی ہوئی چنگاریوں کی طرح کرید رہا تھا اور فائزہ ماضی کے قصوں سے جلد جان چھڑانا چاہتی تھی۔ اسے اب ماضی سے زیادہ مستقبل سے دلچسپی تھی۔ ماضی اس کے لیے ببول کا کانٹا بن گیا تھا۔ جسے جتنا نکالو اندر گھستا ہی جاتا ہے۔ وہ مستقبل کے خواب دیکھنا چاہتی تھی۔ وہ طارق کی باتیں بظاہر بڑی دلچسپی سے سن رہی تھی لیکن اس کا دماغ کہیں اور تھا۔

"فائزہ!" اس نے اسے چونکایا۔

"جی۔" وہ واقعی چونک گئی۔

"ایک بات بتاؤ فائزہ۔" طارق نے بڑے سنجیدہ لہجے میں پوچھا۔

"کیا بات؟" اس نے بڑی معصومیت سے پوچھا۔

"کیا اس زندگی میں ہی کیے کی سزا مل جاتی ہے؟"

مجھے معلوم نہیں طارق۔ ہو سکتا ہے مل جاتی ہو ویسے اتنا ضرور یقین ہے کہ اوپر ضرور سزا ملے گی۔"

"میرا خیال ہے کہ اللہ زندگی میں ہی سزا دے دیتا ہے۔ اسے ہم سمجھیں یا نہ سمجھیں یہ الگ بات ہے رہی بات اوپر کی وہ تو خیر ہمارا آخری ٹھکانا ہے۔ وہاں بھی اگر جزا سزا نہ ملی تو پھر

کہاں ملے گی۔ میں تو اس دنیا کو ہی انسان کے لیے ایک سزا سمجھتا ہوں۔"

ہاں شاید تم ٹھیک کہتے ہو۔ فائزہ نے کہا "اس زندگی میں ہم کتنے عذاب جھیلتے ہیں کتنے دکھ اٹھاتے ہیں سکھ تو یہاں صرف چند لوگوں کو ملتا ہے یا شاید انہیں بھی نہیں۔"

"سکھ کا نام اگر پیسہ ہے تو وہ یہاں بہت لوگوں کے پاس ہے....."

نہیں سکھ کا نام پیسہ ہرگز نہیں۔ اگر سکھ کا نام پیسہ ہوتا تو ہر پیسے والا خوش و خرم ہوتا پرسکون ہوتا۔"

"پیسہ تو سکون کا دشمن ہے۔"

"ہاں یہ بات سو فیصد صحیح ہے لیکن یہ بات ہر ایک کی سمجھ میں آئے گی نہیں۔

"تم ٹھیک کہتے ہو؟"

"میں بات کر رہا تھا کیے کی سزا کی۔ فائزہ تم ایک بیوی ہو تم اس مسئلے پر اچھی طرح روشنی ڈال سکو گی۔ آج صبح دفتر میں کسی سے مرد اور عورت کی بے وفائی پر بات ہو رہی تھی۔ خاص طور پر شادی شدہ عورتوں اور مردوں کی۔ عورتوں کی نظر میں مرد بدفطرت ہوتا ہے لڑکی دیکھ کر پھسلنے والا۔ چلو مان لیتا ہوں لیکن تم ذرا ان شادی شدہ عورتوں کی نفسیات پر روشنی ڈالو جو اپنے شوہر کو چھوڑ کر غیر مرد کے گلے کا ہار بن جاتی ہیں۔ عورتیں تو بدفطرت نہیں ہوتیں پھر وہ ایسا کیوں کرتی ہیں؟"

"انتقاماً..... میں سمجھا نہیں! وہ بے وفائی کر کے کس سے انتقام لیتی ہیں؟"

"اپنے شوہر سے۔"

"یہاں محبت کرنے والے شوہر کا ذکر نہیں۔"

"اچھا فرض کرو ایک شوہر ہے اسے اپنی بیوی سے بڑی محبت ہے۔ وہ اس کا ہر طرح خیال رکھتا ہے لیکن اس کی بیوی پھر بھی کسی سے دامن الجھا لیتی ہے۔ اب تم....."

"نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔" فائزہ نے یہ بات بڑے اعتماد سے کہنا چاہی لیکن اس کے لہجے میں اعتماد نہ آ سکا۔ اس کی آواز کانپ کر رہ گئی۔

"اگر ایسا ہو جائے تو شوہر کو کیا کرنا چاہیے؟"

"اسے طلاق دے دینی چاہیے۔"

"بس طلاق..... یہ تو کوئی سزا نہ ہوئی۔ شوہر کی عزت کو داؤ پر لگانے والی عورت کو اتنی کی سزا! طلاق ایسی عورت کے لیے سزا نہیں جزا ہے۔" طارق بڑے جذباتی انداز میں بولا۔

"طارق آج کے دن یہ کیا لے بیٹھے!" فائزہ نے اس کی آنکھوں میں دیکھنے کی کوشش کی۔

"اوہ سوری۔" طارق فوراً سنبھل گیا۔ اچھا اب جلدی کھانا کھاؤ۔ پکچر کا وقت نہ نکل جائے۔"

"نہیں وقت نہیں نکلے گا۔ انگلش فلم تو ویسے بھی دیر سے شروع ہوتی ہے۔"

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

کھانے سے فارغ ہو کر جب وہ پکچر ہاؤس پہنچے تو فلم کے ٹائٹل چل رہے تھے۔ ٹارچ مین نے ان کی نشستوں تک رہنمائی کی' طارق نے سیٹ پر بیٹھ کر سکون کا سانس لیا۔

''ٹھیک وقت پر پہنچ گئے۔'' فائزہ نے کہا

''ہاں۔'' طارق نے ٹانگیں پھیلاتے ہوئے کہا۔ ''فلم کا ایک سین بھی نکل جائے تو مجھے بڑی بوریت ہوتی ہے۔''

''جانتی ہوں۔ اسی لیے تو ڈر رہی تھی کہ کہیں دیر نہ ہو جائے۔''

یہ فلم بھی اتفاق سے ازدواجی زندگی پر تھی۔ یہ ایک ایسی عورت کی کہانی تھی جو اپنے شوہر سے بے وفائی کرتی ہے' کسی اور کی ہو جاتی ہے' لیکن آخر میں وہ اپنے شوہر کی طرف پلٹ آتی ہے۔

اس فلم کو دیکھتے ہوئے فائزہ انگاروں پر لوٹتی رہی' اس فلم کا ہر سین اس کو آئینہ دکھا رہا تھا۔ وہ بے قرار ہو کر بار بار پہلو بدلتی' کن انکھیوں سے طارق کی طرف دیکھتی اور پھر اسکرین پر نظریں جما دیتی۔ اس فلم کا انجام دیکھ کر وہ بے اختیار سسک پڑی' اس نے دفور جذبات سے طارق کا ہاتھ دبایا۔

''میں تمہاری ہوں طارق..... صرف تمہاری۔'' اس کی روح کی نادم مگر دھیمی آواز آئی' پر یہ آواز طارق تک نہ پہنچ سکی۔

فلم کے اختتام پر وہ دونوں آہستہ آہستہ سینما ہال سے باہر نکلے۔ رکشا' ٹیکسی کا دور تک پتا نہ تھا۔ طارق اور فائزہ سڑک کے کنارے کھڑے ہو کر سواری کا انتظار کرنے لگے۔ ایک دو منٹ کے بعد سڑک کے اس پار پٹرول پمپ پر ایک ٹیکسی آ کر رکی' ٹیکسی خالی تھی وہ اسے دیکھ کر بھاگا۔

''فائزہ تم یہیں کھڑی ہو۔ میں ٹیکسی والے سے بات کرتا ہوں۔''

''جی ٹھیک ہے۔'' فائزہ نے اثبات میں گردن ہلائی۔

فائزہ نے طارق کو سڑک پار کرتے دیکھا۔ وہ بھاگ کر ٹیکسی کے قریب پہنچا۔ چند لمحے ٹیکسی والے سے ب کی پھر اس نے طارق کو ٹیکسی میں بیٹھتے ہوئے دیکھا' اسے ٹیکسی میں بیٹھتے دیکھ کر اس کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ ٹیکسی والے کا مان جانا بھی کسی محبوب کے مان جانے سے کم نہیں ہوتا۔

چند سیکنڈوں کے بعد ٹیکسی فائزہ کے سامنے آ کر رکی۔ فائزہ دروازہ کھول کر طارق کے ساتھ بیٹھ گئی۔ ٹیکسی چل پڑی۔ ٹیکسی ڈرائیور نے چلنے سے پہلے بغور انہیں دیکھا۔

''اس فلم کا انجام بہت اچھا تھا۔'' فائزہ نے تبصرہ کیا۔

''ہاں' بڑا اصلاحی تھا۔'' طارق کے لہجے میں بڑا طنز تھا اور اس بات کی تنبیہ بھی کہ وہ مزید اس موضوع پر بات کرنا نہیں چاہتا۔

فائزہ اس کے لب و لہجے کو اچھی طرح سمجھتی تھی لہٰذا اس نے خاموشی اختیار کی۔

ٹیکسی اب شہر سے نکل چکی تھی۔ سڑکیں سنسان تھیں' کبھی ایک آدھ گاڑی نظر آ جاتی۔ ٹیکسی ڈرائیور نے منی بیگم کی غزلوں کی کیسٹ لگا دی تھی جسے وہ دونوں بھی دلچسپی سے سن رہے تھے۔

ٹیکسی پل پر پہنچی تو طارق نے دیکھا کہ دو آدمی سڑک پر کھڑے ہیں۔ نزدیک ہی ایک موٹر سائیکل کھڑی ہے۔ وہ دونوں ٹیکسی کو رکنے کا اشارہ کر رہے تھے۔

وہ دونوں آدمی ظاہر ہے کہ کوئی اچھے آدمی نہیں ہو سکتے تھے' اس لیے طارق ٹیکسی کو رکتے ہوتے دیکھ کر فوراً چیخا۔ ''گاڑی مت روکنا۔''

لیکن ٹیکسی والے نے اس کی بات پر ذرا بھی دھیان نہیں دیا۔ اس نے گاڑی روک لی اس سے پہلے کہ وہ دونوں آدمی نزدیک آتے' ٹیکسی ڈرائیور پیچھے مڑا اور طارق کو ریوالور دکھاتے ہوئے بولا۔ ''چلو نیچے اترو۔''

''یہ کیا بکواس ہے!''

''یہ بکواس نہیں ریوالور ہے اور بھرا ہوا ہے۔''

فائزہ آج گھر سے پوری طرح دلہن بن کر نکلی تھی۔ اس کے جسم پر خاصا زیور تھا۔ وہ طارق سے چمٹ گئی۔

اتنے میں وہ دونوں غنڈے بھی قریب آ گئے اور دروازہ کھول کر طارق کو باہر کھینچنے لگے۔

''یہ کیا بدتمیزی ہے؟'' طارق کو غصہ آ گیا۔

''باہر نکلو گدھے ورنہ ابھی گولی چلاتا ہوں۔'' ٹیکسی ڈرائیور نے ریوالور اس کی کنپٹی سے لگا لیا۔

فائزہ سہم گئی۔ اس نے اور مضبوطی سے طارق کو پکڑ لیا اور لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔

''نہیں' خدا کے واسطے میرے شوہر کو کچھ نہ کہنا۔''

تب ایک غنڈہ دروازے کے دوسری طرف گیا۔ اس نے ایک جھٹکے سے فائزہ کو طارق سے الگ کیا۔ اس اثنا میں ٹیکسی ڈرائیور نے دوسرے آدمی کے ساتھ مل کر طارق کو ٹانگ اور ہاتھ پکڑ کر باہر گھسیٹ لیا' فائزہ نے تڑپ کر باہر نکلنے کی کوشش کی۔

''طارق!'' وہ چیخی۔

فائزہ کی چیخ سن کر وہ ان دونوں سے الجھ گیا' لیکن اس ہاتھا پائی کا کوئی نتیجہ نہ نکلا' سوائے اس کے کہ طارق لہولہان ہو گیا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے اس کے سر پر ریوالور کا دستہ مارا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے تارے ناچ گئے۔ پھر اس نے دھندلاتی آنکھوں سے اتنا دیکھا کہ ٹیکسی ڈرائیور گاڑی میں بیٹھا اس کا دوسرا ساتھی بھی پیچھے بیٹھ گیا اور فائزہ کو قابو کرنے میں اپنے پہلے ساتھی کی مدد کرنے لگا فائزہ نے کاٹ کاٹ کر زخمی کر دیا تھا۔ پھر گاڑی سٹارٹ ہو گئی۔

فائزہ بری طرح چیخ رہی تھی' وہ ''طارق' طارق پکار رہی تھی اور طارق کی آنکھوں میں

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔ اس نے لڑکھڑاتے قدموں سے ٹیکسی کی طرف بڑھنے کی کوشش کی' لیکن بے سود وہ چکرا کر زمین پر گرا اور بے ہوش گیا۔

حواس کھوتے ہی جیسے فائزہ کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ وہ بڑے پردرد لہجے میں کہہ رہی تھی۔

"میں تمہاری ہوں طارق۔ مجھے بچالو۔"

لیکن اب کیا ہوسکتا تھا۔ ہونی ہو چکی تھی' ہونی کو نہیں روکا جا سکتا تھا۔

کچھ دیر کے بعد وہاں سے ایک ٹرک گزرا ٹرک ڈرائیور کی نظر جب طارق پر پڑی جو ایک لاش کی مانند پل پر پڑا تھا تو اس پٹھان ڈرائیور کے دل میں جذبہ رحم جاگا' اس نے ٹرک روک لیا۔

پھر وہ ٹرک سے کودا۔ ساتھ ہی کلینر بھی اترا۔ پٹھان ڈرائیور نے اپنے گلے میں پڑے ہوئے ریوالور کو ہاتھ سے چھو کر دیکھا اور پھر اطمینان سے طارق کی طرف بڑھا۔

طارق اوندھے منہ سڑک پر پڑا تھا۔ اس کے سر سے خون بہہ کر پیشانی پر آ گیا تھا۔

ڈرائیور نے جھک کر اس کا معائنہ کیا۔ پھر کلینر سے مخاطب ہوا۔

"ابھی زندہ ہے۔ اٹھاؤ اسے ٹرک میں ڈالو۔ کوئی شریف آدمی معلوم ہوتا ہے' اسے شاید کسی نے لوٹا ہے۔"

پھر دونوں نے مل کر اسے اٹھا کر ٹرک میں ڈالا۔

"استاد اسے کہاں لے جاؤ گے؟"

"اوئے۔ ہسپتال لے جائیں گا اور کدھر لے جائیں گا۔"

ہسپتال پہنچنے سے پہلے ہی طارق کو ہوش آ گیا۔ ہوش میں آتے ہی پہلے تو اس نے اپنے گردوپیش کا جائزہ لیا اور پھر گھبرا کر ٹرک سے چھلانگ لگانے لگا۔

"ذرا ہوش کرو یار۔ تم پہلے ہی زخمی ہے' چھلانگ لگا کر کیوں مرتا ہے۔"

"تم لوگ مجھے کہاں لے جا رہے ہو۔ کون ہو تم لوگ؟"

"ارے ہم لوگ ٹرک ڈرائیور ہے اور کون ہے۔ تم سڑک پر بے ہوش پڑا تھا' ہم نے اٹھایا۔ بس یہی ہے ہمارا قصور۔"

"خاں صاحب۔ وہ میری بیوی کو اغوا کر کے لے گئے"

"تم اتنی رات کو بیوی کو لے کر نکلا کیوں؟"

"خاں صاحب' ہم فلم دیکھ کر آ رہے تھے اور گھر جا رہے تھے" پھر طارق نے سارا روداد ٹرک ڈرائیور کو سنا دی' کیا ہوا اور کیسے ہوا۔

ٹرک ڈرائیور نے اسے تسلی دی' پہلے ہسپتال میں اس کی مرہم پٹی کرائی پھر اسے تھانے کے گیٹ پر چھوڑ دیا۔ اپنا نام پتا بھی اس نے بتا دیا کہ اس کی ضرورت پڑے تو اسے بلا تکلف بلا

لیا۔

تھانے میں اس نے اغوا کی رپورٹ درج کرائی۔ وہیں سے احمد میاں کو فون کیا۔ پانچ چھ گھنٹیاں بجنے کے بعد انہوں نے فون اٹھایا' چند لمحوں بعد احمد میاں کی نیند میں ڈوبی ہوئی آواز سنائی دی۔

ماموں جان میں بول رہا ہوں۔" طارق کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس طرح اس خبر کو سنائے۔

"ارے طارق! تم خیریت تو ہے" احمد میاں کی فوراً نیند اڑ گئی۔

"ماموں جان" بہت بری خبر ہے۔ فائزہ کو ڈاکوؤں نے اغوا کر لیا۔" طارق نے بہ مشکل خبر سنائی۔" ماموں جان' میں اس وقت تھانے میں ہوں' آپ فوراً یہاں آ جائیے۔"

تھانے کا انچارج معصوم شاہ بڑا شریف النفس آدمی تھا۔ اس نے طارق کو بڑی تسلی دی۔ اچھی طرح پورے واقعات سنے۔ رپورٹ درج کی پھر وائرلیس کے ذریعے ہیڈ کوارٹر اطلاع دی۔ جہاں سے تمام شہر کی پولیس کو چوکس کر دیا گیا۔ ناکہ بندی کر دی گئی۔

ابھی وہ رپورٹ درج کرا ہی رہا تھا کہ احمد میاں' اپنی بیگم کے ساتھ تھانے پہنچ گئے۔ طارق کے سر پر پٹی بندھی دیکھ کر وہ دونوں بے قرار ہو گئے۔ احمد میاں نے اسے لپٹا لیا۔

طارق نے ایک مرتبہ پھر ٹیکسی میں بیٹھنے سے لے کر تھانے پہنچنے تک کے واقعات دہرائے۔

معصوم شاہ نے بہت غور سے اس کا بیان سنا۔ اس کا بیان حرف بہ حرف وہی تھا جو وہ رپورٹ میں لکھوا چکا تھا۔

"کیا آپ کو ٹیکسی کا نمبر یاد ہے؟" معصوم شاہ نے سگریٹ کا گل جھٹکتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں' میں نے اس طرف دھیان نہیں دیا۔"

"اس ٹیکسی ڈرائیور کو پہچان لیں گے؟"

"ہاں' اسے میں فوراً پہچان لوں گا۔ اس کا چہرہ میری آنکھوں میں محفوظ ہے۔"

"اور اس کے ساتھیوں کو؟"

"ان کے چہرے بھی مجھے یاد ہیں۔"

معصوم شاہ اسی طرح کے رسمی سوالات کرتا رہا۔ پھر بولا۔

"اچھا ٹھیک ہے۔ آپ لوگ اب جائیں' جیسے ہی کوئی اطلاع ملے گی میں آپ کو فون پر دوں گا۔ ویسے آپ لوگ فکر نہ کریں وہ ضرور مل جائے گی۔"

"خدا کرے' ایسا ہی ہو۔" طارق نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

شائستہ کی حالت خاصی خراب ہو گئی تھی۔ ان پر نیم غشی سی طاری تھی۔ طارق نے انہیں سہارے کر اٹھایا اور باہر کی طرف لے چلا۔

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

اب طارق کا اپنے گھر جانا فضول تھا' وہاں کون بیٹھا تھا جس کے لیے جاتا۔ وہ احمد میاں کے ساتھ آ گیا۔ شائستہ کی طبیعت ٹھیک نہ تھی' یوں احمد میاں بھی نڈھال ہو رہے تھے۔ طارق کی جو حالت تھی' وہ خود ہی جانتا تھا۔ سر پر تو خیر چوٹ پڑی ہی تھی' لیکن دل پر جو چوٹ پڑی تھی وہ خاصی کاری تھی۔ اس میں شدید تکلیف تھی۔ لہٰذا وہ ماموں جان کے گھر ہی ٹھہر گیا۔

وہ رات تقریباً آنکھوں میں کٹی۔ کوئی نہ سو سکا۔ سوتا بھی کیسے' بیٹی کا اغوا ہو جانا' بیوی کا چھن جانا' ایک کربناک حادثہ تھا۔ والدین کے لیے بھی اور شوہر کے لیے بھی۔ ٹیلی فون کی گھنٹی پر سب کے کان لگے رہے۔ تھانے سے کوئی فون نہ آیا البتہ رانگ نمبر آتے رہے۔ طارق اور احمد میاں خود ہی وقفے وقفے سے تھانے ٹیلی فون کر کے صورتحال معلوم کرتے رہے' لیکن صورتحال جوں کی توں وہی تھی۔ پولیس ابھی تک کوئی سراغ نہ لگا سکی تھی۔

صبح اذان کے وقت طارق کی آنکھ لگ گئی' لیکن شائستہ بالکل نہ سو سکیں۔ ادھر احمد میاں کا بھی یہی حال تھا۔ کمرے میں ٹہل ٹہل کر انہوں نے رات کاٹی۔ وہ صبح گاڑی لے کر نکل گئے۔ ان کے جانے کے تھوڑی دیر بعد ٹیلی فون کی گھنٹی بجی گھنٹی کی آواز سے طارق کی آنکھ کھل گئی۔ وہ جھپٹ کر اٹھا اور لپک کر ریسیور اٹھا لیا۔

"ہیلو۔" وہ بے قراری سے بولا۔

شائستہ بھی اس کے قریب آ کر کھڑی ہو گئیں اور پرامید نظروں سے طارق کا چہرہ دیکھنے لگیں۔

"ہیلو۔ جلترنگ میرج ہال۔" ادھر سے آواز آئی۔

یہ سن کر طارق بھنا اٹھا' اس نے ریسیور کریڈل پر پٹخ دیا اور بولا۔ "گدھے کا بچہ۔"

"کون تھا طارق؟"

"رانگ نمبر تھا ممانی جان۔"

"ایک ان رانگ نمبروں نے بڑی مصیبت ڈالی ہوئی ہے۔ خدا سمجھے انہیں۔"

"ماموں جان کہاں ہیں؟ طارق نے پوچھا۔

"گاڑی لے کر کہیں نکلے ہیں۔" شائستہ نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ "ایک خفیہ پولیس کا افسر ان کا جاننے والا ہے' ممکن ہے' اس کے گھر گئے ہوں۔"

"کچھ بتا کر نہیں گئے؟"

"نہیں۔" شائستہ نے نفی میں گردن ہلائی۔

کوئی آٹھ بجے کے قریب احمد میاں واپس آئے۔ وہ واقعی اپنے واقف کار خفیہ پولیس افسر خورشید احمد خان کے پاس گئے تھے۔ اس نے تعلقات کی لاج رکھتے ہوئے' ادھر ادھر فون کھڑکائے' معصوم شاہ سے بھی تازہ صورتحال معلوم کی مگر نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ مایوسی کے سوا کچھ نہ ملا۔

اسی تذبذب میں پریشانی کے عالم میں' آس نراس میں چوبیس گھنٹے مزید گزر گئے۔

دوسرے دن ٹھیک آٹھ بجے معصوم شاہ کا ٹیلی فون آیا۔ ٹیلی فون احمد میاں نے اٹھایا۔ انہیں نہیں معلوم تھا کہ یہ ٹیلی فون ان کے لیے کیا خبر لایا ہے۔ اگر یہ معلوم ہوتا تو وہ ہرگز ٹیلی فون نہ ریسیو کرتے۔

ادھر سے معصوم شاہ ایک اندوہناک خبر سنا رہا تھا اور احمد میاں کے جسم میں کپکپاہٹ اور آنکھوں کے آگے اندھیرا چھاتا جا رہا تھا۔ تب انہوں نے ریسیور طارق کے ہاتھ میں دے دیا اور خود دل تھام کر بیٹھ گئے۔

"ہائے میری بچی۔"

فائزہ کی لاش مل گئی تھی۔ معصوم شاہ اس وقت ہسپتال سے بول رہا تھا۔ اس نے دونوں کو بلایا تھا تاکہ آ کر لاش لے جائیں۔

جب ایمبولینس میں لاش کو لایا گیا تو تمام عزیز و اقارب اکٹھے ہو چکے تھے۔ لاش کو دیکھ کر ایک کہرام سا مچ گیا۔ شائستہ "ہائے میری بچی" کہہ کر غش کھا کر گریں۔ طارق اپنے پھٹے سر کو دیوار سے ٹکرانے لگا۔ اس کی حالت دیوانوں جیسی ہو رہی تھی۔ البتہ احمد میاں پر سکتہ طاری تھا۔ وہ چپ چاپ لاش کے پاس بیٹھا ایک ٹک اسے دیکھے جا رہے تھے۔

جب فائزہ کا آخری سفر شروع ہوا تو احمد میاں کے اندر تھما ہوا طوفان ایکدم ابل پڑا۔ وہ دہاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ فائزہ ان کی اکلوتی بیٹی تھی اور بہت چہیتی۔ شائستہ پر متواتر غشی کے دورے پڑ رہے تھے۔ وہ چند منٹ کے لیے ہوش میں آتیں۔

"ہائے میری بچی" کہتیں اور پھر بے ہوش ہو جاتیں۔

فائزہ کی جوان موت سب کے دکھ کا باعث تھی' لیکن خالق کے آگے کس کی چلی ہے۔ جو دیتا ہے' وہ لینا بھی جانتا ہے' جو جلاتا ہے وہ مارنا بھی جانتا ہے' اس کی مصلحتوں کے آگے بندے کا سر جھکا دینا ہی بہتر ہے۔

فائزہ کے جنازے میں خاصے لوگوں نے شرکت کی۔ ان بہت سے لوگوں میں خورشید احمد خان اور معصوم شاہ بھی شامل تھے۔ معصوم شاہ سادہ لباس میں تھا۔ اس اثنا میں اس نے بہت سی معلومات اکٹھا کر لی تھی۔

یہ معلومات فائزہ کے متعلق بھی تھیں اور طارق کے متعلق بھی۔ ان معلومات میں ایک بہت بڑی چونکا دینے والی تھی۔ اس سراغ کی روشنی میں معصوم شاہ اور خورشید احمد خان نے ازسرنو کیس کا جائزہ لیا۔ اس جائزے کی روشنی میں انہیں مجرم کسی حد تک نظر آنے لگا۔ پھر پوسٹ مارٹم کی رپورٹ نے اس فیصلے پر مزید مہر ثبت کر دی۔

دوسرے دن معصوم شاہ' احمد میاں کے گھر آیا۔ ساتھ دو سپاہی تھے۔

گھنٹی بجانے پر شائستہ باہر آئیں تو معصوم شاہ نے بڑے مہذبانہ انداز میں پوچھا۔ "طارق صاحب کہاں ہیں؟"

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

"طارق تو اپنے گھر گئے ہوئے ہیں' میں نے ہی انہیں بھیجا تھا تاکہ کپڑے وغیرہ تبدیل کر لیں۔ بہت میلے ہو گئے تھے۔ اب جانے والی تو چلی گئی۔ اس کے ساتھ آدمی خود تو مٹی نہیں ہو جاتا۔" یہ کہتے ہوئے ان کی آنکھیں بھر آئیں۔

"احمد میاں بھی گھر پر نہیں؟"

"جی نہیں۔ وہ طارق کو گھر پر چھوڑنے گئے ہیں۔"

"آپ مجھے طارق صاحب کے گھر کا پتا بتانا پسند کریں گی؟"

"جی ہاں' کیوں نہیں۔" پھر انہوں نے تفصیل سے طارق کے گھر کا پتا بتایا اور آخر میں بولیں۔ "خیریت تو ہے نا؟"

"جی ہاں' بالکل خیریت ہے۔ ذرا ان سے کچھ بات کرنا تھی۔ اچھا جی' بہت شکریہ۔ ہم چلتے ہیں۔"

"جی بہتر۔" شائستہ نے انہیں "خدا حافظ" کہا اور گیٹ اندر سے بند کر لیا۔

طارق کے گھر پہنچنے میں معصوم شاہ کو آدھا گھنٹا لگا۔ سیڑھیاں چڑھ کر اس نے ایک گہرا سانس لیا۔ دروازے پر لگی نام کی تختی کو پڑھا اور پھر کال بیل پر ہاتھ رکھ دیا۔

تھوڑی دیر کے بعد دروازہ کھلا۔ طارق نے معصوم شاہ کو مع دو سپاہیوں کے اپنے دروازے پر کھڑا دیکھا تو ایک لمحے کو چکرا گیا پھر اس نے اپنی بدلتی کیفیت کو تیزی سے کنٹرول کیا اور مسکراتے ہوئے بولا۔ "آیئے۔ انسپکٹر صاحب' آیئے۔"

"احمد میاں کہاں ہیں؟" معصوم شاہ نے ڈرائنگ روم کا جائزہ لیتے ہوئے سوال کیا۔

"اچھا تو آپ ادھر سے آ رہے ہیں۔" طارق نے بات کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کی۔ "ماموں جان تو مجھے نیچے ہی چھوڑ کر چلے گئے تھے۔"

"طارق صاحب' آپ بہت ذہین آدمی ہیں۔" معصوم شاہ نے یہ بات بڑی سادگی سے کہی' لیکن طارق اندر ہی اندر چوکنا ہو گیا۔

"میں سمجھا نہیں۔"

"آپ نے بھئی' بڑی زبردست پلاننگ کی۔"

"کس بات کی؟"

"اپنی بیوی کو موت کے گھاٹ اتارنے کی اور کس بات کی۔" اچانک حملہ ہوا تھا۔

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں! انسپکٹر صاحب' آپ نشے میں تو نہیں ہیں۔" طارق نے اپنے حواس کو منتشر ہونے سے روکا۔

معصوم شاہ نے اس کی بات کا بالکل برا نہیں مانا۔ جان کر سرد مزاجی کا مظاہرہ کیا اور پھر مسکراتے ہوئے بولا۔ "میں تو خیر نشے میں نہیں ہوں اور نشہ تو بڑی چیز ہے' میں تو سگریٹ بھی نہیں پیتا۔"

"پھر اس طرح کا الزام مجھ پر تھوپنے کی کوشش کیوں کر رہے ہیں؟"

"آپ نے بہت سی باتیں ہمیں بتائیں مگر جو اصل بات تھی' وہ چھپا گئے۔"

"مثلاً؟" طارق اندر ہی اندر سٹ رہا تھا۔

"مثلاً یہ بات کہ آپ نے اپنی بیوی کی پانچ لاکھ کی انشورنس کرائی تھی۔"

"اس بات کا اس کیس سے کیا تعلق ہے۔"

"انشورنس آپ نے کرائی یا نہیں؟ مجھے صرف اس بات کا جواب چاہئے۔" معصوم شاہ کے لہجے میں تھوڑی سی سختی آ گئی۔

"یہ بات بالکل ٹھیک ہے' لیکن....."

"آپ کا کیا خیال ہے' فائزہ کو کیوں قتل کیا گیا؟"

"اغوا' ڈکیتی' مجرمانہ حملہ اور پھر قتل۔" طارق نے تجزیہ کیا۔

"پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کہتی ہے کہ مقتولہ پر کوئی مجرمانہ حملہ نہیں ہوا۔"

"زیورات تو لوٹے گئے۔ اس کے جسم پر خاصے قیمتی زیورات تھے۔" طارق نے کہا۔

"کیا مالیت رہی ہو گی ان زیورات کی؟"

"ساٹھ ستر ہزار۔"

"اگر آپ کو یہ معلوم ہو کہ زیورات بھی نہیں لوٹے گئے تو"

"لیکن فائزہ کے جسم پر تو ایک بھی زیور نہیں تھا۔ حتیٰ کہ ہاتھ میں انگوٹھیاں بھی نہیں [illegible]۔"

"آپ کی بیوی کا سارا زیور تھانے میں موجود ہے۔ میں نے قصداً آپ کو اور احمد میاں [illegible] سے لاعلم رکھا مگر خورشید احمد خاں کو بتا دیا تھا اور اسی بات نے ہمیں دوسری طرف سوچنے پر [illegible] کیا۔ اگر آپ کی بیوی کو زیورات کے لیے اغوا کیا گیا تھا تو اس کے جسم سے زیورات غائب [illegible] چاہئیں تھے۔ پھر پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سے پتا چلا کہ مجرمانہ حملہ بھی نہیں ہوا۔ اگر اس ٹیکسی [illegible] کو مقتولہ پسند آ گئی تھی تو صاف کیوں چھوڑ دیا۔ یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ ان کا مقصد محض [illegible] قتل کرنا تھا۔ لہٰذا وہ اسے کہیں نہیں لے گئے۔ ٹیکسی میں ہی گولی اس کے سر پر ماری اور سڑک [illegible] کے جھاڑیوں میں لاش پھینک کر چلے گئے۔ زیورات وغیرہ پر انہوں نے توجہ نہیں دی۔ توجہ [illegible] کی ضرورت بھی نہیں تھی کیونکہ بدمعاش لوگ اصول کے بڑے کھرے ہوتے ہیں۔ کام بڑی [illegible] داری سے کرتے ہیں۔ آپ نے تو ان سے صرف قتل کرنے کا سودا کیا تھا نا۔ ظاہر ہے' آپ [illegible] لاکھ ملنے والے ہیں۔ اس میں سے ڈھائی لاکھ بھی قاتلوں پر خرچ کر دیئے جائیں' پھر بھی [illegible] گھاٹے میں رہیں گے۔ کیوں طارق صاحب' میں نے غلط تو نہیں کہا۔" معصوم شاہ نے [illegible] کو اپنے ہاتھ پر مارتے ہوئے طارق کو تیز نظروں سے دیکھا۔

"یہ جھوٹ ہے۔" طارق نے ذرا سخت لہجہ اختیار کرنے کی کوشش کی۔

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

"اچھا' یہ جھوٹ ہے تو پھر تھانے چلیں۔ وہاں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔" معصوم شاہ نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

پھر وہ سپاہیوں سے مخاطب ہوا۔ "چلو بھئی' صاحب کو اٹھا کر ڈالو گاڑی میں۔ اب باقی وہیں ہوگی۔"

دونوں سپاہیوں نے بہ آسانی اسے قابو کرلیا۔ "چل اوئے بیوی کے قاتل۔"

"میں گھر کو بند تو کر دوں۔"

"ہاں' بند کر دو۔ ویسے چاہو تو اس گھر کی ہر چیز پر حسرت کی نظر ڈال لو' کیونکہ یہاں سے جانے کے بعد واپس نہ آسکو گے۔ پھانسی تمہارا مقدر ہوگئی ہے۔"

طارق نے کانپتے ہاتھوں سے گھر بند کیا' چابی جیب میں ڈالی اور آہستہ آہستہ سیڑھیاں اترنے لگا۔ ایک سپاہی کو اس کا یہ نخرا پسند نہ آیا۔ اس نے پیچھے سے اسے دھکا دیا۔ "جلدی اتر او شریف بدمعاش۔"

طارق سیڑھیوں پر گرتے گرتے بچا۔

"اقبال پتر' ایسا نہ کر' ابھی اس سے اقبالی بیان لینا ہے۔ ذرا چوٹ سے بچا۔" معصوم شاہ نے اس سپاہی کے کندھے پر ہاتھ رکھا جس نے دھکا دیا تھا۔

"شاہ جی' بغیر چوٹ کھائے یہ کچھ نہیں قبولے گا۔"

"قبولے گا کیوں نہیں پتر۔ تھانے میں اچھے اچھوں کی روح فنا ہو جاتی ہے۔ یہ تو پھر ہے۔"

گاڑی میں بیٹھ کر معصوم شاہ' طارق کو جیسے بھول گیا۔ وہ اپنے ساتھ آئے دونوں سپاہیوں سے گفتگو کرتا رہا اور اس گفتگو کا موضوع تھا اقبال جرم کرانا۔ اقبال جرم کے لیے پولیس کیا کیا کرتی ہے۔ یا کیا کیا کر سکتی ہے' اس کا ذکر اس ڈرامائی انداز سے شروع کیا کہ طارق کی روح فنا ہونے لگی۔ اس کے سر پر پہلے ہی چوٹ لگی ہوئی تھی۔ کچھ اور کرنے کے بجائے محض اس کی چوٹ کو چھیڑ دیا جاتا تو وہ سب کچھ بتا دیتا۔ پولیس نے ویسے بھی اس عامل کی طرح ہوتی ہے جو جن اتارنے کے لیے ہر حربہ استعمال کرتا ہے۔ جس کے نتیجے میں بے چارہ جن..... اٹھک بیٹھک کرتا ہے اور اپنی جان چھڑانے کے لیے اپنی سات پشتوں کی تاریخ بیان کر دیتا ہے۔

تھانے پہنچنے تک معصوم شاہ نے طارق کو محض اپنی باتوں سے ادھ موا کر دیا تھا۔ خوف سے اس کا چہرہ پیلا پڑتا جا رہا تھا۔

تھانے پہنچ کر طارق نے ایک ٹیلیفون کرنے کی درخواست کی تھی۔

"کہاں کرو گے؟ کوئی سفارش۔" معصوم شاہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ماموں جان سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"ماموں جان کی تم فکر نہ کرو' ہم انہیں خود بلوائیں گے اور تمہاری ملاقات بھی کروائیں

گے۔ بس تم ذرا صاف بات بتا دو۔"

"شاہ جی' میں نے کچھ نہیں کیا' میں بھلا ایسا کیسے کر سکتا ہوں۔"

"اچھا۔" معصوم شاہ نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ "اقبال پتر' اس کی بات سن رہے ہو۔ کچھ پکا بننے کی کوشش میں ہے۔ تم ایسا کرو اسے سب سے پہلے قبر کا اندھیرا دکھاؤ۔ شاید اسے کچھ یاد آجائے۔"

"ٹھیک ہے' ابھی دکھاتا ہوں شاہ جی۔" اقبال پتر نے طارق کو گردن سے پکڑا اور کمرے سے دھکیلتا ہوا لے گیا۔

معلوم نہیں' وہ اسے کہاں لے گیا اور اس کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ کوئی بیس منٹ کے بعد وہ اسے اسی انداز سے پکڑے کمرے میں داخل ہوا اور دھکا مار کر اسے معصوم شاہ کے قدموں میں گرا دیا۔ "لو شاہ جی' کر دیا ٹھیک' بولتا ہے' سب بتا دیتا ہوں۔"

معصوم شاہ نے اسے بالوں سے پکڑ کر ایک جھٹکے سے اس کا چہرہ اوپر کیا۔ وہ پسینے میں نہایا ہوا تھا اور بالکل بے دم ہو رہا تھا۔

"چل شروع ہو جا۔" معصوم شاہ نے اس کے بالوں کو ایک زوردار جھٹکا دے کر چھوڑ دیا۔ وہ فرش پر اوندھے منہ جا گرا اور بری طرح ہانپنے لگا۔

"اقبال پتر!"

"جی شاہ جی۔"

"اس کو پانی پلا۔ یہ قبر کا اندھیرا دیکھ کر کچھ زیادہ ہی ڈر گیا ہے۔ اس کی قبر میں سانپ وغیرہ تھے کیا۔"

"جی شاہ جی' کئی سانپ کنڈل مارے بیٹھے تھے۔"

پانی پینے کے بعد اس کی حالت کچھ بہتر ہوئی۔ معصوم شاہ نے اسے کرسی پر بیٹھنے کو کہا۔ کرسی پر بیٹھنے کے بجائے تقریباً لیٹ گیا۔

"اوئے ڈراما ایٹ سکس' سیدھا ہو جا' یہ تھانہ ہے تیرے ماموں کا گھر نہیں ہے۔ ویسے تو اداکار ہوتا تو کتنے غضب کی اداکاری کرتا۔ ویسے تیرے سر پر لگی چوٹ نے ہمیں تو دھوکا دے دیا تھا۔" معصوم شاہ ماچس کی تیلی سے کان کریدتے ہوئے بولا۔ "کیوں قتل کروایا تو نے اپنی بیوی کو کیا پیسے کی خاطر؟"

"نہیں شاہ جی۔ یہ سب میں نے پیسے کے لیے نہیں کیا۔ میری بیوی نے میری عزت خاک میں ملا دی تھی۔ اس نے کسی اور سے آشنائی پیدا کر لی تھی۔ میں نے انتقاماً ایسا کیا۔" یہ کہہ کر طارق نے اپنی زندگی کے تمام واقعات معصوم شاہ کے سامنے بیان کر دیئے۔ باپ اور پھر ماں کا ماموں کے گھر پرورش' ممانی اور فائزہ کی بدسلوکی' ماموں جان کی محبت' فائزہ کے بہکے قدم' شادی کے بعد پھر پرانی روش پر واپسی' قتل کی منصوبہ بندی وغیرہ۔

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

"میں نے اس آوارہ لڑکی سے محض اپنے ماموں کی آنکھوں میں آنسو پونچھنے کے لیے شادی کی تھی ورنہ اس حالت میں کون مرد شادی کرتا ہے۔ میرا خیال تھا کہ میرے اس احسان کو وہ زندگی بھر مان کر میری پوجا کرے' لیکن ایسا نہ ہوا۔ وہ پھر سے اپنی آوارہ فطرت کی طرف لوٹ گئی۔ اسے یہ بات نہیں معلوم تھی کہ میں اس کی بدچلنی سے واقف ہوگیا۔ میں نے اسے یہ بات قصداً نہیں بتائی تھی۔ ایک دن میں نے میز پر رکھی ایش ٹرک میں سگریٹ کا بچا ٹوٹا دیکھا۔ میں نے اس سے باتوں باتوں میں پوچھا کہ گھر میں کوئی آیا تھا' مگر اس نے اقرار کر کے نہ دیا۔ میں سگریٹ نہیں پیتا۔ باہر سے کوئی مرد آیا نہیں تو پھر یہ سگریٹ کا ٹوٹا کہاں سے آیا؟ یہ وہ سوال تھا جس نے میرے دل کی حالت خراب کردی۔ تب میں نے قسم کھائی کہ اس بدفطرت عورت کو ہر قیمت پر ٹھکانے لگا کر رہوں گا۔ پھر میں اس مرد کی تلاش میں رہا جو میری غیر موجودگی میں میرے گھر آ کر میرے منہ کالک ملتا تھا۔ اس مرد کا بھی سراغ لگ گیا وہ میرا ہی دوست تھا اور فائزہ اس سے شادی کی سالگرہ والے دن بھی ملی تھی' کیونکہ اس دن میں نے اپنے باتھ روم میں بھی سگریٹ کا ٹوٹا پایا تھا۔ اب آپ ہی بتایئے شاہ جی' ایسی عورت کو میں قتل نہ کراتا تو اور کیا کرتا۔"

طارق کی نشاندہی پر ٹیکسی ڈرائیور اور اس کے دونوں ساتھیوں کو بھی گرفتار کرلیا گیا۔

جس طرح فائزہ کو یہ بات معلوم نہ تھی کہ طارق اس کی بدکرداری سے واقف ہے اور اندر ہی اندر آگ میں سلگ رہا ہے' اسی طرح طارق یہ کبھی نہیں جان سکے گا کہ اس کی بیوی اس دن سیدھی راہ پر آ گئی تھی۔ اس نے عہد کرلیا تھا کہ وہ آئندہ اس کی ہو کر رہے گی۔ نیکی اور بدی کے درمیان محض ایک لمحے کا فاصلہ ہوتا ہے۔ برا نیک بن جاتا ہے اور نیک برا۔

☆.....☆.....☆

آخری قتل

جب اختر کمال' سیٹھ اکرم کے دفتر میں داخل ہوا تو سیٹھ اکرم اس وقت فون پر مصروف تھا۔ اس نے اختر کمال کو دیکھا' ان دیکھا کردیا اور اسی انہماک سے فون پر بات کرتا رہا۔ اختر کمال دروازے پر ہی رک گیا۔ اس نے اپنی دونوں ٹانگیں چوڑی کر کے ہاتھ باندھ لئے اور سیٹھ اکرم کے متوجہ ہونے کا انتظار کرنے لگا۔

سیٹھ اکرم نے ٹیلی فون پر بات کرتے کرتے اس پر توجہ کی۔ اس کے کھڑے ہونے کے انداز کو دیکھا اور پھر ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ "آ جاؤ" دروازے پر کیوں کھڑے ہو؟

"بس سیٹھ' آپ کی اجازت کا منتظر تھا۔" اختر نے ہاتھ کھولے اور بڑی شاہانہ چال چلتا ایک کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔

سیٹھ اکرم نے دو تین منٹ ٹیلی فون پر مزید گفتگو کی' پھر مسکرا کر ریسیور کریڈل پر رکھا اور اختر سے مخاطب ہو کر بولا۔ "کیا خدمت کروں تمہاری؟"

"سیٹھ' خدمت تو ہم کریں گے آپ کی۔ آپ نے شاید مجھے پہچانا نہیں' ویسے آپ پہچانیں گے بھی کیسے؟ اس سے پہلے ہماری ملاقات بھی تو نہیں ہوئی۔ مجھے سیٹھ صمد صاحب نے بھیجا ہے۔ میرا نام اختر ہے۔ اختر کمال۔" اس نے اپنا تعارف کرایا۔

"اوہ' اچھا' اچھا!" سیٹھ اکرم نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "تمہارے دروازے پر کھڑے ہونے کے اسٹائل سے میں نے کچھ کچھ اندازہ تو کرلیا تھا کہ تمہیں ضرور بھائی صمد نے بھیجا ہے۔ انہوں نے مجھے فون کردیا تھا۔ تمہارے آنے کا وقت بھی بتا دیا تھا۔ حیرت ہے کہ تم وقتِ مقررہ پر پہنچ گئے۔"

"کیوں نہ پہنچتا وقت پر' میں نے بہت وقت گنوا کر' وقت کی قدر کرنا سیکھا ہے۔"

"ٹھیک ہے' پھر میں وقت ضائع کیے بنا مطلب پر آتا ہوں۔ تمہیں بھائی صمد نے یہاں آنے کا مقصد تو بتا دیا ہوگا۔"

"جی ہاں' انھوں نے کچھ ذکر تو کیا تھا لیکن میں ساری بات آپ کی زبان سے سننا چاہتا ہوں؟" اختر نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

"ایک بندے کو اڑانا ہے۔"

"اڑ جائے گا' نام اور پتا بتائیں۔"

"وہ میں بتا دوں گا' تم اپنا مختانہ بتاؤ۔"

"سیٹھ صمد نے آپ کو بتایا تو ہوگا۔"

"بتایا تو تھا لیکن میں تمھاری زبانی سننا چاہتا ہوں۔"

"بہت اچھے۔" اختر ہنستے ہوئے بولا۔ "لیکن میں اپنی زبان سے کچھ نہ کہوں گا۔ درمیان میں سیٹھ صاحب جو ہیں۔ انھوں نے آپ سے جو کہہ دیا ہے' وہ مجھے منظور ہے۔ اگر کچھ بھی نہیں کہا ہے تو وہ بھی منظور ہے۔ آپ بس بندے کا تعارف کرائیں۔"

"مجھے تمھارا یہ انداز بہت پسند آیا' دل والے معلوم ہوتے ہو۔"

سیٹھ اکرم نے کہا۔

"بس سیٹھ صاحب' دل والے تو ہیں لیکن اسی دل کے مارے ہوئے بھی ہیں۔" اس نے آہ بھری۔

"یہ لو رقم' پوری ایڈوانس' تمھاری شرط کے مطابق' گن لو' سیٹھ اکرم نے ایک وزنی لفافہ' دراز سے نکال کر اس کے سامنے رکھا۔

اختر نے اس لفافے کو بغیر کھولے اپنی کوٹ کی جیب میں ڈال لیا اور بولا۔ "پورے ہوں گے' میں جانتا ہوں۔"

"اب میں تمھیں بندہ دکھاتا ہوں۔" سیٹھ اکرم نے کہا۔

"بندہ ادھر ہی ہے؟" اختر نے سوال کیا۔

"ہاں' وہ ہے تو ادھر ہی لیکن میں تمھیں صرف اس کی تصویر دکھاؤں گا۔" یہ کہہ کر اس نے کوٹ کی اندرونی جیب سے ایک پوسٹ کارڈ سائز تصویر نکالی اور اختر کے سامنے رکھ دی۔ "یہ ہے وہ بندہ۔"

اختر نے اس تصویر کو بغور دیکھا' اور پھر اسے لوٹاتے ہوئے بولا۔ "یہ تو بڑا کمزور سا بندہ ہے' اس کیلئے اتنی رقم خرچ کرنے کی کیا ضرورت ہے' اس کے تو آپ خود بھی ایک تھپڑ مار دیں تو اللہ کو پیارا ہو جائے گا۔"

"تصویر دیکھ کر دھوکا نہ کھاؤ' یہ بڑی شاطر شے ہے۔ یہ بندے کو اپنی چالوں سے چت کر دیتا ہے۔"

"اچھا' میں دیکھتا ہوں' کیا شے ہے یہ؟" اختر نے ہنستے ہوئے تصویر واپس کی۔

"اس کی تصویر تو اپنی جیب میں رکھو۔" سیٹھ اکرم بولا۔

"نہیں' اس کی ضرورت نہیں۔ اب یہ میری آنکھوں میں محفوظ ہو چکی ہے۔ آپ مجھے ایڈریس سمجھائیں۔"

"ہاں ایڈریس میں تمھیں سمجھاتا ہوں' یہ دیکھو۔" سیٹھ اکرم نے ایک کاغذ پر نقشہ بناتے ہوئے کہا۔

پھر سیٹھ اکرم نے بڑی تفصیل سے اس کے گھر کا پتا بتایا' جسے اختر نے اچھی طرح ذہن نشین کر لیا۔

"کیا پیو گے' چائے یا کافی؟" سیٹھ اکرم نے پوچھا۔

"سیٹھ صاحب' میں چائے مائے' کافی مافی کچھ نہیں پیتا۔ میں اب چلوں گا۔" اختر یہ کہہ کر کھڑا ہو گیا۔

"اے بیٹھو' تم سے ابھی ایک بات اور کرنا ہے۔"

"ٹھیک ہے جی' بولیں۔" وہ بیٹھتے ہوئے بولا۔

"میں یہ چاہتا ہوں کہ یہ قتل کی واردات دراصل ڈکیتی کی واردات معلوم ہو۔"

"ایسا بھی ہو جائے گا لیکن آپ ایسا کیوں چاہتے ہیں۔"

"بھئی اگر یہ محض قتل کی واردات ہوئی تو شبہے میں' میں خود بھی پھنس سکتا ہوں۔ ابھی سے کل ہی میرا جھگڑا ہوا ہے۔ فیکٹری کے کئی لوگ اس بات کی گواہی دیں گے۔"

"ٹھیک ہے' میں تفصیلات میں نہیں جانا چاہتا۔ میں آپ کی خواہش کے مطابق اسے ڈکیتی کی واردات بنا دوں گا۔"

پھر کچھ دیر مزید اس بندے کے متعلق بات ہوتی رہی' جس کا نام خالد احمد تھا۔ وہ سیٹھ اکرم کا بزنس پارٹنر تھا۔ اس کا کمرا سیٹھ اکرم کے بالکل برابر تھا۔ وہ اس وقت اپنے کمرے میں فیکٹری کے حسابات چیک کر رہا تھا' اس بات سے بے خبر کہ برابر والے کمرے میں اس کی زندگی کا کھاتا بند کرنے کا منصوبہ بن چکا ہے۔

اختر کے جانے کے بعد سیٹھ اکرم نے کل کی امید پر سکھ کی گہری سانس لی اور مسکراتا ہوا کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر کچھ سوچتا ہوا اپنے کمرے سے باہر نکلا اور خالد احمد کے کمرے میں داخل ہو گیا۔

اس وقت خالد کے کمرے میں اکاؤنٹینٹ شاکر موجود تھا اور خالد بڑے انہماک سے کچھ چیک کر رہا تھا۔ سیٹھ اکرم نے اندر داخل ہو کر کھنکار کر گلا صاف کیا۔ یہ خالد کو متوجہ کرنے کی بالواسطہ کوشش تھی لیکن اس نے توجہ نہ کی۔

"بھئی ہم اندر آ جائیں۔" سیٹھ اکرم نے بالآخر لہجے میں مٹھاس بھرتے ہوئے کہا۔

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

"وہ تو آپ اندر آ ہی چکے ہیں۔" خالد احمد نے کھاتے سے سر اٹھایا اور سپاٹ لہجے میں بولا۔ کل کی تلخ گفتگو ابھی تک اس کے دماغ میں گھوم رہی تھی۔

"بھئی' میں مخل تو نہیں ہوا۔" سیٹھ اکرم نے ایک کرسی گھسیٹ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "کہیے شاکر صاحب' آپ کے کیا حال ہیں؟"

"میں ٹھیک ہوں۔" شاکر نے ادب سے کہا۔

"ہاں بھئی خالد تم کب تک فارغ ہو جاؤ گے۔" سیٹھ اکرم نے آج اس لہجے میں بات کی جو کبھی دوستی کے زمانے میں ہوا کرتا تھا۔

خالد احمد نے چونک کر سیٹھ اکرم کی آنکھوں میں دیکھا۔ اس انداز پر شاکر بھی اندر ہی اندر حیرت کیے بنا نہ رہ سکا۔ کل کی تلخ گفتگو جس میں گالیوں کا تبادلہ بھی ہوا تھا' اس کے سامنے ہوئی تھی۔

اس وقت سیٹھ اکرم جان بوجھ کر اپنے لہجے کی شیرینی بانٹ رہا تھا تاکہ آنے والے کل میں اس دوستانہ گفتگو کو کیش کروا سکے۔

"آپ کو کوئی کام ہے مجھ سے؟" خالد احمد کے لہجے میں وہی رکھائی تھی' وہی نکھ تھا۔

"یار' وہ تمھاری بھابی کا فون آیا تھا۔ اس نے تمھیں رات کے کھانے پر بلایا ہے۔"

"شکریہ جناب..... بھابی..... سے میری طرف سے معذرت کر لیجیے گا۔ میں کھانے پر نہیں جا سکوں گا۔" خالد احمد نے دوٹوک انداز اختیار کیا۔

"لگتا ہے' ابھی تمھارا غصہ کم نہیں ہوا۔ چلو یار' میں معافی مانگے لیتا ہوں۔ میں نے جو کچھ کہا ہے' اسے بھول جاؤ۔ مجھے معاف کر دو۔ تم حسابات چیک کر لو۔ پھر جیسا کہو گے' کر دوں گا۔" سیٹھ اکرم نے یہ بات بڑے یقین اور اونچے لہجے میں کہی تاکہ اکاؤنٹینٹ شاکر اچھی طرح سن لے اور وقت ضرورت بطور گواہ ان جملوں کو دہرا سکے۔

"تمھارے کرنے یا نہ کرنے سے کیا ہوگا' میں یہ دھاندلی چلنے نہیں دوں گا۔ میں نے سے ایک ایک پائی وصول کر لوں گا۔ اب دوستی کا ہرگز خیال نہیں کروں گا۔"

"اچھا' مت کرنا خیال' رات کو کھانے پر تو چلو' کھانے سے کیا ناراضگی۔"

"میں منافق نہیں ہوں۔ جب تک حساب صاف نہیں ہوگا' میرا دل بھی صاف نہیں ہوگا۔ پھر اس طرح کھانے کا فائدہ۔۔" خالد احمد نے فیصلہ کن انداز اختیار کیا۔

"اچھا دوست' تمھاری مرضی جو چاہے کرو۔ میں تو تمھاری بھابی کا پیغام لے کر تھا۔ میں فون پر اسے منع کر دیتا ہوں۔" سیٹھ اکرم نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "معافی چ

تمھیں خواہ مخواہ ڈسٹرب کیا۔"

"شاکر یہ مجھے بے وقوف سمجھتا ہے۔" سیٹھ اکرم کے جانے کے بعد خالد احمد شاکر سے مخاطب ہوا۔ "ایک طرف گالیاں دیتا ہے' سارا منافع اکیلے ہضم کر لینا چاہتا ہے اور دوسری طرف مجھے کھانے کی دعوت دے رہا ہے۔ کیا میں اتنا ہی گدھا ہوں۔"

"جی سر' اس کا رویہ میری بھی سمجھ میں نہیں آیا۔" شاکر نے کہا۔ "ویسے ہوسکتا ہے کہ اپنے کیے اور اپنے کہے پر پچھتا رہے ہوں۔"

"ارے نہیں شاکر' یہ اپنے کیے پر کیا پچھتائے گا۔ اس کا تو بس نہیں چلتا' ورنہ مجھے قتل کروا دے۔"

"ارے نہیں سر!" شاکر کو اس کی بات پر یقین نہیں آیا۔

"تم اسے نہیں جانتے' میں جانتا ہوں۔ یہ جو اس وقت دوستی کا ہاتھ بڑھا کر گیا ہے' یہ خالی از علت نہیں۔"

اور یہ بات واقعی خالی از علت نہیں تھی۔ وہ ایک ڈراما کرنے آیا تھا اور ڈراما کر کے چلا گیا تھا۔ اس ڈرامے کا سب سے اہم مگر خاموش کردار اکاؤنٹینٹ شاکر تھا۔

☆.....☆.....☆

اختر کمال جب خالد احمد کے لگژری فلیٹ میں داخل ہوا تو وہاں خالد نہیں تھا۔ اور یہ بات اسے معلوم تھی کہ وہ ابھی گھر نہیں پہنچا ہوگا۔ اختر کا منصوبہ بھی یہی تھا۔ وہ خالد کے فلیٹ میں آنے سے پہلے خود وہاں گھس کر بیٹھ جانا چاہتا تھا۔ فلیٹ کے دروازے کا تالا کھولنا اس کیلئے مشکل نہ تھا۔ یہ کام اس نے جیل یاترا کے دوران ایک ماہر فن سے سیکھا تھا۔

فلیٹ میں داخل ہو کر اس نے دروازے کو پھر سے لاک کر دیا۔ دائیں جانب ڈرائنگ روم تھا۔ وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوا اور بائیں جانب لگے سوئچ بورڈ پر موجود تمام بٹن آن کر دیے۔ کمرا یکدم جگمگا اٹھا۔ خوب صورت صوفے' دیدہ زیب قالین' بڑے بڑے لیمپ لیکن ڈرائنگ روم کی تمام دیواریں خالی تھیں۔ سوائے اس تصویر کے جو ایک خوب صورت سے گول فریم میں لگی تھی۔ یہ کسی حسین عورت کا بڑا سا کلوز اپ تھا۔

ڈرائنگ روم خاصا بڑا تھا۔ اور یہ تصویر سامنے کی دیوار پر لگی تھی۔ جہاں اختر کھڑا تھا' وہاں سے کچھ زیادہ واضح نظر نہیں آ رہی تھی' لیکن جانے کیا ہوا کہ اس تصویر پر نظر پڑتے ہی اختر کے دل میں ایک شعلہ سا بھڑک اٹھا۔

وہ دھیرے دھیرے ایک ہیجانی کیفیت میں تصویر کے اس گول فریم کی طرف بڑھنے لگا۔ وہ فریم کسی بحری جہاز کی گول کھڑکی کی طرح نظر آ رہا تھا' اور یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی عورت کھڑکی سے باہر دیکھ رہی ہو۔ سپاٹ دیوار اس تاثر کو اور تقویت دیتی تھی۔

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

اختر کمال کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ وہی ہے۔

آنکھوں کو یقین دلاتے دلاتے وہ اس تصویر کے اتنے نزدیک پہنچ گیا کہ تصویر اور اس کے درمیان محض ایک فٹ کا فاصلہ رہ گیا۔

اب فریب نظر کی گنجائش نہ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں جو دیکھ رہی تھیں' وہ سچ تھا' وہ شبانہ ہی تھی۔

اس نے اس بڑے سے خنجر نما چاقو کو جو اس کے ہاتھ میں تھا' جسے اس نے فلیٹ میں داخل ہوتے ہوئے احتیاطاً کھول لیا تھا' بند کر کے کوٹ کی جیب میں ڈال لیا۔

"یہ تم ہو شبانہ' تم۔" اختر نے تصویر پر نظریں گاڑ دیں۔ "تم مجھے ملیں بھی تو کہاں؟ ایسے گھر میں جہاں میں مہمان بن کر نہیں' قاتل بن کر آیا ہوں' یہ خالد احمد کون ہے تمہارا۔ اس گھر میں لگی ہوئی خوبصورت سی تصویر تو یہ بتاتی ہے کہ یہ تمہارا گھر ہے اور خالد تمہارا شوہر ہے۔ دیکھو شبانہ' وقت کس طرح انصاف کرتا ہے۔ کل وہ تمہیں مجھ سے چھین کر لے اڑا تھا' آج میں اسے تم سے چھین کر لے اڑوں گا۔"

اختر جنون میں جانے کیا کیا بکے جا رہا تھا۔

پھر اسے کچھ ہوش آیا۔ کیا ضروری ہے کہ یہ شبانہ کی ہی تصویر ہو۔ اس سے ملتی جلتی بھی ہو سکتی ہے۔ یہاں اس کی اور بھی تصویریں ہوں گی۔ شادی کی البم بھی ہو گی۔ پھر اس نے جلدی جلدی ڈرائنگ روم چھان مارا مگر وہاں کچھ نہ تھا۔

پھر البم تلاش کرنے میں زیادہ وقت صرف نہیں ہوا' وہ اسے بیڈ روم میں ڈریسنگ ٹیبل کی ایک دراز سے مل گئی۔ اختر جلدی جلدی شادی کی اس البم کو پلٹنے لگا۔

اب شبہے کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی۔

اس البم میں شبانہ کے والد اور بھائی بہنوں کی تصویریں بھی تھیں۔ شبانہ کو دلہن کے روپ میں دیکھ کر اس پر ایک بے خودی سی چھا گئی اور آنکھوں میں تارے جھلانے لگے۔

اسے وہ رات یاد آئی جب وہ گلی کے موڑ پر پوری رات اس کا انتظار کرتا رہا تھا اور وہ نہیں آئی تھی۔ وہ رات کس قیامت کی تھی۔ وہ انتظار کس قدر جان لیوا تھا' اور جب رات نے صبح کی گود میں منہ چھپایا۔ سپیدۂ سحر نمودار ہونے لگا تو اس نے شبانہ کی راہ تکتی آنکھوں کو کس مشکل سے بند کیا تھا۔

اور جب محبوب کی راہ تکتی آنکھیں بند ہوئیں تو ہر چیز اندھیرے میں ڈوب گئی۔ کچھ نہ رہا' کچھ نہ بچا۔

اپنے شہر سکھر میں اس کی یہ آخری رات تھی۔ اس نے اپنا شہر چھوڑ دیا۔ اپنا گھر اپنے

دوست احباب سب چھوڑ دیئے۔ آج پانچ سال ہونے کو ہیں' وہ کبھی پلٹ کر وہاں نہ گیا۔ اب وہ کس لیے وہاں جاتا' کیوں جاتا۔ جسے اس نے اپنی روح کی گہرائیوں سے چاہا تھا' جب وہی اس کی نہ رہی تھی پھر وہاں کون رہا' جیسے سارا شہر اجنبی ہو گیا۔

سکھر چھوڑ کر وہ کراچی آ گیا۔

روشنیوں کے اس شہر میں وہ کچھ دن دیوانوں کی طرح بھٹکتا پھرا۔ شبانہ کو یاد کر کے روتا اور اسے بے وفا کہہ کر اپنے آنسو پونچھ لیتا۔ دل کی وحشت پھر بھی کم نہ ہوتی' جو جمع پونجی اپنے ساتھ لایا تھا۔ وہ چند دنوں میں چٹنی ہو گئی۔ جیبیں خالی ہو گئیں۔ وہ جس ہوٹل میں ٹھہرا تھا' اس کا کئی دن کا کرایہ چڑھ گیا۔ ہوٹل والوں نے اس کے ہاتھ سے گھڑی اتروا لی اور اس کا سوٹ کیس سڑک پر رکھ دیا۔

پھر وہ اپنا سوٹ کیس اٹھا کر چلنے لگا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے' لیکن اسے اب یہ معلوم ہو گیا تھا کہ اس شہر میں اب کہیں رکنا نہیں ہے' چلتے رہنا ہے' مسلسل چلتے رہنا ہے۔

کراچی میں اس کے کئی رشتے داروں کے گھر تھے..... وہ چاہتا تو وہاں چلا جاتا' لیکن وہ وہاں نہیں گیا۔ وہ کسی کا احسان لینے کا قائل نہ تھا پھر رشتے داروں کا احسان لینے کا سوال ہی نہ تھا۔

وہ سکھر میں' ایک ہوٹل میں استقبالیہ کلرک کی حیثیت سے ملازم تھا۔ کراچی میں بہت سے ہوٹل تھے۔ کہیں نہ کہیں اسے ملازمت مل سکتی تھی' لیکن سردست اسے کوئی ایسا سہارا چاہیے تھا کہ وہ اپنا پیٹ بھر سکے اور آگے کیلئے سوچ سکے۔

تب اس نے ایک طیاری ہوٹل میں قسمت آزمائی کی۔ اس نے ہوٹل کے مالک کو اپنے تمام کوائف بتائے۔ سیٹھ شریف آدمی تھا اور اختر بھی چہرے سے غنڈا نہ لگتا تھا۔ اس نے اپنا سوٹ کیس بطور ضمانت اپنے پاس رکھا اور بطور بیرا ہوٹل میں لگا لیا۔ یہ اتنا بڑا ہوٹل نہ تھا کہ یہاں استقبالیہ کلرک کی ضرورت پڑتی۔ استقبالیہ پر تو یہاں خود سیٹھ بیٹھتا تھا۔

اس ہوٹل میں تین چار بیرے اور تھے۔ شام تک اس نے سارے بیروں سے دوستی گانٹھ لی۔ ان میں سے ایک بیرے حامد کے پاس چھوٹا سا کوارٹر تھا۔ اس کوارٹر پر رات کو پتے کی بیٹھک ہوتی تھی۔ حامد شام کو اسے اپنے ساتھ کوارٹر لے گیا۔ اس طرح پہلے ہی دن اسے ملازمت مل گئی اور رہنے کا ٹھکانا بھی۔

رات کو جب وہ ٹوٹی ہوئی چارپائی پر لیٹا تو شبانہ اس کی آنکھوں کے سامنے گھومنے

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

شبانہ کی محبت نے اسے کہاں سے کہاں پہنچا دیا تھا۔ اب تو اسے عورت کے نام سے ہی نفرت ہو گئی تھی۔ محبت کتنی بے اعتبار ہوتی ہے' ناپائیدار اور پانی کے بلبلے جیسی لیکن شبانہ تو اس کی محبت کا بڑا دم بھرا کرتی تھی۔ شادی سے چند روز پہلے ہی تو اس نے کہا تھا۔

"اختر' مجھے پرائی ہونے سے بچا لو' میں تمہاری ہوں' تمہاری ہی رہنا چاہتی ہوں۔"

"شبانہ' تم فکر نہ کرو' میں تمہیں پرائی نہیں ہونے دوں گا۔ تمہیں مجھ سے کوئی نہیں چھین سکتا۔ میں دنیا سے ٹکرا جاؤں گا۔" اس نے کہا تھا۔

لیکن محبت کرنے والوں کا ملاپ اتنا ہی آسان ہو تو پھر محبت کتنی سہل ہو جائے۔ محبت کرنا جتنا آسان ہے' اس کا نباہنا اتنا ہی مشکل۔

پھر اسے وہ دن یاد آیا' جب اس نے پہلی مرتبہ شبانہ کو دیکھا تھا۔ پڑوس کا مکان کتنے عرصے سے خالی پڑا تھا۔ مکان مالک بیوی بچوں کے ساتھ سعودی عرب میں رہائش پذیر تھا۔ مکان وہ کرائے پر اٹھاتا نہ تھا کہ ضرورت پڑنے پر خالی کرانا مشکل ہو جائے گا' لیکن شبانہ کے والد کو انہوں نے مکان اس لیے دے دیا کہ ایک تو وہ ان کے رشتے دار تھے' دوسرے اچھے شریف آدمی تھے کہ ان سے مکان خالی کرانا کوئی مشکل کام نہ تھا۔

جس دن یہ لوگ اس مکان میں منتقل ہوئے' وہ چھٹی کا دن تھا' بارش ہو رہی تھی۔ سہ پہر کا وقت تھا۔ اختر کے گھر میں پکوان تیار ہو رہے تھے۔ گھر کے سارے افراد برآمدے میں کڑاہی کے گرد گھیرا ڈالے بیٹھے تھے..... اختر کی امی پوریاں تل رہی تھیں اور اختر کو..... بار بار مہر کرنے کی تلقین کر رہی تھیں' کیونکہ وہ پوری کھانے کے لیے بار بار ہاتھ بڑھا رہا تھا۔

اتنے میں گھر کی گھنٹی بجی۔

"اختر دیکھ تو کون آ گیا اس وقت۔" امی نے کہا۔

"یہ ابر' یہ بارش' یہ گھنٹی کی آواز' دیکھ اختر دروازے پر کوئی شناسا تو نہیں۔" اختر کے والد بڑبڑانے کے انداز میں بولے۔

"بھائی جان' دروازے پر کوئی فقیر بھی ہو سکتا ہے۔ آج کل کے فقیر بڑے ماڈرن ہو گئے ہیں....." اختر کی چھوٹی بہن ہما نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ہما' میری بہن' جا ذرا دیکھ لے' کون ہے دروازے پر۔" اختر نے کہا۔

"نہیں اختر تم جاؤ۔" اختر کے ابو نے حکم دیا۔

اتنے میں ایک مرتبہ گھنٹی اور بجی۔

"اچھا بابا' آتا ہوں' ذرا صبر کرو۔" اختر نے ایک پوری پر قبضہ جمایا اور اسے کھاتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا۔

بارش خاصی تیز تھی۔ وہ دروازہ کھولتے اچھا خاصا بھیگ گیا تھا۔ اس نے جلدی سے دروازہ کھولا۔

دروازہ کیا کھلا گویا جنت کا دروازہ کھل گیا۔ وہ کوئی حور تھی' پری تھی یا خوشبو میں بسی کلی تھی..... کون تھی وہ؟

وہ بھیگ رہی تھی۔ سر پر اس کے تولیہ تھا۔ گلابی سوٹ میں گلاب کی طرح نکھری ہوئی تھی۔ مہکتا بدن' مسکراتی آنکھیں۔

اختر کو کچھ ہوش ہی نہ رہا۔ وہ کہاں ہے؟ زمین پر ہے یا آسمان پر۔ دروازہ کھولنے آیا تھا یا بند کرنے۔ آدھی پوری اس کے ہاتھ میں تھی' بقیہ منہ میں اور وہ منہ چلانا بھول گیا تھا۔

"دیکھیے' میں آپ کے پڑوس کے گھر سے آئی ہوں۔ ہم آج ہی یہاں شفٹ ہوئے ہیں۔ آپ کو زحمت نہ ہو تو ماچس دے دیجیے۔ ہمیں مل نہیں رہی' سامان میں کہیں گم ہو گئی ہے۔" وہ بول رہی تھی اور اختر..... کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے باغوں میں کوئی کوئل کوک رہی ہو۔

"آپ اندر آ جائیے۔"

"نہیں' میں پھر آؤں گی' آپ ماچس لا دیجیے۔" وہ مسکرائی۔

اختر..... اندر کی طرف بھاگا۔ بیچ صحن میں جا کر اسے خیال آیا کہ لائیٹر تو اس کی جیب میں ہے' اندر سے ماچس لانے کی کیا ضرورت ہے بھلا۔ وہ فوراً واپس پلٹا' جیب سے لائیٹر نکالا اور اسے دیتے ہوئے بولا۔ "یہ لے جائیے۔"

"شکریہ۔" لائیٹر لیتے ہوئے اس کی نرم و نازک انگلیاں' اس کی انگلیوں سے چھو گئیں۔

ایک کرنٹ سا لگا۔

دور آسمان پر بجلی چمکی' بادل گرجے اور اس بجلی کی چمک اور بادل کی گرج کے دوران لڑکی کہیں غائب ہو گئی۔

"بھائی جان' کون ہے؟" ہما نے زور سے آواز لگائی۔

اختر دروازہ بند کر کے پلٹا تو اس کی دنیا ہی بدلی ہوئی تھی۔ بارش میں بھیگی لڑکی' اس کی آنکھوں میں بجلی بن کر چمکی تھی اور دل پر گھٹا کی طرح برسی تھی۔ ہر سو رنگ تھے' خوشبو تھی اور وہ آدھی پوری اس کے ہاتھ میں دبی کی دبی رہ گئی تھی۔

"اختر کون تھا؟" امی نے پوچھا۔

"بھائی جان' آخر آپ نے دروازے پر ایسی کیا چیز دیکھ لی کہ پوری بھی ادھوری رہ گئی۔" ہما نے چھیڑا۔

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

"نہیں تو' ایسی تو کوئی بات نہیں۔" اختر نے پوری منہ میں رکھتے ہوئے کہا! وہ ماچس مانگنے آئی تھی۔"

"کون ماچس مانگنے آئی تھی؟"

"وہ برابر کے مکان میں نئے کرائے دار آ گئے ہیں' غالباً ان کی لڑکی تھی۔" اختر نے کہا۔

"ارے برابر کے مکان میں کرائے دار آ گئے' یہ تو بہت اچھا ہوا۔ ہم تو پڑوسیوں کے لیے ترس گئے تھے۔" اختر کے ابو نے کہا۔

"خدا کرے' اچھے لوگ ہوں۔" امی نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"امی وہ بہت اچھے لوگ ہیں۔" اختر نے یہ بات اتنے وثوق سے کہی کہ اس کے اس یقین پر سب کو ہنسی آ گئی۔

شبانہ سے اس کی پہلی ملاقات تھی۔

اس پہلی ملاقات نے دلوں پر سحر کر دیا۔ پھر چاند' زمین کو اور زمین چاند کو اپنی طرف کھینچنے لگی۔ یہ پہلی ملاقات' نقش دوام بن گئی۔

ایسا نقش جو مٹائے نہ مٹے اور بنائے نہ بنے۔

شبانہ کے والد ایک سرکاری محکمے میں اسسٹنٹ تھے۔ ان کی چار بیٹیاں تھیں' ایک بیٹا تھا۔ بیٹا سب سے چھوٹا تھا۔ لڑکیوں میں شبانہ سب سے بڑی تھی۔ وہ بی اے کی طالبہ تھی۔ جتنی حسین تھی' اتنی ہی پڑھنے لکھنے میں ذہین تھی۔ شبانہ کے والد کو اس پر بڑا فخر تھا۔

اختر کے والد ایک چھوٹے سے جنرل اسٹور کے مالک تھے۔ ان کے چار بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ لڑکوں میں اختر سب سے بڑا تھا۔ وہ بی اے کر کے ایک اچھے ہوٹل میں استقبالیہ کلرک لگا ہوا تھا۔ باقی تین بیٹے اور بیٹی ہما زیر تعلیم تھے۔ اختر کے والد کو اختر پر بڑا ناز تھا۔ ایسے شریف اور سعادت مند بیٹے خال خال ہی ملتے ہیں۔

شبانہ اور اختر کے گھرانوں میں بہت جلد تعلقات استوار ہو گئے۔ ہما اور شبانہ کی عمروں میں اگرچہ فرق تھا' لیکن ان دونوں میں خوب گاڑھی چھننے لگی۔ ہما میٹرک میں تھی' شبانہ اس کی پڑھائی میں مدد کر دیا کرتی تھی۔ شبانہ اپنے کاموں سے جب بھی فارغ ہوتی' ہما کے گھر آ جاتی۔ یہ اور بات ہے کہ یہ وقت اختر کا بھی گھر میں رہنے کا ہوتا۔

ہما' بھائی کی پسندیدگی کو اچھی طرح سمجھ گئی تھی' اسے یہ بھی معلوم تھا کہ شبانہ کی دلچسپی کا مرکز کون ہے۔ اسے ان دونوں کو چھیڑنے میں بڑا مزہ آتا۔ شبانہ' ہما کو پڑھا رہی ہوتی اور اختر کسی کام سے کمرے میں آ جاتا تو وہ شرارت سے کہتی۔

"بھائی جان' ادھر پردہ ہے۔"

"اچھا' ایسی کون آ گئی پردے والی بی بی' ذرا ہم بھی تو دیکھیں۔"

"دیکھا تو تھا۔" اس کا اشارہ بارش والے دن' پہلی ملاقات کی طرف ہوتا۔ "بس دیکھتے ہی رہ گئے تھے۔"

"ہما' کیا بکواس ہے یہ۔" شبانہ اسے ڈانٹتی۔

"شبانہ باجی' میں نے کوئی غلط تو نہیں کہا۔" وہ اپنی بات پر اڑی رہتی۔

اور یہ بات واقعی غلط بھی نہ تھی۔ اختر نے بھری برسات میں جو دل ہارا تھا' وہ محبت کے سمندر میں ایک جزیرہ بن گیا تھا۔ خوبصورت اور حسین' دل کے اس جزیرے پر دھنک رنگ بکھرے تھے۔ تتلیاں گلوں کے رخساروں پر شوخی چراتی تھیں۔ پکھیرو فضا میں رقص کرتے تھے۔ من مندر کی گھنٹیاں بجتی تھیں۔ کوئی کسی کو پوجتا' تو کوئی کسی کے قدموں میں اپنی آنکھیں نچھاور کرتا تھا۔

جب آدمی کو کسی سے محبت ہو جائے تو اس کی دنیا ہی بدل جاتی ہے۔ ہر شے پر رنگ بکھرے دکھائی دینے لگتے ہیں۔ آدمی بات بے بات مسکراتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں گہرائی آ جاتی ہے۔ خمار چھا جاتا ہے۔ اس کا جی رقص کرنے اور فضا میں اڑنے کو چاہتا ہے۔

محبت چیز ہی ایسی ہے۔

محبت ازل ہے' محبت ابد ہے۔

محبت خدا ہے' خدا محبت ہے۔

ایک محبت وہ ہوتی ہے جو بندے کو خدا سے ہو جاتی ہے۔ اس عشق کے کیا کہنے جسے ہو گیا' وہ بندہ نہ رہا۔ خدا کی ذات میں گم ہو گیا' عظیم ہو گیا' امر ہو گیا۔

ایک محبت وہ ہوتی ہے جو بندے کو بندے سے ہو جاتی ہے۔ اس محبت کے بھی کیا کہنے جسے ہو گئی' وہ اپنا نہ رہا' اپنے آپ میں نہ رہا۔ کسی اور کا ہو گیا' کسی اور کی ذات میں ضم ہو گیا۔

گویا محبت دوئی مٹاتی ہے۔ بندوں کو واحد کرتی ہے' ایک بناتی ہے۔ محبت اصل میں اللہ کے واحد ہونے کا درس دیتی ہے۔

محبت کسی بھی صورت میں ہو' وہ اللہ کا نور ہوتی ہے۔

شبانہ اور اختر کے دل بھی آجکل اسی نور سے معمور تھے۔ اختر چاہتا تھا کہ اس محبت کو وہ ہمیشہ کے لیے اپنا بنا لے۔ اس سلسلے میں اس نے اپنی ماں سے بات کی۔ ماں نے خوشی سے ہامی بھر لی۔ اس گھر میں کوئی ایسا نہ تھا' جسے شبانہ کے اس گھر میں آنے پر اعتراض ہوتا۔ شبانہ

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

سب کو اچھی لگتی تھی' شبانہ سب کو پیاری تھی۔

"میرا پورا گھر تمہارا دیوانہ ہے۔ میں چاہتا ہوں' اپنی امی کو تمہارے یہاں بھیج دوں' تم کیا چاہتی ہو؟" ایک دن اختر..... نے شبانہ سے کہا۔

"میں کیا کہوں' میں ہوں کہاں' میں تو اختر اختر کہتے خود ہی اختر ہو گئی ہوں۔" شبانہ نے بے اختیار جواب دیا۔ "تم امی کو فوراً بھیج دو۔"

"کیا تمہارے گھر والے بھی مجھے اسی طرح پسند کرتے ہیں' جس طرح تم میرے گھر میں چاہی جاتی ہو' کیا یہ رشتہ منظور ہو جائے گا؟"

اختر نے پوچھا۔

"میں اپنے گھر میں تمہارا ذکر کسی سے نہیں کر سکی ہوں۔ ذکر کروں بھی تو کیسے۔ گھر میں کوئی بہن نہیں' بھائی ہیں' والد ہیں۔"

"امی سے تو کہہ سکتی ہو۔"

"ہائے' مجھے شرم آتی ہے' میں ان سے کبھی ایسی بات نہیں کر سکتی۔"

"پھر کیا ہو گا؟"

"تم اپنی امی کو بھیجو' جو ہونا ہو گا' سامنے آ جائے گا۔"

"اگر انکار ہو گیا؟"

"بظاہر ایسی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔"

"پھر بھی دل ڈرتا ہے۔ شبانہ' میں انکار سن نہ سکوں گا' تمہارے بغیر رہ نہ سکوں گا۔"

"تم کیا سمجھتے ہو' میں تمہارے بغیر جی لوں گی؟" شبانہ نے جذباتی لہجے میں کہا۔

اختر نے اللہ کا نام لے کر اپنی ماں کو شبانہ کے گھر بھیجا اور جب تک وہ وہاں سے واپس نہیں آ گئیں' اپنے گھر میں بے قراری سے ٹہلتا رہا۔ اس نے ہما کو جاسوسی پر مامور کیا تھا' لیکن وہ بھی اس کی کوئی خاص مدد نہ کر سکی' کیونکہ بزرگوں کے درمیان بیٹھنا ممکن نہ تھا۔ وہ دوسرے کمرے میں شبانہ کے ساتھ رہی۔ جب شبانہ چائے لے کر اندر گئی تو ہما بھی ساتھ چلی گئی' لیکن اس وقت تک جو بات ہونا تھی' ہو چکی تھی۔ چائے پر ادھر ادھر کی گپوں کے سوا کوئی اور ذکر نہ ہوا۔

جب امی اور ہما گھر میں داخل ہوئیں تو اختر چیل کی طرح ان پر جھپٹا۔ "کیا ہوا؟" اس نے پوچھا۔

"انتظار کر' کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔" امی نے بے پروائی سے کہا۔

"امی' صاف بتائیں نا۔" وہ پریشان تھا' الجھا ہوا تھا۔

"ارے' باؤلا ہوا ہے کیا۔ میں نے ابھی رشتہ ڈالا ہے۔ وہ اپنے شوہر سے بات کریں گی' پھر جواب دیں گی۔" امی نے پھر بے اعتنائی برتی۔

"آخر آپ نے ان کی باتوں سے اندازہ تو لگایا ہو گا کہ وہ کیا جواب دیں گی؟"

"اب میں کسی کے دل میں تو گھس کر بیٹھی نہیں' مجھے کیا معلوم کہ وہ کیا جواب دیں گی۔ وہ بڑی گہری عورت ہیں' انہوں نے کوئی ردعمل ظاہر نہیں ہونے دیا۔"

"اپنے شوہر سے کب تک بات کر لیں گی؟" اختر کے لہجے میں مایوسی آ گئی۔

"ارے لڑکے' اب ہتھیلی پر سرسوں تو نہ جما۔" امی اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولیں۔ "ایک آدھ ہفتہ تو لگے گا ہی۔"

"ایک آدھ ہفتہ" اختر نے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔ "کیسے گزرے گا یہ ہفتہ؟"

اگر صرف ایک ہفتے کی بات ہوتی تو وہ کسی نہ کسی طرح گزر جاتا لیکن وہاں تو ہفتہ پھوڑ کر دو ہفتے ہو گئے' پھر مہینہ ہو گیا' کوئی جواب نہ ملا' کوئی جواب نہ آیا۔

پھر ایک ظلم اور ہوا۔

جب تک رشتے کی بات نہ چلی تھی تو شبانہ کا اس گھر میں آزادانہ آنا جانا تھا' لیکن جیسے ہی رشتے کی بات چلی تو شبانہ کے آنے پر پابندی لگ گئی۔ اختر تو جواب نہ ملنے پر ہی پریشان تھا' اس آفت ناگہانی نے اور بھی بوکھلا کر رکھ دیا۔

شبانہ کی صورت دیکھے بنا اسے چین کہاں آتا تھا۔ اس نے سوچا' گھر سے باہر ملنے کی تدبیر کرے اور یہ کام کوئی ایسا مشکل بھی نہ تھا۔ وہ ہما کے ہاتھ پیغام بھیج دیتا تو شبانہ ضرور اس کی بتائی ہوئی جگہ پر پہنچ جاتی' لیکن اختر نے ایسا نہ کیا۔ وہ بنے بنائے کھیل کو اپنے ہاتھ سے بگاڑنا نہ چاہتا تھا۔ باہر کی یہ ملاقات انہیں نقصان پہنچا سکتی تھی۔ لہٰذا اس نے صبر سے کام لیا۔

لیکن صبر کا بھی ایک پیمانہ ہوتا ہے' کوئی حد ہوتی ہے۔ وہ روز ہی اپنی امی کے کان کھاتا اور ان سے جواب لانے کے لیے کہتا۔ اس ایک ماہ کے عرصے میں اس کی امی کئی بار شبانہ کے گھر گئی تھیں۔ لیکن شبانہ کی امی نے جان بوجھ کر اس رشتے کے ذکر سے گریز کیا تھا۔ امی بس ادھر ادھر کی باتیں کر کے آ گئی تھیں۔

پھر ایک دن صبر کا پیمانہ چھلک پڑا۔

اختر نے اپنی ماں سے کہا۔ "امی' رشتہ ڈالے ایک ماہ ہو گیا۔ وہ لوگ کچھ بولتے ہیں نہیں' آپ جا کر فائنل جواب لے آئیں' اگر رشتہ منظور نہیں تو صاف کیوں نہیں کہتے۔"

"ٹھیک ہے' میں جاتی ہوں اور صاف جواب لے کر آتی ہوں۔" آخر امی کو بھی جوش آ گیا۔

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

"امی' ذرا پیار سے بات کیجیے گا....." اختر اپنی امی کا موڈ دیکھ کر ڈر گیا۔

"تو فکر نہ کر' میں بات کرنے کے سارے طریقے جانتی ہوں۔" امی نے اطمینان دلایا۔

ماں کے جانے کے بعد وہ گھر کے ایک کونے میں بیٹھ گیا اور اللہ سے لو لگائی اسے جتنی بھی دعائیں یاد تھیں' سب پڑھ ڈالیں۔

امی کوئی آدھ گھنٹے کے بعد واپس آئیں تو اختر نے ان کا چہرہ بغور دیکھا اور چہرے سے جواب کا اندازہ لگا لیا۔ ان کا منہ لٹکا ہوا تھا۔ ہما ساتھ گئی تھی۔ وہ بھی کچھ اکھڑی اکھڑی سی تھی..... اختر کو کچھ گڑبڑ کا احساس ہوا۔

"امی' خیر تو ہے؟" اس نے پوچھا۔

"عجیب لوگ ہیں۔" امی غصے سے بولیں۔

"انکار کر دیا؟" اختر نے دل پر پتھر رکھ کر پوچھا۔

"ارے' صاف انکار کر دیتے تو بھی تسلی رہتی' پہلے ایک ہفتے کا وقت لیا کہ شوہر سے مشورہ کر کے بتاؤں گی۔ وہ ایک ہفتے کا ایک مہینہ ہوا۔ اب کہتی ہیں کہ شبانہ کی تو کہیں اور بات پکی ہو چکی ہے۔"

"کیا' بات پکی ہو چکی ہے....." اختر کا یہ سن کر سر گھوم گیا۔ "ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟"

"مجھے یہ سن کر غصہ آ گیا۔ میں نے کہا کہ اگر ایسی بات تھی تو پہلے ہی دن ہمیں بتا دیتا' اسی وقت بات ختم ہو جاتی۔"

"ہاں' اور کیا کہا۔" اختر نے مایوسی سے پوچھا۔

"کہنے لگیں کہ جس دن آپ نے رشتے کی بات کی' اسی دن شبانہ کے ابو فون پر بات پکی کر چکے تھے۔"

"تو پھر ہمیں کیوں ایک ماہ تک لٹکائے رکھا۔" اختر کو غصہ آ گیا۔

"شرمندہ بھی تھیں بے چاری۔ شرمندگی میں جواب نہیں دے پا رہی تھیں۔"

"امی' یہ کیا چکر ہے' انہوں نے ایسا کیوں کیا؟"

"بیٹا' یہ سب پیسے کا کھیل ہے۔ ان کے بھائی کا لڑکا ہے جو دوبئی سے آیا ہے' اب کراچی میں کاروبار کرے گا۔ اسے دی ہے انہوں نے اپنی بیٹی۔"

"لیکن امی' شبانہ باجی نے تو کبھی کسی لڑکے کا ذکر نہیں کیا۔" ہما بولی۔

"میرا خیال ہے کہ یہ سب اچانک ہی ہوا ہے۔" امی نے کہا۔

"خیر اختر' تو پریشان مت ہو۔ تیرے لیے لڑکیوں کی کوئی کمی نہیں۔"

اختر کے لیے لڑکیوں کی کمی تھی یا نہیں' یہ تو اسے نہیں معلوم تھا لیکن وہ یہ بات ضرور جانتا تھا کہ اگر شبانہ اسے نہ ملی تو وہ کہیں کا نہ رہے گا۔

شبانہ میں تو جیسے اس کی جان تھی اور اپنی جان کسے پیاری نہیں ہوتی۔

اس نے ہما کے ذریعے فوراً شبانہ سے ملاقات کا بندوبست کیا۔ شبانہ خود بھی اس سے ملنے کو بیتاب تھی' جب وہ مقررہ جگہ پر ملے تو شبانہ کی خوب صورت آنکھوں میں آنسو تھے۔

"اختر' مجھے پرائی ہونے سے بچا لو' میں تمہاری ہوں' تمہاری رہنا چاہتی ہوں۔"

"تم فکر نہ کرو' تمہیں مجھ سے کوئی نہیں چھین سکتا۔ میں دنیا سے ٹکرا جاؤں گا۔" اختر نے بڑے یقین سے کہا۔

"سچ کہتے ہو؟"

"ہاں' سچ کہتا ہوں۔" اختر نے اس کی آنکھوں سے آنسو صاف کیے۔ "لیکن یہ تو بتاؤ' یہ اچانک ہمارے درمیان کون آ گیا؟"

"میرے ابا کے ایک دوست کا بیٹا ہے۔ وہ دوست ان کے لیے بھائیوں جیسے ہیں۔ لڑکا حال ہی میں دوبئی سے آیا ہے' کراچی میں کاروبار کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ انہوں نے ابا کو ٹیلی فون کیا تھا' ابا نے ٹیلی فون پر ہی ہاں کہہ دی۔"

"کیا ٹیلی فون اسی دن آیا تھا جس دن امی میرا رشتہ لے کر گئیں؟"

"نہیں' یہ چار پانچ دن بعد کی بات ہے۔ تمہارا رشتہ تقریباً منظور ہو چکا تھا' بس تمہاری امی کو جواب دینا باقی تھا کہ وہ منحوس ٹیلی فون آ گیا اور اب شادی کی تاریخ بھی طے ہو گئی ہے۔ اگلے مہینے شادی ہے۔"

"تم خوش ہو؟"

"خوش ہوتی تو تم سے ملنے کیوں آتی؟"

"تم شادی سے انکار کر دو۔"

"میں ایسا نہیں کر سکتی' مجھ میں انکار کی ہمت نہیں۔ بس اب ایک ہی راستہ ہے۔"

"وہ کیا؟" اختر نے پوچھا۔

"میں کچھ کھا کر سو رہوں۔"

"فضول باتیں مت کرو۔"

"تم نہیں جانتے کہ میں تمہاری جگہ کسی اور کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔"

"میں جانتا ہوں۔" اختر نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔ "میں کب تمہارے بنا زندہ رہ سکتا ہوں۔"

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

"پھر کچھ کرو' وقت بہت تیزی سے گزر رہا ہے۔"

وقت واقعی بہت تیزی سے گزر رہا تھا۔

اختر..... سوچ سوچ کر ہلکان ہوا جا رہا تھا۔ اب بس ایک ہی راستہ تھا کہ وہ اپنے اور شبانہ کے خاندان کو بنا لگا دے اور شبانہ کو لے اڑے۔

شادی سر پر آ چکی تھی۔

اب صرف ایک دن رہ گیا تھا۔ سوچ سوچ کر اتنا وقت ہاتھ سے نکل گیا تھا اور اب سوچنے کا وقت نہ رہا تھا۔ اس نے ہما کے ذریعے ایک خط شبانہ کو بھجوایا اور مقررہ وقت پر وہ خود گلی کے موڑ پر پہنچ کر اس کا انتظار کرنے لگا۔

ہما کو نہیں معلوم تھا کہ خط میں کیا لکھا ہے۔ وہ بند لفافہ تھا اور اس نے اس بند لفافے کو ہماری دیانتداری سے شبانہ کو پہنچا دیا تھا۔ وہ خط دے کر گھر واپس آ گئی' اس نے اپنے بھائی کو بتا دیا کہ وہ خط دے آئی ہے۔

محبوب کا خط پا کر شبانہ کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ اس نے باتھ روم میں جا کر خط پڑھا۔ خط پڑھ کر اس کے ہاتھ پاؤں لرزنے لگے۔ وہ فوراً بیٹھ گئی' اگر ایسا نہ کرتی تو چکرا کر گر پڑتی۔ نہیں' وہ ایسا نہیں کر سکتی تھی۔ وہ زہر کھا کر مر تو سکتی تھی لیکن گھر سے بھاگ کر اپنے والدین کی عزت کو خاک میں نہیں ملا سکتی تھی۔

اختر' قسم ہے' مجھے اس بارش کی جس بارش میں تم سے پہلی بار ملی تھی' میں تمہیں' تم سے زیادہ چاہتی ہوں' تمہاری یہ محبت اب قبر تک میرے ساتھ جائے گی۔ میں تمہیں کبھی نہ بھلا سکوں گی۔ اختر' مجھے معاف کر دینا۔ میں بے وفا نہیں ہوں' بس تھوڑی سی بزدل ہوں۔ کاش' تم ایک بزدل لڑکی سے پیار نہ کرتے۔

شبانہ اس خط کو سامنے رکھے ڈبڈبائی آنکھوں سے دیکھتی رہی۔ دل ہی دل میں بولتی رہی' اپنے من کا بوجھ ہلکا کرتی رہی۔

کئی بار اسے خیال آیا کہ وہ گلی کے موڑ تک چلی جائے۔ اپنے انتظار میں پتھر بنے اختر کو ایک بار اور آخری بار دیکھ لے لیکن یہ کام اتنا آسان نہ تھا۔ رات کے ایک بجے گھر سے نکلنا اور گلی کے موڑ پر اس سے ملنا کسی قیامت سے کم نہ تھا۔

صبح اس کی شادی تھی۔ اگر کسی نے آدھی رات کو اختر سے ملتے دیکھ لیا تو وہ کہیں کی نہ رہے گی۔ اب آنسو بہانے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ وہ گاؤ تکیے پر جھکی آہستہ آہستہ سسکتی رہی۔

اختر..... کو پوری امید تھی کہ شبانہ وقت مقررہ پر گھر سے نکل آئے گی لیکن اب رات کے تین بج رہے تھے۔ گلی کے کتے بھی تھک ہار کر سو گئے تھے۔ جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا' وہ

مایوس ہوتا جا رہا تھا۔ وہ ایک خلجان میں مبتلا تھا۔ کھڑے کھڑے اس کی ٹانگیں اکڑ گئی تھیں' دماغ سن ہونے لگا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ابھی دم تھا' وہ شبانہ کے گھر کی راہ کو تکے جا رہا تھا۔

وہ رات کس قیامت کی تھی۔

وہ انتظار کس قدر جان لیوا تھا۔

اور جب رات نے صبح کی گود میں منہ چھپایا' سپیدۂ سحر نمودار ہونے لگا تو اس نے شبانہ کے گھر کی راہ تکتی آنکھوں کو کس مشکل سے بند کیا تھا اور جب محبوب کی راہ تکتی آنکھیں بند ہوئیں تو ہر چیز اندھیرے میں ڈوب گئی۔ کچھ نہ رہا' کچھ نہ بچا۔

اپنے شہر میں اس کی یہ آخری رات تھی۔ اب وہ کس کے لئے یہاں رہتا۔ جب وہی نہ رہی' تو پھر کون یہاں رہا' جیسے سارا شہر اجنبی ہو گیا۔

اک بے وفا کا شہر ہے اور ہم ہیں دوستو۔

اشک رواں کی نہر ہے اور ہم ہیں دوستو۔

وہ کہتی تھی' مجھے پرائی ہونے سے بچا لو۔ میں کسی اور کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ تم نہ ملے تو میں' کچھ کھا کر سو رہوں گی۔ دیکھو' وقت تیزی سے گزر رہا ہے' کچھ کرو۔

اور جب اس نے کچھ کرنے کے لئے قدم اٹھایا تو وہ پیچھے ہٹ گئی' اسے تنہا چھوڑ گئی' بے وفا ہو گئی۔

شبانہ' قسم ہے مجھے اس حسین موسم کی' جب تم میری آنکھوں میں سمائی تھیں۔ میں تمہیں کبھی نہیں بھول سکتا۔ میں جانتا ہوں' تم کیوں نہیں آئیں۔ میں تمہارا محبوب سہی لیکن تم نے سوچا تھا کہ ایک کلرک شوہر تمہیں کیا دے سکتا ہے۔ تمہیں ایک بزنس مین کی بیوی بننا چاہئے۔ محبت تمہیں کپڑے لتے نہیں دے سکتی' زیور گہنا نہیں دے سکتی' زندگی کی دیگر آسائشیں نہیں عطا کر سکتی۔ پھر کیا ضرورت ہے تمہیں مجھ سے شادی کرنے کی۔ شبانہ' تم نے ٹھیک سوچا لیکن تمہاری سوچ اس طرح کی تھی تو مجھے پہلے ہی آگاہ کر دیا ہوتا۔ میں کم از کم فریب میں مبتلا تو نہ ہوتا۔ اپنی زندگی تو برباد نہ کرتا' خود تباہ تو نہ ہوتا۔ تمہاری محبت نے مجھے تو کہیں کا نہ رکھا۔ میں دھوبی کا کتا بن گیا ہوں۔ نہ گھر کا رہا' نہ گھاٹ کا۔

پھر اس نے اپنا شہر چھوڑ دیا۔

روشنیوں کے شہر کراچی آ گیا۔

طیاری ہوٹل میں بیرا گیری کرتے اور حامد کے ساتھ اس کے کوارٹر میں رہتے ابھی چند ماہ ہی گزرے تھے کہ اس کی قسمت نے پلٹا کھایا۔ جب آدمی کے برے دن آتے ہیں تو پے در پے آفات ناگہانی اس پر نازل ہونے لگتی ہیں۔ گردش پر گردش۔ بھنور در بھنور سامنے آتے ہیں۔

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

ابھی اس کا گھر چھونا تھا۔ اس کے محبوب نے بے وفائی کی تھی۔ یار' دوست' شہر والے سب چھوٹ گئے تھے۔ ابھی اس نے سکھ کا سانس بھی نہ لیا تھا کہ تقدیر نے ایک اور چرکا لگایا۔

حامد کے گھر پر مانگ پتا ہوتا تھا۔ اختر اس بات سے ناواقف تھا۔ اس کا خیال تھا کہ حامد کے یار دوست ویسے ہی اکٹھا ہو کر وقت گزاری کے لئے تاش کھیلتے ہیں۔ اختر کو ان تاش کے پتوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ ہوٹل سے تھکا ہوا آتا تو اسے بس چارپائی پر لیٹنے کی سوجھتی۔ چارپائی پر لیٹتے ہی شبانہ کی یادیں اسے چاروں طرف سے گھیر لیتیں۔ ان نوکیلی یادوں سے لہولہان ہوتا۔ کروٹیں بدلتے بدلتے بالآخر وہ نیند کی آغوش میں چلا جاتا۔

ایسے ہی ایک رات وہ شبانہ کی یاد میں سلگتے سلگتے سویا تھا کہ اچانک اسے ایسا محسوس ہوا جیسے زلزلہ آ گیا ہے۔ زمین لرز رہی ہے اور وہ پہاڑی کی چوٹی سے لڑھکتا ہوا نیچے آ رہا ہے۔ گھبرا کر آنکھ کھولی تو سامنے کا منظر ہی اور تھا۔

وہ پولیس والے تھے۔

ان کے ہاتھ میں رائفلیں تھیں۔ ایک اے ایس آئی تھا' اس نے ریوالور تھاما ہوا تھا..... اختر کی چارپائی الٹ دی گئی تھی۔ وہ زمین پر پڑا حیرت سے انہیں دیکھ رہا تھا۔

"ابے' دیکھتا کیا ہے' چل کھڑا ہو۔ ہمارے ساتھ تھانے چل۔"

"پر میں نے کیا کیا ہے' میں کیوں چلوں تھانے؟"

"ابے' گھر پر جوئے کا اڈا کھول رکھا ہے اور ہم سے پوچھتا ہے' کیوں چلوں تھانے۔"

"حامد کہاں ہے؟"

"کون حامد؟"

"یہ گھر اسی کا ہے' مجھے تو اس گھر میں آئے چند دن ہوئے ہیں' مجھے نہیں معلوم کہ یہاں کیا ہوتا ہے۔"

وہ لاکھ صفائی پیش کرتا رہا لیکن پولیس والوں نے اس کی ایک نہ سنی اور اسے زبردستی تھانے لے آئے' اس کے ساتھ پانچ چھ آدمی اور تھے جو جوا کھیلتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑے گئے تھے۔ لیکن ان میں حامد نہ تھا۔ اس نے اپنے آپ کو صاف بچا لیا تھا۔

رات بھر اختر تھانے میں بند رہا' اپنی قسمت کو کوستا رہا۔ صبح ہوئی تو حامد اس سے ملنے آیا۔ اسے دیکھ کر اختر غصے میں آ گیا۔

"حامد' تو نے یہ کیا کیا؟"

"تو فکر مت کر اختر' سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تجھے تھوڑی سی سزا ہوگی' اے بھئی

میں جیل میں تجھے کوئی تکلیف نہ ہونے دوں گا۔"

لعنت ہے تجھ پر تو نے دوست بن کر دوست کے سینے میں چھرا گھونپا۔ میں' تجھے کبھی معاف نہیں کروں گا۔ تو نے مجھے بے گناہ پھنسایا ہے۔ اگر میں جیل چلا گیا تو تجھے بھی نہیں چھوڑوں گا۔ میرا انتظار کرنا....." اختر نے یہ کہہ کر اس کے منہ پر تھوک دیا۔ "اب جا یہاں سے' مجھے تیری ہمدردی کی کوئی ضرورت نہیں۔"

حامد نے رشوت دے کر خود کو بچا لیا تھا اور چارے کے طور پر اختر..... کو پولیس کی تحویل میں دے دیا تھا۔ پولیس کو بھی تو آخر کارروائی کرنے کے لئے کوئی قربانی کا بکرا چاہئے تھا۔

اختر..... کو گھر پر جوئے کا اڈا چلانے کے جرم میں سزا ہوگئی۔ وہ جیل پہنچا تو وہاں کی دنیا ہی اور تھی۔ وہاں ایک سے ایک چھٹا ہوا بدمعاش قید تھا۔ دو دن میں ہی ان بدمعاشوں نے اختر..... کو دن میں تارے دکھا دیے۔

یہاں شرافت کی زبان سے کوئی واقف ہی نہ تھا۔ صاف ظاہر ہے کہ اگر کوئی شرافت کی زبان سے واقف ہوتا تو وہ یہاں کیوں ہوتا' جیل سے باہر ہوتا۔

ویسے جیل سے باہر کی دنیا میں اب شرافت کہاں باقی رہ گئی تھی۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ جیل میں کیوں ہوتا۔

پھر اختر نے جلد ہی ان کی زبان سیکھ لی۔

ایک دن حامد اس سے جیل میں ملنے آیا لیکن اختر نے اس سے ملنے سے انکار کر دیا۔ تھانے کہلوا بھیجا۔ "بیٹا' کچھ دن انتظار کرو۔ پھر جیل سے باہر تم سے اکٹھی ملاقات ہوگی۔"

جیل میں رہ کر اس نے بہت کچھ دیکھا' بہت کچھ سیکھا۔

یہ چار دیواری کی دنیا ایک تربیت گاہ تھی' جہاں چار دیواری سے باہر کی دنیا سے نمٹنے کے راستے بتائے جاتے تھے اور یہ راستے سیدھے نہ تھے۔

اختر..... جب جیل سے باہر آیا تو وہ صراط مستقیم چھوڑ چکا تھا۔ جیل سے نکل کر سب سے پہلے اس نے راجو بوری سے رابطہ قائم کیا۔

راجو بوری کراچی کے ایک بڑے سینما ہال پر لائن مین تھا۔ سر پر پڑے بڑے بالوں کا گچھا مونچھیں قلموں تک آئی ہوئیں۔ چھ فٹ قد' لحیم شحیم' ایک دم سیاہ۔ اسے قریب آتا دیکھ کر ہی سب اپنی لائن میں سیدھے کھڑے ہو جاتے تھے۔

اختر..... جب سینما ہال میں پہنچا تو وہ شو کا وقت۔ راجو بوری کھڑکی کے پاس خاموش کھڑا تھا۔ اختر..... کو اپنے قریب آتا دیکھ کر اس نے اسے لائن میں لگنے کا اشارہ کیا۔

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

"اوئے' تمہیں لائن نظر نہیں آتی۔" وہ غصے سے بولا۔

"آتی ہے لیکن میں لائن میں لگنے نہیں' تم سے بات کرنے آیا ہوں۔"

"ہاں' بولو۔"

"مجھے بخاری نے بھیجا ہے۔" اختر نے کہا۔

"اوئے' اچھا اس بار بخاری نے کیا چیز بھیج دی' خیر تم بوتکوں کے اسٹال پر جا کر میرے نام سے ایک بوتل پیو' کھڑکی بند ہو جائے تو میں' آتا ہوں۔" راجو بوری بولا۔

کھڑکی بند ہونے کے بعد راجو بوری بوتکوں کے اسٹال کی طرف آیا۔ اختر اس کا منتظر تھا۔

"ہاں بھئی' اب بولو' تمہارا نام کیا ہے؟" راجو بوری نے بے تکلفی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"اختر کمال۔" اس نے جواب دیا۔

"یہ تو بڑا شریفانہ سا نام ہے' صورت بھی تمہاری ٹھیک ٹھاک ہے۔ پھر جیل کیسے پہنچ گئے۔" راجو بوری نے پوچھا۔

"قسمت کی خرابی۔" اس نے کہا۔

"اچھا' اب اپنے یار بخاری کا حال سناؤ۔"

اس دن اختر..... دو تین گھنٹے سینما پر اس کے ساتھ رہا آخری شو کی ٹکٹیں فروخت کرا کر راجو بوری وہاں سے نکلا۔ اس عرصے میں دونوں کے درمیان اچھی خاصی واقفیت ہوگئی۔

بندر روڈ کی ایک مشہور دکان سے انہوں نے کباب کھائے۔ پھر راجو بوری نے ایک خالی فلیٹ کی چابی دی۔ اس کی جیب میں پچاس کا نوٹ ٹھونسا اور اس سے صبح دس بجے آنے کا وعدہ کر کے اسے دس نمبر کے نزدیک ایک بلڈنگ کے سامنے ٹیکسی سے اتارا اور خود گلبرگ چلا گیا اپنے گھر۔

دو کمرے کے اس فلیٹ میں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ وہ پنکھا فل کھول کر بیڈ پر لیٹ گیا۔ کافی عرصے کے بعد اسے فوم کا گدا نصیب ہوا تھا۔ اسے اپنا گھر یاد آ گیا' گھر یاد آیا تو شبانہ بھی کہیں سے نمودار ہوگئی۔ بس پھر کیا تھا' گویا دبستاں کھل گیا۔

ان کڑوے کسیلے لمحوں کو یاد کرتے' جانے کس وقت اس کی آنکھ لگ گئی۔ صبح آنکھ کھلی تو آٹھ بج رہے تھے۔ جلدی جلدی منہ ہاتھ دھو کر اس نے بازار سے ناشتے کا بندوبست کیا۔ حلوہ پوری کھا کر چائے بنائی۔ چائے پیتے پیتے' حامد اس کی نظروں میں آ گیا۔ جیل جاتے ہوئے اس نے یہ بات طے کر لی تھی کہ وہ اس سے اس کے کیے کا بدلہ ضرور لے گا۔

کوئی ساڑھے دس بجے کے قریب راجو بوری اس سے ملنے آیا۔ وہ آتے ہی بولا۔ "لو بھئی تمہاری بات پکی کر آیا ہوں۔"

"کیسی بات؟"

"بھئی میں سیٹھ صمد کے پاس سے آ رہا ہوں' تم یہ بتاؤ' ہانگ کانگ چلے جاؤ گے؟"

"ہانگ کانگ!" اختر کی آنکھیں حیرت سے کھل گئیں۔ "ہاں ضرور جاؤں گا' کیوں نہیں جاؤں گا۔"

"بس پھر تم چل کر تصویریں بنوالو تاکہ تمہارا پاسپورٹ بن جائے' ایک ہفتے کے اندر اندر تم جہاز پر بیٹھے ہانگ کانگ جا رہے ہوگے۔"

"پہلے میں حامد سے نمٹنا چاہتا ہوں۔"

"میں' چلوں تمہارے ساتھ؟" راجو بوری نے کہا۔

"نہیں راجو بوری' میں اکیلا بہت ہوں' مجھے ایک چاقو چاہئے۔"

"یہ لو۔" راجو بوری نے اپنے نیفے میں اڑسا ہوا ایک کھٹکے سے کھلنے والا بڑا سا چاقو اس کے حوالے کیا۔ "ایک بات کا خیال رکھنا' بندہ مرنے نہ پائے۔"

"میں سمجھتا ہوں' میں خود بھی قاتل نہیں بننا چاہتا۔"

راجو بوری دوسرے دن آنے کا وعدہ کر کے اس سے رخصت ہوا۔ اس کے جانے کے بعد اختر نے اس ہوٹل کا رخ کیا جہاں حامد ملازم تھا۔

ہوٹل پہنچ کر اسے معلوم ہوا کہ وہ کب کا وہاں سے نوکری چھوڑ کر جا چکا ہے۔ وہ کہاں گیا ہے' یہ کسی کو معلوم نہ تھا۔

شام کو پھر وہ اس کے کوارٹر پر پہنچا۔ کوارٹر بند تھا' تالا لگا ہوا تھا۔ پاس پڑوس میں دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ حامد یہ کوارٹر بھی چھوڑ چکا ہے۔ کسی نے کہا کہ وہ کراچی چھوڑ کر حیدر آباد چلا گیا ہے۔ کسی نے بتایا' ملیر چلا گیا ہے۔ بہرحال' کوئی صحیح بات نہ بتا سکا۔ اختر کمال وہاں سے لوٹ آیا۔

ایک ہفتے کے اندر اس کی ہانگ کانگ جانے کی تیاری مکمل ہوگئی۔ سیٹھ صمد نے اسے ساری بات اچھی طرح سمجھا دی۔ وہ اس کے حکم کے مطابق ایک اچھے ہوٹل میں ٹھہرا۔ دوسرے دن ایک مقامی شخص نے اس سے رابطہ قائم کیا۔ کوڈ ورڈز کا تبادلہ ہوا اور اختر نے ایک چھوٹا سا بریف کیس اس کے حوالے کر دیا۔

پھر اسی شام ایک خوبصورت لڑکی ہوٹل آئی۔ اس نے ایک بڑی سی گڑیا جو ایک ڈبے میں پیک تھی' اس کے حوالے کی اور کچھ دیر بیٹھ کر چلی گئی۔

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہانگ کانگ اسے جس مقصد کے لئے بھیجا گیا تھا' وہ پورا ہوگیا تھا۔ اختر اب آزاد تھا۔ اس نے دو تین دن ہانگ کانگ گھومنے میں لگائے اور اس کے بعد پاکستان کا رخ کیا۔ وہ اپنے آنے کی اطلاع ٹیلکس کے ذریعے کر چکا تھا۔ لہٰذا ایئرپورٹ پر سیٹھ صمد کا ایک آدمی موجود تھا۔ اس نے اختر کا سامان کھلنے نہ دیا۔ وہ بخیر و عافیت کسٹم سے نکل آیا۔

باہر آ کر اختر نے وہ بریف کیس جس میں گڑیا تھی' سیٹھ صمد کے بندے کے حوالے کیا اور خود اپنے فلیٹ کی طرف روانہ ہوگیا۔ دوسرے دن صبح ہی صبح راجو بوری آ پہنچا۔ اس نے اسے کامیاب دورے کی مبارکباد دی اور بیس ہزار روپے اس کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے بولا۔ ''یہ تمہارا انعام ہے۔''

''راجو بوری' ایک بات تو بتاؤ۔'' اختر نے نوٹوں کو تھامتے ہوئے پوچھا۔ ''بریف کیس میں کیا تھا جو میں نے ہانگ کانگ پہنچایا۔

تم ان چکروں میں مت پڑو۔ تمہیں تمہاری خدمت کا صلہ مل گیا اور مفت میں ہانگ کانگ کی سیر بھی ہوگئی۔ اب تم تین مہینے کے لئے آزاد ہو۔ تین ماہ بعد پھر تمہیں ہانگ کانگ جانا ہوگا اور اس مرتبہ تم داڑھی میں جاؤ گے' نقلی نہیں' اصلی داڑھی میں آج ہی سے شیو بنانا چھوڑ دو۔''

تین ہفتے میں اچھی خاصی گھنی داڑھی اس کے چہرے پر نمودار ہوگئی۔ اس مرتبہ اس کا ایک نیا پاسپورٹ بنوایا گیا اور اسے مشن پر روانہ کر دیا گیا۔ جب وہ واپس لوٹا تو راجو بوری حسب سابق اس کے لئے انعام لے کر حاضر ہوگیا۔ اس مرتبہ یہ انعام تیس ہزار روپے کا تھا۔

اس طرح ساڑھے تین ماہ میں اختر نے پچاس ہزار روپے کما لیے۔ وہ بہت خوش تھا۔ اس نے فوراً ایک نئی موٹر سائیکل خریدی تاکہ کہیں آنے جانے میں دقت نہ ہو۔ اس کے بعد راجو بوری کے ساتھ اس کی راتیں گزرنے لگیں۔ راجو بوری جوئے کا رسیا تھا۔ اختر کو بھی جوئے کی لت پڑ گئی۔ اب اسے جوا کھیلے بنا چین نہ آتا تھا۔ یہ وہ اختر کمال تھا جسے تاش کے پتوں سے ذرا بھی دلچسپی نہ تھی۔ لیکن اب وہی تاش کے پتے اس کے ہاتھ میں ریشم کی طرح پھسلتے تھے۔

ایک دن جوا کھیلتے ہوئے اس کا ایک بدمعاش سے جھگڑا ہوا' تو اس نے چاقو نکال لیا اور غصے میں آ کر پے در پے کئی کاری ضربیں اس کے جسم پر لگا دیں۔ وہ گہرے زخموں کی تاب نہ لا کر جائے واردات پر ہی زمین سے آسمان کی طرف منتقل ہوگیا۔ اس کے ساتھیوں نے اختر کو پکڑنا چاہا لیکن راجو بوری نے انہیں ایسا نہ کرنے دیا۔ وہ دونوں اس خفیہ جوئے خانے سے فرار ہونے میں کامیاب ہوگئے۔ وہاں سے بھاگتے ہوئے انہوں نے داؤ پر لگی ساری رقم بھی سمیٹ لی تھی۔

کچھ دن کے بعد انہوں نے ایک اور جوا خانہ تلاش کر لیا اور پہلے ہی دن اختر..... ایک

ساری رقم ہار گیا۔ اب اس کے پاس کچھ نہ رہا' سوائے ایک موٹر سائیکل کے۔ آخر میں وہ بھی اس نے داؤ پر لگا دی۔ قسمت اس دن اس پر نامہربان تھی اسے بھی ہار گیا۔

جب وہ جوئے خانے سے ہارے ہوئے جواری کی طرح باہر نکلا تو اس کی جیب میں سوائے ایک چاقو کے کچھ نہ تھا۔ راجو بوری اسے جوئے خانے میں چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ اسے کہیں جانا تھا' وہ اگر ساتھ ہوتا تو کم از کم ٹیکسی میں اسے گھر تک تو چھوڑ دیتا۔

سڑک پر پہنچ کر اس نے دور تک نظر دوڑائی۔ سڑک سنسان پڑی تھی۔ اس وقت رات کے دو بجے تھے ویسے بھی یہ علاقہ سنسان سا ہی تھا۔ اس کا فلیٹ یہاں سے چھ سات میل دور تھا۔ اتنی لمبی مسافت پیدل طے کرنا اس کے بس میں نہ تھا۔

وہ ابھی یہی سوچ رہا تھا کہ کیا کرے' کس طرح گھر پہنچے کہ دور سے ایک گاڑی آتی دکھائی دی۔ گاڑی نزدیک آئی تو اس نے دیکھا وہ ایک ٹیکسی تھی۔ اختر نے جب اسے لیاقت آباد چلنے کو کہا تو اس نے فوراً بڑی صفائی سے چلنے سے انکار کر دیا۔

اختر نے چاقو کھول کر نوک اس کی گردن سے لگا دی اور بولا۔ ''اب کیا کہتے ہو؟''

''چلوں گا' جہاں آپ کہیں گے وہاں چلوں گا۔'' وہ گھگیا کر بولا۔

''بس پھر ٹھیک ہے' چلو۔'' اختر ٹیکسی میں بیٹھتے ہوئے بولا۔ کھلا چاقو ابھی اس کے ہاتھ میں تھا۔ ''تمہاری جیب میں کتنے پیسے ہیں؟''

''مجھ سے میرے پیسے نہ چھینو۔ بڑی محنت سے کمائے ہیں میں نے۔'' ٹیکسی ڈرائیور نے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔

''سب محنت سے کماتے ہیں' چھپر پھاڑ کر کسی کو نہیں مل جاتا۔'' اختر بولا۔ ''میں دس کروڑ روپے اور اپنی موٹر سائیکل ہار کر آ رہا ہوں۔ وہ بھی میں نے محنت سے کمائے تھے۔ بتاؤ تمہارے پاس کتنے پیسے ہیں؟''

''دو ڈھائی سو روپے ہوں گے۔''

''گاڑی روکو اور پیسے نکالو۔'' اختر نے اس کی گردن میں چاقو کی نوک چبھائی۔

ٹیکسی ڈرائیور نے حکم کی تعمیل میں گاڑی روک لی اور اپنی جیب سے پیسے نکال کر اس کے حوالے کر دیئے۔ اختر نے تیزی سے پیسے گنے۔ ڈھائی سو سے اوپر تھے۔ پیسے جیب میں رکھ کر اس نے ٹیکسی ڈرائیور کو نیچے اترنے کو کہا۔ ''چلو جلدی کرو گاڑی چھوڑو۔''

''پیسے چھین لئے اور اب گاڑی بھی چھین لو گے۔''

''میرے پاس فضول باتوں کے لئے وقت نہیں ہے۔ تم مجھے غصہ مت دلاؤ' قتل ہونے سے بچو' چلو اترو۔'' اختر نے بہت غصے سے کہا۔

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

جس شخص نے اسے مجرم بنایا تھا' اس سے ابھی تک ملاقات نہ ہوئی تھی۔ لیکن اختر ے بھولا نہیں تھا۔ وہ اپنی شخصیت کے قاتل کو بھلا کس طرح بھول سکتا تھا۔

ایک دن وہ گلشن اقبال کے ایک مکان میں جوئے کے لئے داخل ہو رہا تھا تو حامد ہاں سے نکل رہا تھا۔ اختر کے ساتھ راجو بوری بھی تھا۔ اختر اسے دیکھتے ہی راجو بوری کی آڑ میں ہو گیا۔ حامد سوٹ پہنے ہوئے تھا' وہ بڑی شان سے چلتا ایک گاڑی میں بیٹھا اور ان کے نزدیک سے نکل گیا۔

"یہ حامد ہے' چلو اس کا ٹھکانا دیکھیں۔" اختر نے اپنی موٹر سائیکل گھمائی۔

"ٹھیک ہے' چلو۔" راجو بوری موٹر سائیکل پر سوار ہوتے ہوئے بولا۔ وہ دونوں اس کے تعاقب میں لگ گئے۔ اس وقت رات کے گیارہ بجے تھے۔ سڑک پر زیادہ ٹریفک نہ تھا' اس لئے اس کے تعاقب میں کوئی دشواری پیش نہ آ رہی تھی۔

"راجو بوری اس نے تو اپنا حلیہ ہی تبدیل کر لیا ہے۔"

"تمہیں یقین ہے' یہ حامد ہی ہے۔"

"ہاں' یہ حامد ہی ہے' اس نے مجھے بے گناہ پھنسایا تھا۔ خود کہیں غائب ہو گیا تھا اور مجھے گرفتار کروا دیا تھا۔ آج میں اسے نہیں چھوڑوں گا۔"

حامد' حسن اسکوائر کے نزدیک ایک اپارٹمنٹ میں داخل ہوا بلڈنگ کی باؤنڈری میں اپنی گاڑی پارک کر کے وہ زینے کی طرف بڑھا۔ راجو بوری اور اختر نے بھی اس کا تعاقب جاری رکھا۔ حامد تھرڈ فلور کے فلیٹ نمبر بیالیس پر جا کر رک گیا۔ وہ دونوں اس کے نزدیک سے گزرتے ہوئے چوتھے فلور کی طرف بڑھے۔ سیڑھیوں پر اندھیرا تھا۔ ویسے بھی حامد نے ان دونوں کی طرف کوئی خاص توجہ نہ دی۔ ہوں گے کوئی۔ وہ اس بلڈنگ کے لوگوں سے ویسے بھی واقف نہ تھا۔ گھنٹی بجانے پر ایک خوبصورت عورت نے دروازہ کھولا۔ یہ دونوں جہاں کھڑے تھے' وہاں سے فلیٹ کا دروازہ صاف نظر آ رہا تھا۔ حامد کے اندر داخل ہوتے ہی اس عورت نے دروازہ بند کر لیا۔

"راجو' کیا کہتے ہو؟" اختر نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"کر لو حساب صاف۔" راجو بوری نے جواب دیا۔ "گھر میں لگتا ہے اس عورت کے علاوہ کوئی اور نہیں۔"

وہ دونوں اوپر سے نیچے آئے۔ دونوں نے اپنے چاقو کھول لئے۔ اختر نے گھنٹی کے بٹن پر ہاتھ رکھا۔ چند لمحوں بعد اندر سے تالا کھولنے کی آواز آئی۔ پھر جیسے ہی دروازہ کھلا' اختر نے سنبھلنے کا موقع نہ دیا۔

دبلا پتلا ٹیکسی ڈرائیور قتل کا ذکر سن کر کانپ گیا۔ اس نے فوراً ٹیکسی چھوڑ دی۔ اختر نے خود اسٹیئرنگ سنبھالا اور ہوا ہو گیا۔

ابھی کچھ دیر پہلے وہ جوئے خانے سے تہی دست نکلا تھا۔ وہ ہارا تھا لیکن اس کی قسمت نہیں ہاری تھی۔ اب اس کے نیچے گاڑی تھی اور جیب میں ڈھائی سو روپے تھے۔

یہ گاڑی پچپن ساٹھ ہزار سے کسی طرح کم نہ تھی لیکن وہ اسے تیس ہزار روپے میں فروخت کر دے گا اور اس پیسے سے ایک جوا خانہ قائم کرے گا۔

ابھی وہ مستقبل کی منصوبہ بندی میں مصروف تھا کہ اچانک ایک پولیس پارٹی نے اسے آلیا۔ اس پولیس پارٹی کے ساتھ ٹیکسی ڈرائیور بھی تھا۔ اختر کے فرار کے تمام راستے مسدود تھے اس لئے وہ بڑی خاموشی سے ٹیکسی سے اتر آیا۔

ایک ٹیکسی ڈرائیور کو لوٹنے اور اس کی گاڑی چھین کر فرار ہونے کے جرم میں اسے جیل بھیج دیا گیا۔ اس مرتبہ جیل جاتے ہوئے وہ ذرا بھی نہ گھبرایا۔ اندر بخاری موجود تھا' وہ اسے دیکھ کر کھل اٹھا۔

"اوئے' اتنی جلدی؟"

"کیا کروں یار' تیری یاد ستاتی تھی۔" اختر نے ہنس کر کہا۔

"بس تو اب فکر ہی مت کر' ادھر سے ساتھ چلیں گے....." بخاری نے کندھے پر ہاتھ مارا۔

اپنی اپنی سزا کاٹ کر بخاری اور اختر باہر آئے تو ان کے استقبال کے لئے باہر راجو بوری موجود تھا۔ اس نے ان دونوں کو ان کے گھروں تک پہنچایا۔

راجو بوری جس سینما ہال پر ملازم تھا' وہ سیٹھ صمد کی ملکیت تھا۔ بخاری بھی اس سینما ہال پر لائن مین کی حیثیت سے ملازم تھا۔ بخاری اور راجو بوری دونوں ایک دوسرے کے جگری یار تھے اور سیٹھ صمد کے گرگے تھے۔ بخاری کو ایک بندے کو چاقو مارنے پر سزا ہوئی تھی۔ اختر بھی اب اس پارٹی میں شامل ہو گیا تھا۔

اب اسکی زندگی اسی طرح کبھی اندر' کبھی باہر گزر رہی تھی۔ وقت کے ساتھ ساتھ وہ ایک پختہ کار مجرم بنتا جا رہا تھا۔ اب پیسے کمانا اس کے لیے مسئلہ نہ رہا تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ وہ جو کچھ کماتا تھا' وہ پانی کی طرح اس کے ہاتھ سے بہہ جاتا تھا۔

ناجائز کمائی' حرام کا پیسہ جس طرح آتا ہے۔ ویسے ہی نکل جاتا ہے۔ اختر کمال کو تو سو بیماریوں کی ایک بیماری جوئے کی لگی ہوئی تھی۔ جو اسے پنپنے نہ دیتی تھی۔ پیسہ ادھر آتا اور ادھر نکل جاتا۔

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

پے در پے اس نے چاقو کے کئی وار کیے۔ جب وہ لہولہان ہوگیا تو اختر نے اسے ایک طرف دھکا دے کر ٹھوکر ماری۔ وہ فرش پر اوندھے منہ گرا' تب اس نے جھک کر اس کی ناک کاٹ دی۔

میرا نام اختر کمال ہے' ایک دن تم مجھے بے گناہ پھنسا کر غائب ہوگئے تھے۔ آج میں تمہیں چاقو مار کر غائب ہو رہا ہوں' اس دن میں تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکا تھا۔ آج تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکو گے۔" اختر نے ایک اور ٹھوکر لگائی اور اس کی لرزتی' کانپتی بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "سنبھال اس کتے کو۔"

اس کی بیوی نے ان کے کمرے میں داخل ہوتے ہی چیخنے کی کوشش کی تھی لیکن راجو بوری نے اسے سنبھال لیا تھا۔ اختر..... کی بات سن کر وہ فوراً اپنے شوہر پر جھک گئی۔

نکل چل راجو۔" اختر نے سیڑھیاں اترتے ہوئے کہا۔"

پھر وہ دونوں بڑے اطمینان سے اپارٹمنٹ سے نکل آئے۔ کسی نے ان کو ہاتھ لگانے یا پکڑنے کی کوشش نہ کی۔

اس واردات کے بعد وہ دونوں واپس گلشن اقبال آئے اور رات بھر جوا کھیلتے رہے۔ اختر کے چہرے پر بڑا سکون تھا۔ اس کے باوجود کہ وہ مسلسل ہار رہا تھا۔ لیکن وہ خلش جو کانٹا بن کر اس کے دل میں چبھی تھی' اب ختم ہوگئی تھی۔

لیکن ایک خلش اس کے دل میں آج تک جوں کی توں تھی۔ اب پانچ سال ہونے کو آئے تھے۔ اس عرصے میں وہ ایک دن کو بھی بھلا نہ پایا تھا۔ گھر کی یاد اسے کبھی کبھار ہی آتی تھی لیکن وہ شبانہ کو بالکل نہ بھولا تھا' جیسے ہی وہ تنہا ہوتا' شبانہ اس کے دل کا طواف کرنے لگتی۔ وہ اس اذیت ناک یاد کو اپنے دل سے نہ نکال پاتا۔

آج خالد احمد کے فلیٹ میں شبانہ کی شادی والی تصویریں دیکھ کر اس پر قیامت گزر گئی تھی۔ تو یہ تھا وہ دوبئی سے آنے والا بندر جس نے نوٹوں کی گڈیوں سے اس کی شبانہ کو چھین لیا تھا۔ اس کے دل میں آگ سلگ اٹھی۔ اس نے وہ بڑا سا چاقو جو کھلنے پر خنجر جیسا ہو جاتا تھا' کھول لیا۔ پھر اس نے اس خنجر سے خالد کی تصویروں پر وار کرنے شروع کیے۔

شبانہ کے ساتھ خالد کی جتنی بھی تصویریں تھیں اس نے ان کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا۔

اب شبانہ کے ساتھ اس کی ایک بھی تصویر نہ رہی۔

اچانک باہر دروازے میں چابی لگنے' پھر گھومنے کی آواز آئی۔

گھر کی تمام بتیاں بند تھیں' سوائے بیڈ روم کے جہاں وہ بیٹھا تھا۔ اس نے لپک کر وہ بتی بھی گل کردی۔ ہاتھ میں خنجر سنبھال لیا اور بیڈ روم کے دروازے کے پیچھے سانس روک کر کھڑا

ہوگیا۔

خالد احمد فلیٹ کے دروازے پر پہنچ کر ذرا چونکا تھا۔ باہر کی لائٹ جلی ہوئی تھی' پھر اس نے سوچا۔ یہ اسی کا کارنامہ ہوگا؟" اس سے پہلے بھی کئی بار باہر کی لائٹ جلی چھوڑ کر جا چکا تھا۔ ظاہر ہے' باہر کی لائٹ جن بھوت تو جلانے سے رہے۔

دروازہ کھول کر' وہ سیٹی بجاتا اندر داخل ہوا۔

ڈرائنگ روم کی لائٹیں روشن کیں۔ باورچی خانے کی بتی جلائی۔ یہ اس کی ہمیشہ کی عادت تھی کہ وہ داخل ہوتے ہی گھر کی تمام بتیاں روشن کر دیتا تھا۔

اسے گھر میں اندھیرا بالکل پسند نہ تھا۔

باورچی خانے کی لائٹ جلا کر اس نے ٹی وی لاؤنج کی لائٹ جلائی اور پھر گھڑی دیکھ کر ٹیلی ویژن آن کردیا۔ ٹیلی ویژن پر اشتہار آرہے تھے۔

اب وہ بیڈ روم میں داخل ہوا اور اندازے سے دروازے کے پیچھے لائٹ جلانے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ ادھر اختر..... بالکل الرٹ کھڑا تھا۔ اس نے اس کا ہاتھ پکڑ کر زور سے جھٹکا دیا۔ خالد کا سر دروازے کی کنارے سے ٹکرایا۔ اس اچانک حملے پر اس کے ہوش اڑ گئے' آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا' چکر آگئے' پیشانی سے خون بہنے لگا۔

اختر نے اسے سنبھلنے کا موقع نہ دیا۔ اس کے ہاتھ پشت کی طرف موڑ کر' اس کی کمر پر ایک زوردار لات جمائی تو خالد کے رہے سہے اوسان بھی خطا ہوگئے۔

اختر نے ایک ریشمی ڈوری سے اس کے ہاتھ باندھ دیئے' پھر اسے بیڈ کی طرف زور سے دھکا دیا۔ وہ اوندھے منہ گرا۔ اس سے پہلے کہ وہ سیدھا ہونے کی کوشش کرتا' اس نے ریشمی ڈوری سے پیر بھی جکڑ دیے۔

پھر اس نے کمرے کی ساری بتیاں جلادیں۔ بیڈ پر چاروں طرف تصویریں بکھری پڑی تھیں۔ خالد نے کٹی پھٹی تصویروں کو حیرت سے دیکھا اور پھر اختر سے پوچھا جو خنجر ہاتھ میں لیے اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ "کون ہو تم؟"

"ارے مجھے نہیں پہچانتے۔" اختر نے اس کی ٹانگیں کھینچتے ہوئے کہا۔

"یہ تم نے تصویریں کیوں خراب کی ہیں' کون ہو تم؟" خالد احمد پریشان تھا۔

"ہاں' تم بھلا مجھے کہاں جانتے ہوگے لیکن میں تمہیں اچھی طرح جانتا ہوں۔" اس نے اس کی ٹانگیں کھینچ کر بیڈ کے نیچے کیں اور سہارا دے کر بٹھا دیا پھر بولا۔ "تم شبانہ کے شوہر ہو۔"

"تم شبانہ کو کیسے جانتے ہو؟" خالد احمد نے اسے چونک کر دیکھا۔

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

"شبانہ میری محبت تھی جسے تم نے مجھ سے چھین لیا۔" اختر قالین پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"تم لوگ دوسرے کیا ہو آتے ہو' خود کو شہزادے تصور کرنے لگتے ہو۔ پیسہ تمہارا ایمان بن جاتا ہے۔ اپنی خوشیوں کے پیچھے تمہیں کچھ نظر نہیں آتا۔ نہ تمہیں اپنی عمر نظر آتی ہے' نہ تمہیں اپنی شکل و صورت' سچ بتاؤ' کیا تم اس قابل تھے کہ تمہیں شبانہ کا شوہر بنا دیا جاتا لیکن تم اس کے شوہر بنا دیے گئے اور اس کی مرضی کے خلاف بنا دیے گئے۔ محض پیسے کے بل بوتے پر میں جو ایک کلرک تھا' غریب کلرک' گلی کے موڑ پر اس کا انتظار کرتا رہ گیا۔ بے بس اور لاچار۔

"لیکن میری شادی کو تو پانچ سال ہونے کو آئے' تم اب تک کہاں تھے اور اب اچانک کس طرح یہاں آ پہنچے۔"

"مجھے محض تقدیر یہاں کھینچ لائی ہے۔ خالد احمد جس طرح ایک دن تم پیسے کے بل پر شبانہ کو حاصل کر کے یہاں آ گئے تھے' آج ویسے ہی میں تمہیں شبانہ سے چھین لوں گا۔ تم چاہے ہو کہ میں' اتنے عرصے کہاں رہا تو خالد احمد' میں تم سے ان گزرے ہوئے پانچ سالوں کے ایک ایک لمحے کا حساب لوں گا' تم ہی وہ شخص ہو جس نے مجھ سے میری محبوبہ چھینی' میرا گھر چھینا اور مجھے مجرم بنا دیا۔"

"کیا تم اختر کمال ہو؟" خالد احمد نے پوچھا۔

"ہاں' میں اختر کمال ہوں' لیکن تم میرا نام کس طرح جانتے ہو؟"

"میں نے شبانہ کی زبانی تمہارا نام سنا ہے۔ تم شبانہ کے پڑوس میں رہتے تھے اور میری شادی سے پہلے تم سکھر سے غائب ہو گئے تھے اور پھر لوٹ کر کبھی اپنے شہر نہیں گئے۔" خالد احمد نے بتایا۔

"ہاں' ٹھیک ہے لیکن تمہیں یہ کس نے بتایا؟"

"مجھے شبانہ نے بتایا۔"

"کیا اس نے تمہیں یہ بھی بتا دیا کہ ہم ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے؟"

"نہیں' یہ نہیں بتایا۔ تمہارا ذکر اس نے ایک اچھے پڑوسی کی حیثیت سے کیا تھا لیکن مجھے معاملے کو سمجھنے میں دیر نہ لگی۔ پھر اس خیال کو یوں بھی تقویت ملی کہ شادی کے بعد میں نے اسے کبھی خوش نہیں دیکھا۔ وہ ہمیشہ کھوئی کھوئی سی رہتی اور آج اس بات کی تصدیق ہو گئی کہ وہ تمہاری یاد کو سینے سے لگائے رہی۔ اگر مجھے یہ بات پہلے ہی دن معلوم ہو جاتی تو میں اس سے کبھی شادی نہ کرتا۔ میں محبت کرنے والوں کا دل سے احترام کرتا ہوں۔ ایک بات تو بتاؤ' کیا تم آج یہاں مجھ سے انتقام لینے آئے ہو' کیا مجھے قتل کرنے آئے ہو۔ اگر ایسا ہے تو اتنی دیر سے کیوں آئے؟"

"میں' تمہیں صاف بتاؤں۔" اختر ..... نے خنجر سیدھا کیا۔ "میں' یہاں واقعی تمہیں قتل کرنے آیا ہوں' اپنی وجہ سے نہیں' کسی اور کی وجہ سے یہاں آنے سے پہلے مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ میں شبانہ کے گھر جا رہا ہوں۔ یہ تو مجھے یہاں آ کر معلوم ہوا' جب میں نے ڈرائنگ روم میں اس کی تصویر لگی دیکھی۔ پھر میں نے گھر میں اس کی مزید تصویریں تلاش کیں تو یہ البم ہاتھ آ گئی۔ اس کی تصویریں دیکھ کر میرے دل میں آگ بھڑک اٹھی اور یوں میں نے غصے میں آ کر تمہاری تصویروں کو خنجر کی نوک سے پھاڑ ڈالا۔ اب یہی کام میں خنجر سے تمہارے جسم پر کروں گا۔ میں تمہیں سے تمہیں موت کے گھاٹ اتار کر جاؤں گا۔ تمہیں کچھ پوچھنا ہے تو پوچھ لو۔ میں مرنے سے پہلے کے سامنے بالکل سچ بولوں گا۔" اختر ..... نے ہنستے ہوئے کہا۔

"مجھے کون قتل کروانا چاہتا ہے؟" خالد احمد نے پوچھا۔

"سیٹھ اکرم۔" اختر کمال نے جواب دیا۔

"بالآخر اس کمینے نے میرے قتل کا فیصلہ کر ہی لیا۔ میں آج ہی اپنے اکاؤنٹینٹ سے کہہ رہا تھا کہ اکرم کا بس نہیں چلتا ورنہ مجھے قتل کرا دے۔"

"تم دونوں کے درمیان کیا جھگڑا ہے؟" اختر نے پوچھا۔

"اس نے کچھ نہیں بتایا؟"

"نہیں۔" اختر ..... بولا۔

"تم نے پوچھا بھی نہیں؟" خالد احمد نے سوال کیا۔

"نہیں' میں نے اس کی ضرورت نہیں سمجھی' ویسے بھی اس نے تمہیں قتل کرنے کے لئے معقول رقم میرے حوالے کی ہے۔"

"کیا تم مجھے وہ رقم بتانا پسند کرو گے؟"

"رقم تو میں بتا دوں گا لیکن اگر تمہارے ذہن میں یہ بات آئی ہے کہ سیٹھ اکرم سے زیادہ رقم دے کر تم مجھے سیٹھ اکرم کے قتل پر مامور کر دو گے تو ایسا نہیں ہو سکے گا۔ میں پیشہ ور قاتل ضرور ہوں لیکن اصول پسند آدمی ہوں' اب تمہیں قتل ہونے سے کوئی نہیں بچا سکتا' سمجھے۔"

"کیا یہ ممکن ہے کہ مجھے قتل کرنے سے پہلے' قتل کروانے کی وجہ جان لو۔"

"ہاں بتاؤ' اس میں کوئی حرج نہیں۔"

"کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ یہ خون جو پیشانی سے بہہ کر میری آنکھ میں آ رہا ہے' اسے صاف کر لینے تو لینے سے صاف کر دو۔" خالد نے آنکھ کی طرف اشارہ کیا۔

"خالد احمد' میں' تمہیں قتل کرنے آیا ہوں اور تم مجھ سے مسیحائی کروانا چاہتے ہو۔"

"قتل تو تم مجھے کر ہی دو گے۔ میں تمہارے قابو میں ہوں۔ میرے ہاتھ پاؤں بندھے

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہوئے ہیں۔ میں تم سے بچ کر کہاں جاؤں گا۔ یہ خون میری آنکھ میں بھر رہا ہے۔ اسے مرنے والے کی آخری خواہش سمجھ کر صاف کردو تاکہ میں اطمینان سے اکرم کے بارے میں بتا سکوں۔"

"اچھا' ٹھیک ہے۔" یہ کہہ کر اختر..... اٹھا۔ اس نے باتھ روم میں جا کر تولیے کو پانی میں بھگویا اور اس بھیگے تولیے سے بہتے خون کو اچھی طرح صاف کردیا اور پھر اسی گیلے تولیے کو اس کے سر سے اچھی طرح لپیٹ دیا۔

خالد احمد کو کچھ سکون ملا۔ اس نے بڑی ممنونیت سے اختر..... کو دیکھا۔ "شکریہ' دیے مجھے امید نہ تھی کہ تم ایسا کرو گے۔ میں تو جواب میں اس زخم کے اور گہرا ہونے کا منتظر تھا۔ تم بڑے خوبصورت قاتل ہو۔"

"زیادہ وقت میرے پاس نہیں' بہتر ہوگا کہ تم جو کچھ کہنا چاہتے ہو' جلد کہہ دو۔" اختر..... نے اس کے جملے کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

"میں اپنی بات کرنے سے پہلے تم سے ایک سوال پوچھتا ہوں۔"

"ہاں' پوچھو۔"

"کیا تمہیں شبانہ سے اب بھی محبت ہے؟"

"ہاں ہے۔ وہ میری پہلی اور آخری محبت ہے۔ اس سے پہلے نہ کبھی کسی کو چاہا نہ اس کے بعد کسی کو چاہ سکوں گا۔" اختر..... نے جذباتی لہجے میں کہا۔

"اختر' تم کتنے عظیم انسان ہو۔ تم مجرم کیوں بن گئے۔" خالد نے تاسف سے کہا۔

"عظیم ہوں یا نہیں' یہ تو مجھے نہیں معلوم لیکن مجرم بن کر میں زیادہ خوش نہیں' خوش کبھی بھی تو مجھے بہت پچھتاوا ہوتا ہے۔ شبانہ مجھے مل گئی ہوتی تو میری زندگی کا آج رخ ہی کچھ اور ہوتا۔ اب کیا ہے' سوائے پچھتاوے کے۔ میں اس دلدل سے نکلنا بھی چاہوں تو نہیں نکل سکتا۔ شاید میں مجرمانہ زندگی کا عادی ہوتا جا رہا ہوں۔

اختر' تم نے اب تک مجھ سے یہ سوال نہیں کیا کہ شبانہ کہاں ہے؟"

"میں جانتا ہوں کہ وہ یہاں نہیں ہے تو میکے گئی ہوگی' اسی لئے سوال نہیں کیا۔ کیا ایسا نہیں ہے؟" اختر..... نے سوال کیا۔

"تم نے ٹھیک قیاس کیا' وہ دو تین دن قبل ہی سکھر گئی ہے اور کافی دن کے بعد گئی ہے۔ دس پندرہ دن رہ کر آئے گی۔" خالد..... نے بتایا۔ "اختر' جس طرح تم اسے نہیں بھولے ہو' وہ بھی تمہیں نہیں بھولی' شادی شدہ زندگی کے یہ پانچ سال یوں سمجھ لو' میں نے بے لطف گزارے ہیں۔ میں اصلی شبانہ کو آج تک نہیں پا سکا۔ پتا کیسے اس کی روح تو تمہارے پاس ہے۔ شاید تمہیں یہ جان کر حیرت ہو کہ میں ابھی تک بے اولاد ہوں۔"

"ارے' یہ تو واقعی حیرت کی بات ہے' ایسا کیوں ہوا؟"

"بس' اللہ کی مرضی۔"

"تم مجھے سیٹھ اکرم کے بارے میں بتانے والے تھے۔"

"ہاں' سیٹھ اکرم میرا بہت پرانا دوست ہے۔ ہم دونوں کالج کے زمانے میں کلاس فیلو بھی رہ چکے ہیں۔ میں جب دوبئی سے واپس آیا تو میرے پاس اچھی خاصی رقم تھی۔ میں کراچی میں کوئی مناسب کاروبار کا سوچ رہا تھا۔ میں اس سلسلے میں کافی لوگوں سے ملا۔ مختلف کاروبار کا جائزہ لیا۔ ابھی میں کسی کاروبار کے بارے میں فائنل نہ کر پایا تھا کہ گھر والوں نے میری شادی فائنل کردی۔ شبانہ سے شادی کے بعد میں پھر سے اپنے مشن پر لگ گیا۔ ان دنوں اکرم گارمنٹس کا چھوٹا موٹا کاروبار کر رہا تھا۔ اس کے پاس سرمائے کی کمی تھی۔ میرے بارے میں اسے معلوم تھا کہ سرمائے کی میرے پاس کوئی کمی نہیں۔ آہستہ آہستہ اس نے مجھے اپنے کاروبار کی طرف مائل کرنا شروع کردیا۔ گارمنٹس کے کاروبار سے مجھے بھی دلچسپی تھی لیکن تجربہ نہ تھا۔ میں نے سوچا اکرم کو تجربہ ہے' وہ محض سرمائے کی کمی کی وجہ سے مار کھا رہا تھا۔ کیوں نہ میں اس کے کاروبار میں شریک ہو جاؤں۔ پھر جب ہم نے مشترکہ کاروبار شروع کیا تو اس فیکٹری میں میرا حصہ پچھتر فیصد اور اس کا پچیس فیصد تھا۔ ہم دونوں نے مل کر بڑی محنت سے کام کیا۔ فیکٹری نے دو تین سال کے عرصے میں اتنی ترقی کرلی کہ مال باہر بھی سپلائی ہونے لگا اور آج ہمارے پاس باہر کے اتنے آرڈرز ہیں کہ ہم انہیں پورا کرنے سے قاصر ہیں۔ شہر میں' ہم نے کئی شوروم کھولے ہوئے ہیں۔ الحمدللہ ہمارا کاروبار اس وقت ٹاپ پر ہے۔ فیکٹری کو پھلتا اور پھیلتا دیکھ کر اکرم کی نیت میں فتور پیدا ہونے لگا ہے۔ وہ مجھے میرے حصے کے مطابق منافع دینے کو تیار نہیں۔

وہ کہتا ہے' اپنا بنیادی سرمایہ لے لو اور فیکٹری سے الگ ہو جاؤ۔ بھلا بتاؤ' یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ اس فیکٹری میں جہاں میں نے اپنا سرمایہ لگایا

کی تھی کہ کام چل نکلے تو اکرم مجھے بنیادی سرمایہ واپس کر کے فیکٹری سے نکال باہر کرے۔ میں نے جواب میں اس سے کہا کہ اگر بنیادی سرمائے کی واپسی کا مسئلہ ہے تو تم مجھ سے اپنا بنیادی سرمایہ لے لو اور فیکٹری سے الگ ہو جاؤ۔ اس بات پر وہ بھڑک اٹھا۔ اس سے پہلی خوب تو تو میں میں ہوئی۔ وہ پچیس فیصد سرمایہ لگا کر خود کو فیکٹری کا مالک تصور کرنے لگا ہے۔ ویسے اس اختلاف کی اصل وجہ کچھ اور ہے' دیکھو' تم برا نہیں ماننا۔" خالد احمد یہ کہہ کر خاموش ہوگیا۔

"کیا مطلب' میں سمجھا نہیں' میں بھلا کیوں برا مانوں گا۔" اختر..... نے کہا۔

"اس مسئلے میں شبانہ ملوث ہے۔"

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

"یعنی کوئی بے وفائی کا شاخسانہ۔"

"نہیں' یہ بات نہیں۔ دراصل اکرم آوارہ مزاج آدمی ہے۔ اب وہ شراب بھی کبھی کبھی سے پینے لگا ہے۔ ایک دن وہ نشے میں تھا' مجھ سے ملنے گھر چلا آیا۔ میں اس وقت گھر پر اکیلی تھا۔ شبانہ نے اسے عزت و احترام کے ساتھ ڈرائنگ روم میں بٹھالیا۔ اس کے لئے چائے وغیرہ بنائی۔ اس نے اس خاطر مدارات کا کچھ اور ہی مطلب لیا۔ اس نے آگے بڑھنے کی کوشش کی لیکن شبانہ نے اسے سختی سے جھٹک دیا۔ اتنے میں' میں گھر آ گیا۔ اس کا موڈ کچھ اکھڑا اکھڑا تھا۔ وہ پانچ دس منٹ بیٹھ کر چلا گیا۔ بعد میں شبانہ نے مجھے سارا قصہ بتایا کہ اکرم صاحب ذرا بے تکلف ہونے کی کوشش کی تھی تو میں نے اس بات کا سختی سے نوٹس لیا' کیونکہ شبانہ نے اس کو خاصا سخت وست کہہ دیا تھا' لہٰذا میں نے پھر اس مسئلے پر بات نہ کی۔ البتہ شبانہ کو یہ ہدایت کردی کہ وہ میری غیر موجودگی میں آئندہ اسے گھر میں داخل نہ ہونے دے۔ بس یہاں سے میرے اور اس کے درمیان اختلافات شروع ہوئے۔ اس نے اس توہین کو اپنی انا کا مسئلہ بنالیا پھر ہمارے درمیان کھنچاؤ آ گیا اور آہستہ آہستہ اختلافات نے بھیانک صورت اختیار کرلی۔ اتنی بھیانک کہ اسی نے مجھے قتل کروانے کی ٹھان لی ہے۔ اب اختر تم بتاؤ کہ قصور کس کا ہے لیکن بھلا یہ باتیں کیوں سوچو گے۔ تمہیں بھلا اس سے کیا غرض کہ قصوروار کون ہے۔ تم تو اندھے اور گونگے ہو۔ تمہیں ایک معقول رقم دے کر ایک بندے کو قتل کرنے کے لئے بھیجا گیا ہے۔ تم اپنا فرض نبھاؤ گے اور چلے جاؤ گے۔" خالد احمد نے جذباتی انداز میں کہا۔

"میں اب شش و پنج میں پڑ گیا ہوں۔" اختر..... واقعی الجھ گیا تھا۔

"کاش' آج شبانہ یہاں ہوتی۔"

"تو کیا ہوتا؟"

"تمہیں' تمہاری شبانہ مل جاتی اور مجھے میری زندگی' میں اسے طلاق دے کر تمہارے حوالے کر دیتا اور تم سے اپنی زندگی مانگ لیتا۔" خالد احمد نے دوٹوک لہجے میں کہا۔

"واقعی' کیا ایسا ہوسکتا تھا کہ تم شبانہ کو میرے لئے طلاق دے دیتے۔"

"ہاں' بالکل....." خالد احمد نے کہا۔

"پھر یہ سودا تو اب بھی ہوسکتا ہے۔ تم سادہ کاغذ پر مجھے طلاق لکھ کر دے دو مجھے شبانہ مل گئی تو میں سب کچھ چھوڑ دوں گا۔ تمہیں بھی اور اپنی مجرمانہ زندگی کو بھی۔"

"اور سیٹھ اکرم کا کیا ہوگا؟" خالد احمد نے اداس لہجے میں کہا۔

"وہ میرے پاس پھر کسی کرائے کے قاتل کو بھیج دے گا۔ اسے میں کیا دے کر جان چھڑاؤں گا؟"

"پھر کیا چاہتے ہو؟" اختر نے پوچھا۔

"سیٹھ اکرم کا صفایا۔" خالد نے کہا۔ "جو رقم اس نے تمہیں' مجھے قتل کرنے کو دی ہے' مجھ سے لے لو۔ ابھی' اسی وقت۔"

"نہیں' مجھے رقم کی ضرورت نہیں' جو اس نے مجھے دے دی ہے' وہ میرے لئے کافی ہے۔ اب اسی کا جوتا اور اسی کا سر ہوگا..... بس تم طلاق نامہ میرے حوالے کردو۔"

"ٹھیک ہے' میں تیار ہوں' کھولو میرے ہاتھ' پاؤں بے شک طلاق حاصل کرنے کے بعد کھول دینا۔" خالد احمد نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"دیکھو' میرے ساتھ کوئی جعل سازی نہ ہو۔"

"جعل سازی کیسی؟ تم یوں کرو' طلاق نامے کے ساتھ رقم بھی لے لو۔"

"نہیں' رقم کی مجھے ضرورت نہیں' وہ میں سیٹھ اکرم سے حاصل کر چکا ہوں۔"

"بس پھر اطمینان رکھو۔"

"اطمینان تو مجھے اس وقت ہوگا جب شبانہ مجھے مل جائے گی۔ شبانہ میرا خواب ہے' وہ مجھے حاصل ہوگئی تو پھر میں سب کچھ چھوڑ دوں گا۔ اسی کی وجہ سے میں نیک سے بد بنا اور اب اسی کی خاطر بد سے نیک بننا چاہتا ہوں۔ تم فکر مت کرو' سیٹھ اکرم کو ٹھکانے لگانے کا ذمے دار میں ہوں۔ یہ میرا آخری جرم ہوگا۔" اختر نے بڑے یقین سے کہا۔ "لاؤ میں تمہارے ہاتھ کھول دوں' کاغذ قلم اٹھاؤ اور لکھو کہ میں نے شبانہ کو طلاق دی۔"

☆.....☆.....☆

اختر جھومتا' گنگناتا اپنے فلیٹ میں داخل ہوا۔

وہ نشے میں نہیں تھا۔ بچھڑا یار ملنے کی آس نے اس پر نشہ سا طاری کردیا تھا۔ آج کا دن اس کے لئے کس قدر خوش نصیب تھا۔ وہ خالد کو قتل کرنے گیا تھا اور وہاں اسے شبانہ مل گئی تھی۔ وہ شبانہ جو اس کی رگ رگ میں سمائی تھی' جسے کھو کر وہ اپنا سب کچھ ہار بیٹھا تھا۔ اس محبت کے خلا کو پورا کرنے کے لئے وہ کہاں کہاں بھٹکتا پھرا تھا۔ زندگی نے اسے کیسے کیسے رنگ دکھائے تھے کیسے کیسے ڈسا تھا لیکن آج وہی زندگی اس پر مہربان ہوگئی تھی' اس نے محبوب سے ملنے کی نوید سنادی تھی۔

یہ فلیٹ جس میں اختر کمال داخل ہوا تھا' وہی تھا جس میں راجو بوری نے جیل سے رہائی کے بعد ٹھہرایا تھا۔ تب سے اب تک وہ اسی فلیٹ میں رہتا چلا آیا تھا۔ اس عرصے میں اس نے اتنا کما لیا تھا کہ اس چھوٹے سے بے قیمت فلیٹ کی جگہ اگر وہ چاہتا تو کسی اچھے علاقے میں مکان خرید لیتا اور پر آسائش زندگی گزارتا' لیکن اختر نے کبھی اس طرف توجہ دی ہی نہیں تھی۔ وہ کماتا' ویسے ہی اڑا دیتا۔ یوں بھی حرام کی کمائی میں پر لگے ہوتے ہیں۔ وہ کسی کے پاس ٹھہرتی

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

کہاں ہے' موقع دیکھتے ہی اڑ جاتی ہے۔ یہ فلیٹ سیٹھ صمد کی ملکیت تھا اور راجو بوری کے قبضے میں تھا۔ اختر کے جیل سے آنے کے بعد اس نے اس کے حوالے کردیا تھا کہ جب تک دل چاہے رہو۔ اختر نے جب فلیٹ کا دروازہ کھولا تو اسے اندر کسی کی موجودگی کا احساس ہوا' اس نے فوراً خنجر نما چاقو کھول لیا۔ یہ دو کمرے کا فلیٹ تھا۔ باہر کا دروازہ کھولتے ہی دونوں کمرے کے دروازے نظر آنے لگے تھے۔ ڈرائنگ روم کا دروازہ کھلا ہوا تھا جبکہ بیڈ روم بند تھا۔ اختر کی ہمیشہ کی عادت تھی کہ وہ اندر کے دروازے کبھی بند نہیں کرتا تھا۔ جو دروازہ بند تھا' اس کے نیچے سے روشنی نظر آ رہی تھی۔ گویا کمرے میں لائٹ بھی جل رہی تھی۔

اختر نے باہر کی لائٹ جلا کر یہ دیکھنے کو کہ دروازہ اندر سے کھلا ہے یا بند' ہاتھ لگایا تو اندر سے چٹخنی کھولنے کی آواز آئی۔

اختر فوراً دروازے کے سامنے سے ہٹ گیا۔ اس نے ڈرائنگ روم کے دروازے کی آڑ لے لی اور خنجر تان کر اس کا انتظار کرنے لگا' اور جیسے ہی وہ سامنے آیا' اختر نے اس پر وار کرنے کے لیے ہاتھ اٹھایا لیکن پھر خود بخود اس کا ہاتھ ڈھیلا ہو کر نیچے آ گیا۔

اس کے سامنے راجو بوری کھڑا تھا۔ ''اوئے اختر' کیا کرتا ہے؟'' ''راجو بوری'' تو آج بچ گئے' ورنہ تمھارا کام ہو گیا تھا۔ تم آئے کیسے؟''

''میں آیا کیسے' میرے پاس اس فلیٹ کی دوسری چابی نہیں ہے کیا؟'' راجو بوری نے جواب دیا۔ ''بس اسی چابی سے دروازہ کھول کر اندر آ گیا۔''

اختر ڈرائنگ روم کے دروازے سے نکل کر بیڈ روم میں جانے لگا تو راجو بوری نے اسے روک لیا' اس کا بازو پکڑ لیا۔

''او بھائی'' تم اندر کدھر جاتا' یہ کھلا خنجر لے کر' کیا اپنی بھابی کو بے ہوش کرے گا؟'' راجو بوری مسکراتا ہوا بولا۔

''اوہ' تو یہ بات ہے۔ کمرے کے اندر ہماری بھابی براجمان ہے۔''

''جی صاحب۔'' راجو بوری نے ہنس کر آنکھ ماری۔

''راجو بوری' یہ ہماری کون سی بھابی ہے۔ میرا مطلب ہے' اس کا نمبر کیا ہے؟''

''نمبر تو پچاس کے اوپر ہی ہوگا' باون یا ترپن۔''

''اوہ شاباشے' راجو بوری' تو بھی کمال کا آدمی ہے' تو نے اپنی پوری زندگی ان بھابیوں کے پیچھے تباہ کر لی۔''

''یار' یہ بھی نشہ ہے' لت ہے' جیسے تجھے جوئے کی لت ہے۔'' راجو نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''تجھ سے یہ جوا نہیں چھوٹتا' مجھ سے یہ تیری بھابیاں نہیں چھوٹتیں۔''

''اچھا' جائیں آپ یہاں کھڑے ہو کر اپنا وقت ضائع نہ کریں۔'' اختر نے اسے ... کی طرف دھکیلتے ہوئے کہا۔ ''آپ واپس آئیں تو میں آپ کو ایک زبردست خوشخبری ... گا۔ ایسی خوشخبری ہے کہ بس جی خوش ہو جائے گا۔''

''چل تو پہلے خوشخبری سنا' میں نہیں جاتا اندر۔'' راجو بوری نے کہا۔

''نہیں' ایسے نہیں۔'' اختر نے کہا۔ ''مزہ نہیں آئے گا ایسے' بات ذرا لمبی ہے۔''

''اچھا' ٹھیک ہے' میں آتا ہوں۔'' راجو بوری یہ کہہ کر اندر چلا گیا۔

راجو بوری کے دروازہ بند کرنے کے بعد' اختر نے باورچی خانے کا رخ کیا۔ اس ... چائے کی طلب ہو رہی تھی۔ چائے بناتے ہوئے وہ سوچنے لگا کہ راجو بوری نے ٹھیک ... کہ اسے جوئے اور راجو بوری کو عورتوں نے تباہ کر دیا تھا۔ راجو بوری کے پاس فلیٹ کی ... چابی تھی۔ اس دوسری چابی کا استعمال وہ اکثر و بیشتر کرتا رہتا تھا۔

راجو بوری نے اختر کو بھی اس طرف راغب کرنے کی کوشش کی تھی' لیکن اس نے کبھی ... کر بھی ایسی عورتوں کو نہ دیکھا تھا' وہ کہتا تھا۔

''یہ ٹھیک ہے کہ میں کوئی اچھا آدمی نہیں ہوں۔ قتل' ڈاکا' جوا اور دوسرے جرائم میری ... کا حصہ بن چکے ہیں' لیکن عورت کو میں نے اپنے لیے شجر ممنوعہ کر دیا ہے۔ میری زندگی میں ... ایک عورت آئی تھی۔ میری پہلی اور آخری محبت' وہ مجھے حاصل نہ ہو سکی۔ پھر بھی وہ میری ... کا حاصل ہے۔ تم نہیں جانتے راجو بوری کہ مجھے شبانہ سے کس قدر محبت ہے۔ میں اس کے ... اور عورت کو اپنے نزدیک نہیں دیکھ سکتا۔ میں اس سے بے وفائی نہیں کر سکتا۔''

''اچھا یار' تو بے وفائی نہ کر' میرا ٹائم تو ضائع نہ کر۔ تیرے جیسا آدمی میں نے اپنی ... میں نہیں دیکھا۔ اللہ میاں نے بس ایک ہی پیس بنایا ہے۔'' راجو بوری مذاق کرتا۔

چائے کا کپ لے کر' وہ بند دروازے پر نظر ڈالتا ڈرائنگ روم میں آ گیا۔ کرسی پر بیٹھ ... سامنے ٹانگیں میز پر پھیلا لیں اور اطمینان سے گھونٹ گھونٹ کر کے چائے پینے لگا۔

رہ رہ کر اس کا دھیان سیٹھ اکرم کی طرف جا رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کیسے کیسے لوگ ... دنیا میں' دوسرے کا مال دبا کر بیٹھے ہیں' پھر بھی چین نہیں آتا اور اسے قتل بھی کروا رہے ... ظہ احمد واقعی شریف آدمی ہے۔ اگر شریف نہ ہوتا تو وہ اتنی آسانی سے اپنی خوب صورت ... بیوی کو طلاق نہ دے دیتا۔ یہ سب اس نے ہماری محبت کو دیکھتے ہوئے کیا۔ دو پیاسی ... کو ملوانے کے لیے خود درمیان سے الگ ہو گیا۔

''ہاں' بھائی اختر' دکھاؤ اپنا جمال۔'' راجو بوری کی آواز سن کر وہ چونکا۔

اس نے اپنی گھڑی پر نظر ڈالی اور بولا۔ ''بڑی جلدی آ گئے۔''

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

"ہاں' یہ وقفہ خاص طور سے تمہارے لیے کیا گیا ہے' تمہاری خوشخبری سننے کیلئے۔"

"یار راجو بوری' شبانہ مجھے مل گئی ہے۔" اختر نے خوشخبری سنائی۔

"قسم سے" راجو بوری ایک دم خوش ہو گیا۔ "ابے تو کھڑا ہو' بیٹھا کیا کر رہا ہے۔ گلے لگ..... یہ تو بہت بڑی خوشخبری ہے..... پر کہاں ملی؟"

"آج میں خالد احمد کو ٹھکانے لگانے گیا تھا۔ تجھے میں نے بتایا تو تھا' وہاں مگر پر تقدیر ہی بدل گئی۔ وہ شبانہ کا گھر تھا' خالد اس کا شوہر ہے۔"

"پھر تو تجھے اسے قتل کرنے میں بڑا مزہ آیا ہوگا۔ اسی نے تجھ سے تیری شبانہ کو چھ تھا۔" راجو بوری بولا۔

"لیکن میں نے اسے قتل نہیں کیا' میں اسے قتل نہیں کر سکا اور اچھا ہی ہوا جو میں نے اسے قتل نہیں کیا۔ وہ بڑا شریف آدمی ہے۔ یار' وہ مجھے جانتا تھا۔ اسی کے ذریعے مجھے معلوم ہوا کہ شبانہ ابھی تک مجھے یاد کرتی ہے۔ اس نے میری محبت کی خاطر شبانہ مجھے بخش دی..... یہ دیکھ اس نے اسے طلاق دے دی ہے۔" اختر نے اس کی طرف کاغذ بڑھایا۔

"یہ کیا چکر ہے یار؟" راجو بوری نے کاغذ پر ایک سرسری نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

"چکر کچھ نہیں۔ سیٹھ اکرم نے اس پر بڑے ظلم کیے ہیں۔ وہ خالد احمد کو فیکٹری سے دودھ کی مکھی کی طرح نکال پھینکنا چاہتا ہے۔ اس نے شبانہ پر بھی بری نظر ڈالی تھی۔ اب مجھے اسے ٹھکانے لگانا ہے۔ میں نے خالد احمد سے وعدہ کر لیا ہے۔ یہ طلاق اس نے اسی لیے دی ہے۔"

"تم نہیں جانتے کہ سیٹھ اکرم اپنے سیٹھ کا کتنا یار ہے۔ اگر تم نے اسے قتل کیا تو قیامت آ جائے گی۔" راجو بوری نے اندیشہ ظاہر کیا۔

"اب چاہے کچھ ہو' قیامت آئے یا جائے' مجھے سیٹھ اکرم کا قتل کرنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ میں نے پکا ارادہ کر لیا ہے اور ایسا کر کے میں اپنی جرائم پیشہ زندگی میں پہلی بار نیکی کماؤں گا۔ راجو بوری' مجھے یہ نیکی کمانے دو' یہ میرا آخری جرم ہوگا جسے کر کے میں پشیمان نہیں ہوں گا۔ راجو' اس مجرمانہ زندگی سے میرا دل بھر گیا ہے۔ میری اس دائرے سے نکلنے میں مدد کرو۔ میں تمہارا یہ شہر چھوڑ جاؤں گا' کسی چھوٹے سے غیر معروف شہر میں جا بسوں گا۔ جہاں میں ہوں گا اور میری شبانہ ہوگی۔ اس چھوٹے سے گھر کے آنگن میں پھول سے بچے ہوں گے۔ یہ میرا خواب ہے' اسے پورا ہو جانے دو۔" اختر کہتے کہتے رو پڑا۔

"ارے میرے یار! کیا عورتوں کی طرح آنسو بہانے بیٹھ گیا۔ تو فکر مت کر جیسا تو چاہتا ہے' ویسا کر' میں تیرے ساتھ ہوں۔" راجو بوری نے اسے گلے سے لگاتے ہوئے کہا' تو کہے تو میں سیٹھ اکرم کو ٹھکانے لگا دوں۔"

"نہیں' یہ کام میں خود کروں گا' مجھے اس نیکی سے محروم نہ کر۔" اختر نے کہا۔

☆.....☆.....☆

اختر جب سیٹھ اکرم کے دفتر میں داخل ہوا تو وہ کسی سے فون پر بات کر رہا تھا۔ اس نے اختر کو اندر آتے اور ٹانگیں چوڑی کر کے کھڑے ہوتے اور چاقو کھولتے دیکھا تو دیکھا ان دیکھا نہ کر سکا۔ اس نے فوراً ریسیور رکھ دیا۔ اختر بڑے اسٹائل سے اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر سفاک مسکراہٹ تھی۔ کھلا ہوا چاقو دیکھ کر سیٹھ اکرم کی سٹی گم ہو گئی' لیکن اس نے اپنے حواس پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔ "یہ کیا ہے۔"

"یہ کھلا ہوا چاقو ہے' اب تم مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔"

"میں جانتا تھا کہ وہ بہت شاطر بندہ ہے' بالآخر اس نے تمہیں بے وقوف بنا دیا۔"

"بے وقوف اس نے نہیں بنایا' بلکہ تم ساری دنیا کو بے وقوف بنانے میں مصروف ہو۔ خالد احمد ایک شریف آدمی ہے۔ تم نے اس پر ظلم کیا ہے۔ قتل اسے نہیں تمہیں ہونا چاہیے۔"

"اس جیسا ظالم تو شاید ہی اس دنیا میں کوئی اور ہو' اس نے اپنی بیوی کو سسکا سسکا کر مار دیا۔" سیٹھ اکرم بولا۔

"سسکا سسکا کر مار دیا۔" اختر نے قہقہہ لگایا۔ "کیا خوب ڈراما ہے؟"

"ڈراما نہیں' یہ حقیقت ہے۔ ساری دنیا اس بات سے واقف ہے۔"

"ہاں' ساری دنیا اس بات سے ضرور واقف ہوگی کہ تم نے اس کی بیوی پر بری نظر ڈالی تھی اور اس نے تمہیں جھٹک دیا تھا' یہیں سے تم دونوں دوستوں کے دلوں میں بال پڑا' ٹھیک کہہ رہا ہوں نا میں۔" اختر نے اسے چونکانے کی کوشش کی۔

"اوہ' تو اس نے یہ کہانی سنائی ہے تمہیں اور تم نے اس پر یقین کر لیا۔"

"یقین کیسے نہ کروں۔" اختر نے کہا۔ "تم اس کی بیوی کو سسکا سسکا کر مارنے کی بات کر رہے ہو جبکہ وہ اپنے میکے گئی ہوئی ہے۔"

"میکے گئی ہوئی ہے۔" یہ کہہ کر سیٹھ اکرم نے زور دار قہقہہ لگایا۔ "شاید نجی حسن کا قبرستان اس کا میکہ ہے۔ اسے مرے ہوئے بھی اتنے دن ہو گئے کہ قبر میں اب ہڈیوں کے سوا کچھ نہیں ملے گا۔ تم چاہو تو میں تمہیں اس کا میکہ دکھا دوں۔"

"بکواس مت کرو۔" اختر چیخا۔ اتنی مشکلوں سے تو شبانہ کے ملنے کی آس بندھی تھی لیکن سیٹھ اکرم کس سفاکی سے اس کو توڑے دے رہا تھا۔ وہ اس کی زندگی کی موت کی خبر سنا رہا تھا۔ اختر اب شبانہ سے دوری کا تصور بھی نہ کر سکتا تھا۔ وہ بپھر اٹھا' اس نے خنجر اس کی گردن پر رکھ دیا۔

"اختر' ہوش میں آؤ۔" سیٹھ اکرم کانپ گیا۔

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

"کہو کہ تم جھوٹے ہو' شبانہ مری نہیں' زندہ ہے' یہ بات میں مذاق میں بھی برداشت نہیں کر سکتا۔"

"شبانہ سے تمہارا کیا تعلق ہے؟"

"شبانہ میری زندگی ہے جو مجھ سے چھین لی گئی تھی۔ اب خالد احمد نے میری زندگی میرے حوالے کر دی ہے۔ اس نے اسے طلاق دے دی' یہ دیکھو' طلاق نامہ' اور تم بکواس کیے جا رہے ہو۔ یاد رکھو' تم مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتے۔ میں تمہیں قتل کیے بنا نہیں رہوں گا۔"

"اوہ' تو تم شبانہ کے عاشق ہو' تم سکھر میں اس کے برابر والے گھر میں رہتے تھے۔ کسی ہوٹل وغیرہ میں ملازم تھے اور تمہاری شادی کوشش کے باوجود شبانہ سے نہیں ہو سکی تھی۔ شبانہ کے والدین نے انکار کر دیا تھا؟"

"ہاں' یہ ٹھیک ہے لیکن یہ سب باتیں تم کیسے جانتے ہو؟"

"میں بہت کچھ جانتا ہوں' میں یہ بھی جانتا ہوں کہ یہ طلاق نامہ محض فراڈ ہے۔ جو عورت مر چکی ہو' اسے طلاق دینا کیا معنی رکھتا ہے۔ اب میری سمجھ میں ساری کہانی آ گئی۔ میں جان گیا کہ وہاں کیا ہوا ہو گا۔ لیکن اتنی بات تم بھی جان لو' تم مجھے قتل کر دو یا زندہ چھوڑ دو' تمہیں اب شبانہ کبھی نہیں مل سکے گی' اس لیے کہ وہ اب اس دنیا میں نہیں ہے اور اس کو مارنے والا بھی خالد احمد ہی ہے۔ اس نے شبانہ سے اس کی شدید محبت کا بدلہ بڑے بھیانک انداز میں لیا۔ تمہیں شاید یہ بات نہ معلوم ہو۔ میں' بتاتا ہوں کہ شبانہ شادی کے بعد اپنے میکے کبھی نہ جا سکی۔ اس نے چار سال اسی فلیٹ میں قید تنہائی کاٹی اور اللہ کو پیاری ہو گئی۔"

"سیٹھ اکرم' تم اپنی جان بچانے کے لیے جھوٹ مت بولو۔ میں تمہیں قتل نہیں کروں گا لیکن خدا کے لیے شبانہ کو مت مارو۔ مجھ سے ایسا بھیانک مذاق مت کرو۔"

"میں نے تم سے کہا نا کہ تم مجھے قتل کر دو یا زندہ چھوڑ دو لیکن یہ حقیقت ہے کہ شبانہ مر چکی ہے اور اس کی موت کا ذمے دار بھی یہی ہے۔ اس نے اسے بڑی اذیتیں دے کر مارا ہے۔"

"میں کیسے یقین کر لوں' میرا اعتماد تو اس دنیا سے ہی اٹھ گیا ہے۔"

"یہ کوئی اتنا مشکل کام نہیں' فیکٹری کے کسی بھی ملازم سے پوچھ لو' وہ تمہیں بتا دے گا کہ سیٹھ خالد احمد اکیلے رہتے ہیں' ان کی بیوی کا انتقال ہو چکا ہے۔ جہاں وہ رہتا ہے' وہاں جا کر معلوم کر لو' پڑوسی تمہیں سارا حال سنا دیں گے' پھر بھی یقین نہ آئے تو قبرستان چلو' قبر پر لگا ہوا کتبہ دیکھ لو کتبے پر یقین نہ آئے تو وہ رجسٹر دیکھ لو جس میں مرنے والے کے تمام کوائف درج ہوتے ہیں۔ پھر بھی یقین نہ آئے تو سکھر چلے جاؤ۔ وہاں جا کر اس کے والدین سے پوچھ لو۔ اس سے زیادہ میں اور کیا ثبوت پیش کر سکتا ہوں۔"

"میں کہاں پھنس گیا' میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں کیا کروں؟" اختر نے کہا۔

"تم میری مانو تو اطمینان سے میرے سامنے کی کرسی پر بیٹھ جاؤ۔ اس چاقو کو بند کر کے جیب میں ڈال لو' میں ایک ایک کر کے فیکٹری کے دو' تین ملازمین کو بلاتا ہوں۔ تم خود ان سے بات کر کے تسلی کر لو۔ پھر ہم خالد احمد کے پڑوسیوں سے تصدیق کریں گے۔ پھر قبرستان چلیں گے اور اگر تم کہو گے تو میں تمہارے ساتھ سکھر بھی چلوں گا۔ گویا پوری طرح تصدیق ہونے تک میں تمہارے ساتھ رہوں گا' تمہاری دسترس میں رہوں گا۔" سیٹھ اکرم نے کہا۔ "سب سے پہلے میں ایک ایسے ملازم کو بلاتا ہوں جو شبانہ کے جنازے میں شریک تھا۔ یہ کہہ کر سیٹھ اکرم نے گھنٹی کے بٹن پر پاؤں رکھا۔

☆.....☆.....☆

شام کو جب اختر سینما ہاؤس پہنچا تو اس کے چہرے پر وحشت برس رہی تھی' رنگ زرد تھا۔ وہ ایک ہی دن میں برسوں کا بیمار لگ رہا تھا۔ راجو بوری اسے دیکھ کر پریشان ہو گیا۔ وہ لائن مین لگانا بھول کر اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ "کیا ہوا تجھے میرے یار؟"

"راجو بوری' میں برباد ہو گیا۔ میرے خواب کرچی کرچی ہو گئے۔ شبانہ کے ملنے کی ساری ملیامیٹ ہو گئی۔"

"کیوں' آخر کیا ہوا؟" راجو بوری نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"خالد کے بچے نے میرے ساتھ دھوکا کیا ہے۔ اس فراڈیے کو میں ہرگز نہیں چھوڑوں گا۔" اختر دانت پیس کر بولا۔ "جانتے ہو' اس نے کیا کیا اس نے طلاق کا جھوٹا کاغذ مجھے دکھا دیا۔"

"لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ طلاق تو اس نے صاف لفظوں میں لکھی تھی۔"

"جس کو طلاق دی گئی ہے' اگر وہی دنیا میں موجود نہ ہو' پھر اس طلاق کا کیا فائدہ؟ اس نے جھوٹ بول کر مجھے بہت تکلیف پہنچائی ہے۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہو تم' کیا خالد نے اسے طلاق دینے کے بعد مار دیا؟"

"نہیں' اسے مرے ہوئے ایک سال ہو چکا ہے۔ اس نے محض اپنی جان بچانے کے لیے یہ سب ڈراما کیا۔"

"اس کی موت کا تمہیں کیسے پتا چلا۔" راجو بوری نے پوچھا۔

"سیٹھ اکرم نے بتایا۔"

"کہیں اس میں اس کی کوئی چال نہ ہو؟" راجو بوری نے شبہ ظاہر کیا۔

"نہیں' میں نے تصدیق کر لی ہے۔ آج سارا دن میں نے یہی کیا ہے۔ سیٹھ اکرم میرے ساتھ تھا۔ شبانہ واقعی مر چکی ہے اور اسے مارنے میں خالد کا ہاتھ ہے۔ شبانہ دل سے

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

کبھی خالد کو قبول نہ کر سکی۔ اس نے کھل کر میری محبت کے بارے میں بتا دیا تھا' جس کا بدلہ خالد نے اسے نت نئی اذیتیں دے کر لیا۔ بالآخر وہ سسک سسک کر مر گئی۔ راجو بوری میری شبانہ مر گئی' میری محبت مر گئی اور میں ابھی تک زندہ ہوں۔ مجھے کیوں نہ موت آئی۔" اختر سسک پڑا۔

ہمت سے کام لو اختر' وہ تو تمہارے لیے اسی دن مر گئی تھی' جب تم ساری رات گلی کے موڑ پر اس کے انتظار میں کھڑے رہے تھے اور وہ نہیں آئی تھی۔"

"وہ بے وفا نہیں تھی' وہ مجبور تھی۔" اختر بولا۔

"اس کی مجبوری نے تمہاری زندگی میں اندھیرے بکھیر دیئے' یہ تم کیوں بھولتے ہو۔"

"راجو بوری' ایسی باتیں مت کرو' میرے دل کو مزید مت دکھاؤ' شبانہ اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ مرنے والے کا احترام لازم ہے۔" اختر نے اپنی بھیگی آنکھیں پونچھتے ہوئے کہا۔ "راجو بوری" اس وقت میں تم سے آخری بار ملنے آیا ہوں۔"

"یہ کیا بکواس کر رہے ہو' راجو بوری تڑپ اٹھا۔

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں راجو بوری' میں کسی قیمت پر خالد کو نہیں چھوڑوں گا۔ اس نے اپنا گھر چھوڑ دیا ہے۔ آج وہ فیکٹری بھی نہیں آیا' لیکن سیٹھ اکرم نے مجھے اس کے دو تین ٹھکانے بتا دیئے ہیں۔ میں اسے ڈھونڈ نکالوں گا۔ اب دنیا کی کوئی طاقت مجھے اسے قتل کرنے سے نہیں روک سکے گی۔ یہ میرا آخری قتل ہو گا۔ اس موذی کو مار کر میں اس دنیا سے ایک شیطان کو ختم کر دوں گا' یہ میری پہلی نیکی ہو گی۔ اس نیکی کے بدلے میں پھانسی چڑھ جاؤں گا۔ میرا ضمیر مطمئن ہو جائے گا۔ روز حشر میں شبانہ کے سامنے سر اٹھا کر جا سکوں گا۔ وہ اگر مرتے دم تک مجھے نہ بھلا سکی تو میں بھی آج تک اسے نہ بھلا سکا۔ میں اپنی شبانہ کا اس سے انتقام ضرور لوں گا۔ لاؤ راجو بوری' اپنا ریوالور مجھے دے دو۔"

☆.....☆.....☆

خالد احمد کچھ گنگناتا ہوا گاڑی میں بیٹھا اسے نہیں معلوم تھا کہ موت اختر کی صورت میں سیٹوں کے درمیان چھپی بیٹھی ہے۔ جیسے ہی خالد نے اگنیشن میں چابی گھمائی' اتنی دیر میں اختر سیدھا بیٹھ کر اس کی کھوپڑی سے ریوالور لگا چکا تھا۔

"خالد احمد! یہ ریوالور کی نالی ہے جو تمہاری کھوپڑی سے لگی ہوئی ہے۔ تمہاری کوئی الٹی سیدھی حرکت تمہیں موت کے کنوئیں میں دھکیل سکتی ہے۔ بہتر ہو گا کہ تم خاموشی سے اپنے گھر کا رخ کرو' وہاں بیٹھ کر باتیں ہوں گی۔"

"کیا تم اختر کمال ہو؟"

"ہاں' میں وہی ہوں۔ میں تمہارا دو تین گھنٹے سے انتظار کر رہا تھا۔"

"تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا کہ میں یہاں ہوں گا؟"

"میں تمہاری موت ہوں اور موت کے لیے کسی کو تلاش کر لینا کوئی خاص مشکل کام نہیں۔ ویسے یہ اس بدنام عورت شائستہ جان کا گھر نہیں کیا؟"

"کیا یہ سب تمہیں اکرم نے بتایا ہے؟"

"ہاں' یہی سمجھ لو۔"

"کہاں ہے وہ اس وقت؟"

"اس وقت"۔ اختر ہنسا۔ "اس وقت رات کے دو بجے ہیں۔ ظاہر ہے وہ اپنے گھر میں پرسکون نیند کے مزے لے رہا ہو گا۔"

یہ سن کر خالد احمد نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ کچھ بولا نہیں۔ اسے یہ اندازہ کرنے میں دیر نہ لگی کہ معاملہ الٹ گیا ہے لیکن کس قدر الٹا ہے' اس کا اندازہ اسے نہیں ہو پایا تھا۔ اس نے کم سے کم بولنے میں ہی اپنی عافیت جانی۔

"کیا ہوا تمہیں' سانپ کیوں سونگھ گیا۔ تم نے مجھ سے پوچھا نہیں کہ میں نے سیٹھ اکرم کو قتل کیوں نہیں کیا؟"

"تمہیں موقع نہیں ملا ہو گا۔" خالد احمد نے محفوظ راستہ اختیار کیا۔

"شاباش۔" اختر نے قہقہہ لگایا۔ "تم بہت شاطر آدمی ہو لیکن ایک بات یاد رکھو' چال کا کوئی نہ کوئی توڑ ضرور ہوتا ہے۔ خیر اس بات کو چھوڑو' میں سکھر سے شبانہ کو لے آیا ہوں۔ اسے میں نے ابھی طلاق نامہ نہیں دکھایا ہے' یہ نیک کام تم خود چل کر کرو۔"

یہ بات سن کر خالد احمد کو تہ تک پہنچنے میں دیر نہ لگی لیکن ابھی وہ اپنی زبان سے کچھ کہہ کر پھنسنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے بات کے مزید کھلنے کا انتظار کرنا بہتر سمجھا۔

"تم کچھ بولے نہیں۔" اختر نے اسے خاموش دیکھ کر چھیڑا۔ "ویسے ہوشیار لوگ کم بولنے میں ہی بہتری سمجھتے ہیں۔"

"بھائی اختر' اگر مجھ سے کوئی قصور ہو گیا ہے تو معاف کر دو۔" خالد احمد بولا۔

"نہیں' تم سے بھلا کیا قصور ہو سکتا ہے۔ تم نے تو میرے لیے بڑی قربانی دی ہے۔ میرے لیے اپنی حسین بیوی کو طلاق دے دی ہے۔"

بات ابھی تک واضح نہ ہو پائی تھی۔ اختر بڑے مبہم انداز میں گفتگو کر رہا تھا۔ ایسی گفتگو سے ظاہر ہوتا تھا کہ کچھ ہو گیا ہے لیکن کیا ہو گیا ہے' یہ واضح نہ ہوتا تھا۔

تب خالد احمد نے مکمل سکوت اختیار کر لیا۔ اختر کے چھیڑنے پر بھی وہ ایک لفظ نہ بول لیا۔ یہاں تک کہ گھر آ گیا۔ فلیٹ میں داخل ہو کر اختر نے دروازے کو لاک کیا اور خالد احمد ریوالور سے ڈرائنگ روم میں چلنے کا اشارہ کیا۔ "ادھر چلو۔"

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

خالد احمد نے سعادت مندی سے ڈرائنگ روم کا رخ کیا۔ اختر نے نے کمرے کی تمام بتیاں جلا دیں' کمرا ایک دم جگمگا اٹھا۔

"خالد احمد' شبانہ کی تصویر کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو جاؤ۔" اختر نے حکم دیا۔

خالد احمد نے حکم کی تعمیل کی۔

"شبانہ کی تصویر کو غور سے دیکھو' دیکھو یہ کتنی خوش نظر آ رہی ہے' اس کی آنکھوں میں کس قدر محبت ہے۔ یہ جان گئی ہے کہ آج کیا ہونے والا ہے۔ خالد' کیا تمھیں بھی اندازہ ہے کہ آج کیا ہونے والا ہے؟" اختر نے پوچھا۔

"نہیں' مجھے نہیں معلوم۔" خالد احمد بولا۔

"اچھا' یہ لو۔" یہ کہہ کر اختر نے اس کی کمر پر ایک زوردار لات جمائی۔ خالد احمد اوندھے منہ عین تصویر کے نیچے گرا۔ "اب کچھ اندازہ ہوا کہ کیا ہونے والا ہے تمھارے ساتھ۔"

خالد احمد' دبلا پتلا مخنی سا آدمی تھا۔ ایک لات نے ہی اس پر لرزہ طاری کر دیا۔ وہ کپا بولتا۔ اس کی طرف پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھنے لگا۔

"تم نے مجھے خواب دکھا کر' میری آرزوؤں کا خون کیا ہے۔ تم نے مجھے زندگی کی آس دے کر مصلوب کیا ہے۔ تم انتہائی گھٹیا اور کمینے آدمی ہو۔ تم سمجھتے تھے کہ مجھے دکھوکا دینے میں کامیاب ہو جاؤ گے۔ شبانہ کو مرے ہوئے ایک سال ہونے کو آیا ہے اور تم مجھے طلاق نامہ دے کر اس سے ملاپ کا سراب دکھا رہے تھے۔ تم نے اسے اذیتیں دے کر مار دیا اور خود مظلوم بن گئے۔ اب دیکھو' میں تمھیں کس طرح مارتا ہوں۔"

اختر نے قالین پر اوندھے پڑے ہوئے خالد احمد کو قمیص کا کالر پکڑ کر اٹھایا' اسے سیدھا کھڑا کیا اور پھر اتنے زور سے دھکا دیا کہ ایک دھماکے سے اس کا سر دیوار سے ٹکرایا۔ وہ چکرا کر قالین پر گرا' اس کا سر پھٹ گیا تھا۔

اختر کی آنکھوں میں اب خون اتر آیا تھا۔ اس نے اسے ایک جھٹکے سے اٹھا کر کرسی پر بٹھا دیا اور جیب سے ریشم کی ڈوری نکال کر اسے کرسی سے باندھ دیا۔

پھر اس نے ریوالور صوفے پر اچھال دیا اور جیب سے خنجر نما چاقو نکالا' اسے کھولا اور ہاتھ میں اٹھائے شبانہ کی تصویر کے نزدیک آیا۔ "شبانہ' میں نے قسم اٹھائی تھی کہ میں تمہارے قاتل کو تمھاری نگاہوں کے سامنے ماروں گا۔ اب میں اپنی قسم پوری کر رہا ہوں۔ تم اسے اب تڑپتا ہوا دیکھو۔"

پھر وہ پلٹا۔ اس نے خنجر کی دھار پر انگلی پھیری' اسے چمکایا اور دھیرے دھیرے خالد احمد کی طرف بڑھا۔ اختر کو اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر اس کی روح پر لرزہ طاری ہو گیا۔ اس نے رحم

طلب نگاہوں سے اختر کو دیکھا۔

"اختر' خدا کے لیے مجھے معاف کر دو۔ میں نے واقعی تمھارے ساتھ فریب کیا تھا' تمھارے دل کو دکھایا ہے۔ اس کی تم جو چاہے سزا دے لو۔ تم جتنے پیسے چاہو گے میں تمھیں دے دوں گا۔ بس تم میری جان بخش دو۔ مجھے قتل مت کرو' تمھیں شبانہ کی قسم۔"

"کتے۔" اختر نے اسے ٹھوکر ماری۔ "اپنی ناپاک زبان سے اس معصوم لڑکی کا نام نہ لے۔ میں تجھے کسی قیمت پر نہیں چھوڑوں گا۔ چاہے تو اپنی ساری دولت میرے قدموں میں ڈال دے۔" یہ کہہ کر اختر نے خنجر کی نوک اس کے بازو پر رکھی اور بازو چیتا ہوا کہنی تک لے آیا۔ خنجر کی تیز نوک نے نہ صرف قمیص کو پھاڑ دیا بلکہ جلد میں گہرا زخم ڈال دیا۔ زخم سے خون بہہ نکلا۔ خالد احمد کراہ اٹھا۔

پھر یہ عمل بار بار جسم کے مختلف حصوں پر دہرایا گیا۔

خالد احمد سے جسم کی یہ چیر پھاڑ برداشت نہ ہو سکی۔ وہ ہر نئے زخم پر فلک شگاف انداز میں چیخنے لگا تو اختر نے اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس کر ٹیپ لگا دیا۔

اور عمل جراحی جاری رکھا۔

اختر پر جنون طاری ہو گیا تھا۔ اس کے لہو میں وحشتیں ناچ رہی تھیں۔ دماغ میں انتقام کی آندھی چل رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں دبا خنجر وحشیانہ انداز میں خالد احمد کے جسم کو چھلنی کر رہا تھا۔

وہ ایک نیا زخم لگاتا' اور ہر نئے زخم پر شبانہ کی تصویر کو دیکھتا' جیسے داد طلب کر رہا ہو۔ آخر اسے اپنی محبوبہ کی چار سال کی اذیتوں کا حساب چکانا تھا۔

پھر وہ وقت آیا کہ اس کے جسم پر ایک انچ کی بھی جگہ نہ رہی۔ اب وہ کہاں زخمی لگاتا ہر کیکر لگاتا مخنی سا خالد احمد کب کا جہنم واصل ہو چکا تھا۔ اختر سانپ کو مارنے کے بعد لکیر بھی پیٹ رہا تھا۔

زخم لگاتے لگاتے آخر وہ تھک کر صوفے پر گر گیا اور لمبے لمبے سانس لینے لگا۔

اس کی آنکھوں کے سامنے خیالوں کے چراغ جلا اٹھے' یادوں نے انگڑائی لی۔ محبت کی خوشبو نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

اسے وہ دن یاد آیا جب بارش میں بھیگتی شبانہ اس کے گھر ماچس مانگنے آئی تھی' پھر یک ایک کر کے اس کے ساتھ گزارے خوب صورت لمحے اس کی آنکھوں میں جاگ اٹھے۔ پھر اسے وہ رات یاد آئی' وہ قیامت کی رات جب وہ ہمیشہ کے لیے اس سے بچھڑا تھا۔ اس کے بعد اس کا گھر میں آنا' تصویر کا دیکھنا' خوابوں کا جاگنا اور پھر کرچی کرچی ہونا' سب یاد آتا چلا گیا۔ ایک

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

لال آندھی اس کی آنکھوں کے سامنے سے گزر گئی۔

شبانہ اب اس دنیا میں نہ رہی تھی۔ اب اسے ایسا محسوس ہونے لگا تھا جیسے زندگی بے مصرف ہو گئی ہے۔ اس سے اس کا سب کچھ چھین لیا گیا ہے۔

وہ بہت دیر تک خالی خالی نگاہوں سے شبانہ کی تصویر کو دیکھتا رہا' سوچتا رہا۔ سوچ سوچ کر ہلکان ہوتا رہا۔

پھر اس نے ریوالور صوفے سے اٹھایا اور آنکھیں بند کر کے کنپٹی سے لگا لیا۔

☆.....☆.....☆

راجو بوری نے اگربتیاں سلگا کر کچی قبر کے سرہانے لگائیں۔ گلاب کے پھولوں کی بڑی اور بھاری سی چادر قبر پر پھیلائی اور دو قدم پیچھے ہٹ کر فاتحہ پڑھنے لگا۔

فاتحہ پڑھنے کے بعد اس نے برابر والی قبر کے کتبے پر نظر ڈالی اور دل ہی دل میں مخاطب ہوا۔

"دیکھ میرے یار' تو نے کہا تھا کہ پھانسی کا پھندا چومنے کے بعد جب گہری نیند سو جاؤں تو مجھے شبانہ کی قبر کے برابر دفنا دینا۔ پر تو نے تو مرنے میں کچھ زیادہ ہی تیزی دکھا دی۔ اپنا فیصلہ خود اپنے ہی ہاتھوں کر لیا۔ بہرحال' میں نے تیری وصیت کے مطابق تجھے شبانہ کی قبر کے برابر جگہ دلوا دی ہے۔ اب تو تو خوش ہے نا۔"

یہ کہتے ہوئے راجو بوری کی آنکھوں میں نمی سی آ گئی۔

☆.....☆.....☆

ظالم لمحے

ٹیلی ویژن پر اس وقت کوئی انگریزی فلم آ رہی تھی۔

فلم بہت دلچسپ تھی۔ جمیل صوفے پر لیٹا بڑے انہماک سے سکرین پر نظریں گاڑے فلم دیکھنے میں محو تھا۔

گلشن کچن میں تھی اور برتن وغیرہ سمیٹ رہی تھی۔ چولہے پر چائے کے لیے پانی چڑھا ہوا تھا۔ کچن کی صفائی سے فارغ ہو کر اس نے دو کپ چائے بنائی اور وہ دونوں کپ تھامے کمرے میں داخل ہوئی۔ اس نے چائے میز پر رکھی اور میز جمیل کے نزدیک کر دی۔ پھر آہستہ سے بولی۔

"جمیل، چائے۔"

"یہ چائے کی کوئی نئی قسم ہے کیا؟" جمیل نے ذرا سا اٹھ کر میز سے کپ اٹھایا۔

"ہاں ہے تو نئی۔" گلشن نے ہنستے ہوئے کہا۔ "لیکن یہ صرف اس گھر کی چار دیواری میں ہی دستیاب ہے۔"

"اچھا، فلم دیکھو۔" وہ جانتا تھا کہ اس نے کوئی جواب دیا تو بات بڑھتی جائے گی کیونکہ گلشن کو بولنے سے خاصی دلچسپی تھی اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ اسے بولنے کا موقع دے کر فلم کا مزہ خراب کرے۔

"کیا ہے اس فلم میں، میں نے شروع سے دیکھی نہیں۔"

"بینک ڈکیتی سے متعلق ہے۔ بس یہ دونوں اب بینک کا رخ کرنے والے ہیں۔ ذرا دیکھو، وہاں کیا ہوتا ہے۔"

"ہوگا کیا، یہ لوگ ڈاکہ ڈالیں گے اور مال لوٹ کر چمپت ہو جائیں گے۔" گلشن نے ہنستے ہوئے کہا۔ "بھئی مجھے تو نیند آ رہی ہے، میں چلی سونے۔"

"اچھا ٹھیک ہے، تم چلو، میں فلم دیکھ کر آتا ہوں۔"

گلشن کی چائے ابھی باقی تھی جبکہ جمیل تیز گرم چائے ٹھنڈی سمجھ کر پی گیا تھا۔ گلشن چائے پیتے ہوئے ٹیلی ویژن دیکھنے لگی۔ بینک ڈکیتی اپنے آخری مرحلے میں تھی۔ فلم میں ایک دم سنسنی خیزی پیدا ہو گئی تھی۔ گلشن کی چائے اگرچہ ختم ہو گئی تھی لیکن وہ ایک دو منٹ کے لیے فلم دیکھنے

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

رک گئی تھی۔ وہ دیکھنا چاہتی تھی کہ آیا ڈاکو بینک لوٹنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں یا پولیس کی گرفت میں آ جاتے ہیں۔

ڈاکو بینک لوٹ کر بینک کی عمارت سے نکل رہے ہوتے ہیں کہ پولیس آ جاتی ہے اور گولیوں کا تبادلہ شروع ہو جاتا ہے۔ ایک گولی ڈاکوؤں کے سرغنہ کے سر میں لگتی ہے، وہ لہولہان ہو کر زمین پر گرتا ہے اور اس کی کنپٹی سے بھل بھل خون بہنے لگتا ہے۔

خون دیکھ کر جمیل پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔ وہ دونوں آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیتا ہے۔ اس کے حلق سے گھٹی گھٹی چیخیں نکلنے لگتی ہیں۔

گلشن بھاگ کر ٹیلی ویژن بند کر دیتی ہے اور صوفے پر بیٹھ کر اس کے ہاتھ پکڑ لیتی ہے جو اتنی سی دیر میں برف جیسے ہو گئے تھے۔

"خدا کے لیے جمیل، ذرا حوصلے سے کام لو۔"

"گلشن، میں ٹھیک ہوں۔" جمیل نے اٹھنے کی کوشش کی۔

"لیٹے رہو۔" گلشن بولی۔ "اس طرح کے مناظر دیکھ کر جب تمہاری طبیعت خراب ہو جاتی ہے تو کیوں دیکھتے ہو ایسی فلمیں؟"

"میں اب ٹھیک ہوں۔"

"خاک ٹھیک ہو، تمہارا جسم کانپ رہا ہے۔ ہاتھ پیر ٹھنڈے پڑے ہیں۔ چہرے پر زردی آ گئی ہے۔ تم کہتے ہو، ٹھیک ہوں۔ جمیل تم ٹھیک نہیں ہو۔"

"میں کیا کروں گلشن؟" جمیل بے بسی سے بولا۔ "خود پر بہت کنٹرول کرنا چاہتا ہوں۔ دل کو سمجھاتا ہوں کہ یہ جھوٹے مناظر ہیں۔ ان کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں، پھر بھی میں اپنے آپ میں نہیں رہتا۔"

"جمیل! تمہاری طبیعت روز بروز خراب ہوتی جا رہی ہے۔ اب تمہیں کسی ماہر نفسیات سے رجوع کر لینا چاہیے۔ مان لینا چاہیے کہ تم کسی نفسیاتی مرض میں مبتلا ہو۔ تم کہو تو میں اپنے ڈائریکٹر سے بات کروں گی۔" گلشن بولی۔

"تمہارا ڈائریکٹر کیا کرے گا اس معاملے میں؟"

"میرے ڈائریکٹر کی دوست ہے ڈاکٹر عقیلہ۔ ان سے کہوں گی تو جلد وقت مل جائے گا۔"

"ٹھیک ہے، تم وقت لے لو۔ اب میں بھی عاجز آ گیا ہوں۔"

"اگر کل شام کا وقت مل جائے تو کیا تم دفتر سے جلد اٹھ سکو گے؟"

"ہاں، کیوں نہیں۔ تم مجھے فون کر دینا۔"

"تمہیں اس وقت کچھ گلوکوز وغیرہ دے دوں؟"

"نہیں، اس کی ضرورت نہیں۔" جمیل نے مسکرانے کی کوشش کی۔ "اب میں بہتر محسوس کر رہا ہوں۔"

"چلو پھر سو جاؤ۔" گلشن نے اٹھتے ہوئے کہا۔

☆.....☆.....☆

ڈاکٹر عقیلہ شہر کی ایک مشہور ماہر نفسیات تھی۔ اس سے وقت حاصل کرنا کسی نفسیات کی گتھی کو سلجھانے سے کم نہ تھا۔ ڈاکٹر عقیلہ کے پاس دو مہینے تک کوئی وقت نہ تھا۔ وہ تو بھلا ہو گلشن کے ڈائریکٹر حق نواز کا جنہوں نے اپنی دوستی کا واسطہ دے کر شام کا وقت طے کرا دیا۔ جمیل اس کے فون کرنے پر وقت مقررہ پر کلینک پہنچ گیا۔ گلشن وہاں پہلے سے موجود تھی۔ وہ فیس جمع کرا چکی تھی اور اس نے نمبر بھی لے لیا تھا۔ ڈاکٹر عقیلہ تین چار مریضوں سے زائد نہ دیکھتی تھی۔ اسی وجہ سے اس کی مشورہ فیس بھی زیادہ تھی اور وقت بھی آسانی سے دستیاب نہ تھا۔

جب جمیل گلشن کے ساتھ ڈاکٹر عقیلہ کے کمرے میں داخل ہوا تو اس نے محسوس کیا کہ کمرہ خاصا کشادہ ہے۔ عموماً ڈاکٹروں کے پاس چھوٹے چھوٹے کمرے ہوتے ہیں جس کی وجہ سے ایک گھٹن کا احساس جاگتا ہے۔ یہ کلینک ڈاکٹر عقیلہ نے اپنے بنگلے پر قائم کر رکھا تھا، اس لیے کمرے میں داخل ہوتے ہی ایک طرح کی کشادگی اور گھریلو پن کا سا احساس ہوا۔

ڈاکٹر عقیلہ پینتیس چھتیس سال کی ایک پرکشش عورت تھی۔ خوبصورت، بولتی آنکھیں، گوری رنگت، اپنائیت بھری مسکراہٹ، ایک ایسا دلکش چہرہ جسے دیکھ کر آپ ہی آپ بولنے کو جی چاہے۔ سب کچھ کہہ دینے کی خواہش جاگے۔ شاید اسی لئے وہ ایک کامیاب معالج تھیں۔

"جمیل صاحب! یہ کون ہیں آپ کی؟" ڈاکٹر عقیلہ نے گلشن کی طرف اشارہ کیا۔

"میری بیوی ہیں یہ۔" جمیل نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"جمیل صاحب! کیا میں انہیں باہر جانے کے لئے کہوں؟"

"نہیں، میرے خیال میں اس کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ مجھے مجھ سے بہتر جانتی ہیں۔ ان کی موجودگی سے ہمیں فائدہ پہنچے گا۔"

"چلیے ٹھیک ہے۔" یہ کہہ کر اس نے اپنی ڈائری میں کچھ لکھا۔ پھر سر اٹھا کر بولی۔ "جمیل صاحب! آپ کو کیا شکایت ہے؟"

"شکایت مجھے زمانے سے ہے نہ زندگی سے۔ مجھے شکایت ہے اپنے نفس سے اور نفس سے بھی زیادہ اپنی آنکھوں سے۔"

"کیا کمزور ہو گئی ہیں؟" ڈاکٹر عقیلہ نے ذرا بے تکلفانہ رویہ اختیار کیا۔

"جی نہیں، دھوکہ دیتی ہیں۔"

"آنکھیں دھوکہ دیتی ہیں!" ڈاکٹر عقیلہ نے حیرت کا اظہار کیا۔ "کس طرح؟"

"میں ان آنکھوں سے بڑا عاجز ہوں ڈاکٹر۔ ان آنکھوں نے مجھے خوف میں مبتلا کر دیا ہے۔ میری زندگی اجیرن کر دی ہے۔"

"کیسے آخر، کچھ وضاحت کریں؟"

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

"آنکھوں میں خون اتر آنا تو سنا تھا، یہ خون دکھانا کیا ہوا آخر؟"

تب گلشن نے درمیان میں کچھ بولنا چاہا، شائد وہ جمیل کے جملوں کا مفہوم واضح کرنا چاہتی تھی لیکن ڈاکٹر عقیلہ نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا اور جمیل سے مخاطب ہو کر بولی۔

"جی جمیل صاحب! آپ کی آنکھیں آپ کو خون کس طرح دکھاتی ہیں؟"

"ڈاکٹر ہوتا یوں ہے کہ میری نظریں بیٹھے بیٹھے کسی چیز پر جم جاتی ہیں اور اس چیز سے خون جاری ہو جاتا ہے۔"

"ذرا مثال دے کر سمجھائیں۔"

"فرض کیجئے، میں اپنے دفتر میں اپنی کرسی پر بیٹھا ہوں۔ تو ہوگا یہ کہ کام کرتے کرتے اچانک میری نظر پین ہولڈر پر لاشعوری طور پر جم جائے گی۔ بس پھر چند لمحوں میں ہی پین ہولڈر سے خون بہنا شروع ہو جائے گا۔ میں قلم ہولڈر میں رکھوں گا تو وہ بھی خون میں تر ہو جائے گا۔ بہتے ہوئے خون کو دیکھ کر میرے جسم پر لرزہ طاری ہو جائے گا۔ میں خوف سے تھر تھر کانپنے لگوں گا۔ اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لوں گا اور یوں دفتر میں تماشا بن جاؤں گا۔" جمیل نے افسردگی سے کہا۔

"خون بہنے والا منظر کتنی دیر قائم رہتا ہے؟"

"جب خوف سے میری آنکھیں بند ہو جاتی ہیں، اس کے بعد پھر جب میں آنکھیں کھولتا ہوں تو وہ منظر غائب ہو چکا ہوتا ہے۔"

"جب آپ یہ جانتے ہیں کہ یہ محض فریب نظر ہے، آپ کی آنکھیں آپ کو دھوکہ دے رہی ہیں۔ پھر کانپتے، لرزتے کیوں ہیں؟"

"یہ ٹھیک ہے کہ جب وہ منظر دکھائی دیتا ہے تو مجھے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ میں دیکھ رہا ہوں، محض فریب ہے۔ اس کے باوجود میں خوف سے کانپ اٹھتا ہوں اور اس معاملے میں بے اختیار ہوں۔"

"ایسا پہلی بار کب ہوا؟"

"پہلی بار کب ہوا؟" جمیل سوچ میں پڑ گیا۔ "یہ منظر میں نے اتنے تواتر سے دیکھا ہے کہ اب یاد نہیں آ رہا۔"

"میں بتاتی ہوں، مجھے یاد ہے۔" گلشن فوراً بولی۔

"اچھا ٹھیک ہے، آپ بتائیے۔"

"اصل میں یہ شروع ہی سے فریب نظر میں مبتلا نہیں ہیں۔ پہلے محض خون دیکھ کر ان پر خوف طاری ہو جاتا تھا اور پہلی بار بقرعید کے موقع پر ایسا ہوا۔ یہ ہمیشہ سے بکرے کو خود ذبح کرتے چلے آئے ہیں لیکن پچھلی بقرعید پر جب انہوں نے بکرے کی گردن پر چھری پھیری اور بکرے کی گردن سے فوارے کی طرح خون نکلا تو ان کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو گئے۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ یہ چھری چھوڑ کر وہاں سے بھاگے۔ اس بکرے کو پھر قصائی نے ذبح کیا۔"

"یہ واقعہ آپ کو یاد نہیں؟" ڈاکٹر عقیلہ نے جمیل سے سوال کیا۔

"جی، اب یاد آ گیا ہے۔" جمیل نے کہا۔ "لیکن میرا خیال ہے کہ خون سے خوفزدہ ہونے کی ابتداء اس سے بھی پہلے ہوئی۔"

"وہ کیسے؟"

"ایک مرتبہ شیو بناتے ہوئے بلیڈ سے چہرے پر کٹ لگا۔ کٹ ذرا گہرا تھا۔ اپنے چہرے پر خون دیکھ کر میرے ہاتھوں میں لرزش سی پیدا ہو گئی۔ میں نے گھبرا کر فوراً تولیے سے چہرہ صاف کر لیا۔"

"تو گویا خوف کی ابتداء پہلے اصل خون دیکھنے سے ہوئی۔ اس کے بعد آپ آہستہ آہستہ فریب نظر میں مبتلا ہوتے گئے۔ کیا میں ٹھیک کہہ رہی ہوں؟"

"جی بالکل۔"

"ویسے خون ان سے دیکھا نہیں جاتا۔ کل رات ہی ٹیلی ویژن پر انگریزی فلم دیکھتے ہوئے ان کی حالت خراب ہو گئی تھی۔ انہوں نے ایک ڈاکو کے سر سے بہتا ہوا خون دیکھ لیا تھا۔" گلشن نے بتایا۔

"اچھا، ایک طرف اصل خون دیکھ کر خوف پیدا ہوتا ہے تو دوسری طرف خون خود پیدا کر کے خوف میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔"

"ڈاکٹر صاحب! یہ بہت بری طرح ڈر جاتے ہیں۔ بعض اوقات تو چیخنے لگتے ہیں۔ اس خوف کی وجہ سے ان کی صحت دن بہ دن گرتی جا رہی ہے۔" گلشن بولی۔

"اچھا، یہ بتایئے جمیل صاحب! جب آپ فریب نظر میں مبتلا ہوتے ہیں تو کوئی خیال ذہن میں ہوتا ہے؟"

جمیل نے جواب دینے سے پہلے چند لمحے سوچا، پھر بولا۔ "جی نہیں، کوئی خیال نہیں ہوتا۔ ذہن ایک دم خالی ہوتا ہے۔"

"سوچ کر جواب دیجئے۔"

"جی، سوچ کر ہی جواب دیا ہے۔ اس فریب نظر کے پیچھے کوئی خیال نہیں ہوتا۔ بس ایسا بیٹھے بیٹھے، لیٹے لیٹے ہو جاتا ہے۔ اس کا کوئی وقت مقرر نہیں۔ کوئی جگہ مقرر نہیں۔ میں نے اپنے بیڈروم میں ایک خوبصورت آبشار کی تصویر لگا رکھی تھی۔ وہ تصویر مجھے بہت پسند تھی۔ اسے میں لیٹے لیٹے غور سے دیکھا کرتا تھا۔ پھر ایک دن اسے دیکھتے دیکھتے خوبصورت آبشار کا خون ہو گیا۔ پھر کئی مرتبہ ایسا ہوا، اس تصویر کو دیکھ کر مجھے دورے پڑنے لگے تو گلشن نے اسے بیڈروم سے نکال دیا۔ ایک دن ہمارے ایم ڈی صاحب اپنی گاڑی میں دفتر آتے ہوئے ایک بہت اہم فائل بھول آئے۔ وہ فائل اتنی کانفیڈینشل تھی کہ میرے اور ایم ڈی کے علاوہ اسے کوئی اور ہاتھ نہیں لگا سکتا تھا۔ ایم ڈی نے مجھے بلا کر گاڑی کی چابی میرے حوالے کی اور کہا کہ وہ فائل جا کر لے آؤں۔ میں

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

چابی لے کر نیچے آیا۔ وہ فائل اگلی سیٹ پر رکھی تھی۔ دروازہ کھول کر میں نے فائل اٹھالی لیکن میری نظریں اسٹیئرنگ پر جم گئیں۔ اسٹیئرنگ سے خون ٹپک رہا تھا۔ سیٹ پر بھی خون تھا۔ میں اس خون کو دیکھ کر خوف سے چیختا ہوا دفتر کی طرف بھاگا اور ایم ڈی کے کمرے میں آ کر دم لیا۔ فائل میں نے ان کے حوالے کی۔ میری حالت دیکھ کر وہ پریشان ہو گئے۔ گھبرا کر بولے۔

"کیا ہوا جمیل صاحب؟"

"سر، میں نے آپ کی گاڑی میں خون دیکھا ہے۔" میں نے انہیں بتایا۔

خون کا ذکر سن کر ان کے ہوش اڑ گئے۔ وہ بھاگے بھاگے نیچے گئے۔ وہاں گاڑی میں خون ہوتا تو انہیں نظر آتا۔ میں اپنی بدحواسی میں گاڑی کھلی چھوڑ آیا تھا۔ انہوں نے گاڑی بند کی اور اوپر دفتر میں آ گئے اور قدرے خفگی سے بولے۔

"بھئی جمیل صاحب! آپ کو کیا ہو گیا ہے، وہاں تو کوئی خون نہیں۔"

تب میں نے انہیں اپنی آنکھوں کے بارے میں بتایا کہ یہ کس طرح مجھے دھوکہ دے رہی ہیں، کیسے کیسے منظر دکھا رہی ہیں۔ ہمارے ایم ڈی صاحب نے ساری بات سن کر مسئلے کو بڑے آسان انداز میں لیا۔ ہنستے ہوئے بولے۔

"بھئی حد ہو گئی، کیا فضول بات ہے؟"

"اور واقعی یہ ہے بھی فضول بات۔ جو بھی سنتا ہے اسے میرا وہم سمجھ کر ٹال جاتا ہے۔ میں اصرار کروں تو مذاق اڑانے لگتا ہے لیکن گلشن جانتی ہے کہ میں کس عذاب میں مبتلا ہوں۔ ڈاکٹر عقیلہ آپ کا مجھے پتا نہیں کہ آپ میرے بارے میں کیا سوچ رہی ہیں۔ اندر ہی اندر میرے اوپر ہنس رہی یا واقعی مجھے بیمار سمجھ کر میرا علاج تجویز کرنا چاہتی ہیں۔"

"جناب جمیل صاحب! کوئی ڈاکٹر کبھی اپنے مریض پر نہیں ہنس سکتا۔ میں نے آپ کا علاج شروع کر دیا ہے۔ یہ بات چیت علاج کے زمرے میں ہی آتی ہے۔ اس تحلیل نفس کے ذریعے ہی آپ اس فریب سے چھٹکارا پا سکتے ہیں۔ جمیل صاحب! آپ کرتے کیا ہیں؟"

"اسمگلنگ بہرحال نہیں کرتا۔" جمیل ہنستے ہوئے بولا۔

"ویسے اسمگلنگ کرنے کو جی چاہتا ہے؟"

"جی بالکل نہیں۔" جمیل نے سنجیدگی سے کہا۔ "میں ایک باعزت پیشے سے منسلک ہوں اور ایک بڑی فرم میں چیف اکاؤنٹینٹ ہوں۔ مجھے جتنی تنخواہ ملتی ہے، اس میں ہم دونوں میاں بیوی کی گزر بسر بڑے آرام سے ہو جاتی ہے۔ ہمارے گھر میں اللہ کا دیا سب کچھ ہے، ویسے میری بیوی بھی ملازمت کرتی ہیں۔"

"جمیل صاحب! آپ کے کتنے بچے ہیں؟"

"ایک بھی نہیں۔" جمیل نے گلشن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "غالباً آپ کا اگلا سوال یہ ہوگا کہ ہماری شادی کو کتنا عرصہ ہوا؟"

"جی بالکل۔"

"ہماری شادی کو ابھی صرف دو سال ہوئے ہیں۔"

"خاصی دیر سے کی شادی آپ نے۔"

"جی ہاں۔" جمیل نے گلشن کو معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"لو میرج؟" ڈاکٹر عقیلہ نے پوچھا۔

"جی نہیں، میں شادی سے پہلے محبت کا قائل نہیں۔ اصل محبت وہ ہوتی ہے جو شادی کے [illegible]رہو۔"

"اور وہ محبت آپ دونوں کے درمیان موجود ہے؟"

"جی بلاشبہ۔"

"آپ بڑے خوش قسمت ہیں مسٹر جمیل۔"

"جی ہاں، بیوی کے معاملے میں، میں واقعی خوش قسمت ہوں لیکن اس وہم نے میری [illegible] اجیرن کر دی ہے۔ میں اس خوف سے کہیں آتا جاتا بھی نہیں۔"

"مسٹر جمیل! آپ ٹھیک ہو جائیں گے لیکن ٹھیک ہونے میں کچھ وقت لگے گا اور اس [illegible] میں آپ کو میری مدد کرنا ہوگی۔"

"جی، میں حاضر ہوں۔ بتائیے مجھے کیا کرنا ہوگا؟"

"یہ یقین پیدا کرنا ہوگا کہ آپ ٹھیک ہو جائیں۔ آپ جب تک اندر سے ٹھیک ہونے [illegible] لیے آمادہ نہیں ہوں گے، تب تک آپ کبھی ٹھیک نہیں ہو پائیں گے۔ کیا آپ یقین کی قوت [illegible] بارے میں کچھ جانتے ہیں۔ کیا آپ نے اس سادہ لوح دیہاتی کا قصہ سنا ہے جسے بسم اللہ پر [illegible] یقین ہو گیا تھا اور اس نے بغیر تیرے دریا پار کر لیا تھا؟"

"جی نہیں۔" جمیل نے جواب دیا۔

"دیہات کی ایک مسجد میں تبلیغ پر نکلے ہوئے ایک مولوی صاحب بسم اللہ کی فضیلت پر [illegible] کر رہے تھے۔ انہوں نے بسم اللہ کے فضائل بیان کرتے ہوئے جوش خطابت میں یہاں تک [illegible] دیا کہ اگر کوئی شخص بسم اللہ کہہ کر دریا میں پاؤں ڈالے تو وہ بغیر تیرے پیدل چلتا ہوا دریا پار کر [illegible] ہے۔ یہ بات مولوی صاحب نے اتنے اچھے انداز میں کہی کہ ایک دیہاتی کے دل پر نقش ہو [illegible]۔ وہ دیہاتی دریا پار کر کے ان کا وعظ سننے آیا تھا۔ وعظ سن کر واپس لوٹا تو دریا کے کنارے کشتی کو [illegible] اس نے سوچا، کشتی کی واپسی کا انتظار بیکار ہے۔ اس نے بسم اللہ کہہ کر دریا میں پاؤں رکھا [illegible] مزے سے چلتا ہوا دریا پار کر گیا۔ دوسرے دن وہ پھر مولوی صاحب کا وعظ سننے آیا۔ وہ [illegible] خوش تھا۔ وہ مولوی صاحب کے لئے گڑ کی بھیلی لے کر آیا تھا۔ مولوی صاحب نے گڑ کی بھیلی [illegible] کر وہاں بیٹھے ہوئے حاضرین میں تقسیم کر دی اور اس سے پوچھا کہ یہ گڑ کی بھیلی وہ کیوں لے کر [illegible]۔ اس دیہاتی نے ساری روداد بیان کی کہ کس طرح اس نے ان کا وعظ سن کر بسم اللہ پر یقین

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

کر کے دریا پار کیا۔ یہ سن کر مولوی صاحب کو بڑی حیرت ہوئی۔ انہوں نے کہا کہ اچھا ذرا میرے ساتھ دریا پر چلو۔ میرے سامنے دریا پار کر کے دکھاؤ۔ مولوی صاحب اور وہ دیہاتی دریا پر آئے۔ اس دیہاتی نے بڑے یقین سے بسم اللہ کہہ کر دریا میں پاؤں رکھا اور چلتا ہوا دوسرے کنارے پہنچا۔ دوسرے کنارے پہنچ کر جب دیہاتی نے پلٹ کر دیکھا تو انہیں تذبذب کے عالم میں پایا۔ اس نے دوسرے کنارے سے انہیں دریا پار کرنے کا اشارہ کیا۔ مولوی صاحب نے بسم اللہ کر ڈرتے ڈرتے دریا میں پاؤں رکھا اور دریا کے اندر..... وہ تو خدا کا شکر کہ وہ تیرنا جانتے ورنہ زندگی، موت میں تبدیل ہو جاتی۔" قصہ بیان کر کے ڈاکٹر عقیلہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہوئی۔ جمیل بہت توجہ سے اس کی بات سن رہا تھا۔ وہ پھر گویا ہوئی۔ "آپ کو اپنے اندر اس دریا کا سا یقین پیدا کرنا ہوگا۔ پھر کہیں آپ اس فریب نظر سے چھٹکارا حاصل کر سکیں گے۔"

"لیکن میرے اندر یہ یقین کون پیدا کرے گا؟" جمیل نے پوچھا۔

"یہ یقین میں آپ کے اندر پیدا کروں گی۔ میں آپ کو اس عذاب سے نجات دلاؤں گی۔ اب آپ تین دن کے بعد آئیے گا۔ اسی وقت، آئندہ تنہا آئیے گا۔ اب جائیے، اگلی ملاقات تک کے لئے خدا حافظ۔" ڈاکٹر عقیلہ نے یہ کہہ کر گھڑی دیکھی۔

"جی بہتر۔" جمیل اٹھتے ہوئے بولا۔ گلشن نے ڈاکٹر عقیلہ کا شکریہ ادا کیا اور پھر دونوں کمرے سے باہر آ گئے۔

☆.....☆.....☆

گلشن کی امی کو اپنے داماد کی بڑی فکر تھی۔ وہ اب تک کتنے ہی تعویز گنڈے اس کے لئے لا چکی تھیں لیکن کوئی افاقہ نہ ہوا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ کسی نے جمیل پر کچھ کرا دیا ہے اور اسی سلسلے میں انہیں اپنی خالہ زاد بہن پر شبہ تھا کیونکہ وہ ان تعویز گنڈوں کی ماہر تھی۔ گلشن ان کی سب سے بڑی لڑکی تھی۔ گلشن کے علاوہ چار لڑکیاں اور تھیں جو سب کی سب دوسرے شہروں میں تھیں۔ ایک گلشن ہی ایسی تھی جو ان کے پاس تھی۔ گلشن بڑی ہونے کے باوجود سب سے آخر میں بیاہی گئی تھی۔ گلشن کی خالہ اپنے بیٹے سے اس کا رشتہ چاہتی تھی جو گلشن کی امی کو کسی طرح منظور نہ تھا اور وہ بھی کس طرح۔ ان کا لڑکا عامر ایک تو صرف میٹرک پاس تھا اور دوسرے اس کے لچھن اچھے نہ تھے۔ مزاج کا بڑا تیز تھا۔ آئے دن گلی میں دنگا فساد بپا کیے رکھتا۔ گلشن کی امی ٹس سے مس نہ ہوئیں۔ آخر تھک ہار کر وہ جادو ٹونے پر اتر آئیں۔ گلشن کے کمرے سے تعویز نکلنے لگے۔ بقول گلشن کی امی کے یہ تعویز اس لیے کیے گئے تھے کہ گلشن کے رشتے آنا بند ہو جائیں۔ اتفاق کی بات، ہوا بھی ایسا ہی۔ کوئی رشتہ آتا بھی تو وہ گلشن کو چھوڑ کر دوسری بہنوں کو پسند کر جاتے۔ گلشن کی امی نے ان تعویزوں کے بڑے توڑ کرائے لیکن کوئی اثر نہ ہوا۔ بالآخر تنگ آ کر انہوں نے چھوٹی لڑکیوں کے رشتے منظور کرنا شروع کیے اور اس طرح ایک ایک کر کے گلشن کی چاروں بہنیں اپنے گھروں کی ہو گئیں۔ گھر کے آنگن میں ایک گلشن رہ گئی۔ اس گلشن کے پھول کسی طرح کھلتے ہی نہ تھے۔ امی اس

کے غم میں گھلی جا رہی تھیں کہ جمیل سعودی عرب سے واپس آ گیا۔ وہ ان کا دور کا رشتے دار تھا۔ سعودی عرب سے واپسی پر وہ دو تین دن ان کے گھر رہا۔ پھر لاہور چلا گیا۔ ان دو تین دنوں میں جمیل گلشن کی امی کو بہت پسند آیا۔ انہوں نے جمیل کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دیا۔ جب وہ گلشن کی طرف سے اپنی فکرمندی کا اظہار کر رہی تھیں تو ان کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔ جمیل نے اس رشتے کو فوراً قبول کر لیا اور نہ صرف یہ کہ اس نے گلشن سے شادی کر لی بلکہ لاہور چھوڑ کر کراچی آ گیا تھا۔ اس طرح جمیل دیر سے آیا تھا لیکن اچھا آیا تھا۔

اب اسی اچھے جمیل کو یہ عجیب و غریب بیماری لگ گئی تھی۔ گلشن کی امی کو سو فیصد یقین تھا کہ یہ سب کیا دھرا اسی ڈائن سعیدہ کا ہے۔ اگرچہ عامر کی شادی ہو چکی تھی اور اس کے کئی بچے بھی ہو گئے تھے لیکن سعیدہ کے کلیجے کی آگ ابھی تک ٹھنڈی نہیں ہوئی تھی۔ وہ ہر آئے گئے سے جمیل کی بیماری کا ذکر کرتیں۔ ہر شخص اپنے تجربے اور عقل کے مطابق مشورہ دیتا۔ ان مشوروں میں کسی نہ کسی عامل سے ملنے پر زیادہ زور دیا جاتا۔ گلشن کی امی جب تعویز گنڈے، ٹونے ٹوٹکے کر کے تھک گئیں تو پھر انہوں نے شہر کے ایک مشہور عامل کے پاس جمیل کو لے جانے کا ارادہ کیا اور آج وہ اسی ارادے سے گلشن کے گھر آئی تھیں۔

جمیل کی ملاقات کل ہی ڈاکٹر عقیلہ سے ہوئی تھی۔ دو دن کے بعد پھر اس کے پاس جانا تھا۔ جمیل اور گلشن دونوں ہی اس کی شخصیت سے متاثر ہوئے تھے۔ جمیل کا خیال تھا کہ وہ ضرور اسے اس عذاب سے نجات دلا دے گی۔

جب ساس نے کسی عامل کے پاس چلنے کا ذکر چھیڑا تو وہ مروتاً انہیں منع نہ کر پایا۔ گلشن نے ڈاکٹر عقیلہ کا ذکر چھیڑ کر اسے اپنے ارادے سے باز رکھنے کی کوشش بھی لیکن انہوں نے ایک نہ سنی۔ وہ گلشن کو ستانے لگیں۔ "اری بے وقوف! یہ کام ڈاکٹروں کا نہیں ہے، عاملوں کا ہے..... عاملوں کا..... جادو کا اثر بھلا ڈاکٹرنی کس طرح دور کرے گی۔ میں نے عامل اسرار ندیمی سے بات کر لی ہے۔ انہوں نے جمیل کو بلایا ہے۔"

"تمہیں معلوم ہے اماں کہ میں ان چیزوں کی قائل نہیں ہوں۔"

"قائل نہ تھی، تبھی تو تیری شادی اتنے عرصے تک نہ ہو سکی۔"

"شادی، بیاہ کا اماں ایک وقت مقرر ہے۔ لاکھ کوشش کر لو، وقت سے پہلے نہیں ہوتی۔ جب ہونی ٹھہری تو کوئی نہ روک سکا۔ خالہ سعیدہ کے جادو ٹونے سب دھرے رہ گئے۔"

"کہاں دھرے رہ گئے۔ ارے یہ سب اسی کمینی کا ہی تو کیا دھرا ہے۔ خدا غارت کرے اسے۔ اس سے تو میری کوئی خوشی دیکھی نہیں جاتی۔ میں تو جمیل کو لے جا کر رہوں گی۔ تو اب کتنی مخالف کر، کیوں جمیل، تم چلو گے نا میرے ساتھ؟"

"جی امی۔ میں آپ کے ساتھ ضرور چلوں گا۔ ڈاکٹر کا علاج تو چل ہی رہا ہے۔ اللہ والے سے بھی مل کر دیکھ لینا چاہیے۔ آخر اس میں حرج ہی کیا ہے۔" جمیل نے گلشن کی طرف مسکرا

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

کر دیکھا۔

"آپ خوامخواہ اماں کے چکر میں پڑ گئے۔" گلشن سنجیدگی سے بولی۔

"اری میں تیرے ہی بھلے کی بات کر رہی ہوں اور تو الٹا ناراض ہو رہی ہے۔"

"اماں اسے بکنے دیں، میں آپ کے ساتھ چلوں گا۔ بتائیے کب چلنا ہے؟" جمیل نے گلشن کی امی کی طرف داری کی۔

"آپ کی انہی فرمانبرداریوں نے ہی تو گرویدہ بنا رکھا ہے اماں کو۔" گلشن نے جل کر کہا۔ "ٹھیک ہے جائیں جہاں جانا ہے۔"

اسرار ندیمی بڑے پراسرار عامل تھے۔ ستارہ شناسی سے بندہ شناسی تک تمام علوم سے بہرہ ور تھے۔ بس بے بہرہ تھے تو اللہ کی ذات سے..... بیماریوں کا ایسا عجیب و غریب علاج بتاتے کہ بندہ چکرا کر رہ جاتا۔ اس کے باوجود ان کی رہائش گاہ پر خوب رش رہتا تھا۔ اب وہ پہلے سے وقت دیئے بغیر کسی سے نہیں ملتے تھے۔

گلشن کی امی وقت مقررہ پر جمیل کو لے کر عامل اسرار ندیمی کی رہائش گاہ پر پہنچ گئیں۔ گلشن بھی طوعاً کرہاً ساتھ آ گئی تھی۔ وہ تینوں انتظار کرنے والوں کی قطار میں بیٹھ گئے۔ کوئی پندرہ منٹ کے بعد جمیل کا نام پکارا گیا۔

جمیل کا نام سن کر تینوں اٹھے لیکن دروازے میں داخل ہونے سے پہلے داروغہ زنداں نے روک دیا۔ "مریض کے ساتھ ایک عورت اندر جا سکتی ہے۔"

"گلشن تو ادھر بیٹھ، میں جمیل کے ساتھ اندر جاتی ہوں۔" گلشن کی امی نے خود ہی فیصلہ دے دیا۔ ویسے گلشن خود بھی اندر جانا نہیں چاہتی تھی۔

اندر پہنچ کر گلشن کی امی نے بڑے ادب سے عامل اسرار ندیمی کو سلام کیا۔ جب کہ جمیل بڑی خاموشی سے ان کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ سرخ و سفید اسرار ندیمی نے دونوں پر سرسری سی نظر ڈالی اور بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ دونوں باادب بیٹھ گئے۔

"مسئلہ بیان کرو۔" عامل صاحب گویا ہوئے۔

"شاہ جی! یہ میرے داماد ہیں۔ ان پر میری خالہ زاد بہن نے جادو کرا دیا ہے۔" گلشن کی امی نے داستان شروع کی۔

انہوں نے گلشن کی شادی سے پہلے اور شادی کے بعد کی تمام روداد عامل صاحب کے گوش گزار کی۔ پھر جمیل کی بیماری کے بارے میں بتایا۔

ساری کہانی سن کر اسرار ندیمی نے پاس رکھی ہوئی ایک سلیٹ اٹھائی اور چاک سے کچھ لکھنے لگے۔ پھر تھوڑی دیر بعد سر اٹھایا۔ اپنی سرخ سرخ آنکھوں سے جمیل کو گھورا، پھر بولے۔

"میاں صاحبزادے! پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں۔ تم ٹھیک ہو جاؤ گے۔ تمہاری ساس کا خیال صحیح ہے۔ تم پر واقعی اثر ہے اور یہ سب کیا دھرا تمہاری خالہ کا ہے۔ میں ایک تعویز لکھ

دیتا ہوں۔ اس سے سحر کا توڑ ہو جائے گا اور تمہیں چالیس دن تک ایک عمل کرنا ہوگا۔ کر لو گے میاں؟"

"جی کر لوں گا۔" جمیل نے ان کی سرخ آنکھوں میں جھانکنے سے پرہیز کیا۔

"چالیس دن تک، چالیس سیڑھیاں روز اترنا اور چڑھنا ہیں..... میاں کس فلور پر رہتے ہو؟"

"تھرڈ فلور پر۔" جمیل نے جواب دیا۔

"بس پھر چالیس سیڑھیاں گن کر نشان لگا لینا۔ یہ عمل رات کے بارہ بجے شروع کرنا ہوگا اور سیڑھیاں الٹے ہو کر اترو گے اور چڑھو گے۔ سمجھ گئے میاں؟" انہوں نے پھر گلشن کی امی سے مخاطب ہو کر کچھ اور الٹی سیدھی ہدایات جاری کیں اور پھر جانے کی اجازت دیدی۔

ان کے اٹھنے سے پہلے عامل صاحب نے قریب رکھے ہوئے ایک شیشے کے مرتبان میں کچھ ڈال کر ایک تہ کیا ہوا کاغذ نکالا۔ اس پر کچھ پڑھ کر پھونکا اور گلشن کی امی کے حوالے کر دیا۔ گلشن کی امی نے بڑی احتیاط سے اس تعویز کو اپنے پرس میں رکھ لیا اور بڑے ادب سے سلام کر کے کمرے سے نکل آئیں۔ باہر میز پر رکھے ہوئے ایک خوبصورت ڈبے میں انہوں نے ڈھائی سو روپے ڈالے۔ عامل صاحب کی فیس سوا سو روپے سے لے کر پانچ سو روپے تک تھی۔ اب یہ دینے والے کی مرضی پر منحصر تھا کہ وہ سوا سو دیتا ہے یا ڈھائی سو یا پانچ سو۔ گلشن کی امی نے درمیانہ راستہ اختیار کیا۔

یہ ڈھائی سو روپے کا تعویز چاندی کے خول میں بند کر کے جمیل کے گلے میں ڈال دیا گیا۔ رات کے بارہ بجے گلشن کی امی نے اپنی نگرانی میں اسے سیڑھیاں اتروائیں اور چڑھوائیں۔ الٹی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے ایک بار تو وہ پھسلتے پھسلتے بچا۔

جب صبح گلشن کی امی چلی گئیں تو سب سے پہلے گلشن نے جمیل کے گلے سے تعویز کھینچ کر الماری میں پھینکا اور اپنی امی کی ضعیف الاعتقادی پر خوب بڑبڑاتی رہی۔ جمیل بڑی خاموشی سے اس کی بڑبڑاہٹ سنتا رہا اور دفتر جانے کے لیے تیار ہوتا رہا۔

تھوڑی دیر میں گلشن کے دفتر کی گاڑی آ گئی۔ گلشن کے جانے کے بعد جمیل نے بھی اپنے دفتر کا رخ کیا۔

☆.....☆.....☆

دوپہر کو جب کھانے سے فارغ ہو کر جمیل چائے پی رہا تھا تو ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ جمیل نے کپ پرچ میں رکھ کر ریسیور اٹھایا۔

"جی۔" جمیل نے کہا۔

"جمیل صاحب سے بات ہو سکے گی جناب؟" ادھر سے کسی نے دریافت کیا۔

"میں بول رہا ہوں۔" جمیل نے تصدیق کی۔

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

"اوہ معاف کیجئے گا، میں آپ کی آواز پہچان نہیں سکا۔ اصل میں کئی سالوں بعد سنی نا آپ کی آواز۔"

"کون صاحب بات کر رہے ہیں؟" جمیل نے اس کی آواز پر غور کرتے ہوئے پوچھا۔

"کمال ہے جمیل صاحب! آپ مجھے بھول گئے، اپنے محسن کو بھول گئے۔"

"محسن؟" جمیل حیرت سے بولا۔ "میرا کوئی ایسا محسن نہیں جس کی آواز میں نہ پہچانتا ہوں۔"

"کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ کا دعویٰ غلط ہو جائے۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔ آپ میرے دعوے، کو جھوٹا ثابت کریں، اپنا نام بتائیں۔"

"نام تو میں نے اس وقت بھی نہیں بتایا تھا جب میں نے آپ پر احسان کیا تھا تو اب کیا بتاؤں گا۔ چلیے کچھ اشارے کرتا ہوں۔"

"اچھا بھائی محسن خان، ٹھیک ہے اشارے کرو۔"

"لاہور"

"پیارے لوگوں کا پیارا شہر ہے جس نے لاہور نہیں دیکھا، وہ پیدا ہی نہیں ہوا۔"

"گلبرگ۔"

"لاہور کے ایک مشہور علاقے کا نام ہے۔"

"اب بھی یاد نہیں آیا؟" ادھر سے حیرت ظاہر کی گئی۔

"جی نہیں جناب۔"

"اچھا ایک نام لیتا ہوں، ذرا غور سے سنیئے گا۔ وہ نام ہے نزہت۔"

نزہت کا نام سن کر جمیل کی رگوں میں اندھیرا اترنے لگا۔ اس نام سے بہت تلخ یادیں وابستہ تھیں۔ اس طرف سے جو بھی بول رہا تھا، وہ اس کے ماضی سے واقف تھا لیکن جمیل اپنے ماضی کو بھلا چکا تھا اور بھولا رہنا چاہتا تھا۔

چند لمحے تک جب ریسیور پر کوئی آواز نہ آئی تو ادھر کوئی ہنسا۔ "جمیل صاحب! اب بھی پہچانے یا نہیں؟"

"یہ کیا بکواس ہے؟" جمیل نے غصے سے کہا۔ "بند کریں یہ بکواس، میں کسی نزہت کو نہیں جانتا۔"

"احسان فراموش جو ٹھہرے۔" ادھر سے کسی نے طنز کیا۔ "تو آپ نہیں جانتے نزہت کو۔ ٹھیک ہے اس نے آپ کے ساتھ دھوکہ کیا لیکن وہ کوئی بھلائی جانے والی چیز تو نہیں۔ ایسی صورت میں جب کہ آپ نے بھی کوئی کسر نہ اٹھا رکھی ہو۔ اس نے دھوکہ دیا تو آپ نے اسے صفحہ ہستی سے مٹا دیا۔ اب آپ کہتے ہیں کہ آپ کسی نزہت سے واقف نہیں۔ کمال ہے، اپنی بے وفا بیوی کو کون بھول سکتا ہے!"

"اوہ!" تب اچانک جمیل نے اس آواز کو پہچان لیا۔ وہ واقعی اس کا محسن تھا۔ اسی کی

بات پر تو وہ سب کچھ ہوا تھا ورنہ نزہت نہ جانے کب تک اس سے بے وفائی کرتی رہتی اور وہ بے وفا کی پتی سمجھ کر پوجے جاتا لیکن یہ وقت اس محسن کو پہچاننے کا نہیں تھا۔ بات تین چار سال پرانی ہو گئی تھی۔ اب وہ کسی جھنجٹ میں نہیں پڑنا چاہتا تھا، لہٰذا اس نے بغیر کچھ جواب دیئے ٹیلی فون بند کر دیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ابھی فوراً ہی دوبارہ اس کا ٹیلی فون آئے گا لیکن ایسا کچھ نہ ہوا۔

جمیل نے پسینے میں بھیگے چہرے کو تولیے سے صاف کیا۔ اس ٹیلی فون کال نے اس کے ماضی کو بلا کر رکھ دیا۔ یہ شخص کہاں سے بول رہا تھا۔ لاہور سے بول رہا تھا تو اس کو اس کا ٹیلی فون نمبر کہاں سے ملا۔ اگر کراچی سے بول رہا تھا تو اس کو اس کے دفتر کا کیسے پتا چلا۔ اب وہ شخص اس سے کیا چاہتا تھا۔ اس نے اسے کیوں ٹیلی فون کیا تھا۔ محض اس کو خوفزدہ کرنے کے لیے یا اس کے عزائم کچھ اور ہیں۔ اب اسے کیا کرنا چاہیے؟ وہ جانتا تھا کہ ایک آدھ دن میں اس کا ٹیلی فون پھر آئے گا تو وہ اس کے ساتھ کیسا رویہ اختیار کرے۔ ظاہر ہے، وہ اس کو پہچان کر خود کو پھانسی کے تختے کی طرف نہیں لے جانا چاہتا تھا۔

شام کو جب وہ دفتر سے اٹھنے لگا تو خاصا نروس تھا۔ اٹھتے اٹھتے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے سوچا، کہیں بھائی محسن کا ٹیلی فون نہ ہو۔ یہ سوچ کر اس نے ریسیور اٹھانے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور اپنا سامان سمیٹنے لگا۔ پھر اسے خیال آیا، کہیں گلشن کا ٹیلی فون نہ ہو۔ وہ اکثر اسی وقت ٹیلی فون کیا کرتی تھی۔ اس خیال کے تحت اس نے ریسیور اٹھا لیا۔

"جی!" جمیل بولا۔

"آپ کا محسن، کیسے اتنی دیر میں تو آپ نے میرے بارے میں اچھی طرح غور کر لیا ہوگا۔"

"او گدھے، بکواس بند کر۔" جمیل نے غصے میں کہا۔ "اب اگر مجھے ٹیلی فون کیا تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔"

"تم سے برا تو اب بھی کوئی نہیں ہے۔"

"میں بلیک میل ہونے والوں میں سے نہیں ہوں۔ تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔" جمیل نے اپنے لہجے میں یقین پیدا کرتے ہوئے کہا۔

"اچھا ٹھیک ہے، پھر میرا انتظار کرو۔ میں وقت کی آواز ہوں۔" یہ کہہ کر ادھر سے لائن بند کر دی گئی۔

"وقت کی آواز۔" یہ نام سن کر جمیل کو اب کسی قسم کا شبہ نہ رہا۔ وہ وہی تھا۔ وہ اسی نام سے اسے ٹیلی فون کیا کرتا تھا۔

چند سیکنڈ بعد پھر ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے ڈرتے ڈرتے ریسیور اٹھایا۔ "جی۔"

"ہاں، میں بول رہی ہوں۔ کیا پروگرام ہے تمہارا؟" ادھر سے گلشن تھی۔

"بس میں نکل رہا ہوں دفتر سے۔"

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

"میں بھی نکل رہی ہوں۔ تم راستے کی دکان سے گوشت لیتے آنا، لے آؤ گے؟"

"آج موڈ نہیں۔ گوشت کی دکان پر بہت رش ہوتا ہے۔"

"اچھا چھوڑو، تم گھر آؤ، کچھ کر لیں گے۔"

اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اس کا خیال تھا کہ وہ سارے عذاب لاہور میں دفن کر آیا ہے۔ یہاں خوشیاں ہی خوشیاں تھیں۔ وہ گلشن سے شادی کر کے سب کچھ بھول گیا تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ یہ سب کچھ عارضی ہے۔ اگر بات بڑھ گئی اور گلشن کو سب کچھ معلوم ہو گیا تو وہ اسے منہ دکھانے کے قابل بھی نہ رہے گا۔

اس نے گلشن سے جھوٹ بولا تھا۔ اس نے گلشن کی امی کو اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ لاہور سے نکل آیا ہے۔ اس کے جرم سے کوئی پردہ نہ ہٹا سکے گا لیکن اس "وقت کی آواز" نے سارا کھیل ہی بگاڑ دیا تھا۔ کون ہے یہ کمبخت۔ وہ تو اسے شکل سے بھی نہیں پہچانتا۔ بس آواز ہی سنی تھی، وقت کی آواز۔

پہلی بار جب اس نے اس کی آواز سنی تو محض مذاق سمجھ کر ریسیور نیچے رکھ دیا تھا لیکن چند لمحوں بعد پھر گھنٹی بجی تھی۔

"جی۔" جمیل ٹیلیفون ریسیور کرتے ہوئے کبھی "ہیلو" نہیں کہتا تھا۔

"جمیل صاحب! شاید آپ میری بات کو مذاق سمجھ رہے ہیں۔ اگر کوئی شک ہے تو اپنے گھر آ کر تصدیق کر لیجیے۔"

"آپ ہیں کون صاحب؟"

"میں وقت کی آواز ہوں، بس میرا اتنا ہی تعارف کافی ہے جمیل صاحب۔ میں آپ کا ہمدرد ہوں۔ آپ ایک شریف آدمی ہیں لیکن آپ کی بیوی آپ جیسی نہیں، وہ بے وفا ہے۔"

"بھائی وقت کی آواز! آپ اس وقت کہاں سے بول رہے ہیں؟"

"اسی بلڈنگ سے جس میں آپ کا فلیٹ ہے۔"

"پھر تو آپ میری بیوی کے نام سے واقف ہوں گے۔"

"جی بالکل، آپ کی بیوی کا نام نزہت ہے اور آپ کے یقین کے لیے ایک بات اور بتا دوں، آج وہ کالی ساڑھی باندھے ہوئے ہے۔"

"اوہ" اب وقت کی آواز پر کان دھرنا بہت ضروری ہو گیا تھا کیونکہ اس نے جو نشانی بتائی تھی، وہ صحیح تھی لیکن نزہت کے بارے میں وقت کی آواز نے جو کچھ بتایا تھا، اس پر یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔

اسے اپنی بیوی پر بڑا بھروسہ تھا۔ بڑا اعتماد تھا۔

وہ تو کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کی بیوی اس طرح چوری چھپے اس کی غیرت کو یوں نیلام کر دے گی۔ نزہت بڑے باپ کی بیٹی تھی۔ وہ جہیز میں اپنے ساتھ بہت کچھ لائی تھی۔ اس

کے باپ نے اسے ایک فلیٹ دیا تھا اور اس فلیٹ کو زندگی کی ہر آسائش سے بھر دیا تھا۔

باپ نے جہیز دے کر گویا احسان کر دیا تھا۔ یہ سمجھ لیا جیسے بیٹی کو ہر سکھ دے دیا۔ جہیز دے کر سکھ دینے والا باپ اگر اپنی بیٹی کے ذہن کو پڑھ لیتا تو آج یہ نوبت نہ آتی۔

نزہت کو شروع ہی سے عدنان سے لگاؤ تھا۔ عدنان، نزہت کے بھائی خالد کا دوست تھا۔ اس کا گھر میں آنا جانا تھا۔ اسی آنے جانے میں نزہت اور عدنان ایک دوسرے کے دلوں سے گزر گئے۔

نزہت کو نہیں معلوم تھا کہ عدنان کی اپنی خالہ زاد بہن سے منگنی ہو چکی ہے۔ جب اسے معلوم ہوا تو کف افسوس ملنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ یہ منگنی نہیں ٹوٹ سکتی تھی۔ دو خاندانوں کا مسئلہ تھا۔ ادھر نزہت اسے نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ یہ دو دلوں کا معاملہ تھا۔

عدنان بزدل تھا تو بہادر نزہت بھی نہ تھی۔ وہ بات جو دونوں کے دلوں میں محفوظ تھی، محفوظ ہی رہی۔ کوئی بھی اپنے گھر میں بات نہ کر سکا۔

نزہت کے والد جمیل سے ذاتی طور پر واقف تھے۔ جمیل غریب تھا۔ ایسا غریب بھی نہ تھا کہ کھانے پینے کو کچھ میسر نہ ہو۔ البتہ ان کے مقابلے میں واقعی غریب تھا۔ نزہت کے والد نے اس کی کو اپنے طور پر پورا کر دیا۔ اسے اچھی ملازمت دلوا دی، گھر دے دیا۔ گھر میں سوئی سے لے کر فرنیچر تک سب کچھ رکھوا دیا اور ساتھ ہی گھر کو سجانے، سنوارنے والی لڑکی دیدی۔

ادھر عدنان کے گھر والوں کی طرف سے بھی اسی طرح کا سلوک ہوا۔

دونوں کی شادیوں کی تاریخ مقرر ہو گئی۔

دلچسپ اور عجیب بات یہ تھی کہ دونوں کی شادی کی تاریخ ایک تھی۔

شادی سے ایک دن پہلے عدنان نے نزہت کو فون کیا۔ اتفاق سے فون نزہت نے اٹھایا۔ اس وقت آس پاس بھی کوئی نہ تھا۔ اس لیے دونوں کی بات ہو گئی۔

"کل تمہاری شادی ہے، تم تو بہت خوش ہو گے عدنان؟" نزہت نے پوچھا۔

"شادی تو تمہاری بھی کل ہی ہے، کیا تم خوش ہو؟"

"نہیں، بالکل نہیں۔ تمہیں کھو کر میں کیسے خوش ہو سکتی ہوں۔"

"پھر مجھ سے خوش ہونے کی توقع کیوں ہے؟"

"تم مرد ہو، تمہیں نزہت نہ ملی، نجمہ مل گئی۔ بات ایک ہی ہے۔"

"اچھا، ایسی باتیں کر کے میرا دل نہ جلاؤ۔"

"میں نے ایک بات طے کر لی ہے عدنان۔" نزہت نے ٹھنڈا سانس لیا۔

"کیا؟"

"میں تمہاری ہوں، تمہاری ہی رہوں گی۔ وہ مجھ سے کچھ نہ پا سکے گا۔"

بات شاید آگے بڑھتی مگر اسی وقت کوئی کمرے میں آ گیا۔ اب نزہت کے پاس "ہوں،

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہاں" کرنے کے سوا کچھ نہ تھا۔ وہ ہوں، ہاں کرتی رہی۔ ادھر عدنان نے فوراً سمجھ لیا کہ کمرے میں کوئی آ گیا ہے، لہٰذا اس نے اپنے دل کی بات کہی اور نزہت جواب میں ٹھیک ہے، کہتی رہی۔

دونوں نے شادی کے دوسرے دن ملنے کا پروگرام بنا لیا۔

خیر شادی کے دوسرے دن عدنان کے لیے گھر سے نکلنا اتنا مشکل نہ تھا۔ جتنا نزہت کے لیے لیکن جب سروں میں سودا سمایا ہو اور آدمی خطرات مول لینے کی ٹھان لے تو پھر کچھ مشکل نہیں رہتا۔

شادی کے دوسرے دن شام کو جب جمیل نزہت کو لے جانے کے لیے آیا تو نزہت اس سے یہ کہہ کر گھر سے نکل گئی۔ "تم ذرا بیٹھو، میری ایک سہیلی کی طبیعت خراب ہے۔ میں اسے دیکھ کر ابھی آئی۔ بس پندرہ بیس منٹ سے زیادہ نہیں لگیں گے۔ تب تک میں فرحت کو تمہارے پاس بھیجتی ہوں۔"

ڈرائنگ روم سے نکل کر اس نے اپنی چھوٹی بہن کو کچھ سمجھایا اور پھر پورے اطمینان سے گھر سے نکل گئی۔

گھر سے نکلتے ہی فوراً اسے رکشہ مل گیا۔ وہ رکشے میں بیٹھ کر پہلے سے طے شدہ مقام پر پہنچ گئی۔ یہ کوئی نئی جگہ نہ تھی۔ اس ریستوران میں وہ اکثر ملا کرتے تھے۔

ریستوران میں عدنان پہلے سے اس کا منتظر تھا۔ اسے دروازے میں داخل ہوتے دیکھ کر وہ پھول کی طرح کھل اٹھا۔

"کیسی ہو نزہت؟" عدنان اسے پرشوق نگاہوں سے دیکھتا ہوا بولا۔

"ویسی ہی جیسی شادی سے پہلے تھی۔"

"کیا مطلب؟"

"تمہاری تھی، تمہاری ہوں۔"

"تمہارے بغیر سب پھیکا ہے۔ میں اندر سے خود کو خالی فریم کی طرح محسوس کرتا ہوں۔"

"کیوں اس میں لگی تصویر کہاں گئی؟"

"میرے سامنے بیٹھی ہے۔"

"مردوں کو باتیں بنانا خوب آتی ہیں۔ ایک وہ ہے، اس سے ملاقات ہوئے ابھی چوبیس گھنٹے ہوئے نہیں کہ مجنوں بن گیا ہے۔" نزہت نے ہنس کر کہا۔

"لیکن ہم سے ملے تو صدیاں بیت گئی، ہمیں تو اصلی مجنوں مانتی ہو یا نہیں؟"

"اصلی مجنوں ہوتے تو مجھ سے شادی نہ کر لیتے۔" نزہت نے اسے تیکھی نظروں سے دیکھا۔

"مجھے اگر محبت نہ ہوتی تو یہاں تم سے ملنے نہ چلا آتا۔"

"ہاں، مجھے بڑی حیرت ہے، کیسے آ گئے تم؟" نزہت نے اسے چھیڑا۔ "تمہارا آنا تو اتنا مشکل نہ تھا، میرا گھر سے نکلنا بہت مشکل تھا۔ دیکھ لو، پھر بھی نکل آئی۔ اسے گھر پر بیٹھا چھوڑ آئی ہوں۔ اب چلنا چاہیے۔ باہر رکشا کھڑا ہے۔ پندرہ بیس منٹ کا کہہ کر نکلی تھی۔" یہ کہہ کر نزہت کھڑی ہو گئی۔

کھڑے کھڑے دونوں نے اگلی ملاقات کا وقت اور مقام طے کیا اور پھر نزہت بغیر کچھ کھائے پیے ریستوران سے نکل آئی۔

نزہت جب گھر پہنچی تو پون گھنٹہ گزر چکا تھا لیکن جمیل کو اس کا احساس بھی نہ ہوا۔ فرحت اس کے پاس بیٹھی شگوفے چھوڑتی رہی۔ ویسے بھی جمیل کے تصور میں یہ بات نہیں آ سکتی تھی کہ نزہت اس وقت سہیلی سے نہیں، عاشق سے ملنے گئی ہے۔ عورتوں کو آنکھوں میں دھول جھونکنے کا فن خوب آتا ہے۔

عدنان اور نزہت جن راہوں پر چل پڑے تھے، وہ سراسر تباہی کی طرف جاتی تھیں۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے دشمن ہو گئے تھے اور اسے وہ عشق سمجھ رہے تھے۔ عشق کبھی منفی نہیں ہوتا، منفی ہو ہی نہیں سکتا۔

نزہت نے چند دنوں کے اندر ہی جمیل کو اپنی مٹھی میں بند کر لیا۔ وہ اس کی جھوٹی محبت کے فریب میں آ گیا اور جیسا وہ کہتی، کرنے لگتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شادی کے صرف پندرہ دن بعد جمیل جہیز میں ملنے والے فلیٹ میں منتقل ہو گیا۔ نزہت اپنے ساس سسر کے سامنے میٹھی بنی رہی۔ وہ ظاہر کرتی رہی کہ وہ تو الگ نہیں ہونا چاہتی لیکن جمیل کی ضد کے آگے بے بس ہے۔ جہاندیدہ مدین اس ڈرامے کو خوب سمجھ رہے تھے لیکن انہوں نے جمیل کے گھر چھوڑنے پر کسی ناراضگی کا اظہار نہ کیا۔ وہ چاہتے تھے کہ وہ دونوں خوش رہیں۔ الگ رہ کر خوش رہ سکتے ہیں تو ایسا کر دیکھیں۔

نزہت نے فلیٹ میں آ کر سکھ کا سانس لیا۔ ساس، سسر کا گھر اس کی راہ کا کانٹا تھا۔ جب یہ کانٹا اس نے اپنی ہنرمندی دکھا کر بڑی صفائی سے نکال دیا تھا۔ فلیٹ میں آ کر اس نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اپنے کردار کی مضبوطی کے بارے میں جمیل کو درس دینا شروع کیا۔ اپنی بیتی کے قصے تخلیق کر کر کے اسے سنائے گئے۔ اس درس و تدریس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جمیل کو اس پر اندھا دھند اعتقاد ہو گیا اور اعتقاد جب اندھا ہو جائے تو پھر کچھ نظر نہیں آتا اور جب نظر آتا ہے تو اس وقت تک پانی سر سے اونچا ہو چکا ہوتا ہے۔

ٹیلی فون کے بغیر نزہت خود کو ادھورا محسوس کرتی تھی۔ جمیل کے دفتر جانے کے بعد وہ تنہا ہو جاتی۔ یہ تنہائی اسے کاٹنے کو دوڑتی۔ کبھی وہ رسالے لے کر بیٹھ جاتی۔ کبھی وی سی آر پر کوئی فلم لگا لیتی۔ ان سے اکتاتی تو پڑوس میں جا بیٹھتی۔ آخر دوسرے کے گھر بھی ہر وقت نہیں گھسا جا سکتا۔ آنے جانے کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ پڑوس میں فون تھا۔ اس لیے نزہت نے ان سے اچھے تعلقات استوار کر لیے۔ اب اسے اتنا فائدہ ہو گیا کہ اس کا کوئی فون آتا تو وہ فوراً اسے بلا لیتے۔

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

نزہت کی امی اور بہنیں اس سے فون پر بات کر لیتیں۔ کبھی سہیلیوں کے فون بھی آ جاتے۔ اس طرح نزہت کو کچھ آسرا ہو گیا۔ ویسے اس نے اپنے باپ سے ٹیلی فون لگوانے کو کہہ دیا تھا اور انہوں نے وعدہ بھی کر لیا تھا۔ اب وہ وعدہ وفا ہونے کی منتظر تھی۔

نزہت اپنے گھر پر عدنان سے بات کرنے کے لیے ٹیلی فون لگوانا چاہتی تھی لیکن جمیل پر وہ یہ ظاہر کیا کرتی تھی کہ تمہارے دفتر جانے کے بعد بور ہونے لگتی ہوں۔ تمہارے بغیر دل نہیں لگتا گھر پر ٹیلی فون ہو تو بندہ ٹیلی فون پر ہی بات کر لے۔ جمیل نزہت کی زبانی اس طرح کے جملے سن کر پھولا نہ سماتا۔

نزہت نے عدنان کو پڑوس کا ٹیلی فون نمبر دے دیا تھا۔ ٹیلی فون کی وجہ سے ملاقاتوں میں آسانی ہو گئی تھی۔ نزہت اب اس سے باہر نہیں ملنا چاہتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ یہ ملاقاتیں اب محفوظ انداز میں ہوں اور سب سے محفوظ طریقہ گھر کے سوا کوئی نہ تھا۔

پھر گھر پر ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ نزہت جس کو سب سے محفوظ طریقہ سمجھتی تھی اور یہ خیال کرتی تھی کہ ان ملاقاتوں کا کبھی جمیل کو علم نہ ہو سکے گا لیکن ہوا اس کے برعکس۔

"وقت کی آواز" نے اس راز کو راز نہ رہنے دیا۔

پڑوس کے گھر میں جہاں ٹیلی فون تھا، وہاں ایک لڑکا بھی تھا حماد۔ آج کل امتحان ہو رہے تھے۔ اس لیے اس کا زیادہ تر وقت گھر پر ہی گزرتا تھا۔ نزہت کو نہیں معلوم تھا کہ حماد اس کے بارے میں کیا جذبات رکھتا ہے۔ وہ اس سے بڑی بے تکلفی سے بات کر لیا کرتی تھی۔ اس بے تکلفی نے حماد کے دل میں گدگدی پیدا کر دی۔ وہ اسے پسندیدگی سے دیکھنے لگا اور ایک دن اس نے اپنی پسندیدگی کا اظہار بھی کر دیا۔

نزہت کو اس کا اظہار محبت بہت برا لگا۔ اگر ٹیلی فون کا لالچ نہ ہوتا تو وہ اس کے ساتھ بہت بری طرح پیش آتی۔ ممکن تھا کہ تھپڑ مار دیتی کیونکہ اس نے حرکت ہی ایسی کی تھی۔ نزہت نے کسی شدید ردعمل کا اظہار نہ کیا لیکن اسے یہ بات اچھی طرح سمجھا دی کہ اگر آئندہ اس نے کوئی الٹی سیدھی حرکت کی تو وہ اس کے والدین سے شکایت کر دے گی۔

اس دھمکی کا حماد پر خاطر خواہ اثر ہوا۔ آئندہ اس نے اپنی زبان کو بے قابو نہ ہونے دیا۔ اس کے ساتھ احترام سے پیش آنے لگا لیکن اندر اس کے ایک کانٹا سا چبھ گیا تھا۔ ایک خلش تھی جو ہر وقت اسے بے چین رکھتی تھی۔

ایک دن عدنان کا ٹیلی فون آیا۔ حماد نے اٹھایا۔ "ہیلو۔"

"آپ کے پڑوس میں نزہت رہتی ہیں، ذرا انہیں بلوا دیجئے۔"

"اچھا، ایک منٹ ہولڈ کیجئے۔" حماد نے کہا۔ پھر ریسیور پر ہاتھ رکھ کر اس نے اپنی بہن کو آواز۔ "شنو!"

"جی بھائی جان۔"

"نزہت کا ٹیلی فون ہے، اسے بلوا دو۔"

"اچھا۔" شہناز اسے بلانے چلی گئی۔

فوراً ہی نزہت آ گئی۔ اس نے پوچھا۔ "کدھر سے سنوں؟"

"بیڈ روم میں چلی جائیں۔ ڈرائنگ روم میں بھائی جان کے دوست بیٹھے ہیں۔" شہناز نے بتایا۔

"ہاں، ہیلو!" نزہت نے ریسیور اٹھایا۔

"جان، میں بول رہا ہوں۔" ادھر سے آواز آئی۔

نزہت کی آواز سن کر حماد ریسیور رکھنے لگا تھا لیکن اس بے تکلف انداز تخاطب نے حماد کو روک دیا۔ اس نے ریسیور پر ہاتھ رکھ لیا اور پورے اطمینان سے ٹیلی فون پر ہونے والی گفتگو سننے لگا۔

اس گفتگو نے اس کی آنکھیں کھول دیں۔ نزہت کی پارسائی ریزہ ریزہ ہو کر فضا میں تحلیل ہو گئی۔ ان کی باتیں سن کر وہ معنی خیز انداز میں مسکراتا رہا اور سوچتا رہا کہ اس نے پہلے دن ہی سے نزہت کے ٹیلی فون کیوں نہ سنے کیونکہ ان کی باتوں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ یہ سلسلہ عافی عرصے سے چل رہا ہے۔

"کیا ہو رہا تھا؟" ادھر سے پوچھا گیا۔

"امی آئی ہوئی ہیں۔" نزہت نے جواب دیا۔

"ارے، میں تو تمہاری طرف آنے کا پروگرام بنا رہا تھا۔"

"امی شام تک چلی جائیں گی۔"

"اس کا مطلب ہے کل آؤں؟"

"ہاں۔"

"گیارہ بجے ٹھیک ہے۔"

"بالکل ٹھیک۔"

اس کام کی گفتگو کے بعد پھر ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ ادھر سے بڑی جذباتی باتیں ہو رہی تھیں لیکن نزہت ان باتوں کا بڑے محتاط انداز میں جواب دے رہی تھی۔ اس انداز میں کہ اگر کوئی اس کی گفتگو سن لے تو کچھ اندازہ نہ کر سکے۔ اسے کیا خبر تھی کہ ان دونوں کی گفتگو حماد ڈرائنگ روم میں بیٹھا سن رہا ہے۔

دوسرے دن ٹھیک گیارہ بجے عدنان، نزہت سے ملنے اس کے فلیٹ پر پہنچ گیا۔ حماد نے بیل بجاتے اور پھر فلیٹ میں داخل ہوتے دیکھا۔

کوئی دس منٹ بعد اس نے جمیل کو رنگ کیا۔ آپریٹر سے اس کا نمبر مانگا۔

"جی" ادھر سے جمیل نے ریسیور اٹھایا۔

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

"جمیل صاحب بول رہے ہیں؟"

"جی، فرمایئے۔" جمیل نے بڑی نرمی سے کہا۔ "آپ کون صاحب بول رہے ہیں؟"

"جمیل صاحب! آپ اس وقت دفتر میں بیٹھے کام میں مصروف ہیں اور ادھر آپ کی بیوی دوسرے کام میں مصروف ہے۔"

"یہ کیا بکواس ہے، کون ہیں آپ؟"

"میں وقت کی آواز ہوں۔ آپ زیادہ غصہ نہ کریں۔ میری بات تسلی سے سن لیں۔ ہیلو..... ہیلو!" حماد ابھی بات کر رہا تھا کہ ادھر سے جمیل نے بات کاٹ دی۔ حماد نے دوبارہ اس کو رنگ کیا۔

"جی۔" جمیل کی آواز آئی۔

"جمیل صاحب، شاید آپ میری بات کو مذاق سمجھ رہے ہیں۔ اگر کوئی شک ہے تو اپنے گھر آ کر تصدیق کر لیجیے۔"

اس دن جمیل نے جلدی جلدی اپنی فائلیں بند کیں اور دفتر سے نکلنے لگا تو ایم ڈی صاحب آ گئے۔ انہوں نے اسے بلوا لیا۔ ان سے بات کر کے نکلتے نکلتے اسے آدھ گھنٹہ لگ گیا۔ جب وہ گھر پہنچا تب تک عدنان جا چکا تھا۔

اور نزہت اسی وقت باتھ روم سے نہا کر نکلی تھی۔ اسے دیکھ کر وہ ایک لمحے کو حیران رہ گئی۔ اس نے بغور جمیل کا چہرہ دیکھا۔ وہاں کسی قسم کا شک موجود نہ تھا۔ اس نے اطمینان کی سانس لی۔ پھر بڑی فکرمند ہو کر بولی۔

"جمیل، خیریت تو ہے۔ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

"ہاں، طبیعت بالکل ٹھیک ہے۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔ میں صبح ایک فائل بھول گیا تھا، وہ لینے آیا ہوں۔"

"چلو، اب آ گئے ہو تو کھانا کھا کر جانا، کھانا تیار ہے۔ صرف روٹیاں ڈالنا ہیں۔"

"نہیں، کھانا میں دفتر میں کھا لوں گا۔ فائل لے کر مجھے فوراً پہنچنا ہے۔ ایم ڈی صاحب میرے منتظر ہیں۔"

"پھر چائے بنا دوں؟"

"نہیں، چائے کا موڈ نہیں۔"

پھر اس نے الماری میں سے ایسے ہی ایک فائل نکالی اور گھر سے باہر نکل آیا۔

دفتر پہنچ کر ابھی وہ چین سے کرسی پر بیٹھ بھی نہ پایا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ جمیل نے ریسیور اٹھایا۔ "جی۔"

"جمیل صاحب؟"

"جی، میں بول رہا ہوں۔"

"کہیے، آپ گھر ہو آئے؟"

"جی ہاں، ہو آیا۔ وہاں تو کوئی نہ تھا۔"

"آپ نے پہنچنے میں دیر کر دی۔ تب تک وہ جا چکا تھا۔"

"آپ نے اسے جاتے ہوئے دیکھا تھا؟"

"جی ہاں، نہ صرف اسے جاتے ہوئے دیکھا تھا بلکہ آپ کو آتے ہوئے بھی دیکھا تھا۔ وہ سوا بارہ بجے گھر سے نکلا ہے اور آپ پون ایک بجے گھر پہنچے ہیں۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟"

"بھئی آپ ہیں کون۔ اپنے بارے میں صاف صاف بتاتے کیوں نہیں؟"

"اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ آپ فکر نہ کریں۔ وہ پھر آئے گا۔ میں پھر آپ کو ٹیلی فون پر مطلع کر دوں گا۔ تب تک کے لیے خدا حافظ۔"

اس فون نے جمیل کی زندگی میں ہلچل مچا دی تھی۔ ابھی اس نے اپنی آنکھوں سے کچھ نہیں دیکھا تھا۔ وہ چاہتا بھی نہیں تھا کہ اپنی آنکھوں سے دیکھے بغیر کوئی عملی قدم اٹھائے۔ اس نے اپنا رویہ بھی تبدیل نہیں کیا۔ اپنا رویہ تبدیل کر کے وہ اسے چونکانا نہیں چاہتا تھا۔

کوئی دو تین دن بعد جمیل کے پاس پھر فون آیا۔ وقت کی آواز سن کر وہ چونک پڑا۔ اب وہ اس آواز کو پہچاننے لگا تھا۔

"جمیل صاحب! آج آپ کی بیوی اس کے ساتھ فلم دیکھنے جا رہی ہے۔"

"کون سا شو؟"

"میٹنی شو۔ آج شاید آپ اپنی بیوی سے کہہ کر گئے تھے کہ دفتر میں بہت کام ہے، نو بجے آئیں گے۔"

"ہاں، یہ بات بالکل صحیح ہے۔"

"بس، اسی سے فائدہ اٹھا کر فلم دیکھنے کا پروگرام بن گیا۔ کیا آپ سینما ہال جانا پسند کریں گے؟"

"ہاں، جاؤں گا۔"

"میرا مشورہ ہے کہ آپ شو ختم ہونے سے پہلے وہاں پہنچیں۔"

"کیوں، شو شروع ہونے سے پہلے کیوں نہیں؟"

"وہ دونوں اصل میں الگ الگ آئیں گے۔ جب سینما ہال میں اندھیرا ہو جائے، تب اندر داخل ہوں گے۔ اس طرح آپ انہیں اکٹھا نہ دیکھیں گے۔ ہاں فلم ختم ہونے کے بعد وہ ساتھ نکلیں گے۔ وہ آپ کی بیوی کو آپ کے گھر چھوڑے گا، پھر اپنے گھر جائے گا۔"

"پھر میں سینما ہال جا کر کیا کروں گا۔ اپنے گھر میں بیٹھ کر کیوں نہ ان کا انتظار کروں۔ میں ایک نظر اس بندے کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ وہ ہے کون؟ آپ نے اس کا نام بتایا تو ہے لیکن میں عدنان نام کے کسی آدمی سے واقف نہیں ہوں۔"

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

"ٹھیک ہے، پھر آپ سینما ہال نہ جائیں۔ ان کا گھر پر بیٹھ کر انتظار کریں۔" حماد نے اس کی رائے سے متفق ہوتے ہوئے ٹیلی فون بند کر دیا۔

جمیل شام کو ایم ڈی کے اٹھتے ہی خود بھی اٹھ گیا۔ اس نے بقیہ کام گھر کے لیے سمیٹ لیا۔ انکم ٹیکس کے کچھ گوشوارے آج ہی تیار کرنے تھے۔ کل گوشوارے جمع کرانے کی آخری تاریخ تھی۔ جمیل نے دفتر میں بنیادی کام تو کر لیا تھا، بس ان گوشواروں کو فائنل کرنا تھا۔

گھر پہنچ کر اس نے جیب سے فلیٹ کی چابی نکالی۔ دروازہ کھولتے ہوئے اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ شاید "وقت کی آواز" نظر آ جائے مگر اسے کچھ نظر نہ آیا۔ وہ فائلیں بغل میں دبائے گھر میں داخل ہوا اور دروازے کو اندر سے بولٹ کرنے کے بجائے تالا لگا دیا تاکہ نزہت تالا کھول کر اندر آ سکے۔ اسے فوراً ہی جمیل کی موجودگی کا احساس نہ ہو۔

کوئی آدھ گھنٹہ گزرنے کے بعد دروازے کے تالے میں چابی گھومنے کی آواز آئی۔ ایک لمحے کو جمیل کا دل اتنے زور سے دھڑکا کہ اسے بند ہوتا ہوا معلوم ہوا۔ جمیل نے فوراً خود کو سنبھالنے کی کوشش کی۔

دروازے کے سامنے راہداری تھی اور راہداری کے اختتام پر ٹی وی لاؤنج۔ جمیل کرسی پر اس طرح بیٹھا تھا کہ دروازہ کھلتے ہی فوراً اس پر نظر پڑے۔ دروازہ کھول کر نزہت بڑی خوش خوش اندر داخل ہوئی۔

اندر جمیل کو بیٹھا دیکھ کر ایک لمحے کو اس کی آنکھوں میں اندھیرا اتر آیا لیکن اس نے خود کو فوراً سنبھال لیا اور دروازہ کی طرف پلٹتے ہوئے بولی۔ "آؤ عدنان، اندر آ جاؤ۔ تم بڑے خوش قسمت ہو، تمہاری جمیل سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔ وہ گھر میں موجود ہیں۔"

جمیل دونوں کو دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔ عدنان کچھ جھینپا جھینپا نزہت کے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ جمیل نے اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ اس کے لیے بالکل اجنبی تھا۔

"جمیل تم کب آئے؟" نزہت نے فدا ہونے والے انداز میں پوچھا۔

"ابھی تھوڑی دیر ہوئی ہے۔"

"اچھا۔" وہ مسکرائی۔ "کام جلدی ختم ہو گیا ہوگا؟"

"نہیں، ساتھ لے آیا ہوں۔ ایم ڈی اٹھ گیا تو میں بھی بھاگ آیا۔ یہ کون ہیں؟" جمیل نے بڑی سادگی سے پوچھا۔

"جمیل، یہ عدنان ہے، میرا کزن۔ حال ہی میں امریکہ سے آیا ہے۔ میں انارکلی گئی ہوئی تھی کچھ شاپنگ کے لیے۔ یہ مجھے وہاں مل گیا۔ کہنے لگا چلو، میں آپ کو چھوڑ دوں۔ اس کے پاس گاڑی ہے۔ میں نے کہا بھی کہ میں خود چلی جاؤں گی۔ ٹیکسی یا رکشہ لے لوں گی مگر یہ نہیں مانا۔ پھر جب میں نے اسے بتایا کہ تم اس وقت گھر پر نہیں ہوتے تو یہ نیچے ہی سے واپس جا رہا تھا۔ بڑی مشکل سے اسے اوپر لائی کہ چائے پی کر جانا۔ اچھا ہی ہوا جو میں اسے اوپر لے آئی۔ تم سے ملاقات ہو گئی۔" بالآخر نزہت خاموش ہوئی۔ جمیل نے اس کی بات بڑے صبر سے سنی اور پھر بولا۔

"ہاں تم نے بہت اچھا کیا جو انہیں اپنے ساتھ لے آئیں۔ آئیے عدنان صاحب تشریف رکھیے۔"

"جی بہتر۔" عدنان نے ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"وہ فلم کیسی تھی؟" جمیل نے بڑے بھولپن سے نزہت سے سوال کیا۔

سوال سن کر نزہت چکرا گئی لیکن ان چکروں کو اس نے اپنے چہرے سے ظاہر نہ ہونے دیا۔ وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔ "کونسی فلم جمیل؟"

"ارے صبح جو میں کیسٹ دے کر گیا تھا۔ کیا تم نے دن میں وہ فلم دیکھی نہیں؟" جمیل نے وضاحت کی۔

"اچھا، وہ فلم۔" نزہت نے اطمینان کا سانس لیا۔ ہاں دیکھی کیوں نہیں، اچھی تھی۔ تم کو تمہارے پاس وقت ہو تو دیکھ لینا۔

"بعض فلمیں ایسی ہوتی ہیں کہ انہیں وی۔ سی۔ آر پر دیکھ کر بالکل مزہ نہیں آتا۔ اصل مزہ سینما ہال میں فلم دیکھنے کا لطف ہی کچھ اور ہے۔" اس مرتبہ وہ عدنان سے مخاطب تھا۔ "کیوں جناب، کیا خیال ہے آپ کا؟"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ بڑی سکرین پر فلم دیکھ کر واقعی لطف آتا ہے۔" عدنان نے اس سے آنکھیں چراتے ہوئے کہا۔

پھر نزہت چائے بنانے کے لئے اٹھ گئی۔ اس نے جلدی جلدی چائے بنائی، گھر میں جو کچھ موجود تھا وہ سامنے رکھا اور شکر کرنے لگی کہ جمیل نے ان دونوں کو کسی شک و شبہے کی نظر سے نہیں دیکھا۔

چائے پینے کے بعد عدنان اٹھنے لگا تو جمیل نے بڑے خلوص سے اسے کھانا کھا کر جانے کی دعوت دی۔ عدنان نے اتنے ہی خلوص سے معذرت کر لی اور آئندہ آنے کا کہا۔

پھر وہ دونوں، عدنان کو دروازے تک چھوڑنے آئے۔

عدنان کے جانے کے بعد نزہت نے دروازہ بند کیا اور مسکراتی ہوئی پلٹی۔ "کیا ہوا؟"

"تم انارکلی گئی تھیں۔" اس نے نزہت کی بات جیسے سنی ہی نہیں۔ "کیا لائیں وہاں سے؟"

"مجھے جوتا خریدنا تھا۔ ابھی دو تین دکانیں دیکھ پائی تھی کہ یہ مل گیا۔ پھر اس کے ساتھ گھومنا مناسب نہ سمجھا، اس لئے واپس چلی آئی۔"

"کیوں اس میں نامناسب کیا بات تھی؟"

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

"اب میں اسے جوتے کے لئے کیا دکان دکان لئے پھرتی؟"

"ہاں یہ بات تو ٹھیک ہے۔"

جمیل بڑے حساب کتاب کا آدمی تھا۔ پیشے کے اعتبار سے بھی وہ اکاؤنٹینٹ تھا۔ وہ خوامخواہ کسی شک میں مبتلا نہیں ہونا چاہتا تھا۔ ہوسکتا ہے واقعی عدنان اسے انارکلی میں ملا ہو وہ اسے گھر تک چھوڑنے چلا آیا ہو۔ پھر وہ فون جھوٹا تھا؟ ہوسکتا ہے کسی نے مذاق کیا ہو، وہ بلاوجہ دونوں میں نفرت کی دیوار کھڑی کرنا چاہتا ہو۔ بہرحال جو بھی تھا، اسے زیادہ عرصے چھپنا نہیں تھا۔ جمیل صبر سے کام لینا چاہتا تھا۔ ویسے بھی وہ جمیل تھا۔

رات کو جب وہ دفتر کے کام سے فارغ ہوا تو نزہت جاگ رہی تھی اور کوئی رسالہ پڑھ رہی تھی۔ اسے اٹھتے دیکھ کر اس نے بھی رسالہ ایک طرف پھینکا اور مسکرا کر بولی۔ "کام ختم؟"

"جناب!" جمیل نے خوشدلی سے کہا۔

چند لمحے وہ نزہت کو بڑے غور سے دیکھتا رہا۔ پھر بیڈ پر بیٹھ گیا اور بولا۔ "نزہت! ایک بات بتاؤ۔ یہ بیویاں اپنے شوہروں سے بے وفائی کیوں کرتی ہیں؟"

"سب تو نہیں کرتیں۔" نزہت نے مسکرا کر کہا۔

"چلو، سو میں ایک کرتی ہے۔ آخر وہ بھی کیوں کرتی ہے۔ اس بے وفائی کی وجہ کیا ہوتی ہے؟"

"میں کیا جانوں۔" نزہت ایک ادا سے بولی۔

"اچھا، اگر تمہیں مجھ سے بے وفائی کرنے کا موقع ملے تو .....!" جمیل نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"ہائے، کیسی بات کر رہے ہیں؟" نزہت خفگی کا اظہار کرتے ہوئے بولی۔ "مجھے آپ سے زیادہ کوئی عزیز نہیں۔ اگر آپ کے سامنے کوئی شہزادہ بھی آجائے تو میں اس پر تھوکوں بھی نہیں۔ خدا کے لیے آئندہ اس طرح کی بات مجھ سے مت کہیے گا۔"

"اچھا ناراض نہ ہو، میں تو ایسے ہی مذاق کر رہا تھا۔" جمیل نے لائٹ آف کرتے ہوئے کہا۔ "چلو اب سو جاؤ، بہت رات ہوگئی۔"

☆.....☆.....☆

صبح دفتر پہنچتے ہی وہ گوشواروں کے چکر میں پھنس گیا۔ جلدی جلدی ٹائپ کروائے۔ پھر ایک نظر ایم ڈی کو دکھائے اور انکم ٹیکس آفس بھجوا دیئے۔ گوشوارے بھجوا کر اس نے سکون کا سانس لیا۔

ابھی وہ اپنی کرسی پر نیم دراز یہ سوچ رہا تھا کہ ابھی تک وقت کی آواز کا ٹیلی فون کیوں نہیں آیا۔ آخر اسے یہ پوچھنا تو چاہیے تھا کہ کل کیا ہوا؟

ابھی وہ اس کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ جمیل نے

ریسیور کان سے لگا کر کہا۔ "جی، جمیل۔"

"ہاں جی جمیل صاحب، کیا حال ہیں آپ کے؟" ادھر سے حماد نے پوچھا۔

"بس میں آپ ہی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔" جمیل نے وقت کی آواز پہچان کر کہا۔ "بہت دیر کردی آپ نے ٹیلی فون کرنے میں۔"

"ہاں، ایسا میں نے قصداً کیا۔ خیر آپ سنائیں، کل آپ نے عدنان کو دیکھ لیا؟"

"بھئی وہ لوگ تو انارکلی سے آرہے تھے۔"

"جمیل صاحب آدمی کو سیدھا ضرور ہونا چاہیے لیکن بے وقوف ہونے کی حد تک نہیں۔ بہرحال وہ دونوں آپ کو بے وقوف بنا کر خوش ہیں۔ کل آپ اگر نزہت کے پرس کی تلاشی لے لیتے تو اس میں سے سینما کے ٹکٹ برآمد ہوجاتے جو اس نے صبح آپ کے نکلنے کے بعد جلائے۔"

"یہ سب آپ کو کیسے معلوم ہوا؟ بھئی اب تو مجھے آپ پر شبہ ہونے لگا ہے۔ آپ کن مقاصد کے تحت مجھے میری بیوی سے بدظن کر رہے ہیں؟" جمیل نے سنجیدگی سے کہا۔

"جمیل صاحب، یہ ٹھیک ہے کہ آپ کی بیوی جہیز میں ایک قیمتی فلیٹ اور بے شمار سامان ساتھ لائی ہے لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ آپ اپنی غیرت کا جنازہ اپنے کندھوں پر رکھ لیں۔"

"میں جذباتی آدمی نہیں ہوں۔ میں اپنی آنکھیں کھلی رکھنے کا عادی ہوں۔ میں کسی سنی سنائی بات پر کوئی عملی قدم اٹھانے کے لیے تیار نہیں لیکن میں بے غیرت بھی نہیں۔ جس دن میں نے اپنی بیوی کو کسی غیر کے ساتھ ملوث دیکھ لیا۔ وہ ان دونوں کے لیے آخری دن ہوگا۔" جمیل نے بڑے اطمینان سے کہا۔ "میرے پاس ریوالور موجود ہے جس کا لائسنس مجھے میرے سسر نے دلوایا تھا۔"

"یہ ہوئی نامردوں والی بات۔ اب میں آپ کو بار بار فون نہیں کروں گا۔ بس آخری بار فون کروں گا، پھر آپ اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ لیں گے۔ پھر اس منظر کو دیکھ کر آپ کیا ایکشن لیتے ہیں، یہ بھی چھپا نہ رہے گا۔"

"چلو ٹھیک ہے، بات پکی۔" جمیل مضبوط لہجے میں بولا۔

"او کے جی، اللہ حافظ۔" حماد نے یہ کہہ کر ٹیلی فون بند کردیا۔

جمیل ریسیور ہاتھ میں پکڑے گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ اس کا مطلب ہے کہ معاملہ سنجیدہ ہے اور ٹیلی فون کرنے والا جو کوئی بھی ہے، اس کا ہمدرد ہے۔ یہ نزہت کن راہوں پر چل نکلی ہے۔ اس نے اسے کیا دکھ دیا ہے کہ وہ امانت میں خیانت کر رہی ہے۔ کیسی عیار عورت ہے۔ کہتی ہے کہ اگر آپ کے سامنے کوئی شہزادہ بھی آجائے تو میں اس پر تھوکوں بھی نہیں۔ حد ہے کوئی محبت کی! گھر میں وہ اس کا کس قدر خیال رکھتی ہے۔ ہر وقت اس کے لیے بچھی بچھی رہتی ہے۔ عورت آدمی کو ایک حد تک ہی بے وقوف بنایا جاسکتا ہے۔ ساری عمر کون بے وقوف بنتا ہے۔

ایسی باتیں بھلا کہاں چھپتی ہیں۔ ایسی باتوں کے پر ہوتے ہیں۔ وہ بند کمروں سے بھی

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

اڑ جاتی ہیں۔

شام کو وہ دفتر سے گھر پہنچا تو بجھا بجھا سا تھا۔ گھر میں داخل ہوتے ہی اس نے اپنے چہرے پر مسکراہٹ سجالی۔ ادھر نزہت نے بھی اسے دیکھتے ہی چہرے پر نقاب چڑھالی۔ اسے دیکھ کر کھل اٹھی جیسے بڑی بے قراری سے اس کی آمد کی منتظر تھی۔

جمیل نہا دھو کر باتھ روم سے نکلا تو چائے تیار تھی۔ نزہت نے ٹیلی ویژن کھول دیا۔ نغموں کا پروگرام آرہا تھا۔ دونوں نے ٹی وی لاؤنج میں چائے پی۔

چائے پی کر جمیل نے کپڑے تبدیل کیے۔ کپڑے تبدیل کرتے دیکھ کر نزہت نے پوچھا۔ ''کدھر؟''

''ایک دو فلموں کے کیسٹ لے آؤں۔''

''ہاں ٹھیک ہے، کل تو چھٹی ہے۔ رات کو اطمینان سے دیکھیں گے۔'' نزہت نے کہا، پھر ایک دو انڈین فلموں کے نام بتائے۔

ویڈیو شاپ نزدیک ہی تھی۔ وہ دس پندرہ منٹ میں کیسٹ لے کر واپس آ گیا۔ ایک انگریزی فلم تھی اور ایک انڈین۔

کھانے سے فارغ ہو کر جمیل نے پہلے انگریزی فلم لگا دی۔ یہ فلم ایک شادی شدہ عورت کی زندگی پر مبنی تھی جو شوہر کی غیر موجودگی میں اپنے دوست سے ملتی ہے۔ اس کا شوہر بے حد شریف تھا۔ اس کا ہر طرح خیال رکھتا تھا لیکن پھر بھی اس کی بیوی ناپسندیدہ حرکتوں سے باز نہیں آتی۔ ایک دن وہ ان دونوں کو رنگے ہاتھوں پکڑ لیتا ہے اور مشتعل ہو کر دونوں کو قتل کر دیتا ہے۔

فلم ختم ہوئی تو دونوں کچھ دیر سناٹے میں بیٹھے رہے۔ پھر نزہت نے خود کو سنبھالا اور بڑے دوٹوک لہجے میں بولی۔ ''میں اگر اس فلم کے ہیرو کی جگہ ہوتی تو اس عورت کو قتل کرنے میں اتنی دیر نہ لگاتی۔ وہ خوامخواہ ڈھیل دیتا رہا۔''

یہ بات سن کر جمیل نے اسے چونک کر دیکھا۔ یہ عورت کس قدر عیار ہے۔ اپنے کمزور ہونے کا کہیں سے کوئی سراغ دینا نہیں چاہتی۔

''لیکن اگر میں اس ہیرو کی جگہ ہوتا تو کبھی قتل جیسا اقدام نہ کرتا۔ بس اسے جا کر طلاق بھجوا دیتا۔'' جمیل نے آخر اسی کا سا انداز اختیار کیا۔ آخر وہ اپنے دل کی بات کیوں بتائے۔ وہ اگر اسے گمراہ کر رہی ہے تو اسے بھی گمراہ کرنا آتا ہے۔

فلموں سے فارغ ہو کر جب جمیل بیڈ پر لیٹنے لگا تو اس نے نزہت سے کہا۔ ''ذرا وہ ریوالور لانا۔''

''یہ رات کے ایک بجے آپ کو ریوالور کیسے یاد آ گیا؟''

''ذرا لاؤ، بہت دن سے میں نے اسے دیکھا نہیں۔ کہیں زنگ نہ لگ گیا ہو۔''

''اب دن میں دیکھ لیجیے گا۔''

''اچھا، چھوڑو، میں خود لے آتا ہوں۔'' یہ کہہ کر جمیل اٹھنے لگا۔

''نہیں، یہ مطلب نہیں۔ میں لائے دیتی ہوں۔ آپ بیٹھیں۔''

ریوالور الماری کے سیف میں بند تھا۔ نزہت تھوڑی دیر میں ریوالور لے کر آ گئی۔ جمیل نے اسے اپنے ہاتھ میں لے کر اچھی طرح معائنہ کیا، پھر بولا۔ ''صفائی کی ضرورت ہے اسے، اب صبح کروں گا صفائی۔''

یہ کہہ کر اس نے ریوالور تکیے کے نیچے رکھ لیا اور نزہت کو لائٹ آف کرنے کا اشارہ کیا۔

نزہت اس کی اس حرکت کے بارے میں کچھ اندازہ نہ لگا سکی کہ وہ ریوالور تکیے کے نیچے رکھ کر کیوں سو رہا ہے۔ صفائی کرنے کے لیے وہ اسے الماری میں سے بھی نکال سکتا تھا۔ خیر اس نے سوچا کہ اس مسئلے پر کوئی بحث نہیں کرنا چاہیے۔ یہ سوچ کر اس نے لائٹ آف کر دی اور خاموشی سے بستر پر آ کر لیٹ گئی۔

صبح جب نزہت کی آنکھ کھلی تو وہ خلاف معمول اس سے پہلے اٹھ چکا تھا۔ جب کہ وہ روزانہ اسے اٹھاتی تھی اور چھٹی کے دن تو وہ اسے اٹھا اٹھا کر تھک جاتی تھی۔

وہ ایک جھٹکے سے بستر سے اٹھی اور اپنا گاؤن سنبھالتی ہوئی بیڈ روم سے نکلی۔ جمیل ڈرائنگ روم میں بیٹھا بڑے انہماک سے ریوالور کی صفائی میں مصروف تھا۔ اس کے چہرے پر بڑی سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔

نزہت اپنے شانے پر بکھرے ہوئے بالوں کا جوڑا بناتی ہوئی صوفے پر بیٹھ گئی اور ہنستے ہوئے بولی۔ ''آج تو آپ خود ہی جاگ گئے۔''

''جاگنے کا وقت جو ہو گیا تھا۔'' جمیل نے بڑی سادگی سے کہا۔

''اور دنوں میں تو آپ اٹھائے نہیں اٹھتے تھے؟''

''وقت وقت کی بات ہے۔'' جمیل نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''اب سلائے نہیں سوؤں گا۔''

''اچھا، یہ خوب تبدیلی ہے۔'' نزہت یہ کہہ کر ڈرائنگ روم سے نکل گئی۔

ہاں، واقعی یہ خوب تبدیلی ہے۔ انسان کو تبدیل ہونے میں کتنی دیر لگتی ہے۔ وہ سوچنے لگا۔ تبدیل تو وہ دونوں ہی ہو گئے تھے لیکن ایک دوسرے کو نظر نہیں آ رہے تھے۔ جمیل چوکنا ہو گیا تھا جیسے جنگل میں کوئی شکاری کسی درندے کی دہاڑ سن کر چوکنا ہو جائے۔ وہ وقت بے وقت گھر کے چکر لگا لیتا۔ ایک دو مرتبہ اس نے اس کی الماری اور پرس کی تلاشی بھی لی لیکن کوئی قابل گرفت چیز برآمد نہیں ہو سکی۔

کوئی دس پندرہ دن بعد جب جمیل نزہت کے بارے میں اپنی رائے تبدیل کرنے لگا اور سوچنے لگا تھا کہ اس نے خوامخواہ نزہت پر شک کر کے خود کو ہلاکت میں ڈالا۔ اس دس پندرہ دن کی نگرانی میں کوئی بات سامنے نہ آئی تو وقت کی آواز کا فون آ گیا۔

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

"دیکھیں جمیل صاحب، میں نے آپ سے وعدہ کیا تھا کہ اب آخری بار ٹیلی فون کروں گا اور آپ کو وہ منظر دکھا دوں گا جسے شاید آپ برداشت نہ کر سکیں۔ اچھا یہ بتائیں۔ آپ نے ارشاد فارم دیکھا ہے؟"

"نہیں۔"

"خیر کوئی بات نہیں، آپ کاغذ قلم نکالیں اور جو پتا میں بتاؤں، اسے احتیاط سے سمجھنے کے ساتھ ساتھ لکھتے بھی جائیں۔" یہ کہہ کر حماد نے ارشاد فارم کا مکمل پتا اسے سمجھایا۔ پتا سمجھانے کے بعد وہ بولا۔ "یہ ایک بہت خوبصورت فارم ہے۔ یہاں لوگ پکنک کے لیے آتے ہیں۔ یہ فارم عدنان کے ایک دوست کا ہے۔ یہاں پر آسائش کمرے بنے ہوئے ہیں۔ دن کے علاوہ رات کو بھی یہاں ٹھہرا جا سکتا ہے۔ یہاں پکنک پر آنے والے لوگ بہت محدود اور مخصوص ہیں۔ یہاں صرف وہی لوگ آ سکتے ہیں جو فارم کے مالک کے دوست ہیں یا رشتے دار۔ بہر حال تنہائی میں ملنے کی یہ ایک پرسکون جگہ ہے۔ عدنان اور نزہت کل وہاں ہوں گے۔ گیارہ اور تین بجے کے درمیان کھانا کھا کر وہ لوگ واپس آ جائیں گے اور آپ کے پہنچنے سے پہلے نزہت گھر پہنچ چکی ہوگی۔ نزہت آپ سے کل اپنی امی کے ہاں جانے کا بہانہ کرے گی۔ میرا خیال ہے اتنی معلومات ایک غیرت مند شوہر کے لیے کافی ہیں۔ اچھا جناب، اللہ حافظ۔" یہ کہہ کر وقت کی آواز نے ٹیلی فون بند کر دیا۔ وہ ہیلو ہیلو ہی کہتا رہ گیا۔

"وقت کی آواز" کا ٹیلی فون ریسیو کر کے اس نے ایک گہرا اور ٹھنڈا سانس لیا اور کل فارم پر پہنچنے کا منصوبہ بنانے لگا۔

جمیل دفتر جانے کے لیے گھر سے تقریباً پونے نو بجے نکلتا تھا۔ آج بھی وہ حسب معمول پونے نو بجے گھر سے نکلا۔ نزہت روز کی طرح اسے دروازے پر چھوڑنے آئی اور بولی۔

"جمیل، آج میرا امی کی طرف جانے کا ارادہ ہے۔ آپ کہیں تو چلی جاؤں۔ شام کو آپ کے گھر پہنچنے سے پہلے آ جاؤں گی۔"

"ٹھیک ہے، چلی جانا۔" جمیل نے خوشدلی سے کہا۔ "جلدی آنے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ شام کو میں ایک دوست کے یہاں جاؤں گا۔ آٹھ نو بجے تک آ جاؤں گا۔"

"نہیں میں زیادہ دیر نہیں رکوں گی۔ جلدی آ جاؤں گی۔ مجھے بس اپنا گھر اچھا لگتا ہے لیکن یہ گھر آپ کے بغیر اچھا نہیں لگتا۔ آپ ذرا جلدی واپس آ جایئے گا۔" نزہت نے اسے بڑے پیار سے دیکھتے ہوئے کہا۔

جمیل کا جی چاہا کہ ابھی بریف کیس سے ریوالور نکال کر پانچ چھ گولیاں اس کے سینے میں پیوست کر دے۔ پھر پوچھے، اب بتا تجھے کون سا گھر اچھا لگتا ہے۔ مکاری کی بھی آخر کوئی حد ہوتی ہے۔

یہ بات وہ محض سوچ کر رہ گیا۔ ابھی حساب کتاب کا وقت نہیں آیا تھا اور وہ خالص

حساب کتاب کا آدمی تھا۔

"اچھا ٹھیک ہے، میں جلدی آ جاؤں گا۔ تمہارے بغیر تو میں بھی تنہا ہوتا ہوں۔"

"سچ؟" نزہت نے خوش ہو کر کہا۔

"ہاں بالکل سچ۔" جمیل نے جھوٹ سچ کی طرح بولا۔

جمیل کے جاتے ہی نزہت نے فوراً دروازہ بند کر لیا اور گھڑی میں وقت دیکھا۔ عدنان کے آنے میں ابھی ڈیڑھ گھنٹہ باقی تھا۔ ارشاد فارم لاہور سے سترہ اٹھارہ کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ یہ زرعی فارم پھولوں اور پھلوں سے لدا ہوا تھا۔ یہاں ایک سوئمنگ پول بھی تھا۔ ایئر کنڈیشنڈ کمرے تھے۔ باہر کی فضا اگر جنت نظیر تھی تو اندر کا موسم دلپذیر۔

گھڑی دیکھ کر نزہت نے باتھ روم کا رخ کیا۔ وہ گنگناتے ہوئے نہانے لگی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ اگلے دو تین گھنٹوں میں کیا ہونے والا ہے۔ کیسی گھڑی آ پہنچی ہے، برا وقت اور بری گھڑی کبھی بتا کر تھوڑے ہی آتے ہیں۔

ٹھیک ساڑھے دس بجے وہ ایک نوکری اٹھائے نیچے پہنچی تو عدنان اس کا منتظر تھا۔ وہ چند لمحے پہلے وہاں پہنچا تھا۔

"ہم وقت کے معاملے میں کتنے انگریز ہیں۔" عدنان نے ہنستے ہوئے اس کے لیے کار کا دروازہ کھولا۔

"میرا خیال ہے کہ ہم وقت کے معاملے میں ہی نہیں، کچھ اور معاملات میں بھی خاصے انگریز واقع ہوئے ہیں۔" نزہت نے سیٹ پر بیٹھ کر اسے ترچھی نگاہوں سے دیکھا۔

"بھئی بہت اچھے، خوب کہا۔" عدنان نے اس کی بات سمجھتے ہوئے تعریف کی۔

"آداب عرض۔" نزہت نے اسے ایک ادائے خاص سے سلام کیا۔

عدنان نے نزہت کی لائی ہوئی نوکری پچھلی سیٹ پر رکھتے ہوئے گاڑی اسٹارٹ کی۔

"کیا مال ہے اس میں؟"

"سب تمہاری پسند کی چیزیں ہیں۔" نزہت نے کہا۔

"تم بھی میری پسند کی چیز ہو کہ نہیں؟" عدنان نے کہا۔

"یہ تو تم بہتر جانتے ہو گے؟" نزہت نے سڑک کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ایک بات بتاؤ نزہت، یہ جمیل تمہیں بالکل پسند نہیں؟"

"مجھے اس پر بڑا ترس آتا ہے عدنان۔ وہ بہت سیدھا آدمی ہے۔ میں اس سے جیسا کہہ دیتی ہوں، وہ یقین کر لیتا ہے۔"

"ہاں، گدھوں کے سر پر سینگ تھوڑے ہی ہوتے ہیں۔" عدنان نے مذاق اڑایا۔

"شاید وہ مجھ سے محبت کرنے لگا ہے۔" نزہت نے سنی ان سنی کر دی۔

"تمہیں کیا پتا، وہ کہاں کہاں جاتا ہے۔" عدنان نے بدظن کرنے کی کوشش کی۔

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

"میں جانتی ہوں۔ وہ دفتر کے سوا کہیں نہیں جاتا۔ جب مرد ادھر ادھر جانے لگتا ہے تو بیویوں کو فوراً معلوم ہو جاتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ خاموش رہیں۔"

"اس کا مطلب ہے کہ میں تم سے ملتا ہوں تو میری بیوی کو بھی اس کا پتا ہوگا۔" عدنان نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ہاں ہونا تو چاہیے۔" نزہت نے بڑے یقین سے کہا۔

"ارے، کیا فضول بات کر رہی ہو۔ اگر ایسی بات ہو تو پھر کوئی مرد اپنے مرکز سے نہ ہٹ پائے۔ وہ اگر دفتر سے باہر نہیں جاتا ہوگا تو دفتر میں ہی اس نے کوئی سلسلہ جوڑ رکھا ہوگا۔"

"جمیل کے دفتر میں کوئی لڑکی نہیں۔" نزہت نے بڑے وثوق سے کہا۔ "اور نہ وہ ایسا ہے۔"

"یعنی ہم سا۔" عدنان نے نکڑا لگایا۔

"جی ہم سا۔" نزہت نے جواب دیا۔

"کیا تم مجھ سے مل کر پچھتاتی ہو؟" عدنان نے سگریٹ سلگایا۔

"پچھتاتی تو تمہارے ساتھ نہ جا رہی ہوتی۔" نزہت نے اسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا "لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہم اس گناہ کو ثواب سمجھ لیں۔ میں بہت حقیقت پسند واقع ہوئی ہوں۔ میں گناہ کو کبھی ثواب نہیں کہہ سکتی اور نہ میں رک سکتی ہوں۔ اللہ جانے کیا حشر ہوگا ہم دونوں کا۔"

"ارے یہ کیا بکواس شروع کر دی۔" پھر عدنان نے منی بیگم کی غزلوں کا ایک کیسٹ لگا دیا اور آواز اچھی خاصی تیز کر دی۔ پھر وہ خاموشی سے کیسٹ سنتے رہے۔

گیارہ بجے تک وہ ارشاد فارم پہنچ گئے۔

چوکیدار گل بابا عدنان کو اچھی طرح پہچانتا تھا۔ اسے دیکھ کر اس نے فوراً کمرہ کھول دیا۔ گاڑی سے نوکری نکال کر میز پر رکھ دی اور پوچھا۔ "صاحب جی، چائے وغیرہ بناؤں؟"

"نہیں گل بابا، شکریہ۔ چائے ہم خود بنا لیں گے۔" عدنان نے کہا۔ "کیوں نزہت ٹھیک ہے نا؟"

"ہاں اور کیا۔" نزہت نے جواب دیا۔

"اچھا ٹھیک ہے صاحب جی۔ کچن میں سب سامان موجود ہے۔ کسی اور چیز کی ضرورت ہو تو مجھے بتا دیجئے گا۔ میں ذرا باغ کا چکر لگا آؤں۔"

گل بابا کے جانے کے بعد عدنان نے دروازہ بند کر کے اے سی کھول دیا اور بولا۔ "کچھ دیر آرام کر لیں، پھر باہر نکل کر گھومتے ہیں۔"

"عدنان یہ بہت خوبصورت جگہ ہے۔ ہائے تم مجھے پہلے کیوں نہیں لائے یہاں۔"

"ابھی تم نے دیکھا ہی کیا ہے۔ گاڑی میں بیٹھ کر تو کوئی خاص چیز تمہیں نظر نہیں آئی

ہوگی۔ یہاں ایک تالاب ہے جس میں بڑی خوبصورت مچھلیاں ہیں۔ ایک گوشے میں کچھ چرند پرند ہیں۔ ہرن، مور وغیرہ۔ ایک بہت حسین فوارہ ہے۔ ایک پل ہے جس کے نیچے سے پانی بہتا رہتا ہے۔ پھلوں سے لدے درخت ہیں۔ بہت کچھ ہے یہاں۔ بس یوں سمجھ لو کہ ایک جنت آباد ہے۔ تم ذرا اپنے حسین ہاتھوں سے چائے بنا لو، چائے پی لیں تو چلیں۔"

"ہاں ٹھیک ہے، بتاؤ کدھر ہے کچن؟"

"آؤ میرے ساتھ۔" عدنان نے کہا۔

کچن کمرے سے ملحق ہی تھا لیکن اس کا راستہ باہر سے تھا۔ دونوں کمرے سے نکل کر کچن میں آ گئے۔

"ایسی جگہ آدمی کا گھر ہونا چاہیے۔" نزہت نے کھڑکی سے دور تک دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم ٹھیک کہتی ہو، میں بھی ایک چھوٹا سا فارم بنانے کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ میں وہاں کمرہ بنوانے کے بجائے چھوٹا سا گھر بنواؤں گا اور وہاں ہم تم رہا کریں گے۔" عدنان نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"خواب تو برا نہیں۔" نزہت نے ہنستے ہوئے کہا۔ "آپ فی الحال کمرے میں چلیں، میں چائے لے کر آتی ہوں۔"

"میں کچھ مدد کروں؟" عدنان نے قریب ہو کر پوچھا۔

"جی بالکل نہیں، مجھے مردوں کا کچن میں گھسنا بالکل پسند نہیں۔"

"او کے جناب، ہم آپ کی مملکت سے نکلے جاتے ہیں۔" عدنان یہ کہہ کر ہنستا ہوا کمرے میں چلا گیا۔

چند منٹ بعد نزہت چائے بنا کر لے آئی۔ عدنان اس وقت پلنگ پر لیٹا چھت کو گھور رہا تھا۔ وہ نزہت کو دیکھ کر فوراً اٹھ بیٹھا اور وہاں سے صوفے پر آ گیا۔ نزہت نے ٹرے میز پر رکھی۔ پھر اس نے چائے پیالیوں میں نکالی۔

"لیجئے جناب چائے۔" اس نے ایک پیالی عدنان کی طرف بڑھائی۔

"اب اسے میٹھی بھی کر دو۔"

"شکر ڈال دی ہے میں نے۔"

"مجھے معلوم ہے، آپ ذرا اس میں سے ایک گھونٹ پی لیں۔"

"اپنی چائے کیوں جھوٹی کرواتے ہو؟"

"جھوٹی نہیں ہوگی، بچی ہو جائے گی۔"

"عدنان کیا تم اپنی بیوی کی بھی جھوٹی چائے پیتے ہو؟"

"توبہ کرو۔"

"کیوں؟"

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

"اصل میں یہ سب وہاں اچھا لگتا ہے جہاں پیار ہو، محبت ہو۔ محبت کے بغیر سب پھیکا ہے۔ بے رس ہے۔"

"تمہیں بہت محبت ہے مجھ سے؟"

"ہاں یہ کوئی پوچھنے والی بات ہے۔"

"پھر میں طلاق مانگ لوں جمیل سے؟"

"وہ دے دے گا؟"

"مانگ کر دیکھ لیتی ہوں۔ میرا خیال ہے کہ وہ انکار نہیں کرے گا۔"

"وہ پوچھے گا تو آخر تمہیں کیا تکلیف ہے؟"

"میں اسے صاف صاف بتا دوں گی۔"

"کیا بتا دو گی؟"

"یہی کہ مجھے عدنان ہو گیا ہے۔"

"واہ بہت خوب، جی خوش کر دیا تم نے۔" عدنان نے اس کے جملے سے محظوظ ہوتے ہوئے کہا۔

"تم کیا کرو گے؟"

"کیا تم سنجیدہ ہو؟"

"سنجیدہ ہو بھی جاؤں تو اس سے کیا ہوگا۔ جب وقت تھا، تب بہادری نہ دکھائی۔ اب تو صورت ہی کچھ اور ہے۔ کاش! ہم دونوں بزدل نہ ہوتے۔ میں سوچتی ہوں، اس طرح ہم کب تک ملیں گے۔ ہماری یہ ملاقاتیں کب تک راز رہیں گے۔ ایک نہ ایک دن یہ راز ضرور افشا ہو جائے گا۔ ہو سکتا ہے آج ہی ہو جائے یا ممکن ہے دو چار ماہ لگ جائیں۔ ایسی صورت میں ہمارا کیا بنے گا۔ اس دن سے لرزتی ہوں۔"

"ارے دیکھا جائے گا، فکر مت کرو۔ اگر کوئی ایسی بات ہوئی تو میں تمہیں تنہا نہ چھوڑوں گا۔" عدنان نے اسے یقین دلانے کی کوشش کی۔

"میں جانتی ہوں۔" نزہت نے یقین کر لیا۔ "لیکن بدنامی سے ڈرتی ہوں۔ گھر والے کیا کہیں گے، دنیا کیا کہے گی؟"

نزہت جس بدنامی سے ڈر رہی تھی اور جس بری گھڑی کی آمد سے لرز رہی تھی وہ بری گھڑی سر پر آ پہنچی تھی۔ بدنامی کے دروازے کھل چکے تھے لیکن وہ دونوں اس سے بے خبر اپنے آپ میں مگن تھے۔ پرفضا مقام اور پرسکون کمرے کی لذتوں سے بہرہ ور ہو رہے تھے۔

اور باہر انہیں موت تلاش کرتی پھر رہی تھی۔ انہیں کیا معلوم تھا کہ زندگی نے اب ساتھ چھوڑ جانے کی قسم کھالی ہے۔ اگر انہیں معلوم ہوتا تو شاید زندگی کے ان باقی ماندہ لمحات میں توبہ کے در پر دستک دیتے۔ کیا پتا کہ توبہ ان پر اپنے دروازے کھول دیتی لیکن اب کچھ ممکن نہ تھا اور جو ممکن

تھا، وہ ہوا چاہتا تھا۔

زندگی سے لمحہ لمحہ رس نچوڑنے والے اس وقت چونکے جب دراز رسی کو ایک دم کھینچ لیا گیا۔

جمیل نے دروازے کو زور سے ٹھوکر ماری۔ دروازہ اندر سے بند نہ تھا۔ وہ محبوب کی بانہوں کی طرح فوراً کھل گیا۔ جمیل ہاتھ میں ریوالور لیے تیزی سے اندر داخل ہوا۔ اس نے دونوں سانپوں کو بیڈ پر لیٹے دیکھا۔

اس منظر نے اس کی آنکھوں میں شعلے بھر دیئے۔ اس دھوکے، اس فریب نے اس کے تن بدن میں آگ لگا دی۔ اس کے دل پر جیسے کسی نے پے در پے وار کیے۔

تب اس کے ہاتھ میں دبا ریوالور شعلے اگلنے لگا۔ ان سانپوں کے سر کچلنے لگا۔ گولیوں کی بوچھاڑ نے دونوں کے بدن کو لہولہان کر دیا۔ زندگی ان سے روٹھ گئی اور بدنامی کے تمام دروازے بیک وقت کھل گئے۔

موت کا منظر لہو میں ڈوبے ہوئے بدن اور ان کا تڑپتا جسم کئی دن تک جمیل کی نگاہوں میں گھومتا رہا۔ اس خونی منظر نے اس کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ وہ اس منظر کو جتنا بھلانا چاہتا تھا، اتنا ہی وہ تروتازہ ہو کر اس کے سامنے آ جاتا۔ پھر آہستہ آہستہ خون میں ڈوبی ہوئی ان لاشوں کا منظر اس کے لاشعور میں پیوست ہوتا چلا گیا۔

ان خون میں لتھڑی ہوئی نفرت انگیز لاشوں سے کسی کو دلچسپی نہ تھی۔ چاہے وہ عدنان کے والدین ہوں یا نزہت کے گھر والے۔ جمیل ہو یا عدنان کی بیوی۔ عدنان کے دوست علیم کو بھی جس کے فارم پر ان دونوں کا قتل ہوا تھا، دلچسپی نہ تھی۔ جب مرنے والوں سے کسی کو ہمدردی نہ ہو بلکہ وہ ان کے کارنامے سن کر لرزتے ہوں تو پھر ایسے کیس میں پولیس کو کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ ہماری پولیس تو ویسے بھی روایات کی ماری ہے۔ بس روایتی انداز میں تفتیش جاری رہی۔ اس سکینڈل کو علیم نے اپنے اثر و رسوخ سے کام لے کر اخبارات میں بھی نہ چھپنے دیا۔ اس طرح اخبار اس سکینڈل کو نہ چھاپ کر اپنی اشاعت بڑھانے سے محروم رہ گیا۔ نہ مقتولین کی حسین و جمیل تصویریں چھپیں، نہ سنسنی خیز رپورٹیں شائع ہوئیں۔ کچھ بھی نہ ہوا۔

اس حادثے نے جمیل کی زندگی کو بہت متاثر کیا۔ وہ بجھ کر رہ گیا۔ پہلے تو اسے پکڑے جانے کے خوف نے بوکھلائے رکھا۔ پھر جب پولیس روایتی انداز میں اس کے سامنے سے گزر گئی تو اسے کچھ وقتی طور پر اطمینان نصیب ہوا۔

جمیل اس فلیٹ کو چھوڑ کر اپنے والدین کے پاس آ گیا۔ یہ فلیٹ نزہت کو جہیز میں ملا تھا۔ اسی کے نام پر تھا۔ جمیل نے اس گھر کو تالا لگا کر چابی نزہت کے والد کے حوالے کر دی۔

"یہ اس گھر کی چابی ہے جو آپ نے بیٹی کو دیا تھا۔ میں نے وہاں سے اپنی چیزوں کے علاوہ کچھ نہیں اٹھایا ہے۔ جیسا سجا سجایا گھر آپ نے دیا تھا، ویسا ہی آپ کو لوٹا رہا ہوں۔ یہ گھر اور

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

سامان آپ نے جس کو دیا تھا، جب وہی نہ رہی تو میں اس گھر کا کیا کروں گا۔ میں اب اس گھر میں نہیں رہ سکتا۔ اس کے ساز و سامان کو استعمال نہیں کر سکتا۔ اس لیے میں یہ چابی آپ کے حوالے کر رہا ہوں۔ میں نے اپنی قسمت کے لکھے کو قبول کر لیا ہے۔ آپ بھی اپنی قسمت کے لکھے کو بھول جائیے۔"

یہ کہہ کر جمیل وہاں سے چلا آیا۔ نزہت کے والد اپنی آنکھوں میں آنسو بھرے میز پر پڑی اس چابی کو دیکھتے رہے اور اپنی قسمت کے لکھے کو روتے رہے۔

جمیل کا پھر اس شہر میں جی نہ لگا تو اس نے سعودی عرب کا رخ کیا۔ وہاں اسے بہت اچھی جاب مل گی۔ وہاں بھی وہ بے چین رہا۔ بے کل رہا۔ وہ کبھی اپنا تجزیہ کرنے بیٹھتا تو کچھ سمجھ میں نہ آتا کہ وہ پریشان کیوں ہے۔ بیٹھے بٹھائے اسے زندگی اجیرن کیوں معلوم ہوتی ہے۔ اس پر کرب کی سی کیفیت کیوں چھا جاتی ہے۔ وہ اداس کیوں ہو جاتا ہے؟

وہاں جب کسی طور دل نہ لگا تو وہ اپنے وطن واپس آ گیا۔

یہاں اسے گلشن مل گئی جس نے اس کی زندگی گل و گلزار بنا دی۔ وہ سب کچھ بھول گیا۔ اس نے ارادتاً سب کچھ بھلانے کی کوشش کی۔ بظاہر وہ بھول بھی گیا اور بھولنے کی اس شعوری کوشش نے اسے نفسیاتی مریض بنا دیا۔ وہ جس فریب نظر میں مبتلا تھا، اس کے ڈانڈے خون سے لتھڑی ہوئی لاشوں سے ملتے تھے۔ وہ ایک کا نہیں دو انسانوں کا قاتل تھا۔ ضمیر کی خلش اسے بے چین رکھتی تھی۔ وہ ایک عذاب میں مبتلا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اسے خون دیکھ کر کیوں خوف آتا ہے جہاں وہ نظریں جما دیتا ہے، وہاں سے خون ٹپکتا کیوں دکھائی دیتا ہے لیکن وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ کسی کو اپنے قاتل ہونے کا بتا نہیں سکتا تھا۔

اسی اظہار کی بندش نے اسے اندھے کنویں میں پھینک دیا تھا۔ وہ لحہ بہ لحہ مر رہا تھا۔ خود کو مرتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ کتنا بے بس تھا وہ۔

ادھر حماد نے اسے فون کر کے ایک عذاب میں مبتلا کر دیا تھا۔ اگرچہ اس نے حماد سے بڑے اکڑ کر بات کی تھی لیکن وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ یہ اکڑ کتنی کھوکھلی ہے۔ وقت کی آواز کی گواہی اسے تختہ دار تک لے جا سکتی ہے۔

آخر وہ کیا چاہتا ہے؟ اسے بلیک میل کرنا؟

وہ لاہور سے کراچی کس طرح آ گیا؟ اگر آ گیا ہے تو اس نے اسے کیسے تلاش کر لیا؟ لاہور میں اس کے والدین کے علاوہ کوئی اس کے پتے سے واقف نہیں۔ پھر اس نے اسے کیسے ڈھونڈ لیا۔ نہ صرف ڈھونڈ لیا بلکہ اس کا ٹیلی فون نمبر بھی معلوم کر لیا۔

اس نے انتظار کرنے کو کہا ہے۔ کیا وہ غصے میں آ کر پولیس کو مطلع کر دے گا یا پھر وہ خود نفس نفیس اس سے ملنے آئے گا۔ اسے دھمکانے کے لیے۔

شاید وہ جونک کی طرح اس سے چمٹ جانا چاہتا ہے۔

ایک جونک تو فریب نظر اور خوف کی صورت میں پہلے ہی اس سے چمٹی ہوئی ہے۔ اب یہ نیا عذاب تو اس کی زندگی اجیرن کر کے رکھ دے گا۔

پھر وہ کیا کرے؟

اس سے پہلے کہ وقت کی آواز اسے گرفتار کروائے یا بلیک میل کر کے اس کی زندگی اجیرن کر دے۔ اسے خود ہی پولیس اسٹیشن پہنچ جانا چاہیے۔ اس خوف میں مبتلا زندگی نے یوں بھی اسے کہیں کا نہ رکھا تھا۔

تب اس نے ایک فیصلہ کر لیا اور یہ فیصلہ ایسا تھا جو اسے آج نہیں تو کل کرنا پڑتا۔ اگر نہیں کرتا تو کروا دیا جاتا۔

☆.....☆.....☆

گلشن بڑی بے چینی سے جمیل کا انتظار کر رہی تھی۔

وہ ابھی تک گھر نہیں پہنچا تھا۔ وہ اگر گوشت لینے رک گیا تھا تو بھی اسے اب تک گھر پہنچ جانا چاہیے تھا۔ وہ نیچے بیکری سے جا کر اس کے دفتر بھی ٹیلی فون کر آئی تھی۔ یہ دفتر کا وقت نہ تھا۔ اس نے احتیاطاً ٹیلیفون کیا تھا۔ شاید وہ کام سے دفتر میں رک گیا ہو۔ وہاں گھنٹی بجتی رہی۔ ٹیلیفون اٹھانے والا کوئی نہ تھا۔

ابھی وہ اسی پریشانی میں گھوم رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ کیا کرے؟ اتنے میں گھنٹی بجی۔ شاید جمیل آ گئے۔ وہ بھاگ کر دروازے پر پہنچی۔ جھپٹ کر دروازہ کھولا۔ وہ جمیل سمجھ کر کچھ کہنے ہی والی تھی کہ لفظ اس کی زبان پر آ کر اٹک گئے۔

دروازے پر جمیل نہ تھا۔ پولیس والا تھا۔

"جی فرمائیے۔" گلشن نے پوچھا۔

"یہ جمیل صاحب کا گھر ہے؟"

"جی ہاں۔"

"جمیل صاحب کہاں ہیں جی؟" پولیس والا بولا۔

"مجھے نہیں معلوم، میں خود ان کے لیے پریشان ہو رہی ہوں۔ پتا نہیں کہاں چلے گئے۔"

"انہوں نے کہاں جانا ہے جی۔ وہ تھانے میں بیٹھے ہیں۔" انکشاف ہوا۔

"تھانے میں بیٹھے ہیں؟" گلشن پہلے ہی کیا کم پریشان تھی اور پریشان ہو گئی۔ "لیکن کیوں؟"

"وہ قاتل ہیں جی۔ انہوں نے لاہور میں دو بندوں کو قتل کیا تھا۔ اچھا جی اب میں چلتا ہوں۔ میں آپ کو صرف اطلاع دینے آیا تھا۔ باقی کی معلومات آپ تھانے آ کر لیں۔ اچھا جی سلام علیکم۔" یہ کہہ کر کانسٹیبل نے ایک لحہ بھی انتظار نہ کیا۔ اس نے پیچھے ہٹ کر بھی نہ دیکھا کہ اس انکشاف نے گلشن پر کیا قیامت ڈھائی ہے۔

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

☆.....☆.....☆

حماد نے جمیل کے دفتر کا ٹیلی فون نمبر ڈائل کیا اور بڑی بے قراری سے ادھر سے ریسیور اٹھائے جانے کا انتظار کرنے لگا۔

"ہاں جی، کس سے بات کرنا ہے؟"

"جمیل صاحب سے۔"

"آپ ہولڈ کریں۔" آپریٹر نے نرمی سے کہا۔

چند لمحوں کے بعد پھر کسی نے ریسیور اٹھایا۔ "ہیلو!"

لیکن یہ جمیل کی آواز نہ تھی۔

"مجھے جمیل صاحب سے بات کرنا تھی۔"

"وہ تو ابھی دفتر آئے نہیں اور اب آئیں گے بھی نہیں۔" ادھر سے بولنے والے کے لہجے میں تمسخر تھا۔

"کیا مطلب؟" حماد حیران ہوا۔

"مطلب یہ کہ وہ اس وقت حوالات میں ہیں۔ انہوں نے لاہور میں دو بندوں کو قتل کیا تھا۔ کل شام کو تھانے پہنچ کر انہوں نے خود ہی اقبال جرم کر لیا۔"

"اوہ" یہ سن کر حماد کو جھٹکا سا لگا۔ "یہ تو انہوں نے بڑی حماقت کی۔ ویسے آپ کون صاحب بول رہے ہیں؟"

"میں جمیل صاحب کا اسسٹنٹ ہوں، شفیع احمد۔"

"شفیع صاحب، کیا آپ میرا ایک پیغام ان تک پہنچا دیں گے؟"

"جی میں کوشش کروں گا۔ آپ فرمائیں کیا کہنا چاہتے ہیں؟"

"پہلے تو آپ میرا نام سن لیں، میرا نام ہے وقت کی آواز۔"

"وقت کی آواز، یہ کیا مذاق ہے؟"

"شفیع صاحب میں آپ سے جو کچھ کہہ رہا ہوں۔ اسے بغیر مداخلت کیے غور سے سن لیں۔ آپ کی سمجھ میں کچھ نہیں آئے گا لیکن وہ فوراً سمجھ جائیں گے۔ ہاں تو میں وقت کی آواز ہوں۔ میرا مقصد جمیل صاحب کو نقصان پہنچانا ہرگز نہیں تھا۔ میں یہاں کراچی میں ایک ماہ سے تھا۔ بالکل اتفاق سے میں نے جمیل صاحب کو اپنے برابر والی بلڈنگ کے گیٹ سے نکلتے دیکھ لیا۔ پھر چوکیدار سے میں نے ان کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ اس نے مجھے انکوائری آفس سے ان کا ٹیلی فون نمبر لے کر دے دیا۔ میں یہاں اپنے چچا کے پاس ٹھہرا ہوں۔ نوکری کی تلاش میں آیا تھا۔ مجھے ملازمت مل گئی ہے۔ میں آج لاہور واپس جا رہا ہوں۔ اپنا سامان وغیرہ لے کر واپس آؤں گا اور اس وقت میں نے انہیں یہ بتانے کے لیے ہی ٹیلی فون کیا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ جمیل صاحب ایسی احمقانہ حرکت کر بیٹھیں گے۔ مجھے اگر انہیں گرفتار کرانا تھا تو اسی وقت کروا

دیتا۔ میں ان کا ہمدرد ہوں، بس جی۔ مجھے یہی کچھ کہنا تھا۔"

☆.....☆.....☆

صبح ٹیلی فون پر ہونے والی گفتگو کی روداد شفیع احمد نے جمیل کے سامنے بیان کر دی۔ وہ "وقت کی آواز" کا پیغام سن کر مسکرا دیا اور بڑے یقین سے بولا۔

"نہیں شفیع، میں نے کوئی حماقت نہیں کی بلکہ اقبال جرم کر کے میں نے عقلمندی دکھائی ہے۔ فرض شناسی کا ثبوت دیا ہے۔ وقت کی آواز نے ٹھیک کہا ہے، وہ واقعی میرا ہمدرد ہے۔ تم نہیں جانتے کہ جب میں نے تھانے آ کر اقبال جرم کیا۔ اس قتل کی واردات کی ایک ایک تفصیل یہاں تعینات چوکیدار کو بتائی تو مجھے کتنا سکون ملا۔ میں اقبال جرم کر کے ایک دم ہلکا پھلا ہو گیا۔ میں تتلی بن کر فضا میں اڑنے لگا۔ پھر ایک فائدہ مجھے اور ہوا۔ میری بیماری سے تو تم واقف ہو۔ میں کس عذاب میں مبتلا تھا۔ رات کو یہاں حوالات میں دو قیدیوں میں لڑائی ہوئی۔ اس گتھم گتھا میں ایک قیدی کا سر دیوار سے ٹکرایا اور پھٹ گیا۔ اس کے سر سے خون بہہ کر کپڑوں پر آ گیا۔ اگر کوئی اور وقت ہوتا تو اس خون کو دیکھ کر مجھے دورہ پڑ جاتا لیکن اس وقت ایسا نہیں ہوا۔ میں بڑے اطمینان سے اس خون کو دیکھتا رہا۔ اب تم ہی بتاؤ شفیع کہ میں نے اقبال جرم کر کے اچھا کیا یا برا؟"

☆.....☆.....☆

جمیل جب بھی گلشن کا چہرہ دیکھتا تو اس کا سر ندامت سے جھک جاتا اور آنکھیں بھیگ جاتیں۔ اب بھی ایسا ہی ہوا۔ وہ گلشن کو دیکھ کر بڑی آزردگی سے بولا۔ "گلشن مجھے معاف کر دینا، میں نے تم سے حقیقت چھپائی۔"

"کوئی بات نہیں جمیل۔ میں خوش ہوں کہ تم نے اقبال جرم کر لیا۔ اب تم فکر نہ کرو، میں تمہارا کیس لڑوں گی۔ میں تمہیں بچاؤں گی۔ تم بنیادی طور پر ایک اچھے اور سچے انسان ہو۔ بس ظالم حالات نے اچانک تمہیں قاتل بنا دیا۔ قتل کرنے سے پہلے تم ایک اچھے انسان تھے۔ قتل کرنے کے بعد بھی تم ایک اچھے انسان رہے۔ تم نے پہلے ایک عورت کی بے وفائی دیکھی۔ اب تم ایک عورت کی وفاداری دیکھنا۔ میں تمہارا انتظار کروں گی جمیل۔ جب تک تم باہر نہیں آؤ گے۔ تمہاری آس میں رہوں گی اور تمہاری ہو کر رہوں گی۔ تم فکر مت کرنا۔"

☆.....☆.....☆

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

لپ اسٹک

درخشاں کو ہیبت ناک' دہشت ناک اور خوفناک فلمیں دیکھنے کا جنون کی حد تک شوق تھا اور جتنا شوق تھا' اسے اتنا ہی ان فلموں کو دیکھ کر ڈر لگتا تھا۔

پاکستان میں تو خیر کوئی مسئلہ نہ تھا' لیکن جب سے وہ امریکا آئی تھی' ان ہورر فلموں کا کریز اس کے لیے جان لیوا ہو گیا تھا۔

پاکستان میں اس کی چھوٹی بہن گل افشاں اس کے ساتھ ہوتی تھی۔ گل افشاں کرکٹ اور فلموں کا کمپیوٹر تھی۔ کرکٹ کا کوئی بھی مسئلہ ہوتا' مثلاً کس کھلاڑی نے کس سن میں پہلی سنچری بنائی تھی۔ کس ٹیم سے مقابلہ تھا' کس شہر میں تھا۔ اگر اس دن بارش کی وجہ سے میچ نہیں ہو سکا تھا تو یہ اور اس سے متعلقہ تمام معلومات وہ اس قدر تیزی سے بیان کرتی تھی کہ اس کے حافظے پر حیرت ہوتی تھی۔ یہی حال فلموں کا تھا۔ فلمیں چاہے بھارتی ہوں' پاکستانی ہوں' انگلش ہوں' سب کے بارے میں یکساں معلومات رکھتی تھی۔ کسی بھی اداکارہ کا ذکر ہوتا' وہ اس کے سن ولادت سے لے کر شادیوں' طلاقوں اور بچوں تک کا حال بیان کر دیتی۔ کون سا گانا کس فلم کا ہے۔ یہ بتانا تو اس کے لیے بالکل مشکل نہ ہوتا۔ وہ تو یہ بھی بتا دیتی تھی کہ اس گانے کو کس نے گایا' کس اداکار پر پکچرائز ہوا اور اس اداکار نے کیسے اور کس رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ اس کا موڈ ہوتا تو وہ بیک وقت تین فلمیں دیکھتی اور مجال ہے کہ ایک فلم کی کہانی' دوسری فلم میں گڈمڈ ہو جائے۔

گل افشاں کو محبت سے بھری فلمیں زیادہ پسند تھیں جبکہ درخشاں لو سٹوری سے دور بھاگتی تھی۔ اسے خوفناک اور جرائم کی فلمیں بہت اچھی لگتی تھیں۔ دونوں بہنیں ایک ہی گھر میں پلی بڑھی تھیں' ایک ہی والدین تھے' ایک جیسا ماحول ملا تھا۔ پھر بھی دونوں کی پسند و ناپسند میں زمین آسمان کا فرق تھا۔

گل افشاں کہتی۔ ''باجی' تو الا بلا قسم کی فلمیں کیوں دیکھتی ہے؟''

درخشاں' گل افشاں سے بڑی تھی' اس لیے وہ اسے باجی کہتی تھی' لیکن اتنی بڑی نہ تھی کہ وہ اسے 'آپ' کہہ کر مخاطب کرتی۔ وہ اسے بڑی بے تکلفی سے 'تو' کہتی اور وہ اس 'تو' کو سن کر ناراض نہ ہوتی۔

''ہائے گل' ڈراؤنی فلمیں دیکھ کر بڑا مزہ آتا ہے۔'' درخشاں کہتی۔

''مزہ آتا ہے تو انہیں دیکھ کر سویا بھی مزے سے کر' مجھے کیوں رات بھر پریشان کرتی ہے۔''

''میں کہاں پریشان کرتی ہوں' میں تو بڑے آرام سے سو جاتی ہوں۔'' وہ صاف جھوٹ بولتی۔

''ہاں' میں کہاں پریشان کرتی ہوں۔'' وہ سفید جھوٹ سن کر کلبلا اٹھتی۔ ''پھر وہ بچوں کی طرح چٹ کر کون سوتا ہے۔ کمرے کی لائٹ بجھاتی ہوں تو رونے بیٹھ جاتی ہے۔ دروازے' کھڑکیاں اندر سے بند ہونے کے باوجود ان میں موجود ہر سوراخ میں کپڑے ٹھونسنے کی کوشش کون کرتا ہے؟''

''میں کرتی ہوں' تو دیکھتی نہیں ہے کہ فلموں میں آسیب اسی طرح اندر داخل ہوتے ہیں۔ اس لیے دروازے کے تالے کے سوراخ' میں کپڑا ٹھونسنا پڑتا ہے۔'' وہ بڑی سادگی سے کہتی۔

''جب تجھے اتنا ڈر لگتا ہے تو ایسی فلمیں دیکھتی کیوں ہے؟'' گل افشاں اسے ڈانٹتی۔

''تو تو جیسے بڑی بہادر ہے' ڈرتی ہی نہیں۔''

''میں ڈرتی ہوں' میں نے کب کہا کہ نہیں ڈرتی' اسی لیے میں ڈراؤنی فلمیں نہیں دیکھتی۔''

اور یہ حقیقت تھی جب درخشاں وی سی آر پر کوئی ڈراؤنی فلم لگاتی تو وہ پیٹھ موڑ کر بیٹھ جاتی۔ رات کو جب درخشاں کو فلم دیکھنا ہوتی تو وہ ٹی وی لاؤنج سے ٹی وی ٹرالی اندر کمرے میں کھینچ لاتی اور اسے بیڈ کے عین سامنے کر کے خود بیڈ پر بیٹھ جاتی۔ کھڑکیاں پہلے ہی بند ہوتیں' دروازہ بھی بند کر دیا جاتا۔ درخشاں کو یہ سب اہتمام کرتے دیکھ کر گل افشاں سمجھ جاتی کہ ٹی وی پر اب ہیبتناک شکلیں ابھرنے والی ہیں۔ وہ فوراً کمبل اوڑھ کر لیٹ جاتی' لیکن درخشاں اسے ایسا کرنے نہ دیتی' کہتی۔ ''میری پیاری بہن' لیٹ مت' نہیں تو تو سو جائے گی' پھر میں اکیلے فلم کس طرح دیکھوں گی۔''

نتیجے میں اسے اٹھ کر بیٹھنا پڑتا۔ دونوں بہنوں کو ایک دوسرے سے محبت بہت تھی۔ یہاں وہ ایک دوسرے سے جھگڑتی رہتی تھیں۔ وہاں ایک دوسرے کا خیال بھی رکھتی تھیں۔ گل افشاں اس کی خوشامد کرنے پر پیٹھ موڑ کر بیٹھ جاتی۔

جب فلم شروع ہوتی اور کوئی ڈراؤنا منظر آتا' کسی کی چیخ سنائی دیتی تو گل افشاں' درخشاں سے پوچھتی۔ ''باجی' بتانا کیا ہو رہا ہے؟''

تب درخشاں فلم کا آنکھوں دیکھا حال اسے بتانے لگتی۔ فلم میں اس وقت اگر کوئی ڈراؤنا سین نہ چل رہا ہوتا تو وہ کہتی۔ ''اب دیکھ لے لائن کلیئر ہے۔''

تو وہ گردن گھما کر ڈرتے ڈرتے ٹی وی دیکھنے لگتی۔ جیسے ہی کوئی خوفناک منظر آتا تو وہ پھر پیٹھ موڑ کر بیٹھ جاتی اور درخشاں کی کمنٹری شروع ہو جاتی۔

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

فلم ختم ہوتی تو ٹی وی ٹرالی کو لاؤنج تک پہنچانا اور باتھ روم جانا ایک مسئلہ بن جاتا۔ خیر ٹی وی ٹرالی کو کسی طرح گل افشاں لاؤنج میں دھکیل آتی' لیکن وہ اس کے ساتھ باتھ روم تو نہیں جا سکتی تھی۔ درخشاں کسی طرح ہمت کر کے باتھ روم تک جاتی اور اتفاق سے کبھی اسے کوئی لال بیگ ٹہلتا ہوا نظر آ جاتا تو وہ چیخ مار کر باتھ روم سے باہر آ جاتی اور گل افشاں سے لپٹ جاتی۔

اس ایک فلم دیکھنے کے نتیجے میں کئی دن درخشاں کو ڈر لگتا۔ وہ سوتے سوتے اٹھ کر بیٹھ جاتی۔ گل افشاں کو جھنجوڑ کر اٹھا دیتی اور وہ بے چاری خاموشی سے اٹھ کر بیٹھ جاتی۔ "ہاں کیا ہوا؟"

"گل افشاں' میری پیاری بہن' مجھ کو ڈر لگ رہا تھا۔ وہ آ گیا تھا۔" درخشاں لرزتے ہوئے کہتی۔

"اچھا' اب زیادہ بکواس کرنے کی ضرورت نہیں ہے' خاموشی سے سو جا' میں جاگ رہی ہوں۔"

"میری پیاری بہن' میری طرف منہ کر لے۔"

"لے۔" گل افشاں غصے میں کہتی۔ "اب گھسے گی' میرے اوپر ہاتھ رکھ لے۔"

"ایسا کرے تو بہت اچھا ہو' مجھے جلد نیند آ جائے گی' میں سو جاؤں گی؟ پھر تم بے شک' میرے اوپر سے ہاتھ ہٹا لینا' ادھر کروٹ لے لینا۔" درخشاں بڑی مسکینیت سے کہتی۔

اس کی مسکین صورت دیکھ کر ہمیشہ کی طرح اس پر رحم آ جاتا اور وہ غصہ چھوڑ کر اسے پیار سے اپنے قریب کر لیتی۔

"باجی' تم فلمیں دیکھنا مت چھوڑنا' بے شک مر جانا۔" وہ اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتی۔

درخشاں اس بات کا کوئی جواب نہ دیتی۔ تھوڑی دیر میں دونوں کو نیند آ جاتی۔

صبح کو اٹھتیں تو رات کے خوف کا ان پر کوئی سایہ بھی نہ ہوتا۔ درخشاں نے ایم ایس سی کرنے کے بعد امریکا کا رخ کیا۔ نیویارک میں اس کے بڑے بھائی بابر بلال موجود تھے۔ لہٰذا رہائش کا کوئی مسئلہ نہ تھا۔ والدین نے بھی یہی سوچ کر اسے بھیج دیا تھا کہ بابر کے ہوتے ہوئے اسے کسی قسم کی پریشانی نہ ہوگی۔

کراچی ایئرپورٹ پر جب گل افشاں نے اسے آنسو بھری آنکھوں سے رخصت کیا تو ایک نصیحت کی اور یہ نصیحت ڈراؤنی فلموں کے بارے میں تھی۔

"خدا کے لیے' وہاں اپنے اوپر رحم کرنا' ہورر فلمیں بھول کر نہ دیکھنا۔"

لیکن درخشاں نے نیویارک پہنچ کر جو سب سے پہلا کام کیا' وہ ہورر فلموں سے متعلق معلومات کا تھا۔ گھر میں وی سی آر موجود تھا' لیکن بھیا' بھابی کو فلموں سے کوئی خاص لگاؤ نہ تھا۔ بھابی کو تو بالکل نہ تھا۔ کبھی کبھار بابر کا کوئی دوست بھارتی فلم کا کیسٹ اٹھا لاتا تو وہ اس فلم کو چلتے پھرتے دیکھ لیا کرتی تھیں۔ بابر کے پاس وقت ہوتا تو وہ انگلش فلم دیکھ لیتا تھا ورنہ وی سی آر بند پڑا

رہتا تھا۔

فلموں کے بارے میں بھیا' بھابی کی عدم دلچسپی سے اسے سخت مایوسی ہوئی۔ اس کا خیال تھا کہ اگر بھابی ذرا بھی فلموں میں دلچسپی رکھتی ہوں گی تو وہ انہیں کسی نہ کسی طرح ہورر فلموں کی طرف راغب کر لے گی۔ اگر وہ ڈراؤنی فلمیں دیکھنے کے لیے راضی نہیں ہوں گی' تب کم از کم وہ انہیں اپنا محافظ تو بنا لے گی۔

یہاں کا ٹیلی ویژن چوبیس گھنٹے چلتا تھا۔ بہت سے چینل تھے اور ان چینلوں پر مختلف قسم کے پروگرام پیش کیے جاتے تھے۔ اخبار دیکھ کر اس نے ٹی وی پروگراموں کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ تب اسے معلوم ہوا کہ ایک دن چھوڑ کر ایک چینل سے رات بارہ بجے کے بعد ڈراؤنی فلمیں ٹیلی کاسٹ کی جاتی تھیں۔ یہ دیکھ کر اس کا چہرہ کھل اٹھا۔

اب اسے وی سی آر کی ضرورت تھی' نہ یہ مسئلہ تھا کہ ڈراؤنی فلموں کے کیسٹ کہاں سے حاصل کرے گی' کیونکہ نیویارک آئے ہوئے اسے چوبیس گھنٹے سے زائد نہ ہوئے تھے۔ وہ یہاں کی کسی ویڈیو شاپ سے واقف نہ تھی۔

آج بارہ بج کر پچیس منٹ پر جو فلم آنا تھا' وہ ایک دم نئی فلم تھی اور اسے ٹیلی ویژن کے پروگرام بنانے والے ایک کمرشل ادارے نے بنایا تھا۔ فلم کے تعارف سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ ایک دلچسپ اور بے حد ڈراؤنی فلم ہوگی۔

ابھی رات کے نو بجے تھے۔ وہ لوگ کھانے سے فارغ ہو کر کافی کے کپ ہاتھ میں تھامے' خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ پاکستان کی باتیں ہو رہی تھیں۔ بھیا اور بھابی ایک ایک کر کے عزیزوں' رشتے داروں اور دوستوں کا حال پوچھ رہے تھے۔ بھابی خاندان ہی کی تھیں' اس لیے ان کے اور بابر کے رشتے دار مشترکہ ہی تھے۔

بابر بلال کو امریکہ آئے تقریباً دس گیارہ سال ہو گئے تھے۔ وہ یہاں بہت اچھی طرح سیٹ تھے۔ ان کے پاس گرین کارڈ موجود تھا۔ وہ یہاں کی ایک بڑی فرم میں جو مختلف کاروبار کرتی تھی' ایک اچھے عہدے پر فائز تھے ان کا دفتر ان کی رہائش گاہ سے خاصے فاصلے پر تھا اس لیے انہیں دفتر وقت پر پہنچنے کے لیے گھر سے صبح ساڑھے سات بجے نکلنا پڑتا تھا۔ اسی طرح واپسی میں بھی انہیں سات آٹھ بج جاتے تھے۔ اس دوران بھابی گھر میں اکیلی ہوتی تھیں۔ بابر بلال کی شادی ہوئے پانچ سال ہو چکے تھے۔ ان کے ہاں ابھی کسی بچے نے جنم نہ لیا تھا۔

اس سلسلے میں بابر بلال بہت فکرمند تھے' لیکن بھابی فاخرہ ان کی اس فکر کو چٹکیوں میں اڑا دیتی تھی۔ فاخرہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کے یہاں اتنی جلد بچہ ہو۔ وہ ایک فیشن ایبل لڑکی تھی' اسے اپنے جسم کے تناسب کا بہت خیال رہتا تھا۔ دوسرے وہ بچے کی پرورش سے بہت گھبراتی تھی۔ اس لیے وہ چاہتی تھی کہ یہ معاملہ جس قدر ٹل سکتا ہے' ٹلتا رہے۔ اس طرح اس نے ٹالتے ٹالتے پانچ سال گزار دیئے تھے' لیکن اب بابر بلال کا اس معاملے میں اصرار بڑھ رہا تھا' اس کا خیال تھا کہ اب

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

شاید وہ اس سلسلے میں مزید چھوٹ حاصل نہ کر سکے۔

درخشاں نے آ کر اس جلتے ہوئے مسئلے پر اور پٹرول چھڑک دیا۔ اس نے اپنے بھائی سے تو کچھ نہ کہا' وہ ان سے کچھ کہہ بھی نہیں سکتی تھی۔ ایک تو بڑے بھائی تھے' پھر وہ ریزرو بھی رہتے تھے۔ اس نے بھابی کو پکڑا۔

"کیوں بھابی' یہ کیا چکر ہے؟"

"کہاں' کیا چکر ہے؟" فاخرہ نے چونکتے ہوئے کہا۔

"ہوتا کیوں نہیں؟" درخشاں نے چھت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا

"بھئی' کیا نہیں ہوتا۔" وہ کچھ نہ سمجھی۔

"پانچ سال ہو گئے۔" درخشاں بولی۔

"کس بات کو؟" فاخرہ نے پوچھا

"آپ کی شادی کو۔"

"تو پھر؟" "صاف کہلوا کر ہی رہیں گی۔"

"ہاں' صاف کہو پہیلی بجھانے کا کیا فائدہ۔"

"بچہ' کیوں نہیں ہوتا؟" آخر درخشاں نے صاف کہہ دیا۔

"میری ساس' تجھے اتنی فکر کیوں ہے؟"

"بھابی قسم سے' تم اپنے ملک میں ہوتیں تو اب تک تمہاری مصیبت آ گئی ہوتی۔ امی نے اب تک تمہیں دنیا جہاں کے چکر کٹوا دیے ہوتے۔ ڈاکٹری سے لے کر جھاڑ پھونک' تعویذ گنڈے سب ہو چکے ہوتے اور تم نے بالآخر تنگ آ کر گردن جھکا دی ہوتی۔"

"گردن جھکا دی ہوتی' کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ میں بھیا کا وہ خط پڑھ چکی ہوں جو انہوں نے امی کو لکھا تھا۔"

"ہائے' کیا یہ خالہ جان کو بھی کچھ لکھ چکے ہیں' کیا لکھا تھا' انہوں نے؟"

"یہی کہ فاخرہ ابھی نہیں چاہتی کہ اس کے یہاں بچہ ہو۔"

"بڑے خراب ہیں یہ۔" فاخرہ نے شکوہ بھرے لہجے میں کہا۔

"خیر' کوئی بات نہیں' اب ہم ادھر آ گئے ہیں' ہو رہے گا کچھ نہ کچھ' گھبراؤ مت۔"

"اچھا میری ساس' فاخرہ نے ہنس کر کہا۔" میں بھی دیکھتی ہوں' کیا ہوتا ہے؟"

"ویسے بھابی' پانچ سال ہو گئے' ہم لوگوں پر اتنا ظلم نہ کرو' اب اس گھر میں ننھی منھی چیخوں کی آوازیں آنے دو۔" درخشاں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"پگلی' تو سمجھتی نہیں۔" فاخرہ بولی۔

"سمجھاؤ گی تو سمجھوں گی نا' بولو' کیا کہنا چاہتی ہو۔" درخشاں نے ذرا آرام سے بیٹھتے ہوئے کہا۔

"بچہ ہونا تو کوئی مسئلہ نہیں' لیکن بچے کی پرورش کرے گا کون؟ بھئی صاف بات ہے' مجھ سے یہ ذمے داری نہیں اٹھائی جائے گی۔ پھر ایک بات اور ہے بچے کی پیدائش کے بعد عورت میں جان نہیں رہتی' ایک دم کھوکھلی ہو جاتی ہے۔ موٹی' بھدی اور پلپلی ہو جاتی ہے۔"

"ساری عورتیں تو نہیں ہوتیں' بعض عورتیں ماں بننے کے بعد اور نکھر جاتی ہیں' پرکشش اور خوب صورت ہو جاتی ہیں۔" درخشاں نے دلیل دی۔

"سو میں سے کوئی ایک عورت ہوتی ہو گی جو ماں بننے کے بعد مزید خوب صورت ہو جاتی ہو گی' مجھے یقین ہے کہ میں ان عورتوں میں سے نہیں ہوں۔" فاخرہ نے وثوق سے کہا۔

"رہ گئی یہ بات' بچے کی پرورش کی تو تمہیں کون سا ملازمت پر جانا ہوتا ہے' دن بھر گھر میں رہتی ہو' پھر کیا مشکل ہے۔ اب تو میں بھی یہاں آ گئی ہوں' دو تین سال ریسرچ میں لگ ہی جائیں گے۔ میں آپ کا ہاتھ بٹا دیا کروں گی۔ اب تو آپ مان جائیں۔"

"اور میرے حسن کا کیا ہو گا؟" فاخرہ پریشان ہو کر بولی۔

"بگڑے گا نہیں' سنورے گا' یہ میری گارنٹی ہے' اگر بگڑ جائے تو پیسے واپس۔"

اسی طرح بحث مباحثے میں کوئی بارہ بج گئے۔ بابر بلال کب کے سونے جا چکے تھے۔ ان کے جانے کے بعد ہی درخشاں نے یہ ساری گفتگو چھیڑی تھی اور بڑی حد تک اس نے فاخرہ کو قائل کر لیا تھا۔

"ہائے' بارہ بج گئے' اب میں چلوں سونے۔" فاخرہ اٹھتے ہوئے بولی۔ "اب تم بھی سو جاؤ۔"

"بھابی' کیا آپ اپنے کمرے کا دروازہ بند کر کے سوتی ہیں۔" درخشاں نے پوچھا۔

"ہاں' کیوں؟"

"ایسے ہی پوچھ رہی تھی' میں خود دروازہ بند کر کے سوتی ہوں' دروازہ کھلا ہو تو میں سو ہی نہیں سکتی۔"

"ٹھیک ہے تو بند کر لینا۔" فاخرہ نے کہا۔

"خیر' ابھی تو میں جاگ رہی ہوں' بارہ پچیس پر ٹی وی پر ایک فلم آئے گی' اسے دیکھ کر سوؤں گی۔"

"اچھا! اس وقت بھی ٹیلی ویژن پر کوئی فلم آتی ہے؟ یہ تو میں آج ہی سن رہی ہوں' مجھے یہاں رہتے ہوئے پانچ سال ہو گئے میں آج تک یہ بات نہ جان سکی' لیکن تمہیں یہاں آئے ابھی پچیس گھنٹے ہوئے ہیں' پھر بھی تم نے یہ معلوم کر لیا کہ اس وقت فلم آتی ہے' تمہیں کس نے بتایا؟"

"یہ کون سی مشکل بات ہے' میں نے اخبار میں پروگرام دیکھا ہے۔ بھابی' بات یہ ہے کہ آدمی کو شوق ہو تو اسے خدا بھی مل جاتا ہے۔" درخشاں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اچھا' اخبار سے معلوم ہوا تمہیں! بھئی یہاں اخبار پڑھتا کون ہے۔ یہاں اخبار بھی تو

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

ڈیڑھ سیر کا ہوتا ہے۔ صفحات الٹتے الٹتے آدمی تھک جاتا ہے۔ میں تو بس اشتہار کے لیے اخبار دیکھتی ہوں۔"

"ماشاء اللہ آپ بڑا اچھا کرتی ہیں' کچھ دیر بیٹھ جائیں نا' فلم دیکھ کر ہی جائیں۔ فلم بھی بڑی مزیدار ہے۔" درخشاں نے اس کے شوق..... کو ابھارنے کی کوشش کی۔

"بے حد ڈراؤنی' آپ نے کبھی ہورر فلمیں دیکھی ہیں؟" درخشاں نے پوچھا۔

"نا بابا' مجھے تو تم معاف رکھو میں دیسی فلمیں نہیں دیکھتی تو یہ خوفناک فلم کیا دیکھوں گی۔ تم دیکھو میں تو چلی' صبح مجھے جلدی اٹھنا ہوتا ہے۔ اچھا شب بخیر۔" یہ کہہ کر وہ بیڈ روم میں داخل ہوئی اور کھٹاک سے کمرے کا دروازہ بند کر لیا۔

درخشاں نے جس مقصد کے لیے یہ بات چھیڑی تھی' وہ دل کی دل میں ہی رہ گئی۔ یہ بات تو درخشاں کو کراچی سے ہی معلوم تھی کہ بھابی کو فلمیں دیکھنے کا قطعاً شوق ہی نہیں لہٰذا اس وقت ساتھ بیٹھ کر فلم دیکھنے کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ وہ ان سے یہ کہنا چاہ رہی تھی کہ وہ اپنے کمرے کا دروازہ بند کر کے نہ سوئیں تاکہ اسے ڈر لگے تو وہ انہیں خاموشی سے اٹھا لے' لیکن یہ بات وہ کچھ شرم اور کچھ جھجک کی بنا پر نہ کہہ سکی کہ بھابی کیا کہیں گی' کیا سوچیں گی۔ ہوسکتا ہے وہ پلٹ کر کہہ دیں کہ بی بی' اتنا ہی ڈرتی ہو تو پھر فلم دیکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ پھر انہیں کون قائل کریگا۔

فاخرہ کے کمرا بند کرنے کے بعد اس نے سر کو فیصلہ کن انداز میں جھٹکا اور ذرا اپنے آپ میں ہمت پیدا کر کے بولی۔ "دیکھا جائے گا۔" اس نے اپنے کمرے میں ٹیلی ویژن گھسیٹا اور اسے کھول کر بیڈ پر بیٹھ گئی۔

ٹھیک بارہ پچیس پر اناؤنسر نمودار ہوئی۔

اس نے فلم شروع ہونے کا اعلان کیا اور ساتھ ہی خصوصی ہدایت بھی کہ اس فلم کو کمزور دل حضرات ہرگز نہ دیکھیں۔ اور مضبوط دل کے لوگ بھی اسے اکیلے نہ دیکھیں۔ یہ بات سن کر جہاں اس کے ذہن میں سنسنی پیدا ہوئی' وہاں اس نے سوچا کہ خیر' وہ مضبوط دل کی تو ہے' پوری فلم دیکھ لے گی' لیکن ہے اکیلی۔ کمرے میں اکیلی ہے تو کیا ہوا' گھر میں بھیا' بھابی تو ہیں۔ اگر بہت ڈر لگے گا تو وہ انہیں جگا لے گی۔ بے شک' بھیا بعد میں ڈراؤنی فلم دیکھنے پر کتنا ہی ڈانٹیں۔

فلم شروع ہو چکی تھی۔

درخشاں نے اپنے گرد اچھی طرح کمبل لپیٹ لیا۔ باہر اچھی خاصی سردی تھی۔ کمرے میں ہیٹر جل رہا تھا۔ اس لیے سردی کا احساس زیادہ نہ تھا' لیکن فلم جوں جوں آگے بڑھتی گئی' کمرا سرد ہوتا گیا۔ کمبل اور ہیٹر کے باوجود اس کی ریڑھ کی ہڈی میں ٹھنڈ اترنے لگی۔ وہ ہمت کر کے اٹھی اور کمرے کا دروازہ بند کر لیا۔ کھڑکیاں پہلے سے بند تھیں۔ دروازہ بند ہونے سے تنہائی کا احساس زیادہ بڑھا۔ پھر اس نے ڈر کر دروازہ کھول دیا۔ دروازہ کھلا ہوگا تو اسے بھیا کے دروازے تک بھاگ کر جانے میں آسانی ہوگی۔ کچھ دیر بعد خوف نے پھر زور مارا تو اس نے دروازہ پھر سے بند

کر دیا۔

بس فلم کے اختتام تک یہی ہوتا رہا۔ کبھی وہ اٹھ کر دروازہ بند کرتی' کبھی کھول دیتی۔

تقریباً دو بجے فلم ختم ہوئی۔ فلم بہت ڈراؤنی تھی' لیکن اتنی ڈراؤنی نہ تھی جتنا اناؤنسر نے ڈرا دیا تھا۔ حسب معمول خوف کے مارے اس کا برا حال تھا۔ دروازہ اس نے اندر سے لاک کر دیا تھا۔ کمرے کی بتی روشن تھی اور وہ کمبل میں گڑی مڑی ہوئی لیٹی تھی۔

زبردستی آنکھیں بند کر کے وہ سونے کی کوشش کر رہی تھی' لیکن نیند کہاں؟ رہ رہ کر فلم کے مناظر اس کی نظروں میں گھوم رہے تھے۔ کروٹ لیتے ہوئے بیڈ ذرا بھی چرچراتا تو درخشاں کے اس سردی میں پسینے چھوٹ جاتے۔ وہ اٹھ کر بیٹھ جاتی اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھنے لگتی۔

اس وقت اسے گل افشاں بڑی شدت سے یاد آ رہی تھی۔ وہ ہوتی تو کوئی مسئلہ ہی نہ ہوتا۔ وہ اس سے لپٹ کر سو جاتی۔ ڈر ضرور لگتا' لیکن کسی کے پاس ہونے کا احساس بھی ہوتا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ بھابی کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹا دے اور فاخرہ کو اپنے ساتھ لے آئے' لیکن پھر جھجک آڑے آ گئی۔ بھابی کیا سوچیں گی کہ یہ کس قدر ڈرپوک لڑکی ہے۔

بس اسی ادھیڑ بن میں ڈرتے ڈرتے اسے نیند آ گئی۔

صبح کو دروازے پر کسی نے دستک دی تو وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ کلائی پر بندھی گھڑی پر نظر ڈالی تو سوا سات بج رہے تھے۔ اس نے جلدی سے اٹھ کر دروازہ کھولا' باہر بھیا کھڑے تھے۔

"سنا ہے' رات کو آپ نے فلم دیکھی اور وہ بھی ہورر اسپل' لیکن یہ آپ اتنی بہادر کب سے ہو گئیں کہ اکیلے ہی فلم دیکھ لی۔ میری معلومات کے مطابق تو آپ خاصی ڈرپوک واقع ہوئی ہیں۔ ہوسکتا ہے' دس گیارہ سال میں آپ نے ترقی کر لی ہو اور ڈرنا چھوڑ دیا ہو۔"

"بھیا' رات کو فلم بڑی خطرناک تھی' مجھے بڑا ڈر لگا۔"

"ایسی فلمیں تنہا نہیں دیکھنا چاہئیں۔"

"میں نے رات کو بھابی سے کہا تھا بیٹھنے کو' لیکن انہیں تو فلموں سے کوئی دلچسپی نہیں۔"

"ہاں' اس معاملے میں وہ میری طرح بدذوق ہے۔"

"تب ہی تو خوب نبھ رہی ہے' دونوں بدذوقوں میں۔" درخشاں نے چھیڑا۔

"اے درخشاں' میں سب سن رہی ہوں تمہاری بکواس۔" باورچی خانے سے فاخرہ کی آواز آئی۔

"بھابی' میں تو آپ دونوں کی تعریف کر رہی ہوں۔"

"اچھا درخشاں' میں' یہ کہہ رہا تھا' میرے پاس وقت کم ہے۔ دس بارہ منٹ بعد میں یہاں سے نکل جاؤں گا۔ تم ایسا کرو' رات کو جاگی ہو تو نو بجے تک سو جاؤ' دس بجے پروفیسر ڈینی آئیں گے تمہیں یونیورسٹی لے جانے کے لیے۔ پہلے میرا خیال تھا کہ میں خود تمہارے ساتھ

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

یونیورسٹی چلوں گا مگر میرے جانے کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ میں بھی وہاں تمہاری ہی طرح ہوں گا۔ ڈیلی یونیورسٹی سے اچھی طرح واقف ہیں۔ وہ میرے دوست ہیں۔ لسانیات کے پروفیسر ہیں۔ ڈین فیکلٹی آف سائنس ان کے بہت اچھے دوست ہیں۔ وہ ان سے بھی تمہارا تعارف کروا دیں گے' اس طرح تمہیں کوئی پریشانی نہ ہوگی۔ پھر تم وہاں سے اکیلی واپس آ جانا۔ میرے دفتر کا ٹیلی فون نمبر اور گھر کا پتا اپنے پاس رکھ لو جو راستہ بھولنے کی صورت میں کام آئے گا۔ ٹھیک ہے؟" بابر بلال نے اس کی طرف اپنا کارڈ بڑھاتے ہوئے کہا جس پر دفتر کا ٹیلی فون نمبر اور گھر کا پتا بھی درج تھا۔

"درخشاں ناشتہ! فاخرہ نے باورچی خانے سے پکارا۔

"اچھا بھابی۔" درخشاں نے جواب دیا۔ "میں دانت برش کر کے آتی ہوں۔"

"ارے فاخرہ' اسے ابھی سونے دو' نو بجے اٹھا کر ناشتہ کروا دینا۔" بابر بلال نے باورچی خانے کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ "نیند پوری نہ ہونے کی وجہ سے اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی ہیں۔"

"اچھا ٹھیک ہے' درخشاں' تم سو جاؤ' میں تمہیں اٹھا لوں گی۔"

"او کے بھابی۔" یہ کہہ کر وہ واپس پلٹی اور بیڈ پر کسی شہتیر کی طرح گری اور پانچ منٹ کے اندر نیند کی آغوش میں چلی گئی۔

بابر بلال کو' خدا حافظ' کہنے کے بعد فاخرہ نے دروازہ بند کیا۔ پھر وہ درخشاں کے کمرے میں داخل ہوئی درخشاں بڑی گہری نیند میں تھی۔ اس نے آہستگی سے ٹی وی ٹرالی کو کھینچ کر لاؤنج میں اس کی جگہ پر پہنچایا اور پھر درخشاں کے کمرے کا دروازہ باہر سے بند کر دیا۔

ادھر سے مطمئن ہو کر وہ اپنے کمرے میں پہنچی۔ کھڑکی سے پردہ سرکایا' لیکن باہر بہت کہر تھی' اس لیے پردہ سرکانے کے باوجود کمرے میں روشنی نہ ہوئی۔ پردہ برابر کر کے اس نے ٹیبل لیمپ روشن کر دیا۔ میز پر رکھے ڈرائنگ بورڈ کو سیدھا کیا پھر میز کی دراز سے تالا کھول کر ایک رول کیا ہوا کاغذ نکالا۔ اس کاغذ کو پنوں کے ذریعے بورڈ پر لگایا اور اس آدھی بنی تصویر کو ایک نظر دیکھا..... پھر بورڈ میں انار جر لگا کر کام شروع کر دیا۔

پھر وہ کام میں اس قدر محو ہوئی کہ اسے وقت کا اندازہ نہ رہا۔

درخشاں جب سونے کے لیے لیٹی تھی تو اس کے ذہن میں یہ بات موجود تھی کہ اس نے نو بجے اٹھنا ہے۔ اس خیال نے گھڑی کے الارم کی طرح کام کیا۔ ٹھیک نو بجے اس کی آنکھ پٹ سے کھل گئی۔ چند سیکنڈ اسے اپنے حواس درست کرنے میں لگے۔ پھر وہ اپنے بالوں کا جوڑا بناتی ہوئی بیڈ سے اٹھ گئی۔

وہ دروازہ کھلا چھوڑ کر سوئی تھی' لیکن اس وقت دروازہ بند تھا۔ اس نے سوچا' بھابی نے بند کر دیا ہوگا کہ وہ پورے سکون سے سو سکے۔

جب اس نے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھ کر اسے کھولنا چاہا تو وہ نہ کھلا۔ دروازہ

لاک تھا۔ پھر اچانک اسے رات کی فلم یاد آ گئی اور ایک خوف کی لہر اس کے جسم میں سرایت کر گئی۔

یہ دروازہ باہر سے بھابی نے کیوں لاک کیا ہے؟ کیا وہ گھر میں نہیں ہیں۔ ہو سکتا ہے' وہ کچھ شاپنگ کرنے چلی گئی ہوں' لیکن انہیں اس طرح بند کر کے تو نہیں جانا چاہیے۔ کمرے کا دروازہ بند کرنے کے بجائے انہیں گھر کا دروازہ بند کرنا چاہیے تھا۔

پھر درخشاں نے چابی کے سوراخ سے باہر جھانکنے کی کوشش کی' لیکن اسے سوائے دیوار کے کچھ نظر نہ آیا۔ پھر وہ زور زور سے دروازہ پیٹنے لگی۔

زور زور سے دروازہ پیٹے جانے پر فاخرہ کو ایک دم ہوش آ گیا۔ اس نے گھڑی پر نظر ڈالی نو بج چکے تھے۔ پھر اس نے جلدی جلدی پنیں نکال کر اس کاغذ کو رول کیا اور اس کی جگہ ایک دوسرا کاغذ بورڈ پر لگا دیا۔ اس کاغذ پر ایک نامکمل لینڈ اسکیپ بنا ہوا تھا۔ پھر جلدی سے اٹھ کر بھاگی۔

فاخرہ نے چابی سے کمرے کا تالا کھولا اور مسکراتی ہوئی درخشاں سے لپٹ گئی۔

"ڈریں تو نہیں؟"

"ویسے آپ نے خوفزدہ کرنے میں کوئی کسر بھی نہ چھوڑی تھی۔" درخشاں نے سنجیدگی سے کہا۔

"ہائے' تم تو سچ مچ ڈر گئیں۔" فاخرہ فکرمند ہوتے ہوئے بولی۔

"بس' آپ دو چار منٹ اور دروازہ نہ کھولتیں تو میں کھڑکی سے باہر چھلانگ لگانے والی تھی۔ مجھے پکا یقین ہو گیا تھا کہ یہ مکان آسیب زدہ ہے۔"

"چل پگلی۔" فاخرہ نے پیار سے اس کے رخسار پر چپت لگائی۔ "میں نے تو ایسے ہی مذاق میں تالا لگا دیا تھا۔ مجھے معلوم ہوتا کہ تم اس حرکت کو آسیب کی کارستانی سمجھو گی تو میں ہرگز ایسا نہ کرتی۔"

"آپ کیا کر رہی تھیں اس وقت؟" درخشاں نے پوچھا۔

"میں ایک تصویر پر کام کر رہی تھی' تمہیں ہے کچھ آرٹ سے دلچسپی یا تمہارا ذوق بھی بھوت کو انسان سمجھنے کی حد تک ہے۔"

"آپ کسی حد تک ٹھیک کہہ رہی ہیں۔" درخشاں نے برا مانے بغیر کہا۔ "سمجھا تھا جسے انسان وہ عورت نکلی۔ اپنا بھی کچھ اسی طرح کا حال ہے۔"

"پھر تو تم سے اس موضوع پر بات کرنا فضول ہی ہوگا۔" فاخرہ نے کہا۔

"بھابی' آپ کو یہ آرٹ سے کس طرح لگاؤ ہو گیا؟ پاکستان میں تو ایسا کوئی چکر نہ تھا۔"

"آرٹ سے دلچسپی تو مجھے شروع سے ہے' لیکن کبھی اسے سنجیدگی سے لیا نہ تھا۔ یہاں تنہائی نے مجھے اس کی طرف راغب کر دیا۔ وقت گزارنے کا یہ بہت خوبصورت مشغلہ ہے۔"

"آپ نے یہاں کسی سے سیکھا یا بس خود ہی آ گیا برش چلانا۔" درخشاں نے پوچھا۔

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

"انٹرویو شروع ہو گیا۔" فاخرہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

"جی جناب اور آپ یہ دیکھیں کہ انٹرویو لینے یہ بندی کتنی دور سے آئی ہے۔" درخشاں مسکرائی۔

"درخشاں' میں نے یہاں ایک آرٹ اکیڈمی میں دو سال کا کورس کیا ہے۔ اس مصوری کے علاوہ میرا ایک مشغلہ اور ہے۔ تم سنو گی تو شاید تمہیں حیرت ہو۔"

"اچھا' وہ کیا؟" درخشاں نے پوچھا۔

"میوزک۔" فاخرہ نے بتایا۔

"یعنی گانا۔" درخشاں نے وضاحت چاہی۔

"نہیں' بجانا۔"

"ہاں!" درخشاں نے حیرت سے کہا۔ "ارے بھابی' آپ نے امریکا آ کر بڑی ترقی کر لی' آپ کیا بجاتی ہیں؟"

"میں وائلن بجاتی ہوں۔"

"لیکن وائلن تو بہت مشکل انسٹرومنٹ ہے۔" درخشاں نے کہا۔

"دیکھ لو' اس مشکل کو میں نے آسان کر لیا۔" فاخرہ کے لہجے میں فخر تھا۔

"واہ۔ بھابی' پھر تو بڑا مزہ آئے گا۔" وہ باتھ روم کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔ "میں ذرا یونیورسٹی سے فارغ ہو کر آ جاؤں' پھر سنوں گی آپ سے وائلن۔"

"ہاں' ٹھیک ہے۔ پروفیسر ڈینی بھی آتے ہوں گے' تم جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ میں تمہارے لیے ناشتا تیار کرتی ہوں۔" یہ کہہ کر فاخرہ نے باورچی خانے کا رخ کیا۔

درخشاں نے جلدی جلدی ہاتھ منہ دھویا' اپنے بالوں پر برش پھیرا اور پھر باورچی خانے میں جھانکتے ہوئے بولی۔ "ہاں بھابی' میں آپ کی کچھ مدد کروں۔"

"بس' آپ اتنی مدد کریں کہ میز پر براجمان ہو جائیں' میں ناشتا لا رہی ہوں۔" فاخرہ نے خوشدلی سے کہا۔

"بھابی' ناشتے میں کیا ہے؟" درخشاں نے پوچھا۔

"تمہیں کیا چاہئے' فاخرہ نے پوچھا۔" امریکی یا پاکستانی ناشتا؟"

"ہم تو فقیر لوگ ہیں جو مل جائے خوشی سے کھا لیں گے۔" درخشاں نے صدا لگائی۔

"پھر صبر سے بیٹھیں اور ناشتے کے میز پر آنے کا انتظار کریں۔" فاخرہ نے صبر کی تلقین کی۔

اور جب ناشتا درخشاں کے سامنے آیا تو اس نے خوشی سے نعرہ لگایا۔ "قیمہ پراٹھا' میرا پسندیدہ ناشتا' بھابی فاخرہ زندہ باد۔"

پھر ناشتا کرتے اور خوش گپیاں کرتے ساڑھے نو بج گئے۔ ناشتے سے فارغ ہو کر

درخشاں نے اپنا لباس تبدیل کیا اور پھر وہ کاغذات نکالنے لگی جن کی یونیورسٹی میں آج ضرورت پڑتی۔

اسے یقین تھا کہ پروفیسر ڈینی صحیح وقت پر گھر پہنچ جائیں گے' اس لیے اس نے ان کے آنے سے پہلے اپنی تیاری مکمل کر لی تاکہ اگر وہ فوراً چلنے کے لیے کہیں تو وہ ان کے ساتھ نکل سکے' لیکن پروفیسر ڈینی دس کے بجائے سوا دس بجے تشریف لائے۔

جب گھر کی گھنٹی بجی تو فاخرہ نے درخشاں سے کہا۔ "ذرا دیکھو' دروازے پر کون ہے' میرا خیال ہے کہ پروفیسر ڈینی ہوں گے۔"

"جی اچھا۔" درخشاں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "لیکن یہ پندرہ منٹ لیٹ کیوں آئے ہیں۔"

درخشاں نے دھیرے سے دروازہ کھولا تو اسے ایک سوٹ پوش شخص مسکراتا نظر آیا۔ اس کی آنکھیں کالی تھیں' لیکن بال ڈارک براؤن تھے اور پیشانی پر پڑے ہوئے تھے۔ کلین شیو' سرخ سفید رنگت' درخشاں نے اندازہ لگایا کہ وہ اس سے آٹھ دس سال بڑے رہے ہوں گے۔

"میں ڈینی ہوں' ڈینی آئزک۔" انہوں نے انگریزی میں کہا۔

"گڈ مارننگ پروفیسر' میرا نام درخشاں ہے۔" درخشاں بولی۔

"درکھشاں؟" پروفیسر ڈینی نے اس کے نام کے تلفظ کی ریڑھ مارتے ہوئے کہا۔ "مجھے آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔"

"درخشاں کا خیال تھا کہ وہ اس جملے کے ساتھ ہی اس سے ہاتھ ملانے کے لیے ہاتھ بڑھائے گا' لیکن ایسا نہ ہوا۔ درخشاں نے سکون کا سانس لیا اور رسماً بولی۔ مجھے بھی آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔ آیئے اندر تشریف لایئے۔"

"کیا آپ چلنے کے لیے تیار نہیں ہیں؟" انہوں نے مسکرا کر سوال کیا۔

"جی' میں بالکل تیار ہوں' ویسے اگر ہم کافی پی کر گھر سے نکلیں تو کیا یہ بہتر نہ ہوگا۔"

"کوئی مضائقہ نہیں' میں نے ساڑھے گیارہ بجے ڈین سے ملاقات کا وقت لے رکھا ہے۔ پندرہ منٹ میں پہلے ہی لیٹ ہوں جس کی ابھی میں نے معذرت نہیں کی۔ بس ہمارے پاس دس بارہ منٹ ہیں۔" پروفیسر ڈینی نے اندر آتے ہوئے کہا۔

"کافی پینے میں مشکل سے دس منٹ لگیں گے۔" درخشاں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہیلو پروفیسر ڈینی۔" فاخرہ نے ان کو خوش آمدید کہا۔ آیئے آیئے۔"

"ہاؤ' مسز بابر' کیسی ہیں آپ؟" پروفیسر ڈینی نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "سوری' میں پندرہ منٹ لیٹ ہو گیا۔ اصل میں گاڑی کچھ نخرے دکھا رہی تھی' راستے میں اسے ٹھیک کرایا۔ اس لیے دیر ہو گئی۔"

"بھابی' آپ بیٹھیں' میں کافی بناؤں۔" درخشاں نے کہا۔

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

"نہیں' تم بیٹھو' میں بنا تی ہوں کافی۔" فاخرہ نے کہا' پھر وہ پروفیسر سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔" کوئی بات نہیں پروفیسر' زندگی میں دیر سویر تو چلتی رہتی ہے۔"

دو منٹ میں فاخرہ کافی بنا لائی' اس عرصے میں سوائے دو تین رسمی جملوں کے ان کے درمیان کوئی بات نہ ہوئی۔ کافی پیتے ہوئے درخشاں نے پروفیسر ڈینی کو غور سے دیکھا۔

وہ کہیں سے پروفیسر دکھائی نہ دیتا تھا۔

پروفیسر کے بجائے وہ ایک چاق و چوبند سیکرٹ ایجنٹ زیادہ دکھائی دیتا تھا۔ نیوی بلیو سوٹ میں وہ کچھ زیادہ ہی پرکشش دکھائی دے رہا تھا۔

"اچھا مس درخشاں' اب ہمیں چلنا چاہئے۔" کافی ختم کرنے کے بعد پروفیسر نے کہا۔

"جی' بالکل چلیں۔" درخشاں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"درخشاں' واپسی کب تک ہو گی؟" فاخرہ نے انگریزی میں پوچھا۔

درخشاں کو اندازہ نہ تھا کہ وہاں کتنی دیر لگے گی۔ اس لیے جواب کے لیے اس نے پروفیسر ڈینی کی جانب دیکھا۔" کیوں پروفیسر ڈینی' واپسی کتنی دیر میں ہو جائے گی؟"

"مسز بابر' آپ ان کے لیے لنچ تیار رکھیں' یہ ایک اور ڈیڑھ کے درمیان آ جائیں گی۔" پروفیسر ڈینی نے فاخرہ سے مخاطب ہو کر کہا۔

"ٹھیک ہے' میں آپ دونوں کے لیے لنچ تیار کر لیتی ہوں' آپ واپسی میں ادھر ہی آئیے گا۔"

"شکریہ مسز بابر' میں نہیں آ سکوں گا' مجھے کچھ کام ہے۔"

ان دونوں کے جانے کے بعد فاخرہ نے بڑی بے قراری سے گھر کا دروازہ بند کیا اور جلدی جلدی کسی کو ٹیلی فون کرنے لگی۔

"آج کا موسم خاصا خوشگوار ہے۔" پروفیسر ڈینی نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

لیکن مجھے تو سردی لگ رہی ہے۔ یہ بات اس نے کہنا چاہی لیکن کہی نہیں' وہ بولی" جی آپ ٹھیک کہتے ہیں۔"

"کیا آپ کے شہر میں بھی اتنی سردی ہوتی ہے؟" پروفیسر ڈینی نے پوچھا۔

"جی نہیں۔" درخشاں نے مختصر جواب دیا۔

"پھر تو آپ کو سردی لگ رہی ہو گی۔"

"نہیں' گھر میں تو اتنی نہیں محسوس ہو رہی تھی' لیکن باہر نکل کر معلوم ہوا کہ سردی ہے۔"

"جلدی سے اس سردی کی عادی ہو جائیں' ابھی تو آپ کو یہاں کئی سال گزارنے ہیں۔"

"ہم پاکستانی بڑے سخت جان ہوتے ہیں' ہر طرح کے موسم میں گزارا کر لیتے ہیں۔"

"ہاں' میں نے بابر کو دیکھا ہے' شروع میں یہاں آیا تو سردی کی وجہ سے پناہ مانگتا تھا' لیکن اب اس سے یہاں کی سردی پناہ مانگتی ہے۔" پروفیسر ڈینی نے ہنستے ہوئے کہا۔" میں پاکستان دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"یہ تو کوئی ایسا مشکل مسئلہ نہیں' اس سلسلے میں آپ بابر بھیا سے بات کریں۔"

"لیکن میں وہاں جانے سے پہلے تھوڑی سی اردو سیکھنا چاہتا ہوں۔ ایک بار بابر نے مجھے سکھانا شروع کیا تھا' لیکن پھر معاملہ ٹھپ ہو گیا۔ میں دو چار جملے ہی سیکھ پایا' مثلاً آپ کا کیا حال ہے۔ میں ٹھیک ہوں۔ آپ کا نام کیا ہے وغیرہ۔" پروفیسر ڈینی کی زبان سے اردو کے جملے سن کر اسے بڑی طمانیت کا احساس ہوا۔

ایک یہ ہے جو امریکی ہو کر اردو سیکھنے کی بات کر رہا ہے' اردو بولنے کی کوشش کر رہا ہے۔ ایک ہم ہیں جنہیں اردو آتی ہے' پھر بھی ہم اسے بولنا اپنی توہین سمجھتے ہیں۔

"میں سکھاؤں گی آپ کو اردو۔" درخشاں نے بڑے خلوص سے کہا۔

"واقعی!" پروفیسر ڈینی نے حیرت سے کہا۔" پھر تو شاید میں جلد ہی سیکھ جاؤں۔"

"وہ کیوں؟" وہ کچھ سمجھی' کچھ نہ سمجھی۔

"بھئی' ایسا حسین ٹیوٹر جسے مل جائے' وہ بھلا کیسے نہ سیکھے گا۔" پروفیسر ڈینی نے یہ بات بڑی سادگی سے کہی۔

وہ صرف مسکرا کر رہ گئی۔

"آپ نے میری بات کا برا تو نہیں مانا۔" پروفیسر ڈینی نے اسے خاموش دیکھ کر پوچھا۔" کیا آپ نے کوئی برا ماننے والی بات کہی؟" درخشاں نے الٹا سوال کیا۔

"نہیں' میں نے تو کوئی ایسی بات نہیں کہی' لیکن آپ کی خاموشی سے شبہ پیدا ہوا۔ بات یہ ہے مس درخشاں کہ خواتین کے حسن کو خراج تحسین پیش کرنا یہاں کی تہذیب کا حصہ ہے۔ آپ کیونکہ ہماری تہذیب کا حصہ نہیں ہیں۔ اس لیے اگر آپ کو میری بات بری لگی ہو تو میں فوراً معذرت کر لوں گا۔"

"کسی کو کچھ کہہ کر پھر معذرت کرنا' کیا یہ بھی یہاں کی تہذیب کا حصہ ہے؟" درخشاں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

جواب میں پروفیسر ڈینی صرف مسکرا کر رہ گئے۔

یونیورسٹی میں پروفیسر ڈینی کی واقفیت کی بنا پر زیادہ دیر نہ لگی۔ سائنس فیکلٹی کے ڈین نے درخشاں کو خاصی پذیرائی بخشی اور اس طرح وہ داخلے کے مراحل سے بآسانی گزر گئی۔

ایک بجے کے قریب پروفیسر ڈینی نے درخشاں کو ایک بس سٹاپ پر اتار دیا۔

"میں آپ کو گھر تک چھوڑ دیتا' لیکن ایک تو بابر کی ہدایت تھی کہ میں آپ کو بس کا راستہ دکھاؤں' دوسرے آج میری کچھ مصروفیت ایسی ہے کہ میں آپ کو چھوڑنے نہیں جا سکتا۔"

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

یہ کہہ کر پھر اسے نے درخشاں کو بس کے بارے میں بتایا کہ اس کو کہاں اترنا ہے۔

''ویسے یہاں راستہ بھولنا بڑا آسان ہوتا ہے کیونکہ نئے آنے والے کو یہاں سارے چوراہے اور بلڈنگیں یکساں دکھائی دیتی ہیں' لیکن پھر دھیرے دھیرے پہچان بڑھتی ہے۔ یہی مسئلہ' یہاں کے انسانوں کے ساتھ بھی ہے۔ سڑک پر گھومتے پھرتے دور سے سب ایک جیسے دکھائی دیتے ہیں' لیکن انہی چہروں میں کوئی اپنا چہرہ بھی ہوتا ہے جسے ہمارے اندر کی لگن دوسروں سے الگ کر دیتی ہے' منفرد بنا دیتی ہے۔ بہرحال تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ اگر آپ راستہ بھ جائیں تو ٹریفک پولیس سے مدد لے لیں۔ وہ آپ کو نہ صرف آپ کے گھر تک چھوڑ دے گا' گائیڈ بھی کر دے گا۔ آپ کے پاس گھر کا پتا اور بابر کا فون نمبر تو ہے؟'' پروفیسر نے پوچھا۔

''جی ہاں' ہے۔'' درخشاں نے جواب دیا۔

''بس پھر خدا حافظ' وہ سامنے سے آپ کی بس آ رہی ہے۔''

وہ اسے خدا حافظ کہہ کر بس میں سوار ہو گئی اور مطلوبہ اسٹاپ پر اتر کر اس نے گھر کی لی۔ اس کا فلیٹ کیونکہ مین روڈ سے ہٹ کر تھا' اس لیے اسے تھوڑا سا پیدل چلنا پڑا' لیکن وہ بغیر سے پوچھے بہ خیر و عافیت گھر پہنچ گئی۔

بابر بلال کا فلیٹ فرسٹ فلور پر تھا لہٰذا اس نے لفٹ کے چکر میں پڑنے سے بہتر یہ کہ سیڑھیوں کے ذریعے اوپر جائے۔ جب وہ سیڑھیاں چڑھ رہی تھی تو اسے دروازہ کھلنے اور پھر بند ہونے کی آواز آئی۔

پھر ایک شخص اس کے سامنے سے تیزی سے سیڑھیاں اترتا گزر گیا۔ درخشاں نے اس کوئی خاص توجہ نہ دی' لیکن جانے اسے یہ احساس کیوں ہوا کہ یہ شخص اس کے گھر سے نکلا ہے۔ نے شخص دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز سنی تھی' اسے دروازے سے نکلتے نہ دیکھا تھا۔ ہو سکتا وہ کسی اور دروازے سے نکلا ہو۔ اس نے سوچا۔ اس فلور پر چار فلیٹ تھے۔

گھنٹی بجانے پر کچھ دیر بعد فاخرہ نے دروازہ کھولا اور اسے دروازے پر پا کر کھل اٹھی۔

''ارے' بڑی انگریزوں کی طرح آئی ہو۔'' اس نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

''انگریزوں کی طرح نہیں' امریکیوں کی طرح۔'' درخشاں بولی۔

''ایک ہی بات ہے وہ بھی گورے یہ بھی گورے۔'' فاخرہ نے ہنس کر کہا۔

''آپ ابھی تک کچن میں گھسی ہوئی ہیں۔'' درخشاں ہاتھ پاؤں پھیلا کر ایک صوفے بیٹھتے ہوئے بولی۔

''وہ ایپرن باندھے ہوئے تھی۔''

''ہاں' بس تھوڑا سا کام باقی ہے۔'' فاخرہ نے کہا۔

''یعنی روٹیاں پکانا ہیں؟'' درخشاں نے پوچھا۔

''ہاں' تمہیں بھوک تو نہیں لگ رہی۔''

''نہیں'' آپ صبح سے کام کر کے تھک گئی ہوں گی' لائیے' روٹیاں میں پکا دوں۔''

''ارے نہیں' دو آدمی کی تو روٹی پکانا ہے۔ تم خود تھک کر آ رہی ہو' ہاں یہ تو بتاؤ تمہارا کیا کام ہ لیا؟'' فاخرہ نے باورچی خانے کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

''جی بھائی' اپنا کام ہو گیا' بس کل سے باقاعدگی سے یونیورسٹی جانا ہے۔''

''چلو' مبارک ہو۔ ویسے پروفیسر ڈینی کی وجہ سے کافی مدد ملی ہو گی۔

''جی ہاں' سب کچھ انہوں نے ہی کیا' میں تو بس ان کے ساتھ چلتی رہی۔''

''ان کے ساتھ چلنا کیسا لگا؟'' اس نے پوچھا۔

فاخرہ کیونکہ باورچی خانے میں تھی' اس لیے وہ اس جملے کی ادائیگی کے وقت اس کے ات نہ دیکھ سکی۔ لہجے سے کوئی خاص اندازہ نہ ہوا کہ یہ بات یونہی کہہ دی ہے یا اس کے پس کچھ معنی چھپے ہیں۔ اس نے سوچا' اگر اس جملے میں کوئی معنی چھپے ہیں تو بے شک چھپے رہیں' وہ خواہ کیوں سمجھے۔ ہو سکتا ہے' یہ بات بھابی نے سادگی سے ہی کہی ہو۔

''اچھا لگا۔ پروفیسر ڈینی بہت ذہین آدمی ہیں۔ خاص طور سے انہیں اپنی بات کہنا خوب ہے۔'' درخشاں نے بڑی بے تکلفی سے ان کی تعریف کر دی۔

تب فاخرہ نے باورچی خانے سے باہر جھانکا اور معنی خیز انداز میں بولی۔ ''ایسا کیا کہہ دیا نے نے۔''

''وہ بہت مہذب آدمی ہیں۔'' درخشاں نے سنجیدگی سے کہا۔

''صاف ظاہر ہے' اگر وہ غیر مہذب ہوتے تو تمہارے بھائی تمہیں ان کے ساتھ کیسے دیتے۔ اچھا چلو چھوڑو۔ اس بحث کو' کھانا تیار ہے' تم ڈریس تبدیل کر لو۔''

جانے کیوں' بھابی کی پروفیسر کے حوالے سے یہ جملے بازی اسے کچھ اچھی نہ لگی۔ ہم کسی مرد' عورت کو ایک جگہ اکٹھا دیکھتے ہیں تو ہزار مفروضے گھڑ لیتے ہیں' جانے کیا کیا سوچ لیتے جانے کہاں تک سوچ لیتے ہیں۔ درخشاں کو ایسی باتوں سے بڑی الجھن ہوتی تھی۔ وہ بڑے ت ذہن کی لڑکی تھی۔ مردوں سے بلا جھجک گفتگو کرتی تھی اور یہی وجہ تھی کہ ایم ایس سی کرنے کے وہ یونیورسٹی سے بغیر کسی افیئر کے نکل آئی تھی۔

ایسا نہیں تھا کہ لڑکے اس کے نزدیک نہ آتے ہوں۔ وہ ایک دلکش لڑکی تھی۔ لڑکے اس نزدیک ہونے کو اپنی خوش قسمتی گردانتے تھے' لیکن وہ ان کے ساتھ کچھ اس طرح کا رویہ اختیار تی تھی کہ وہ سب اپنی مکالمے بازی بھول کر سیدھی راہ اختیار کر لیتے۔ ایسا بھی نہیں تھا کہ وہ ں کے ساتھ بے اعتنائی یا سخت انداز اختیار کرتی ہو۔ وہ ان کے ساتھ بہت بے تکلفی سے بات تی تھی' لیکن اس بے تکلفی میں بھی ایک حجاب ہوتا تھا اور یہی حجاب فصیل کا کام دیتا تھا۔

کھانا کھانے کے بعد وہ کچھ دیر آرام کرنے کے لیے لیٹ گئی۔ بیڈ پر لیٹی تو پروفیسر اس کی نگاہوں میں گھومنے لگا۔

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

"دور سے دیکھنے پر سب چہرے ایک جیسے دکھائی دیتے ہیں' لیکن انہی چہروں میں کوئی ایسا چہرہ بھی ہوتا ہے جسے ہمارے اندر کی لگن اسے دوسروں سے الگ کر دیتی ہے۔"

یہ بات پروفیسر ڈینی نے کیوں کہی؟ اس بات کا کوئی مطلب ہو سکتا ہے؟ یہ سوچتے سوچتے اس کی آنکھوں میں نیند اترنے لگی۔

پھر وقت کو پر لگ گئے۔

درخشاں اپنے ریسرچ کے کام میں دلجمعی سے جت گئی۔ پروفیسر ڈینی سے بھی اس کی ملاقاتیں جاری رہیں۔ کبھی وہ گھر آ جاتے' کبھی یونیورسٹی میں مل جاتے۔ ایک دو بار وہ ان کے ساتھ ریستوران میں کافی پینے بھی گئی۔ اس ساری ملاقاتوں کے باوجود کبھی پروفیسر ڈینی نے کوئی ایسی حرکت نہ کی' کوئی ایسی بات نہ کہی جس سے درخشاں کو دھچکا لگتا۔

ایک دن وہ بس سٹاپ پر بس کے انتظار میں کھڑی تھی کہ برف باری شروع ہو گئی۔ سردی اچھی خاصی تھی۔ درجہ حرارت منفی سات آٹھ رہا ہو گا۔ وہ گرم کپڑوں میں لپٹی ہوئی تھی' لیکن ان کپڑوں کی گرمی جیسے ہوا ہو گئی تھی۔ دانت بج رہے تھے اور جسم بار بار کانپ جاتا تھا۔

بس سٹاپ تقریباً سنسان تھا۔ ایک دو لڑکے لڑکیاں کھڑے تھے۔ بس کے آنے میں ابھی دیر تھی۔ اس نے سوچا ٹیکسی پکڑ کر گھر پہنچ جائے' لیکن ٹیکسی کا کرایہ گھر تک خاصا بن جاتا۔ وہ یہاں پڑھنے آئی تھی' ٹیکسی کا کرایہ برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

پھر یہ تو یہاں کا روز کا معمول تھا۔ کبھی بارش' کبھی برف باری۔ وہ روزانہ کیسے ٹیکسی میں سفر کرتی۔ اس کے علاوہ اسے ٹیکسی میں سفر کرنے سے منع بھی کیا گیا تھا۔ کسی نیگرو ڈرائیور کی ٹیکسی میں بیٹھنے سے بطور خاص منع کیا گیا تھا۔

ابھی وہ یہ سب سوچ ہی رہی تھی کہ پروفیسر ڈینی کی گاڑی اس کے نزدیک آ کر رکی۔ ان کی پوری گاڑی سفید ہو رہی تھی۔ پروفیسر ڈینی نے کھڑکی کا شیشہ اتار کر درخشاں کی طرف اشارہ کیا۔

وہ انہیں دیکھ کر خوش ہو گئی۔ تیزی سے ان کی طرف لپکی۔

"آپ کہاں جا رہے ہیں پروفیسر؟" اس نے پوچھا۔

"میں جہاں بھی جا رہا ہوں" بہرحال آپ کو گھر چھوڑ کر جاؤں گا۔" وہ بولے۔

"او تھینک یو پروفیسر۔" وہ بے تکلفی سے گاڑی میں بیٹھ گئی۔ "آج تو بے پناہ سردی ہے۔"

"یہ تو کچھ بھی نہیں' آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا۔" پروفیسر ڈینی نے ہنس کر کہا۔

"پھر ہماری تو آئسکریم بن جائے گی۔" درخشاں نے اپنے دستانے اتار کر ہاتھوں کو ایک دوسرے پر رگڑا۔ پروفیسر ڈینی نے گاڑی سٹارٹ کرتے ہوئے اس کے نازک اور خوصورت ہاتھوں کی طرف دیکھا۔ اسی وقت درخشاں نے اپنے ہاتھوں پر ان کی نظریں محسوس کیں۔ اس نے

دستانے پہن لیے۔

پروفیسر ڈینی نے گہرا سانس لیتے ہوئے گاڑی کی سپیڈ تیز کر دی۔

"اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو کہیں بیٹھ کر کافی پی لیں۔"

"جی' مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ میں آپ کے ساتھ ایک دو بار ریستوران جا بھی چکی ہوں' لیکن اس وقت مسئلہ یہ ہے کہ گھر پہنچنے میں دیر ہو جائے گی۔ ایسی صورت میں ہماری بھابی پریشان ہو جائیں گی۔"

"آپ کوئی بچی تو نہیں ہیں' اپنا بھلا برا اچھی طرح سمجھتی ہیں۔" پروفیسر ڈینی کے لیے بھابی کا پریشان ہونا نئی بات تھی' انہوں نے کچھ اور ہی مطلب لیا۔

"ہاں' یہ ٹھیک ہے کہ میں بچی نہیں ہوں' اپنا بھلا برا خوب اچھی طرح سمجھتی ہوں' لیکن پروفیسر میں اپنے آپ کو کسی حادثے سے تو نہیں بچا سکتی۔ دراصل ہمارے معاشرے میں' ہمارے گھرانوں میں ایک دوسرے کا اسی قدر خیال رکھا جاتا ہے۔ میں جب تک گھر پہنچ نہیں جاؤں گی' وہ گھر میں بے قراری سے ٹہلتی رہیں گی اور میں نہیں چاہتی کہ وہ میرے لیے ذرا بھی پریشان ہوں۔" درخشاں نے کہا۔

"تو کوئی بات نہیں' میں آپ کو گھر چھوڑ دیتا ہوں۔"

"نہیں' میرا یہ مطلب نہیں تھا' ہم کہیں بیٹھ کر کافی ضرور پئیں گے' لیکن زیادہ دیر نہیں بیٹھیں گے۔" درخشاں نے درمیان کی راہ اختیار کی۔

"چلئے' یہ ٹھیک ہے۔" پروفیسر ڈینی نے کہا اور کچھ دور آگے جا کر ایک کیفے کے سامنے گاڑی روک دی۔

کیفے اس وقت کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ دروازے پر کھڑے ہو کر دونوں نے جائزہ لیا۔ پھر انہیں ایک میز خالی دکھائی دے ہی گئی۔ یہ میز بھی اچھی جگہ تھی' کھڑکی کے قریب' یہاں بیٹھ کر باہر کا نظارہ بھی ہو سکتا تھا۔ پروفیسر ڈینی نے میز پر بیٹھتے ہوئے کھڑکی سے پردہ ہٹا دیا۔

باہر ہر طرف' دور تک برف ہی برف پھیلی تھی۔

خود پروفیسر کے کپڑوں پر بھی برف جمی ہوئی تھی۔ اس نے اپنے کپڑوں کو جھٹک کر برف صاف کی۔ درخشاں کے کپڑوں پر بھی کہیں کہیں برف جمی ہوئی تھی۔ پروفیسر ڈینی نے سوچا کہ وہ اس کے کپڑوں سے برف صاف کر دے اور یہ کوئی ایسی معیوب بات بھی نہ تھی' لیکن پھر بھی اس نے اپنے اٹھتے ہوئے ہاتھ کو روک لیا اور درخشاں سے مخاطب ہو کر کہا۔ "اپنے اوپر جمی برف جھاڑ لیں یا مجھے اجازت دیں۔"

درخشاں نے یہ سنتے ہی فوراً اپنے لباس سے برف اچھی طرح صاف کر دی اور مسکرا کر بولی۔ "بس۔"

"بس۔" پروفیسر ڈینی نے اسے گہری نگاہوں سے دیکھا۔

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

"آج آپ کو دیر ہو گئی۔" درخشاں نے ان نگاہوں سے بچنے کا توڑ کیا۔

"ہاں' وہ کل مجھے ایک لیکچر دینا ہے' لائبریری میں اس کے لیے نوٹس تیار کرنا رہ گیا تھا۔"

"مجھے بھی آج خاصی دیر ہو گئی۔ لیب میں کام کرتے ہوئے کچھ وقت کا اندازہ ہی نہ ہوا۔ لیب میں ویسے بھی دن میں بلب روشن رہتے ہیں۔"

"کل' پرسوں' آپ کے پروفیسر براؤن سے بات ہوئی تھی۔ وہ آپ کی خاصی تعریف کر رہے تھے۔ ان کا خیال ہے کہ آپ اپنا کام وقت سے پہلے ہی ختم کر دیں گی۔" پروفیسر ڈینی نے اسے تعریفی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"اللہ کرے ایسا ہی ہو۔" درخشاں نے خوش ہو کر کہا۔

"کیوں' پاکستان جانے کی بہت جلدی ہے کیا؟" پھر وہ ویٹر سے مخاطب ہو کر بولے۔

"کافی۔"

"اپنے وطن کون واپس نہیں جانا چاہتا' میری بھی خواہش ہے کہ میں یہاں جلد از جلد ریسرچ مکمل کروں اور اپنے گھر کی راہ لوں۔" درخشاں نے کہا۔

"اگر آپ برا نہ مانیں تو ایک بات پوچھوں؟" پروفیسر ڈینی نے کہا۔

"ہاں' پوچھیں۔" درخشاں نے سڑک کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ برف باری اب بھی جاری تھی۔

"وہاں آپ کی کوئی راہ دیکھ رہا ہے؟" انہوں نے پوچھا۔

"ارے نہیں پروفیسر' ایسی کوئی بات نہیں۔"

"پھر کیا بات ہے' یہ نیویارک بہت بڑا ہے یا یہاں کے لوگ پسند نہیں آئے۔"

"ہاں' یہاں کے لوگ بہت برے ہیں۔" درخشاں نے پروفیسر کی طرف دیکھتے ہوئے ازراہ مذاق کہا۔

"درخشاں' میں آپ سے ایک بات کہنا چاہتا تھا۔" انہوں نے اس کے مذاق پر کوئی توجہ نہ دی۔

"آپ جو بات کہنا چاہتے ہیں' ضرور کہیں' لیکن اس بات کا خیال رکھیں کہ وہ بات ایسی نہ ہو کہ اس سے آپ کا امیج خراب ہو جائے۔ میں دراصل آپ کے بارے میں بہت اچھی رائے رکھتی ہوں۔" درخشاں نے پیش بندی کرتے ہوئے کہا۔ اسے اچانک یہ احساس ہوا تھا جیسے پروفیسر ڈینی کوئی ایسی بات کہنے والا ہو جسے درخشاں کے لیے سننا محال ہو۔ ایسی باتیں تو اس نے پاکستان میں نہیں سنی تھیں تو دیار غیر میں کیا سنتی۔

"مجھے نہیں معلوم' یہ بات بتانا آپ کو ضروری ہے یا نہیں' لیکن میرا جی چاہتا ہے کہ آپ سے اپنے بارے میں کچھ بات کروں' اپنا کچھ ذکر کروں' ہو سکتا ہے' بابر نے میرے بارے میں کچھ بتایا ہو' ہمیں تین چار ماہ ملتے ہوئے ہو گئے ہیں' گو ان ملاقاتوں کو انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے' لیکن

میرے لیے یہ ملاقاتیں اثاثہ ہیں۔"

"ایسا اثاثہ جنہیں فروخت نہیں کیا جا سکتا۔" درخشاں نے بات پھر مذاق میں اڑانا چاہی۔

اتنے میں ویٹر کافی رکھ گیا۔ درخشاں کافی بنانے لگی۔ پروفیسر ڈینی یکلخت خاموش ہو گیا۔ وہ درخشاں کو کافی بناتے ہوئے خاموشی سے دیکھنے لگا۔

"جی پروفیسر ڈینی' آپ کیا فرما رہے تھے؟" درخشاں نے اس کی طرف کپ بڑھاتے ہوئے کہا۔

"میں آپ سے اپنی شادی کا ذکر کرنا چاہتا تھا۔"

"شادی کا لفظ سن کر درخشاں کو ایک دم دھچکا سا لگا۔ یہ اپنی شادی کے بارے میں کیا بات کرنا چاہتا ہے؟ پہلے سے شادی شدہ ہے یا اب شادی کرنا چاہتا ہے؟

"میں سمجھی نہیں!" وہ واقعی نہیں سمجھی تھی۔

"میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میں شادی شدہ ہوں' لیکن میری بیوی میرے ساتھ نہیں رہتی۔"

پروفیسر ڈینی کی شادی کا ذکر اسے کچھ اچھا نہ لگا' لیکن وہ اس بات کا تجزیہ نہ کر سکی کہ ایسا کیوں ہوا۔ بہرحال اس نے اپنے جذبات چھپاتے ہوئے بڑی ہمدردی سے کہا۔ "یہ بات سن کر مجھے بہت افسوس ہوا۔"

کافی ختم ہو چکی تھی۔ جو بات اس نے کہنا تھی' وہ بھی کہہ چکا تھا۔ اب دیر ہو رہی تھی۔

"آیئے چلیں' باقی باتیں گاڑی میں کر لیں گے۔"

پھر اس نے زبردستی کافی کا بل ادا کیا۔ پروفیسر ڈینی نے اسے بل دینے سے بہت روکا' لیکن وہ نہ مانی۔

گاڑی میں بیٹھ کر دوسری باتیں ہوتی رہیں' لیکن شادی سے متعلق کوئی بات نہ ہوئی۔ درخشاں نے کچھ پوچھا نہ پروفیسر ڈینی نے کچھ بتایا۔

گھر پہنچ کر جب پروفیسر ڈینی نے گاڑی میں بیٹھے بیٹھے اسے گڈبائی کہا تو درخشاں بولی۔ "نہیں' یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ آپ اوپر چلیں۔"

"پھر آؤں گا۔ اس وقت مجھے دیر ہو رہی ہے' ایک جگہ پہنچنا ہے۔" پروفیسر ڈینی نے معذرت چاہی۔ حالانکہ وہ جانتی تھی کہ اس وقت پروفیسر کو کہیں نہیں جانا۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ اس بات کا ذکر کیفے میں ہی کرتے' بہرحال' جانے والے کو زبردستی نہیں روکا جا سکتا جبکہ درمیان میں کوئی رشتے والا رشتہ بھی نہ ہو۔

برف باری اب رک چکی تھی' لیکن ٹھنڈ بڑھ گئی تھی۔ درخشاں نے کھڑے ہو کر پروفیسر ڈینی کو واپس جاتے دیکھا' اسے ہاتھ ہلا کر الوداع کہا۔ جب اس کی گاڑی آنکھوں سے اوجھل ہو گئی

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

تو اس نے ایک ٹھنڈا سانس لیا اور دھیرے دھیرے سیڑھیاں چڑھنے لگی۔

گھنٹی بجانے پر فوراً ہی فاخرہ نے دروازہ کھول دیا۔ اس کے ہاتھ میں واکمن تھا۔

"اوہو' واکمن سے شوق فرمایا جا رہا تھا۔" درخشاں نے دروازے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"درخشاں' آج تم نے بڑی دیر کر دی' کہاں رہ گئی تھیں؟"

"کہاں رہتی بھابی' لیب میں کام کرتے ہوئے وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوا۔" درخشاں نے بتایا۔ "پھر یونیورسٹی سے نکلی تو بس سٹاپ پر پروفیسر ڈینی مل گئے۔ ان کا ملنا اچھا ہی ہوا' وہ کم از کم گھر تک چھوڑ گئے۔ ورنہ بس سٹاپ سے گھر تک پیدل آنا پڑتا اور وہ بھی اس جان لیوا سردی میں۔"

درخشاں درمیان سے کیفے کا ذکر گول کر گئی۔ اس کے نزدیک یہ کوئی معیوب بات نہ تھی' لیکن بھابی کو بات کا بتنگڑ بنانے میں بڑا مزہ آتا تھا اور وہ چاہتی نہیں تھی کہ اس کی کوئی بات بتنگڑ بن کر اس کے بھائی کے سامنے پہنچے۔

فاخرہ نے اس کی بات سن کر کوئی تبصرہ نہ کیا۔ یہ بھی نہ کہا کہ پروفیسر ڈینی اگر یہاں تک آئے تھے تو اوپر کیوں نہ آئے۔

"کافی تو پیو گی؟" فاخرہ نے پوچھا۔

"ہاں' کیوں نہیں' آپ کے ہاتھ کی کافی تو لاجواب ہوتی ہے۔"

"شکریہ اس عزت افزائی کا۔" یہ کہہ کر فاخرہ نے واکمن میز پر رکھا اور مسکراتی ہوئی کچن میں چلی گئی۔

فلیٹ چاروں طرف سے بند تھا۔ سامنے ہیٹر روشن تھا۔ سردی کا احساس کم ہوا تو اس نے کوٹ اتار دیا اور بڑی آسودگی سے صوفے پر لیٹ گئی۔

"بھائی' یہ گھر بھی بڑی عجیب چیز ہے۔ گھر میں گھستے ہی ایک آسودگی کا احساس ہوتا ہے' اس کی گرم آغوش میں کس قدر مزہ ہے۔" درخشاں نے لیٹے لیٹے کہا۔

"لیکن سارے گھر ایک جیسے نہیں ہوتے۔" فاخرہ کافی کا مگ اس کے ہاتھ میں تھما کر بولی۔ "کچھ گھر ایسے ہوتے ہیں جہاں گھستے ہی تنہائی کا احساس ہوتا ہے۔ کچھ گھر ایسے ہوتے ہیں جو کاٹنے کو دوڑتے ہیں اور کچھ گھر ایسے ہوتے ہیں جہاں جانے کو جی نہیں چاہتا۔ آدمی سوچتا ہے' کہیں باہر ہی رات بسر کرے تو اچھا ہے۔"

"پروفیسر ڈینی بھی آج کل شاید اسی قسم کے گھر میں رہ رہے ہیں؟"

"ہاں' اس کی اپنی بیوی سے علیحدگی ہے۔" فاخرہ بولی۔ "ہائے بے چارہ پروفیسر' کتنا بدقسمت ہے وہ' کتنا خوبصورت' کتنا ملنسار اور کتنا خوش اخلاق آدمی ہے۔ اس کے باوجود کس قدر تنہا۔ اصل میں اس کی بیوی بڑی تیز مزاج' جھگڑالو اور بے پروا قسم کی ہے۔ ان دونوں میں ایک

نٹ نہیں بنتی۔ تمہیں کچھ بتایا پروفیسر نے؟"

"بس اتنا ہی کہ وہ شادی شدہ ہیں اور ان کی بیوی ان کے ساتھ نہیں رہتی۔ اچھا چھوڑیں بھابی اس قصے کو' آپ ذرا واکمن پر کوئی نمکین سی دھن چھیڑیں۔"

فاخرہ واکمن بہت اچھی بجاتی تھی۔ اس شام درخشاں نے جی بھر کر واکمن سنا۔ وہ واکمن سنتی رہی اور اس کی نگاہوں میں وہ شخص گھومتا رہا جو اس کے دل کے بند کواڑوں پر آہستہ آہستہ دستک دینے کی کوشش کر رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

یہ بات دس پندرہ دن بعد کی ہے۔

وہ لیب میں بڑے انہماک سے کام کر رہی تھی کہ اچانک اسے احساس ہوا جیسے کوئی پیچھے کھڑا ہے۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو سامنے پروفیسر ڈینی کو پایا۔

"ارے' آپ!" درخشاں نے خوشگوار حیرت سے کہا۔

"آپ سے ملاقات ہوئے کافی دن ہو گئے تھے یا شاید زیادہ دن نہ ہوئے ہوں۔ یہ محض میرا احساس ہو۔ میں نے سوچا' آپ سے چل کر مل لوں۔"

"آپ نے بہت اچھا کیا۔ میں پانچ منٹ میں فارغ ہوتی ہوں۔ پھر چل کر کہیں بیٹھتے ہیں۔"

بیس منٹ کے بعد وہ ایک بہت خوبصورت ریستوران میں بیٹھے ہوئے تھے۔ پروفیسر ڈینی کافی اور کچھ کھانے پینے کی چیزوں کا آرڈر دے چکا تھا۔ وہ کچھ خاموش خاموش سا تھا۔ درخشاں یوں محسوس کر رہی تھی جیسے کوئی بات اس کے لبوں پر ہو اور وہ کچھ کہنے کی ہمت نہ کر پا رہا ہو۔

"کہیے پروفیسر' آپ کی اردو کہاں تک پہنچی؟"

یہ سن کر وہ چونکا جیسے کہیں خیالات میں گم ہو۔ پھر مسکراتے ہوئے اردو میں بولا۔ "ہم اس کتاب سے سیکھ رہا ہوں۔"

"میں اس کتاب سے سیکھ رہا ہوں۔" درخشاں نے تصحیح کی۔

"اوہ' یس' میں۔" پروفیسر ڈینی نے میں' میں کی گردان کرتے ہوئے کہا۔

"وہ کیسی کتاب ہے' اس سے کچھ سیکھنے میں مدد مل رہی ہے؟"

"وہ بہت اچھی کتاب ہے' ابھی میں الفاظ کا ذخرہ بڑھا رہا ہوں۔" پروفیسر ڈینی نے جھجک میں کہا۔ "کچھ تلفظ کا مسئلہ ہے۔"

"تلفظ تو آہستہ آہستہ ٹھیک ہو گا' اس کی فکر نہ کریں' بس زیادہ سے زیادہ بولنے کی کوشش کریں۔"

اتنے میں ویٹر ٹرے لے کر حاضر ہو گیا۔ درخشاں کافی بنانے لگی۔ کافی بناتے بناتے اسے اپنے چہرے پر کسی کی نگاہوں کا احساس ہوا۔

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

اس نے اچانک اپنی نگاہیں اٹھائیں تو پروفیسر کو بڑی محویت سے اپنی طرف دیکھتے ہوئے پایا۔

"کافی۔" درخشاں نے کافی کا مگ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے اس کی محویت توڑنے کی کوشش کی۔

تب اس نے اپنے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور اس کے سامنے ایک چیز رکھ دی۔

"یہ کیا ہے؟" درخشاں نے پریشان ہو کر اس چیز کو دیکھا۔

"یہ آپ کے لیے ہے۔" وہ بولا۔

"لپ اسٹک۔" درخشاں نے بڑی حیرت سے اسے دیکھا۔ "آپ جانتے ہیں کہ میک اپ سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔ آپ نے مجھے ان چیزوں کو کبھی استعمال کرتے نہ دیکھا ہوگا۔"

اور یہ بات تھی بھی حقیقت۔ میک اپ سے واقعی اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ چہرے اور آنکھوں کے میک اپ کی تو دور کی بات ہے' وہ لپ اسٹک اور نیل پالش کے استعمال کی بھی روادار نہ تھی۔

قدرت نے اسے سفید دودھ جیسی رنگت بخشی تھی۔ بڑی بڑی سیاہ جگمگاتی آنکھیں' ان پر گھنیری پلکوں کا سایہ' باریک کمان جیسی بھویں' بھرے بھرے گلابی ہونٹ۔

اسے بھلا میک اپ کی کیا ضرورت تھی۔

ویسے وہ میک اپ اس لیے نہیں کرتی تھی کہ اسے کسی سنگھار کی ضرورت نہ تھی۔ میک اپ سے وہ فطری طور پر کچھ الرجک سی تھی۔ اس مسئلے پر گل افشاں سے اس کی لڑائی رہتی تھی۔ وہ دونوں کہیں باہر نکلتیں تو گل افشاں اسے ٹوکتی۔ "باجی' میک اپ نہ سہی' ہونٹوں پر لپ اسٹک ہی لگا لیا کرو۔ برا لگتا ہے۔"

"اری چھوڑ' اس فضولیات میں کون پڑے۔" یہ کہہ کر پرس اٹھاتی اور دروازے سے نکل جاتی۔ تب گل افشاں کو مجبوراً اس کے پیچھے جانا پڑتا۔

لیکن شادی بیاہ کے موقع پر گل افشاں اڑ جاتی۔ "باجی' اگر آج تو بیواؤں کی طرح گھر سے نکلی تو مجھ سے برا کوئی اور نہ ہوگا۔"

"تو' تو سہاگن بن کر چل رہی ہے' بس اتنا کافی نہیں کیا؟"

"باجی' تو سمجھتی کیوں نہیں' ایسے موقعوں پر ہزار نظریں چہرے پر پڑتی ہیں۔ عزیز رشتے دار بھی دیکھتے ہیں۔ پھر خاندان کے لڑکے بھی ہوتے ہیں وہاں۔"

"میں شادی میں جا رہی ہوں یا وہاں خود کو پسند کروانے جا رہی ہوں' مجھے نہیں اچھا لگتا۔"

بنا سنورنا' یہ میک اپ' یہ فضولیات۔" درخشاں جھلا جاتی۔

"آج اگر تو نے لپ اسٹک نہ لگائی اور بالوں کا جوڑا نہ بنایا' پھر دیکھ میں تیری کیسی خبر لیتی ہوں۔" گل افشاں بھی مقابلے پر آ جاتی۔

"کیا کر لے گی تو؟" درخشاں پوچھتی۔

"ابھی ابو کو جا کر بتاتی ہوں۔" وہ دھمکی دیتی۔

"یہ کیا بکواس ہے' ابو کا اس بات سے کیا تعلق؟"

"بس ڈر گئی نا' چل اب سیدھی طرح ادھر بیٹھ جا' میں صرف لپ اسٹک لگاؤں گی' نیل پالش لگاؤں گی اور تیرے بالوں کا جوڑا بناؤں گی۔"

پھر اسے گل افشاں کی محبت کے آگے ہتھیار ڈالنا پڑتے۔

جب وہ امریکا آئی تو بھابی فاخرہ کو بھی یہ بات بڑی عجیب لگی۔ اس نے شروع شروع میں اسے میک اپ کی طرف راغب کرنے کی بہت کوشش کی' لیکن وہ دام میں نہ آئی۔ تب تھک ہار کر فاخرہ نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔

اب اس کی زندگی میں یہ نیا مرحلہ آ گیا تھا۔

پروفیسر ڈینی اس کے لیے لپ اسٹک خرید لائے تھے' انہیں کیا ہو گیا تھا؟

"ہاں' میں جانتا ہوں' آپ میک اپ نہیں کرتیں۔ میں نے آپ کے چہرے پر کبھی میک اپ نہیں دیکھا' لیکن میں چاہتا ہوں کہ آپ کم از کم لپ اسٹک کا استعمال ضرور کریں' بے شک ہلکی سی لگائیں۔"

اب درخشاں میں پروفیسر ڈینی کی دلچسپی بڑی حد تک واضح ہو گئی تھی۔ درخشاں نے ایک بار سوچا کہ اس محبت بھرے تحفے کو سختی سے ٹھکرا دے' لیکن ایسا کرنے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔ وہ پروفیسر ڈینی کا دل نہیں توڑنا چاہتی تھی' بے چارہ اس کی خاطر شاپنگ کرنے پر مجبور ہوا۔ جانے کس طرح اس نے یہ لپ اسٹک خریدی ہوگی۔ سیلز گرل کی دبی دبی مسکراہٹ کا اس نے کس طرح مقابلہ کیا ہوگا۔

اسے اس بات کا احساس نہیں تھا کہ اس کا چہرہ پروفیسر کے لیے کس قدر کشش کا باعث بن گیا ہے۔ اس نے پروفیسر کی نگاہوں کو بارہا اپنے چہرے پر محسوس کیا تھا' لیکن وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ وہ اس قدر غور سے اس کے چہرے کو دیکھا کرتا ہے۔ وہ یہاں تک جانتا ہے کہ وہ لپ اسٹک بھی استعمال نہیں کرتی۔

وہ پروفیسر کی اس توجہ کو کیا سمجھے؟ محبت سمجھے' لگاؤ سمجھے یا محض دوستی؟

اسے معلوم تھا کہ اگر اس نے اس تحفے کو قبول کر لیا تو کل وہ کوئی اور چیز اس کے لیے لے آئے گا۔ پھر یہ سلسلہ بڑھتا ہی جائے گا۔ ہو سکتا ہے' وہ اس سے فضول قسم کی توقعات باندھ لے۔

ان سارے خدشات کے باوجود اس تحفے کو واپس کرنے کی اپنے اندر ہمت نہ پاتی تھی۔ پروفیسر التجا بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ تب اس نے درمیان کا راستہ نکالا۔

"پروفیسر ڈینی' آپ کا یہ بیش قیمت تحفہ میں قبول کر لوں گی' لیکن آپ کو میرے ساتھ

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

ایک عہد کرنا ہوگا۔"

"میں سارے عہد کرنے کے لیے تیار ہوں۔" اس نے جذباتی انداز اختیار کیا۔

"سارے عہد نہیں' صرف ایک۔" درخشاں نے ہنس کر کہا۔ "یہ آپ کا پہلا اور آخری تحفہ ہوگا۔"

"یہ بہت مشکل عہد ہے۔" وہ بولا۔

"لیکن کرنا ہوگا۔" درخشاں نے زور دے کر کہا۔

"اچھا ٹھیک ہے' میں کوشش کروں گا کہ آئندہ کوئی چیز آپ کو نہ دوں۔"

"کوشش نہیں' پکا عہد۔"

"اچھا بابا' پکا عہد' یہ میرا آخری تحفہ ہے۔" بالآخر ڈینی کو کہنا پڑا۔

"تھینک یو۔" درخشاں نے خوش ہو کر کہا اور اس لپ اسٹک کو اٹھا لیا۔ اسے الٹ پلٹ کر دیکھا۔ پھر اسے کھولا اور اس کو دیکھ کر خوشی کا اظہار کرتی رہی۔

اس کے بیگ میں اس وقت آئینہ نہیں تھا' نہیں تو وہ یہیں بیٹھے بیٹھے اپنے ہونٹوں پر یہ لپ اسٹک لگا لیتی۔ پھر وہ کچھ سوچ کر اٹھی اور پروفیسر ڈینی سے مخاطب ہو کر بولی۔ "میں ایک سیکنڈ میں آئی۔"

اس نے ریستوران کے ٹوائلٹ کا رخ کیا' وہاں آئینہ موجود تھا۔

اس نے لپ اسٹک کو بڑی نفاست سے لگایا اور اپنی صورت آئینے میں دیکھنے لگی۔

گل افشاں جب زبردستی اس کا بناؤ سنگھار کیا کرتی تو وہ کبھی پلٹ کر آئینہ نہ دیکھتی تھی' لیکن آج اس نے اپنے آپ کو مختلف زاویوں سے دیکھا۔

لپ اسٹک کا شیڈ اس کے ہونٹوں سے ہم رنگ تھا۔ اس نے اس رنگ کو اور گہرا کر لیا۔ وہ اچھی لگ رہی تھی اور بار بار اپنے آپ کو آئینے کے نزدیک کر کے دیکھ رہی تھی۔

جب وہ واپس میز پر آئی اور پروفیسر ڈینی کے سامنے بیٹھی تو اس کی نگاہیں خود بخود جھک گئیں' اسے شرم سی محسوس ہوئی' لیکن اس نے خود کو سنبھالے رکھا۔

پروفیسر ڈینی نے جب اس کے ہونٹوں پر لپ اسٹک لگی دیکھی تو یکا یک اس کی آنکھوں میں بہت سے چراغ جل اٹھے۔ وہ خوشی سے جھوم اٹھا اور اس کے ہاتھ پر آہستہ سے ہاتھ رکھ کر بولا۔ "تھینک یو۔"

درخشاں نے فوراً اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور کافی کی طرف توجہ دلاتے ہوئے بولی۔ "کافی لیں' ٹھنڈی ہو رہی ہے۔"

"اصل میں تحفے کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔ تحفے کی قیمت تو تحفہ وصول کرنے والا متعین کرتا ہے۔ ایک ڈالر کی حقیر سی چیز ایک لاکھ ڈالر کی بن سکتی ہے اور ایک لاکھ ڈالر کی چیز ایک ڈالر کی ہو سکتی ہے۔ آپ نے اس حقیر سے تحفے کو فوراً استعمال کر کے لاکھوں کا بنا دیا ہے۔ اس پذیرائی پر

تہ دل سے آپ کا مشکور ہوں۔

"اچھا بس' بہت ادا ہو گیا شکریہ۔" درخشاں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

یسے ڈینی آپ کو یہ سوجھی کیا؟"

"ایک مرتبہ میں اور آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں کہ آپ نے مجھے پروفیسر ڈینی نہ کہا'

ف ڈینی کہا۔" پروفیسر ڈینی نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ایسا غلطی سے ہو گیا۔" وہ جھینپ کر بولی۔

"میں چاہتا ہوں' یہ غلطی مستقل ہوتی رہے۔"

"چلیے' آپ کو صرف ڈینی کہلوانا اچھا لگتا ہے تو میں یہ کہہ دیا کروں گی۔" درخشاں نے

"تھینک یو۔" ڈینی کی آنکھوں میں ایک مرتبہ پھر چراغ جل اٹھے۔

پھر وہ کچھ دیر اور ریستوران میں بیٹھے۔ اس کے بعد درخشاں کی خواہش پر ڈینی نے ے یونیورسٹی واپس چھوڑ دیا۔ اس کے جانے کے بعد اس نے لیبارٹری کے ٹوائلٹ میں جا کر ٹشو سے رگڑ کر اچھی طرح لپ اسٹک صاف کر دی۔ وہ بڑی مشکل سے صاف ہوئی۔ رنگ کچھ زیادہ گہرا چڑھ گیا تھا۔

پھر وہ لیب میں واپس آ کر گل افشاں کو خط لکھنے لگی۔

گل افشاں کے خط بڑی پابندی سے اس کے پاس آتے تھے۔ ان خطوں میں بڑی ت ہوتی تھی۔ وہ اسے بڑی شدت سے یاد کرتی تھی۔ ہائے باجی' اب نہ شاپنگ کا مزہ رہا ہے نہ ک کا۔ تقریبات میں بھی اکیلی ٹوتھ سی بنھی رہتی ہوں۔ باجی' تو میری کمپنی تھی۔ تجھے امریکیوں چھین لیا۔ یہ گورے لوگ ہمارے پیچھے کیوں پڑ گئے ہیں آخر۔

گل افشاں کا خط آتا تو وہ اداس ہوئے بنا نہ رہتی' بے اختیار اس کا جی چاہتا کہ وہ سب ہ چھوڑ چھاڑ کر اپنی چھوٹی بہن کے پاس پہنچ جائے۔ اس کے بغیر وہ خود کو بعض اوقات ادھورا سا وس کرتی۔ ایک خلا اس کی زندگی میں ابھر آتا۔

وہ اسے بہت پیار بھرے لہجے میں جواب دیتی۔ دیکھ گل افشاں' تو مجھے اس قدر محبت ے خط نہ لکھا کر۔ میرا جی اچاٹ ہو جاتا ہے۔ میں چاہتی ہوں جس کام کے لیے آئی ہوں' وہ کے ہی جاؤں' لیکن لگتا ہے' تیرے خطوط مجھے کہیں کا نہ چھوڑیں گے۔ میری پیاری بہن' تھوڑا کر لے۔

درخشاں اپنے خطوں میں پروفیسر ڈینی کا ذکر ضرور کیا کرتی تھی۔ جواب میں اب گل اں اسے چھیڑنے لگی تھی' لیکن وہ ہر بار بڑی سختی سے اس کے خدشات کی تردید کر دیتی تھی۔ اری' ں ہوئی ہے کیا۔ یہ عشق وشق تجھے ہی مبارک ہوں' میں ان فضولیات کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ میں س کام کرنے آئی ہوں۔ میرا دماغ ہمہ وقت کام ہی کی طرف رہتا ہے۔ انشاء اللہ کام مکمل کر کے

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

جیسی تیرے پاس سے آئی تھی' ویسی ہی تیرے پاس پہنچ جاؤں گی۔

آج جب وہ خط لکھنے بیٹھی تو ڈینی کے تحفے سے متعلق تمام جزئیات بیان کردیں' لیکن ڈینی کے سامنے لپ اسٹک استعمال کرنے والی بات بڑی صفائی سے گول کرگئی۔ اگر اسے یہ معلوم ہو جاتا کہ اس نے ایک گورے کی دی ہوئی لپ اسٹک کو بڑے چاؤ سے استعمال کیا ہے تو وہ خط ملتے ہی پہلی فلائٹ سے ریوالور لے کر امریکا پہنچ جاتی۔ آخر باجی' ہم سے اچھا تو وہ گورا ہی رہا۔ ہم پوری زندگی تیری خوشامدیں کرکر کے تھک گئے' لیکن تیرے کان پر جوں تک نہ رینگی اور اس گورے کی دی ہوئی لپ اسٹک فوراً ہونٹوں پر تھوپ لی۔

ویسے یہ بات اس کے لیے بھی باعث حیرت تھی۔

اسے کیا ہو گیا تھا کہ لپ اسٹک کو استعمال کرنے میں اس قدر عجلت سے کام لیا۔ اس نے لپ اسٹک دی تھی تو لے کر پرس میں ڈال لیتی۔ بعد میں کہیں اٹھا کر پھینک دیتی۔ وہ پلٹ کر ہرگز نہ پوچھتا کہ اس کی دی ہوئی لپ اسٹک استعمال کیوں نہ کی۔

آخر یہ سب کیسے ہوا۔ اس نے اس کے بے قیمت تحفے کو اس قدر قیمتی کیوں بنا دیا۔

خط بند کرکے وہ بہت دیر تک اس مسئلے پر غور کرتی رہی' لیکن اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ اس جذبے کو وہ کوئی نام دیتے ہوئے ڈرتی۔

عشق اس کے نزدیک دماغ کے خلل سے زیادہ اہمیت نہ رکھتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ محبت صرف ایب نارمل لوگ کرتے ہیں اور وہ نارمل رہنا چاہتی تھی۔

بہرحال' اس دن وہ بہت خوش تھی۔ گھر میں داخل ہوئی تو اس کا جی چاہا کہ وہ بھابی کے گلے میں بانہیں ڈال کر جھول جائے۔ آج وہ ان سے دامن پر خوشی کی دھنیں سنے' لیکن اس نے کسی طرح اپنے جذبات پر قابو پالیا۔ بھابی کے سامنے ایسا کرنا بہت ضروری تھا۔

ویسے وہ جب سے یہاں آئی تھی بھابی کے رویے میں ایک عجیب سی بات محسوس کر رہی تھی اور اس احساس کے پیچھے کوئی ٹھوس وجہ بھی نہ تھی۔ بس ایک واہمہ سا تھا۔

اس کا خیال تھا کہ جیسے بھابی اس کی یہاں آمد سے خوش نہ ہوں۔ ویسے وہ اس کا ہر طرح سے خیال رکھتی تھی' کبھی کسی کمی کا احساس نہ ہونے دیا تھا۔ پھر بھی جانے کیوں فاخرہ کے چہرے سے یہ گمان ہوتا کہ وہ درخشاں کے یہاں رہنے سے خوش نہیں ہے۔

یونیورسٹی آنے جانے کا بڑی حد تک وقت مقرر تھا۔ اس کے باوجود جاتے ہوئے فاخرہ' درخشاں سے واپسی کا وقت ضرور معلوم کرتی تھی۔ ایسا شاذ ہی ہوتا تھا کہ وہ وقت مقررہ سے پہلے آ جائے۔ اگر آ جاتی تو فاخرہ کچھ اس انداز سے سوال کرتی کہ اسے ایسا محسوس ہوتا جیسے قبل ازوقت آ کر اس نے بھابی کو کوئی بڑا نقصان پہنچا دیا ہے۔ اگر وہ دیر سے آتی تو وہ سرسری سا پوچھ کر رہ جاتی جیسے اس نے دیر سے آ کر برا نہ کیا ہو۔

یونیورسٹی سے آنے کے بعد وہ کھانا کھاتی اور کچھ دیر آرام کرنے کے لیے لیٹ جاتی۔

اخبار یا کوئی میگزین پڑھنے کے لیے اٹھا لیتی۔ پھر پڑھتے پڑھتے اسے نیند آ جاتی۔ لیٹتے وقت وہ کمرے کا دروازہ کبھی بند نہیں کرتی تھی' لیکن جب وہ سو کر اٹھتی تو اکثر اس کے کمرے کا دروازہ بند ہوتا۔

فاخرہ پھر خود ہی بتا بھی دیتی کہ دروازہ اس نے بند کر دیا تھا کہ وہ اطمینان سے سو سکے' کیونکہ وہ دامکن پر ایک نئی دھن نکالنے کی کوشش کر رہی تھی۔

کبھی ایسا ہوتا کہ جب وہ سو کر اٹھتی تو دروازہ کھول کر باہر آ جاتی اور یہ دیکھنے کے لیے کہ بھابی کیا کر رہی ہے' وہ اس کے بیڈ روم میں چلی جاتی تو وہ فاخرہ کو ٹیلی فون پر بات کرتے ہوئے پاتی۔ وہ بڑے آرام سے لیٹے ہوئے فون پر بات کر رہی ہوتی۔ بات کرنے کے انداز سے معلوم ہوتا' جیسے کسی دوست کا فون ہے۔ درخشاں کمرے میں داخل ہوتی تو وہ فوراً ٹیلی فون بند کر دیتی اور مسکرا کر درخشاں کا استقبال کرتی۔ ''اٹھ گئی شہزادی۔''

''جی بھابی۔'' وہ ہنس کر کہتی' لیکن اسے احساس ہوتا جیسے وہ اس کے کام میں مخل ہوئی ہے۔

ایک دن وہ صبح سو کر اٹھی تو اس کا سر درد کی شدت سے پھٹا جا رہا تھا۔ اسے کچھ ہلکا ہلکا بخار بھی محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے سوچا' آج یونیورسٹی سے چھٹی کر لے' کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کی طبیعت مزید خراب ہو جائے۔ وہ پچھلے دنوں کافی محنت کرتی رہی تھی' دن رات کام کی وجہ سے شاید وہ اعصابی تھکن کا شکار ہو گئی تھی۔ آج وہ آرام کرے گی تو اس کے اعصاب کو سکون مل جائے گا۔

اس نے گھڑی کی طرف دیکھا' آٹھ بج رہے تھے۔ بھیا کب کے دفتر جا چکے تھے۔ اس نے سوچا' ایک گھنٹا اور آرام کر لے' نو بجے اٹھے گی پھر ناشتا وغیرہ کرکے' دوبارہ لیٹ جائے گی۔ یہ سوچ کر اس نے کمبل اپنے گرد لپیٹ لیا اور سونے کی کوشش کرنے لگی' لیکن درد کی شدت نے اسے سونے نہ دیا۔

ابھی وہ سونے کے لیے کروٹیں ہی بدل رہی تھی کہ فاخرہ کمرے میں داخل ہوئی اور اسے کمبل میں لپٹا دیکھ کر اس کی طرف تیزی سے بڑھی۔ ''ارے شہزادی' آج یونیورسٹی نہیں جاؤ گی؟''

''نہیں بھابی۔'' درخشاں بولی۔

''کیوں؟ خیریت' کل تو تم نے ایسا کوئی تذکرہ نہیں کیا۔'' فاخرہ نے کہا۔

''بھابی میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور آج ہی خراب ہوئی ہے۔ سر میں درد اور بخار سا ہے۔''

''ارے تو یہ بات مجھے کیوں نہیں بتائی' میں ابھی تمہیں ایک گولی دے دیتی ہوں' آدھے گھنٹے میں تمہاری طبیعت ٹھیک ہو جائے گی' پھر تم چاہو تو یونیورسٹی چلی جانا۔''

''آپ مجھے دوا ضرور دے دیں' لیکن میں آج گھر پر آرام کروں گی۔ بہت تھک گئی ہوں۔''

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

"جیسی تمہاری مرضی۔ میں تو اس لیے کہہ رہی ہوں کہ تمہارے کام کا ہرج نہ ہو۔" یہ کہہ کر وہ کمرے سے نکل گئی۔

کمبل میں منہ لپیٹے وہ سوچتی رہی کہ بھابی اسے گھر سے نکالنے پر مصر کیوں ہے جبکہ اس نے پچھلے تین چار ماہ میں یہ پہلی چھٹی کی تھی۔ اسے تو خوش ہونا چاہئے تھا کہ آج وہ گھر پر رہ کر اسے کمپنی دے گی۔

پھر وہ اٹھ گئی۔ باتھ روم میں جا کر منہ ہاتھ دھویا اور کچن میں جا گھسی۔ فاخرہ بھی باورچی خانے میں موجود تھی' وہ برتن دھو رہی تھی۔ اسے دیکھ کر بولی۔ "پہلے کچھ کھا لو' پھر میں دوا دیتی ہوں' جاؤ تم ناشتے کی میز پر چلو' میں تمہارے لیے ناشتا وہیں لا رہی ہوں۔"

"اب ایسی طبیعت تھوڑا ہی خراب ہے کہ میں اپنے لیے ناشتا بھی تیار نہ کر سکوں۔"

پھر اس نے ناشتا تیار کیا۔ ناشتا کر کے اس نے اپنے اور فاخرہ کے لیے کافی بنائی۔ دس پندرہ منٹ فاخرہ سے گپ شپ کی پھر اس سے گولی لے کر کھائی۔

"اچھا بھابی' میں اب چلتی ہوں اپنے کمرے میں۔" وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

اس سے پہلے کہ فاخرہ کوئی جواب دیتی۔ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ وہ تیر کی طرح ٹیلی فون کی طرف گئی۔

"ہیلو' اچھا' ایک منٹ ہولڈ کرو۔" اس نے انگریزی میں کہا۔

پھر وہ ریسیور رکھ کر دروازے تک آئی۔ باہر درخشاں موجود نہ تھی۔ وہ سمجھی کہ اپنے کمرے میں چلی گئی ہوگی حالانکہ اس وقت وہ کچن میں تھی۔ اپنے لیے ایک گلاس پانی نکال رہی تھی تاکہ اپنے سرہانے رکھ سکے۔ فاخرہ واپس پلٹی' اس نے ریسیور اٹھایا اور بولی۔ "سنو' آج وہ گھر پر ہے' یونیورسٹی نہیں جا رہی۔"

اپنا ذکر سن کر درخشاں دروازے پر رک گئی۔

"آج نہیں' کل تم مجھے دس بجے کے بعد ٹیلی فون کر لینا۔ ٹھیک ہے' او کے۔"

ٹیلی فون پر گفتگو ختم ہوتے سن کر درخشاں تیزی سے اپنے کمرے کی طرف لپکی۔ سائیڈ ٹیبل پر گلاس رکھا اور جلدی سے کمبل اوڑھ لیا۔

یہ فاخرہ کس کو اس کے بارے میں بتا رہی تھی۔ کون ہے وہ؟ یہ کیا چکر ہے۔ اب اس کی سمجھ میں کچھ کچھ آنے لگا۔ آج بھابی اس کے گھر پر رہنے کی وجہ سے خوش کیوں نہیں ہوئی۔ شاید کہیں جانے کا پروگرام تھا' کسی سے ملنے کا وعدہ تھا' لیکن اس نے گھر پر رہ کر سب کیے دھرے پر پانی پھیر دیا۔

کیا اسے فاخرہ سے اس موضوع پر بات کرنا چاہئے۔ نہیں' ابھی وہ کوئی بات نہیں کرے گی۔ سانپ بل میں داخل ہو جائے تو اسے دم سے پکڑ کر کبھی نہیں کھینچنا چاہئے۔ اس طرح وہ کبھی ہاتھ نہیں آتا۔ اس کے بل سے نکلنے کا انتظار کرنا چاہئے۔ سو وہ مناسب وقت کا انتظار کرے گی۔

اس گولی سے واقعی اسے آرام آ گیا۔ سر کا درد بھی ختم ہو گیا اور بخار کی سی کیفیت بھی دور ہو گئی۔ سکون ملا تو اسے نیند آ گئی۔

کوئی گیارہ بجے کے قریب فاخرہ نے اسے اٹھایا۔ "درخشاں' تمہارا فون ہے۔"

"میرا فون!" اس نے اپنے اوپر سے کمبل ہٹاتے ہوئے کہا۔

"ہاں' ہاں' تمہارا فون ہے۔"

"میرا فون کہاں سے آ گیا؟" اس نے بیڈ سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "مجھے کون ٹیلی فون کر سکتا ہے!"

"وہ ہیں۔" فاخرہ نے آنکھیں چمکاتے ہوئے کہا۔

"وہ کون؟" درخشاں حیران تھی۔

"تمہارے پروفیسر ڈینی۔" فاخرہ مسکرا کر بولی۔

"ارے' ان کا فون کیسے آ گیا!" پھر اس نے بھاگ کر ریسیور اٹھایا۔

"ہیلو' درخشاں بول رہی ہوں۔"

"ہاں' کیا ہوا آپ کو' آج یونیورسٹی نہیں آئیں۔"

"آپ کو کیسے پتا چلا؟" اس نے پوچھا۔

"جب ربط گہرا ہو جائے تو پھر سب کچھ خود بخود معلوم ہونے لگتا ہے۔" ڈینی نے فلسفہ جھاڑا۔

"گویا پادری ہو گئے۔" اس نے ہنس کر کہا۔

"اب کیا حال ہے' کیسی طبیعت ہے' کیا ہوا تھا؟" کئی سوالات ایک ساتھ ہوئے۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں' ذرا سر میں درد تھا اور کچھ بخار کی سی کیفیت تھی۔ آپ کو ڈاکٹر براؤن سے پتا چلا ہوگا۔ میں نے صبح انہیں ٹیلی فون کر دیا تھا۔"

"جی جناب' مجھے انہوں نے ہی بتایا' کیا میں آپ کو دیکھنے آ سکتا ہوں؟" ادھر شوق دیدار تھا۔

"ضرور آئیں' مجھے خوشی ہوگی۔" ادھر بھی کوئی چنگاری دبی ہوئی تھی۔

"ٹھیک ہے' میں تین بجے تک آؤں گا۔" وہ خوشی میں جھومتا ہوا بولا۔

"او کے بائی۔" درخشاں نے ٹیلی فون بند کیا اور فاخرہ کی آنکھوں میں دیکھا۔ وہ بڑے معنی خیز انداز میں مسکرا رہی تھی۔

"آ رہے ہیں؟" وہ بولی۔ "کب تک آئیں گے؟"

"تین بجے تک آئیں گے۔" درخشاں نے سادگی سے کہا۔

"ٹھیک ہے' اس وقت میں ایک دو گھنٹے کے لیے باہر چلی جاؤں گی' تم تنہائی میں اطمینان سے باتیں کر لینا۔" فاخرہ نے بڑی فراخدلانہ پیشکش کی۔

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

اسے یہ سن کر غصہ آ گیا۔ اسے لگا جیسے کسی نے اس کا سر دیوار سے دے مارا ہو۔ ایک دھماکا سا ہوا تھا اور اسے اپنے سر میں شعلے سے بھرے محسوس ہوئے تھے۔

"جی شکریہ بھابی' آپ پورے اطمینان سے گھر میں رہیں بلکہ جب پروفیسر ڈینی آ جائیں تو آپ ہمارے ساتھ بیٹھیں۔ میرے اور ان کے درمیان تعلقات آئینے کی طرح صاف ہیں۔"

یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔ اس نے انہی آنسو بھری آنکھوں سے بھابی کو دیکھا اور اپنے کمرے میں جا کر بیڈ پر اوندھے منہ جا گری اور سسکنے لگی۔

یہ بھابی نے اسے کیا سمجھ لیا ہے۔ امریکا میں رہ کر تو ان کی عادتیں ہی بدل گئی ہیں۔ انہوں نے ڈینی اور میرے درمیان آخر ایسا کیا دیکھا کہ اتنی آسانی سے اتنی بڑی بات کہہ دی۔ ٹھیک ہے' میں ابھی ٹیلی فون کر کے انہیں آنے سے منع کر دیتی ہوں۔

وہ اٹھ کر باہر جانے لگی تو فاخرہ دروازے میں سے اندر داخل ہوئی اسے باہر جاتے دیکھ کر بولی۔ "کہاں جا رہی ہوں درخشاں؟"

"پروفیسر ڈینی کو فون کرنے جا رہی ہوں۔" اس نے بے رخی سے کہا۔

"کیوں؟" اس نے پریشان ہو کر پوچھا۔

"میں نہیں چاہتی کہ وہ یہاں آئیں' کم از کم میرے لیے۔" درخشاں نے بتایا۔

"بے وقوفی کی باتیں نہیں کرتے' تم نے میرے مذاق کو شاید سنجیدگی سے لے لیا ہے۔ نند' بھاوج میں آخر اتنا مذاق تو چلتا ہی ہے۔" فاخرہ نے صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔

"لیکن بھابی' ایسا گندا مذاق مجھے ہرگز پسند نہیں' براہ کرم آئندہ نہ کریں۔" وہ دوٹوک لہجے میں بولی۔

"اچھا بابا' نہیں کروں گی۔ چلو' میں معذرت کر لیتی ہوں۔" فاخرہ نے اس کے دونوں ہاتھ تھام کر کہا۔ "اب تم پروفیسر کو گھر آنے سے منع نہیں کرو گی' ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔" وہ بیڈ کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔ آپ اپنا ذہن میری طرف سے بالکل صاف کر لیجیے۔ میں ذرا مختلف قسم کی لڑکی ہوں۔ میں یہاں پاکستان کا نام اچھالنے نہیں آئی' روشن کرنے آئی ہوں۔"

فاخرہ نے اس بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ وہ کچھ دیر کمرے میں کھڑی رہی۔ پھر تیزی سے باہر نکل گئی۔

پھر اس بات کو دو تین ہفتے گزر گئے۔

پروفیسر ڈینی کے سینے میں جو شمع محبت روشن ہوئی تھی' اس کی روشنی نے اب درخشاں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ ایک دن اس نے وہ بات کہہ دی جس کی توقع درخشاں کو تھی' لیکن وہ اس بات کو سننا نہیں چاہتی تھی۔

پروفیسر ڈینی' درخشاں میں بہت سنجیدہ ہو گیا تھا۔ اس شام تھیٹر سے نکلتے ہوئے اس نے درخشاں کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا اور کہا تھا۔ "تم وہ لڑکی ہو جس کا مجھے صدیوں سے انتظار تھا۔"

درخشاں نے بہت آہستگی سے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھڑا لیا تھا اور مسکرا کر کہا تھا۔ "کیوں مجھے بے وقوف بناتے ہیں۔"

"میں سچ کہتا ہوں' مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے۔" اس نے صاف لہجہ اختیار کیا۔

لیکن خواب میں' میں ایسی کوئی بات نہ کہوں گی۔" درخشاں نے بھی صاف گوئی سے کام لیا۔

"میں جانتا ہوں' میں بہت بدقسمت انسان ہوں۔" وہ اداس ہو گیا۔

"پروفیسر ڈینی' ہم الگ الگ دو سیارے ہیں جو اپنی ایک جداگانہ دنیا رکھتے ہیں۔ آپ میری تمنا کرنا چھوڑ دیں۔"

"تم میری دنیا کا چاند ہو۔" وہ بولا۔

"ہاں' ایسا چاند جسے آپ دور سے دیکھ سکتے ہیں۔" اس نے ہنس کر کہا۔

"میں چاند پر چلا جاؤں گا' اپنی دنیا چھوڑ دوں گا۔" ڈینی نے فیصلہ سنایا۔

"وہ کیسے؟ چاند پر جانا اتنا آسان کہاں؟" اس نے وضاحت چاہی۔

"میں مسلمان ہو جاؤں گا' تمہاری زبان سیکھ لوں گا۔"

جب اس نے یہ بات سنی تو وہ چلتے چلتے رک گئی۔ اس کے مقابل ہوئی۔ اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ اس کی آنکھوں میں سچائی کے دیے روشن تھے۔ وہ بے قراری سے بولی۔ "ڈینی' تم اتنے سنجیدہ ہو مجھ میں۔ اپنا وطن' اپنا مذہب' اپنی زبان سب چھوڑ دو گے۔"

"ہاں' میں اتنا ہی سنجیدہ ہوں۔" اس نے بڑے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

"لیکن یہ سب اتنا آسان نہیں ہے' میری جگہ کوئی اور لڑکی ہوتی تو شاید وہ یہ سب سن کر ہواؤں میں اڑ رہی ہوتی اور یہ بات ہے بھی کسی بھی لڑکی کے لیے قابل فخر' لیکن میں بہت حقیقت پسند لڑکی ہوں۔ جذبات میں بہنا مجھے نہیں آتا اور میں چاہتی ہوں کہ تم بھی جذباتی فیصلے سے احتراز کرو' تم شادی شدہ آدمی ہو۔ تمہاری بیوی نیویارک کے نواح میں ایک چھوٹے سے گھر میں تمہاری منتظر ہے۔ تم اس کے لیے واپس لوٹ جاؤ' وہ تمہاری دنیا کی عورت ہے۔ ہم رنگ' ہم تہذیب' میں مریخ کی مخلوق ہوں' میں نہ تمہاری دنیا میں تمہارے ساتھ رہ سکتی ہوں اور نہ ہی اپنے ساتھ تمہیں لے جا سکتی ہوں۔ یہ میرا آخری اور اٹل فیصلہ ہے۔ اب آپ مجھے میرے گھر تک چھوڑ دیں اور میری طرف سے اپنا ذہن صاف کر لیں۔ دوست کی حیثیت سے میں ہمیشہ آپ کو خوش آمدید کہوں گی۔ ہمیشہ یاد رکھوں گی۔ آیئے اب چلیں' آپ کی گاڑی کس طرف کھڑی ہے؟"

پھر اس شام ان دونوں کے درمیان کوئی بات نہ ہوئی۔ اب کہنے کو رہ بھی کیا گیا تھا۔

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

دونوں ہی اپنی باتیں بڑے صاف لفظوں میں کہہ چکے تھے۔

اس رات درخشاں سو نہ سکی۔ رہ رہ کر اسے ڈینی کا خیال آتا رہا۔ اس نے اس کی محبت کو بڑی بے دردی سے ٹھکرا دیا تھا' لیکن اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ اگر وہ دوٹوک انداز اختیار نہ کرتی تو شاید وہ ڈینی کی محبت سے کبھی نجات نہ پا سکتی۔

اس نے ایک محبت بھرا دل توڑا تھا' لیکن وہ جانتی تھی کہ اس تخریب میں تعمیر چھپی ہے۔ بالآخر ڈینی اپنی بھولی ہوئی بیوی کی طرف لوٹ جائے گا' جو دل اس نے توڑا ہے' وہ اس کی بیوی جوڑ دے گی اور ایک مشرقی لڑکی کا یہ احسان کبھی نہ بھولے گی۔

شاید آج ڈینی سے اس کی آخری ملاقات تھی۔ وہ بڑا انا پرست شخص ہے' اب شاید اس کی طرف لوٹ کر نہ آئے۔ پھر اس کے دل نے پلٹا کھایا۔ پچھتاوا شروع ہوا۔ ہائے' اس نے خواہ مخواہ اسے ٹھکرا دیا۔ اس کے لیے تو وہ اپنا مذہب' اپنا ملک سب کچھ چھوڑ رہا تھا۔ ایسی ہینڈسم شخصیت' پاکستان میں اگر اس کی دوست دیکھتیں تو دانتوں تلے انگلی دبا کر رہ جاتیں۔ پھر گل افشاں کو جب یہ معلوم ہوگا کہ اس نے اپنی حماقت سے ایک اچھا شخص کھو دیا تو وہ اسے کیا کیا نہ کہے گی۔

بس انہی خیالات میں غلطاں سحر ہوگئی' لیکن اس سے نہ اٹھا گیا۔ سر میں شدید درد تھا۔ آنکھوں میں جلن ہو رہی تھی۔ باہر سے کھٹ پٹ کی آوازیں آ رہی تھیں۔ بھیا بھابی جاگ اٹھے تھے۔ ان کے باتیں کرنے کی آوازیں بھی آ رہی تھیں' کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔

بابر بلال کے جانے کے بعد فاخرہ نے درخشاں کے کمرے میں جھانکا اسے سوتا ہوا سمجھ کر کمرے کا دروازہ بند کیا اور کسی کو ٹیلی فون کرنے لگی۔

درخشاں نے اسے دروازہ بند کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا' وہ سو کب رہی تھی۔ اس کی پوری رات آنکھوں میں کٹی تھی۔ دروازہ بند ہوتے ہی درخشاں فوراً اٹھی۔ اس نے دروازے کو آہستہ سے کھولا اور باہر آ گئی۔

فاخرہ بڑے اطمینان سے بیڈ پر بیٹھی' گود میں ٹیلی فون رکھے کسی سے محو گفتگو تھی۔ اسے درخشاں کی طرف سے اطمینان تھا۔ وہ آٹھ بجے اٹھتی تھی اور ابھی آٹھ بجنے میں آدھا گھنٹا باقی تھا۔

درخشاں دروازے سے لگ کر کھڑی ہوگئی اور اس کی گفتگو سننے لگی۔ ''ہاں' پھر بتاؤ' تم کتنے بجے تک آؤ گے۔ گیارہ بجے تک' ٹھیک ہے' تم آؤ گے تو میں ایک چیز دکھاؤں گی۔ نہیں' ابھی نہیں بتاؤں گی۔

اچھا چلو بتا دیتی ہوں' میں نے تمہاری تصویر مکمل کر لی ہے۔ بڑی مشکل سے ہوئی ہے۔ بھئی یہ کام چھپا کر کرنا ہوتا تھا۔ ویسے بھی میں نے تمہیں ساری دنیا سے چھپا کر اپنی آنکھوں میں بسا رکھا ہے۔ مانتے ہو نا اس بات کو۔ اچھا' چلو باقی باتیں ملاقات پر۔ میں گیارہ بجے تمہارا انتظار کروں گی' او کے ڈیئر' بائی۔''

اس سے پہلے کہ وہ ٹیلی فون رکھ کر باہر آتی' درخشاں بھاگ کر اپنے کمرے میں پہنچی

دروازہ بند کیا اور چھلانگ مار کر بستر میں گھس گئی اور سوتی بن گئی۔

تھوڑی دیر بعد اس نے محسوس کیا کہ اس کا دروازہ کھل گیا ہے کیونکہ فاخرہ کے گنگنانے کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ اس نے آنکھیں وا کر کے دیکھا' دروازہ واقعی کھول دیا گیا تھا۔

اب دروازہ بند کرنے کی ضرورت بھی کیا رہ گئی تھی بھلا۔

پھر وہ وقت مقررہ پر اٹھ گئی۔ باتھ روم میں جا کر دانت برش کرتے ہوئے اس نے اپنی شکل پر نظر ڈالی۔ وحشت برس رہی تھی۔ رات بھر جاگنے کے تمام آثار اس کے چہرے پر موجود تھے۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ کچھ سوج بھی رہی تھیں۔ چہرہ کملایا ہوا تھا۔ رنگ بھی پھیکا پھیکا ہو رہا تھا۔

دانت برش کرتے ہوئے وہ ڈینی کے بارے میں سوچتی رہی۔ رات گزرنے کے بعد وہ اپنے اس فیصلے پر قائم تھی کہ اس نے جو کچھ کیا تھا' ٹھیک کیا تھا۔

پھر اس کا ذہن فاخرہ کی طرف متوجہ ہوگیا۔ تو اس کا شبہ ٹھیک ہی تھا۔ کوئی ہے جو اس کی غیر موجودگی میں یہاں آتا جاتا ہے۔ جانے کب سے یہ سلسلہ جاری ہے۔ جانے کب سے بھابی' بھیا کو بے وقوف بنا رہی ہے۔ بہرحال آج معلوم ہو جائے گا کہ وہ کون ہے۔

اصل میں جو جیسا ہوتا ہے' اس کی سوچ بھی اس کے کردار کے مطابق ہوتی ہے۔ بھابی نے اسے ڈینی سے تنہائی میں ملنے کی جو لائن دی تھی' وہ انکے ذہن کی عکاس تھی۔ انہوں نے اسے بھی اپنے جیسا سمجھ لیا تھا یا اسے ڈھیل دے کر اپنے لیے آسانی پیدا کر رہی تھیں۔ ہو سکتا ہے' وہ اس تنہائی کی ملاقات کے بعد اسے بلیک میل کرنا شروع کر دیتیں۔

سوچتے سوچتے اسے یہ احساس نہ رہا کہ وہ کتنی دیر سے دانتوں کو برش کیے جا رہی ہے۔ چونک کر اسے ہوش آیا۔ پھر وہ جلدی جلدی منہ ہاتھ دھو کر باہر نکل آئی۔

''ہائے شہزادی۔'' فاخرہ نے اسے باتھ روم سے نکلتے دیکھ کر جوش کیا۔ وہ اسے پیار سے شہزادی ہی کہتی تھی' درخشاں کو اس کا شہزادی کہنا اچھا لگتا تھا' لیکن آج اچھا نہ لگا۔ جواب میں وہ پھیکی سی ہنسی ہنس دی۔

''ارے' آج تو تم نے باتھ روم میں بڑی دیر لگا دی۔ کیا کر رہی تھیں وہاں؟'' فاخرہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

''وہاں کیا ہو سکتا ہے' منہ ہاتھ دھو رہی تھی۔'' اسے فاخرہ کی ہنسی زہر لگی۔

''اور یہ تمہاری آنکھیں کیوں سرخ ہو رہی ہیں؟'' ''پتا نہیں' آپ نے ناشتا کر لیا؟'' اس نے پوچھا۔

''آدھا بابر کے ساتھ کر لیا ہے' آدھا تمہارے ساتھ کروں گی۔'' اس نے خوشگوار لہجے میں کہا۔ وہ زبردستی مسکرائے جا رہی تھی۔ اٹھلا رہی تھی۔ درخشاں جانتی تھی کہ اس خوشی کے پیچھے کیا راز ہے؟

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

"درخشاں' تمہارا چہرہ بھی کچھ عجیب سا ہو رہا ہے۔ سچ بتاؤ کیا ہوا؟" تم رات کو سوئی ہو یا نہیں۔ رات کو تم نے کوئی ہورر فلم تو نہیں دیکھی۔ میں تمہارے اس شوق سے بڑی تنگ ہوں۔ تمہیں کیا مزہ آتا ہے ان خوفناک فلموں کو دیکھ کر۔ پھر رات بھر ڈر کی وجہ سے سو نہیں سکتیں۔

بھابی' آپ اپنے شوق تو دیکھیں۔ آپ کو کیا مزہ آتا ہے کسی غیر مرد سے مل کر جبکہ اللہ نے آپ کو ایک ہینڈسم شوہر عطا کیا ہوا ہے۔ یہ بات اس نے سوچی مگر کہہ نہ سکی' کہا تو صرف اتنا۔ "نہیں بھابی' میں نے کوئی فلم نہیں دیکھی۔"

پھر تمہاری آنکھیں کیوں سرخ ہیں؟" سوال ہوا۔

"رات کو ٹھیک سے نیند نہیں آئی' بار بار آنکھ کھلتی رہی۔" جواب ملا۔

"چلو' کوئی بات نہیں' کبھی کبھی ایسا ہو جاتا ہے۔" فاخرہ جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی اور اس سے بولی۔ میں تمہارے لیے ناشتا بنا دیتی ہوں' تم تب تک ڈریس تبدیل کر لو۔ کہیں تمہیں دیر نہ ہو جائے۔"

اسے فکر ہو گئی تھی کہ یہ رات بھر سوئی نہیں ہے' کہیں ایسا نہ ہو' یونیورسٹی سے چھٹی کر لے۔ درخشاں کی آج حالت بھی ایسی ہی تھی' اگر اس نے فون پر گفتگو نہ سنی ہوتی تو وہ ضرور چھٹی کر لیتی' لیکن اب تو اسے یونیورسٹی کے بہانے ہر قیمت پر گھر سے نکلنا تھا۔

"بھابی' میرے سر میں بہت درد ہو رہا ہے' آنکھیں بھی جل رہی ہیں' سوچ رہی ہوں' آج یونیورسٹی نہ جاؤں۔"

تب ہی کچن میں چھناکا ہوا۔ فاخرہ کے ہاتھ سے گلاس چھوٹ کر فرش پر گرا۔ وہ فوراً کچن میں پہنچی۔

"کیا ہوا بھابی؟" اس نے بڑی معصومیت سے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔" فاخرہ نے اپنے کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ "گلاس ہاتھ سے سلپ ہو گیا۔"

"ٹوٹے ہوئے ٹکڑے احتیاط سے سمیٹیں' کہیں ہاتھ لہولہان نہ ہو جائے۔" درخشاں بولی۔

"نہیں' ایسا نہیں ہوگا۔" فاخرہ کانچ کے ٹکڑوں کو صاف کرتے ہوئے بولی۔ "میں یہ کہہ رہی تھی کہ تمہارا یونیورسٹی جانے کا پروگرام نہیں ہے تو نہ جاؤ' لیکن دیکھ لو' کہیں تمہارے کام کا ہرج نہ ہو' درد تو میں تمہارا ابھی ٹھیک کر دوں گی' تمہارے سر میں مالش کر کے۔

"ہاں' اچھا یاد دلایا آپ نے' آج تو میں کسی قیمت پر چھٹی نہیں کر سکتی۔ اگر یونیورسٹی اسٹریچر پر جانا پڑے تو جاؤں گی' آج اصل میں میری ڈاکٹر براؤن سے میٹنگ ہے جو کام میں نے اب تک کیا ہے' اس کا جائزہ لیا جانا ہے اور شاید آج مجھے آنے میں دیر بھی ہو جائے۔" یہ کہہ کر درخشاں نے بطور خاص فاخرہ کا چہرہ دیکھا۔ وہاں اداسی کی جگہ خوشی نے لے لی تھی۔ مکار عورت۔ اس نے سوچا۔

"میٹنگ کتنے بجے ہے؟" فاخرہ نے پوچھا۔

"گیارہ بجے۔" درخشاں نے حقیقت بیان کی' لیکن فاخرہ نہ سمجھی۔

"بس تو پھر نو بجے جانے کی کیا ضرورت ہے' تم دس بجے نکلنا' میں تمہارے سر میں تیل گرم کر کے مالش کیے دیتی ہوں' تم پھر تیز پانی کا شاور لے لو۔ پھر اپنی پسند کا ناشتا کرو' گرم گرم کافی پیو' فریش ہو جاؤ اور جاؤ۔"

"بہت اچھے۔" درخشاں نے تالی بجائی۔ "بہت زبردست پروگرام ہے۔ بس پھر شروع ہو جایئے۔"

لاؤ' تیل اٹھا کر لاؤ۔" فاخرہ نے بڑی محبت سے کہا۔

فاخرہ مالش بہت اچھی کرتی تھی۔ اتنی اچھی کہ آدمی کو نیند آنے لگتی تھی۔ وہ اکثر اس کے سامنے تیل کی شیشی لے کر بیٹھ جایا کرتی تھی۔

"بھابی' آج بھیا کتنے بجے گئے؟" درخشاں آنکھیں بند کیے بولی۔

"وہی ساڑھے سات بجے' حسب معمول۔" فاخرہ نے کہا۔ "کیوں پوچھ رہی ہو تم؟"

"میں سوچ رہی تھی کہ ہمارے بھیا کی کوئی لائف نہیں' صبح کے گئے ہوئے رات کو آتے ہیں۔ گھر میں آ کر کچھ دیر مجھ سے بات کر لی' کچھ آپ سے گفتگو فرما لی۔ موڈ ہوا تو ٹی وی دیکھ لیا یا نیوز ک سن لیا' ورنہ کوئی ڈائجسٹ اٹھا کر بیٹھ گئے اور دس بجتے ہی بیڈ روم کا رخ کیا۔ ان کا ویک اینڈ بھی گھر پر ہی گزرتا ہے یا کبھی میں اور آپ انہیں تھیٹر دیکھنے کے لیے پکڑ کر لے جاتے ہیں' یہ بھی کوئی زندگی ہے۔ آفس اور گھر۔ انہیں معلوم ہی نہیں' دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ ویسے وہ پاکستان میں تو ایسے نہ تھے۔ ہم لوگ جس دن بابر بھیا کو گھر پر دیکھ لیتے' اس دن ہماری عید ہو جاتی۔ کہاں وہ اتنا گھومنے پھرنے والے تھے اور کہاں اب وہ کولھو کے بیل ہو کر رہ گئے ہیں۔ ایک بندھی ٹکی لائف۔ وہ بہت سیدھے ہیں بے چارے۔"

"اب اتنے سیدھے بھی نہیں ہیں' جتنا تم سمجھ رہی ہو۔"

"نہیں بھابی' وہ بہت سیدھے ہیں' وہ امریکا میں رہتے ہیں لیکن امریکا جیسی ان میں کوئی بات نہیں۔ شراب وہ نہیں پیتے' نائٹ کلبوں سے انہیں کوئی لگاؤ نہیں اور ....." اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"یہ بات تم کس طرح کہہ سکتی ہو؟"

"وہ میرے بھائی ہیں' میرا خون ہیں' میں انہیں اچھی طرح جانتی ہوں۔" درخشاں نے قدرے وثوق سے کہا۔

"بے وقوف' صبح سے رات تک باہر رہتے ہیں' میں یا تم کیا کہہ سکتے ہیں کہ وہ دفتر جاتے ہیں یا کسی لڑکی کے ساتھ گھومتے پھرتے ہیں۔ درخشاں' تو ابھی ان مردوں کو نہیں جانتی۔"

"آپ جانتی ہیں ان مردوں کو؟" درخشاں نے چٹکی لی۔

"ہاں' میں جانتی ہوں۔"

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

"میرے ہیرے جیسے بھائی کے بارے میں آپ اتنی خراب رائے رکھتی ہیں' یہ جان کر مجھے افسوس ہوا۔"

"ارے' تم سے تو کوئی بات کرنا بھی مشکل ہے' میں تو ایک عام بات کر رہی تھی۔"

"اچھا بھابی' یہ بتائیں' یہ صرف مرد ہی خراب ہوتے ہیں یا عورتیں بھی ہوتی ہیں۔"

عورتوں کو خراب کرنے والے بھی یہی مرد ہیں۔" فاخرہ نے جواب دیا۔

"تو گویا فساد کی جڑ یہی مرد ہیں؟" درخشاں بولی۔

"ہاں' تو اور کیا۔" فاخرہ نے کہا۔

"اچھا چھوڑیں اس بحث کو' یہ فرمائیں' آپ کبھی آئینہ بھی دیکھتی ہیں۔"

"روز ہی دیکھتی ہوں۔" فاخرہ نے کہا۔

"آج بھی دیکھا تھا؟" درخشاں نے پوچھا۔

"ہاں' آج بھی دیکھا تھا۔ میں کوئی تمہاری طرح تھوڑا ہی ہوں جسے آئینہ دیکھے مہینوں ہو جاتے ہیں۔ درخشاں' تم جیسی لڑکی شاید ہی اس دنیا میں کوئی اور ہو۔ حد ہے بے پروائی کی۔ اس طرح بھی کوئی اپنے آپ سے بیگانہ ہوتا ہے۔"

"اچھا' اب ختم کریں مالش' آپ بہت اچھی مالش کرتی ہیں۔ واقعی میرے سر کا درد کم ہو گیا۔ آنکھوں میں بھی تراوٹ آ گئی اور بھوک بھی لگنے لگی۔ میں اب جاتی ہوں نہانے۔ آپ ناشتا تیار کریں۔ پھر میں بھاگوں یونیورسٹی۔" درخشاں اٹھتے ہوئے بولی۔ تاکہ آگے بات کرنے کی کوئی گنجائش نہ رہے۔

جب وہ نہا کر باہر آئی تو فاخرہ نے اسے دیکھ کر ناشتا میز پر چن دیا اور بڑی ملائمت سے بولی۔ "شہزادی' تم نے میری بات کا برا تو نہیں مانا۔"

"آپ کا اشارہ بابر بھیا کے متعلق ہے؟" درخشاں نے وضاحت چاہی۔

"ہاں' انہی کی بات کر رہی ہوں۔" فاخرہ بولی۔

"لیکن آپ نے ان پر کوئی الزام تو نہیں لگایا' محض خیال آرائی کر رہی تھیں' مردوں کی فطرت بیان کر رہی تھیں' پھر میں کیوں برا مانوں۔"

"ہاں' اب دیکھو نا' اپنی بھی کیا لائف ہے۔ دن بھر گھر میں بند رہتی ہوں۔ اگر گھر سے باہر نکلتی بھی ہوں تو اس گھر کے لیے۔ جو کچھ کرنا ہے' بس اس گھر کے لیے کرنا ہے۔ تمہارے بھیا تو اپنے لیے کپڑے خریدنے کے بھی روادار نہیں' ان کی شاپنگ بھی مجھے ہی کرنا ہوتی ہے' لیکن میں نے کبھی اس کا احسان نہیں جتایا۔ ان کی زندگی اگر گھر سے دفتر تک محدود ہے تو میری اپنی زندگی بھی اس گھر کی چار دیواری تک محدود ہے۔ انہوں نے اگر امریکا میں رہتے ہوئے یہاں کی معاشرت کو نہیں اپنایا ہے تو میں بھی یہاں امریکی بیوی کی طرح نہیں رہتی۔ میں ایک پاکستانی بیوی کی طرح اپنے شوہر کو کوئی کام نہیں کرنے دیتی' اس بات کی گواہی تو تم بھی دو گی۔"

"ہاں بھابی' چند گھنٹے اور توقف کریں' پھر میں ایسی گواہی دوں گی کہ آپ کے ہوش اڑ جائیں گے۔ دنیا کو معلوم ہو جائے گا کہ آپ امریکا میں رہ کر کتنی پاکستانی ہیں۔ کتنی وفا شعار ہیں۔ کتنی شوہر کی عزت کو سنبھال کر رکھنے والی ہیں۔ ٹھہر جائیے' صرف چند گھنٹے ٹھہر جائیے۔"

یہ بات اس نے اپنے آپ سے کہی' اپنے دل میں کہی۔ یہ بات بلند آواز میں کہنے کا ابھی وقت نہیں آیا تھا۔ وہ فاخرہ کی باتوں پر محض ہوں' ہاں کرتی رہی۔

دس بجے کے قریب اس نے فاخرہ کو خدا حافظ کہا۔ وہ اسے دروازے تک چھوڑنے آئی۔ یہ روز کا معمول تھا۔ سیڑھیاں اترتے ہوئے درخشاں نے اپنے پیچھے زور سے دروازہ بند ہونے کی آواز سنی۔ بھابی اسے گھر سے نکالنے میں کامیاب ہو کر بہت خوش ہو رہی ہوں گی۔ اس نے سوچا۔ انہیں ابھی یہ نہیں معلوم کہ اسے نکالنا کتنا مہنگا پڑے گا۔ ہر چیز کا ایک وقت ہوتا ہے۔ کوئی برائی زیادہ عرصے تک نہیں چھپ سکتی۔ گناہ خود اپنے منہ سے بولتا ہے۔

اب مسئلہ یہ تھا کہ وہ ایک گھنٹا کہاں گزارے۔ یونیورسٹی جا کر وہاں سے فوراً واپس آنا ممکن نہ تھا۔ اس نے سوچا' کسی قریبی ریستوران میں جا کر بیٹھ جائے۔ آدھا پون گھنٹا ریستوران میں گزارنا کون سا ایسا مشکل تھا۔

دس منٹ پیدل چلنے کے بعد اسے ایک پبلک ٹیلی فون بوتھ دکھائی دیا۔ بوتھ میں داخل ہو کر اس نے بابر بلال کا ٹیلی فون نمبر اپنے بیگ سے نکالا۔ پھر سکہ ڈال کر اس نے نمبر ملایا۔

"ہیلو۔" ادھر سے ریسیور اٹھا لیا گیا۔

"میں بابر بلال سے بات کرنا چاہتی ہوں۔" اس نے انگریزی میں کہا۔

"ہولڈ کیجئے۔" ادھر سے جواب ملا۔

پھر چند لمحوں بعد ریسیور میں جو آواز آئی' وہ بابر بلال کی تھی۔ "ہیلو۔"

"بھیا' میں درخشاں بول رہی ہوں۔"

"کہاں سے بات کر رہی ہو' یونیورسٹی سے؟ بابر بلال نے پوچھا۔

"نہیں بھیا' میں ایک پبلک بوتھ سے بات کر رہی ہوں اور گھر کے نزدیک سے ہی بول رہی ہوں۔"

"خیریت درخشاں! تم کچھ گھبرائی سی ہو' بتاؤ کیا ہوا؟"

"بھیا' ابھی تو کچھ نہیں ہوا' لیکن آئندہ ہونے والا ہے اور جو ہونے والا ہے' اس کا آپ تصور بھی نہیں کر سکتے۔" درخشاں کی آواز میں لرزش تھی۔

"فاخرہ تو ٹھیک ہے؟ بابر بلال نے پوچھا۔

"جی' بہت مزے میں ہے آپ کی فاخرہ۔" درخشاں نے کاٹ دار لہجے میں کہا۔

"پھر تم اتنی پریشان کیوں ہو؟" بابر بلال کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

"بھیا' کیا آپ اس وقت گھر آ سکتے ہیں؟ درخشاں نے پوچھا۔

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

"ہاں' آ سکتا ہوں' لیکن بات کیا ہے؟"

"بھیا' بات میں ٹیلی فون پر نہیں بتا سکتی' آپ بس فوراً گھر آ جائیں' بتائیں' کتنی دیر میں آ جائیں گے۔" اس نے فیصلہ کن انداز اختیار کیا۔

"آنے میں دو گھنٹے ضرور لگ جائیں گے۔" اس نے کہا۔

بس پھر آ جائیں' میں آپ کا شدت سے انتظار کروں گی' اچھا خدا حافظ۔" یہ کہہ کر اس نے ٹیلی فون بند کر دیا اور پبلک بوتھ سے باہر نکل آئی۔ وہ زیادہ بات کرنا نہیں چاہتی تھی۔

کچھ دور آگے چلی تو اسے ایک کیفے دکھائی دے گیا۔ وہ اس میں داخل ہو گئی۔ کیفے تقریباً خالی پڑا تھا۔ اکا دکا آدمی ادھر ادھر بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ دروازے کے نزدیک ہی ایک میز پر بیٹھ گئی۔

اس وقت دس بج کر بیس منٹ ہوئے تھے۔ یہاں اس نے سوا گیارہ بجے تک بیٹھنا تھا۔ پندرہ منٹ کا راستہ تھا۔ وہ ساڑھے گیارہ بجے گھر پہنچنا چاہتی تھی۔

آنے والے وقت کا خیال کر کے اس کے جسم میں سنسنی سی دوڑ جاتی تھی۔ ایک نامعلوم خوف اس پر چھا جاتا تھا۔ دل کی دھڑکن ایکدم تیز ہو جاتی۔ ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہونے لگتے۔

بیٹر کے آنے پر اس نے چائے کا آرڈر دیا اور بیگ سے نکال کر اپنے کیے ہوئے نوٹس پر نظر ڈالنے لگی۔ وہ انہیں بڑے انہماک سے پڑھ رہی تھی' لیکن ایک لفظ بھی اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ بس ایسے ہی ورق الٹے جا رہی تھی۔

چائے آنے پر اس نے پورے اطمینان سے بنائی اور گھونٹ گھونٹ کر کے اسے پینے لگی۔

چائے ختم کر کے جب اس نے وقت دیکھا تو محض دس بج کر چالیس منٹ ہوئے تھے۔ اسے یوں لگا جیسے وقت ٹھہر سا گیا ہے۔ تب اس نے ایک کافی کا آرڈر دے دیا اور ساتھ کچھ کھانے کے لیے بھی منگوا لیا۔

پھر وہ وقت مقررہ پر کیفے سے باہر آئی اور تیز تیز قدموں سے گھر کی طرف چل دی۔

جب وہ بلڈنگ کے احاطے میں داخل ہوئی تو ٹھیک ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔ اس کا اندازہ تھا کہ بابر بلال بارہ بجے تک گھر پہنچیں گے۔ تب تک اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے' اسے کچھ معلوم نہ تھا۔

سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اس نے بیگ سے فلیٹ کی چابی نکال لی' یہ وہ چابی تھی جو بابر بلال نے اسے یہاں آتے ہی دے دی تھی۔

"درخشاں' اس چابی کو رکھ لو' تمہارے کام آئے گی۔ فاخرہ شاپنگ وغیرہ کے لیے گھر سے باہر نکلی رہتی ہے۔ ہو سکتا ہے تم یونیورسٹی سے آؤ تو گھر پر تالا لگا ملے۔ اس وقت یہ چابی تمہارے کام آئے گی۔"

لیکن اس چابی کے استعمال کی آج تک ضرورت نہ پڑی تھی۔ کیونکہ ہمیشہ فاخرہ اسے گھر

پر ہی ملتی تھی۔ آج اس کو چابی کی ضرورت پڑی تھی اور وہ بھی کس طرح۔

درخشاں ان غافل انسانوں کے سروں پر دبے پاؤں' موت کی طرح پہنچنا چاہتی تھی تاکہ شک کی کوئی گنجائش نہ رہے اور کوئی فرار کا راستہ باقی نہ بچے۔

پہنچنے والا ٹھیک گیارہ بجے پہنچ گیا ہوگا۔ ہو سکتا ہے' بے قراری اسے کچھ پہلے ہی لے آئی ہو۔ اب تو وہ بڑے اطمینان سے محو گفتگو ہوں گے۔ ان کے خیال میں درخشاں تو اس وقت اپنے نگران ڈاکٹر براؤن سے میٹنگ کر رہی ہوگی۔ پھر ڈر کا ہے کا۔ دھڑکا کیسا۔

تالے میں چابی لگانے سے پہلے اس نے چابی کے سوراخ سے اندر جھانکا' سامنے کچھ نہ تھا۔ ڈائننگ ٹیبل کا ایک کونا اور دو کرسیاں نظر آ رہی تھیں' وہ اپنے کمرے میں ہوں گے شاید۔

پھر اس نے بہت آہستگی سے دروازے کے تالے میں چابی گھمائی۔ دروازے کو ہلکا سا دھکا دیا۔ وہ بے آواز کھل گیا۔ پھر دروازہ کھلا چھوڑ کر ہی آگے بڑھی۔ وہ دروازے کو کتنا ہی آہستگی سے بند کرتی' کھٹکے کی آواز ضرور ہوتی اور یہ آواز انہیں چونکا بھی سکتی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ انہیں ذرا بھی ہوشیار ہونے کا موقع ملے۔

درخشاں نے دبے قدموں فاخرہ کے کمرے کا رخ کیا۔

کمرے کا دروازہ نیم وا تھا اور اندر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ درخشاں نے ایک جھٹکے سے پورا دروازہ کھول دیا۔

دروازہ جب زور سے دیوار سے لگا تو وہ دونوں چونک اٹھے۔

درخشاں نے اسے دیکھا جس کی خاطر بھائی نے بھیا کی عزت کو خاک میں ملا دیا تھا۔ وہ ایک نیگرو تھا۔ بعض کالے بھی پرکشش ہوتے ہیں' لیکن اس میں کشش نام کی کوئی چیز نہ تھی۔ موٹے بھدے ہونٹ' پھیلی ہوئی ناک' الٹے توے جیسی رنگت' لمبوترا چہرہ۔

وہ دونوں اسے دروازے میں کھڑا دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئے۔ ایک لمحے کو انہیں یقین ہی نہ آیا کہ دروازے پر واقعی کوئی کھڑا ہے اور اگر کوئی کھڑا ہے تو وہ درخشاں ہی ہے۔ وہ اندر کس طرح آ گئی آخر۔

پھر فاخرہ نے نہیں' کہتے ہوئے چیخ ماری اور بے ہوش ہو گئی۔

اس نیگرو نے فاخرہ کو بے ہوش ہوتے دیکھا تو وہ حبشی' وہ کالا آدمی درخشاں کو دھکا دیتا ہوا فلیٹ سے بھاگ گیا۔

کوئی اور وقت ہوتا اور فاخرہ اس طرح بے ہوش ہو کر گرتی تو وہ بھاگ کر اس کے پاس پہنچ جاتی' لیکن آج اتنا کچھ دیکھ لینے پر اس کے قدم پتھر ہو گئے۔ فاخرہ کی اس حرکت نے اس کے اعصاب کو جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا۔ اس نے بیڈ روم کا دروازہ ایک جھٹکے سے بند کر دیا پھر اس نے فلیٹ کا دروازہ بھی بند کر دیا۔ جو اب چوپٹ کھلا پڑا تھا۔ کچن میں جا کر اس نے پانی میں گلوکوز ڈال کر پیا اور صوفے پر بیٹھ کر بابر بلال کے آنے کا انتظار کرنے لگی۔

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

پونے بارہ بجے کے قریب گھر کی گھنٹی بجی۔ اس نے دروازے میں لگی چھپی آنکھ سے باہر دیکھا۔ سامنے بابر بلال کھڑا تھا اس نے جلدی سے دروازہ کھول دیا۔ بابر بلال اندر آیا۔

ہاں' بھئی درخشاں' تم نے تو مجھے پریشان کر دیا' فون بھی اتنی جلدی بند کر دیا تم نے کہ میں کچھ اندازہ ہی نہ لگا سکا۔ بہرحال' اب میں تمہارے کہنے کے مطابق گھر آ گیا ہوں۔ اب مجھے معاملہ بتاؤ اور یہ تم ہلدی کی طرح زرد کیوں ہو رہی ہو؟"

"بھیا' آپ ذرا بیڈ روم میں جا کر دیکھیں۔" درخشاں کی آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگے۔

"ارے کیا ہوا؟" پریشان ہو کر بابر بلال نے بریف کیس میز پر رکھا اور تیزی سے اپنے بیڈ روم کی طرف بڑھا۔

چند لمحے بعد جب وہ واپس آیا تو سب کچھ جان چکا تھا۔ اس نے وہ پینٹنگ بھی دیکھ لی تھی جو کمرے میں سائیڈ ٹیبل پر رکھی ہوئی تھی۔

"کون تھا وہ؟ میں اسے قتل کر دوں گا۔" بابر بلال نے صوفے میں دھنستے ہوئے کہا۔ غصے میں اس کا برا حال تھا۔

"اسے کیوں قتل کرتے ہیں' قتل کرنا ہے تو اسے قتل کیجئے جس نے آپ کی عزت کا جنازہ نکالا ہے۔"

"میں اسے بھی نہیں چھوڑوں گا۔"

"نہیں بھیا' ایسا کچھ نہیں کرنا ہے۔ غصے اور جوش میں آنے کی بالکل ضرورت نہیں ہے' جو کچھ کرنا ہے' ٹھنڈے دل سے کرنا ہے' سوچ سمجھ کر کرنا ہے۔"

"یہ سب کچھ ہوا کیسے؟ تمہیں کیسے پتا چلا؟ مجھے ذرا تفصیل سے ساری بات بتاؤ۔"

جواب میں درخشاں نے وہ سب کچھ کہہ سنایا جو اس نے دیکھا' سنا اور محسوس کیا تھا۔

ابھی وہ یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ بیڈ روم کا دروازہ کھلا۔ فاخرہ لرزتے قدموں سے باہر آئی اور بابر بلال کے قدموں میں گر پڑی۔ "مجھ سے غلطی ہو گئی' بابر' میں بھٹک گئی تھی۔ اب آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔"

بابر بلال نے نفرت سے ٹھوکر مار کر اسے پرے دھکیل دیا اور بولا۔ "نہیں' تم سے کوئی غلطی نہیں ہوئی' غلطی مجھ سے ہوئی ہے تم پر بھروسا کر کے۔ خدا جانے یہ کھیل کب سے جاری تھا۔ بھلا ہو میری بہن کا جس نے میری آنکھوں پر بندھی پٹی کھول دی اور وہ سب کچھ دکھا دیا جس کا میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اب اس گھر میں تمہیں پناہ نہیں ملے گی اپنے کپڑے اور زیورات سمیٹ لو' میں تمہیں تمہارے گھر تک چھوڑ آؤں گا۔ تمہارے والدین کو' تمہارے خاندان والوں کو بتا کر آؤں گا کہ تم کیسی ہو۔ میں وہاں ایک ایک رشتے دار کو تمہارے بارے میں بتاؤں گا تاکہ آئندہ تمہیں کوئی اپنانے کا سوچ بھی نہ سکے۔ اول تو تمہارے شریف والدین جب یہ سنیں گے تو شاید وہ بھی تمہیں گھر میں رکھنے سے انکار کر دیں۔ تم نے اس گھر کا اعتبار کھو کر' سب کا اعتبار کھو دیا ہے۔

اب تم زندگی بھر قابل نفرت زندگی گزارو گی اور یہ سزا قتل سے کہیں عذاب ناک ہے۔ جاؤ' اب میرے سامنے سے اپنا غلیظ چہرہ ہٹا لو۔"

لیکن وہ اس کے قدموں میں گری' سسکتی رہی۔ تب بابر بلال خود وہاں سے اٹھ گیا اور درخشاں کے کمرے میں جا کر لیٹ گیا۔

بابر بلال کے جانے کے بعد اس نے درخشاں کے گھٹنے پکڑ لیے اور التجا بھری آواز میں بولی۔ "درخشاں' تم مجھے بچا لو۔"

"فاخرہ' تمہیں یاد ہے' صبح میں نے تم سے کیا کہا تھا' میرے بھیا بہت سیدھے آدمی ہیں' اس وقت بھی انہوں نے شرافت دکھائی ہے۔ وہ تمہیں' تمہارے گھر تک چھوڑنے جا رہے ہیں۔ تمہارا جرم بہت گھناؤنا ہے' کوئی اور مرد ہوتا تو تمہاری تکا بوٹی کر کے باہر کتوں کو ڈال دیتا۔ جاؤ' اپنا سامان باندھ لو اور یہاں سے دفع ہونے کی تیاری کرو۔" درخشاں نے انتہائی نفرت سے کہا اور دوسری طرف منہ پھیر لیا۔

"میں اس گھر سے نکل کر کہیں کی نہ رہوں گی' مر جاؤں گی۔"

"یہ سب تو عشق کرنے سے پہلے سوچنا چاہئے تھا' ویسے ایک صورت اور ہو سکتی ہے تم اس کتے نیگرو کے گھر کیوں نہیں چلی جاتیں۔"

"وہ پہلے ہی شادی شدہ ہے۔"

"یہ تمہیں ملا کہاں تھا؟"

"میوزک اکیڈمی میں' وائلن بجانا میں نے اسی سے سیکھا ہے۔"

"اچھا تو وہ تمہارا انسٹرکٹر تھا۔ بہت خوب' اب تم اسے ٹیلی فون کر کے ساری صورتحال بتاؤ۔ ہو سکتا ہے' وہ اپنی بیوی کو چھوڑ کر تمہیں اپنا لے۔"

"یہاں بیوی کو طلاق دینا اتنا آسان نہیں ہے۔"

"اور عشق کرنا آسان ہے۔" اس نے فاخرہ کو غصے سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "تمہیں شرم نہ آئی یہ سب کرتے ہوئے' آخر میرے بھائی میں کیا کمی تھی' کیا بگاڑا تھا انہوں نے تمہارا جس کی تم بڑی سزاوار تھی تم نے۔ میں اگر اپنے بھائی کی جگہ ہوتی تو تمہیں اسی شہر میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیتی۔ پھر دیکھتی' تمہارا کون سا عاشق تمہیں پناہ دیتا ہے۔ تم جیسی عورتوں کو کبھی عزت کی زندگی راس نہیں آ سکتی۔ تم بیوی کے روپ میں طوائف ہو' طوائف کا ٹھکانہ کسی شریف آدمی کا گھر نہیں' بازار ہوتا ہے۔ جاؤ یہاں سے۔" درخشاں نے اسے دھکا دے کر دور دھکیل دیا۔

فاخرہ روتی' سسکتی بیڈ روم میں چلی گئی۔

درخشاں کا سر گھوم رہا تھا' وہ وہیں صوفے پر لیٹ گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد بابر بلال اس کے کمرے سے نکلا اور اس کے قریب آ کر بولا۔ "درخشاں' میں باہر جا رہا ہوں۔ ٹکٹ وغیرہ لے آؤں۔ میں کوشش کروں گا کہ آج رات کی فلائٹ سے سیٹیں مل جائیں۔"

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

"بھیا' آپ خود کیوں جا رہے ہیں' اسے تنہا بھیج دیں اور یہاں سے ابو کو ٹیلی فون کر دیں اور خط لکھ دیں' وہاں وہ سنبھال لیں گے۔"

"نہیں درخشاں' میں خود اس کے ساتھ جاؤں گا۔ اس کو اکیلا بھیجا تو ہو سکتا ہے' وہاں جا کر مظلوم بن جائے۔ وہاں کوئی اور ہی کہانی سنا دے۔ خاندان کا معاملہ ہے۔ ابو کس کس کی بات کا جواب دیں گے۔ خاندان کے بزرگوں کو میں ہی قائل کر سکوں گا۔"

"ٹھیک ہے بھیا' جیسا آپ مناسب سمجھیں کریں۔"

"مجھے پاکستان میں آٹھ دس دن لگ جائیں گے۔ تب تک تم یہاں تنہا رہ لو گی؟" بابر بلال نے پوچھا۔

"ہاں' رہ لوں گی۔" اس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"لیکن تمہیں تو ڈر بہت لگتا ہے۔ نہیں تم کس طرح رہو گی' اچھا ٹھیک ہے' میں تمہارا ابھی کچھ بندوبست کرتا ہوں۔"

بابر بلال نے بھاگ دوڑ کر کے رات کی فلائٹ سے دو نشستیں حاصل کر لیں اور اپنے پاکستانی دوست کو ٹیلی فون بھی کر دیا۔ گیارہ بجے کے قریب امجد اپنی بیوی کے ساتھ درخشاں کو ساتھ لے جانے کے لیے آ گیا۔ وہ سب بیک وقت گھر سے نکلے بابر اور فاخرہ ٹیکسی کے ذریعے ایئرپورٹ چلے گئے جبکہ امجد نے اپنے گھر کا رخ کیا۔ امجد نے کہا بھی کہ وہ اسے ایئرپورٹ چھوڑ دے گا' لیکن بابر اس کے لیے راضی نہ ہوا۔ اس نے کہا کہ واپسی میں بہت دیر ہو جائے گی بس تم درخشاں کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔

بابر بلال نے فاخرہ کو پوری آزادی دی تھی کہ اس گھر میں اس کی جو چیز ہے' اٹھا لے۔ فاخرہ نے اس گھر میں اپنی جو چیزیں تھیں' سب سمیٹ لی تھیں' زیورات ان چیزوں میں سرفہرست تھے۔

گھر سے رخصت ہوتے ہوئے فاخرہ نے درخشاں کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھا تھا۔ امجد کی بیوی عقیلہ اس سے تمام تفصیلات پوچھ رہی تھی۔ وہ بتا بھی رہی تھی' لیکن بار بار فاخرہ کی گھورتی نظریں اس کے سامنے آ جاتی تھیں اور وہ بولتے بولتے ایک دم چپ ہو جاتی تھی۔ تب عقیلہ اسے ٹوکتی اور وہ پھر سے تفصیلات بیان کرنے لگتی۔

آج کی رات بھی درخشاں پر قیامت بن کر نازل ہوئی تھی۔ وہ پوری رات کروٹیں بدلتی رہی۔ یہاں تک کہ صبح ہو گئی۔

صبح جب وہ یونیورسٹی پہنچی اور اپنے ڈیپارٹمنٹ کے کیبن میں داخل ہوئی تو اسے اپنی میز پر ایک پیکٹ رکھا ہوا نظر آیا۔ وہ تیزی سے میز کی طرف بڑھی۔ اس نے بے قراری سے پیکٹ اٹھا لیا۔ سبز کاغذ پر سفید چٹ لگی ہوئی تھی اور اس پر لکھا تھا۔ ڈینی کی جانب سے' اس کے نیچے ڈینی کے دستخط تھے اردو میں۔ ڈینی نے درخشاں سے اردو میں اپنا نام لکھنا سیکھ لیا تھا۔ نام کے نیچے تاریخ پڑی

ہوئی تھی۔ یہ تاریخ کل کی تھی۔ اوہ تو یہ پیکٹ کل سے یہاں پڑا ہے۔ کیا خود پروفیسر ڈینی یہاں رکھ کر گئے یا کسی سے بھجوا دیا تھا؟

ابھی وہ اس پیکٹ کو الٹ پلٹ کر دیکھ ہی رہی تھی کہ لیب بوائے جون اندر داخل ہوا۔

"اوہ مس' آپ آ گئیں' یہ پیکٹ آپ کو مل گیا' بس میں یہی چیک کرنے آیا تھا۔"

"سنو' یہ پیکٹ یہاں کس نے رکھا؟" درخشاں نے پوچھا۔

"پروفیسر ڈینی نے۔" جون نے بتایا۔ "آپ کل آئی نہیں تھیں تو وہ مجھے بتا کر اسے آپ کی میز پر چھوڑ گئے تھے اور ابھی کچھ دیر پہلے ان کا ٹیلی فون آیا تھا' پوچھ رہے تھے کہ آپ آئی ہیں یا نہیں۔ اب میں انہیں جا کر فون پر بتائے دیتا ہوں کہ نہ صرف آپ آ گئی ہیں بلکہ پیکٹ بھی مل گیا ہے' ٹھیک ہے۔"

لیب بوائے کے جانے کے بعد درخشاں نے سبز کاغذ کو پھاڑا۔ اندر سے ایک کتاب اور ایک کیسٹ نکلا۔ کتاب کھولنے پر معلوم ہوا کہ وہ کتاب نہیں' ڈائری ہے اور وہ بھی بالکل سادہ۔ اس نے اس ڈائری کا ایک ایک ورق اچھی طرح کھول کر دیکھ ڈالا' لیکن اس پر کوئی تحریر نہ ملی۔ البتہ درمیان کے صفحات پر پھول ضرور لگے ہوئے تھے۔ اس نے اس ڈائری کو اپنے بیگ میں ڈالا اور آڈیو ریڈیو لائبریری میں پہنچ کر..... کیسٹ کو کیسٹ پلیئر میں لگا دیا پھر اپنے کانوں میں ریسیور لگا کر کیسٹ سننے لگی۔

یہ کیسٹ بھی ڈائری کی طرح تقریباً خالی تھا۔ شروع میں ڈینی کی آواز میں چند جملے بھرے ہوئے تھے اور بس۔

ایک تو احمد فراز کا شعر تھا جسے ڈینی نے بڑے انک انک کر امریکی لہجے میں پڑھا تھا۔

اب کے ہم بچھڑے تو شاید کبھی خوابوں میں
جس طرح سوکھے ہوئے پھول کتابوں میں

اس کے بعد انگریزی کی چھوٹی سی نظم تھی جو اس نے دل چیرنے والے لہجے میں پڑھی تھی۔

ڈائری کے ان سادہ ورقوں کی قسم
میں خود بھی ان ورقوں جیسا ہونا چاہتا ہوں
دل سے اس کی محبت نکل جائے
ذہن سے یادیں مٹ جائیں
لیکن کیا یہ سب
میرے مٹنے سے پہلے ہو سکے گا۔

درخشاں تو پہلے ہی کیا کم اداس تھی کہ اس تحفے نے اسے مزید بے کل کر دیا۔ ڈینی' تم اگر مجھے مرتے دم تک نہیں بھلا سکو گے تو میں بھی تمہیں مرتے دم تک نہیں بھلا سکوں گی۔ میں اپنی کتاب

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

محبت کے اوراق کو کس طرح سادہ کر سکوں گی۔ ان یادوں کو کیسے مٹا سکوں گی۔ ڈینی' میں بھی تمہاری طرح تم سے محبت کرتی ہوں۔

یہ سب سوچتے سوچتے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ پھر ڈیپارٹمنٹ میں اس کا دل نہ لگا۔ وہ وہاں سے اٹھ کر امجد کے گھر چلی گئی۔

درخشاں کو بابر بلال کی جانب سے بہت فکر تھی۔ پتا نہیں' وہاں پہنچ کر کیا ہوا ہو۔ اس نے بابر سے ٹیلی فون پر صورتحال بتانے کو کہہ دیا تھا۔ پتا نہیں' وہ وہاں سے فون کرتے ہیں یا نہیں۔ ہو سکتا ہے' وہ سوچتے ہوں کہ اب ٹیلی فون کیا کرنا' وہاں پہنچ کر زبانی ہی سب کچھ بتا دوں گا۔

جب درخشاں انتظار کر کے مایوس ہو گئی تو پانچویں دن بابر بلال کا فون آیا۔

وہ بہت خوش تھا۔ اس نے فاخرہ کو طلاق دے دی تھی۔ فاخرہ کی جو وہاں درگت بنی تھی' اس کا مختصر حال اس نے مزے لے لے کر سنایا تھا۔ اس نے واپسی کے لیے سیٹ کنفرم کرا لی تھی اور دن' تاریخ اور فلائٹ نمبر درخشاں کو بتا دیا تھا۔

بابر بلال' فاخرہ کو ایئرپورٹ سے سیدھا اس کے گھر لے کر پہنچا تھا' لیکن خود گھر میں داخل نہیں ہوا' گھر کے باہر گیٹ پر رک گیا۔ فاخرہ کے ابو اور امی دونوں فوراً گیٹ پر آئے اور بولے۔ ''تم یہاں کیوں رک گئے' آؤ' اندر آؤ۔''

''میں' میں اندر نہیں جاؤں گا' آپ ڈرائنگ روم کھول دیجئے' وہاں بیٹھ کر آپ سے باتیں ہوں گی۔''

ادھر اندر فاخرہ اپنی بہنوں کے گلے لگ کر روئے جا رہی تھی۔ ادھر باہر گھر میں آنے سے احتراز کر رہا تھا۔ باپ کا فوراً ماتھا ٹھنکا تھا' لیکن انہوں نے اس کا اظہار نہ ہونے دیا اور بابر کو ڈرائنگ روم میں لے آئے۔

''ڈرائنگ روم میں پہنچ کر بابر بلال نے ایسا دھماکا کیا کہ اس گھر کی عزت کے پرخچے دور دور تک اڑ گئے۔ فاخرہ کے ابو حنیف صاحب بڑے شریف اور مذہبی قسم کے آدمی تھے۔ بیٹی کے کرتوت سن کر وہ آتش فشاں بن گئے۔ اپنے حوش میں نہ رہے۔ انہوں نے فاخرہ کو بہت مارا اور بابر سے کہا۔ ''بیٹا' تم اسے یہاں کیوں لے آئے' اسے کالوں کی بستی میں چھوڑ آتے' اب یہ اس قابل نہیں کہ میں اسے اپنے گھر میں رکھوں۔''

حنیف غصے اور صدمے سے نڈھال ہو کر ہسپتال پہنچ گئے ان پر دل کا دورہ پڑا تھا۔

پھر یہ بات پورے خاندان میں سینہ بہ سینہ جنگل کی آگ کی طرح بڑی تیزی سے پھیل گئی۔

فاخرہ اپنے کرتوت کی وجہ سے کسی کو شکل دکھانے کے قابل نہ رہی تھی۔ اس نے اپنے آپ کو ایک کمرے میں قید کر لیا۔ پھر بابر نے خاندان کے چند بزرگوں کو اکٹھا کیا۔ سارے واقعات ''ان کے سامنے دہرائے اور ان سے پوچھا۔ ''میں اب کیا کروں؟''

''ایسی حرافہ کے ساتھ کون زندگی گزار سکتا ہے' فوراً طلاق دے دو۔''

تب بابر بلال نے خاندان کے بزرگوں کے سامنے فاخرہ کو طلاق دے دی اور یہ سب کرنے کے بعد اس نے درخشاں کو ٹیلی فون کیا اور اسے خوش ہو ہو کر ساری روداد سنائی۔ درخشاں بھی یہ سن کر خوش ہو گئی' کہ چلو' معاملہ بخیر و خوبی نمٹ گیا۔

بابر بلال جب کراچی سے نیویارک پہنچا تو اس نے فاخرہ کے بارے میں مزید بتایا اس سے معلوم ہوا کہ معاملہ نہ صرف بخیر و خوبی نمٹ گیا بلکہ فاخرہ بھی اپنے انجام کو پہنچ گئی۔

فاخرہ پر چاروں طرف سے لعنت ملامت ہو رہی تھی۔ ہر شخص اس پر لفظوں کے سنگ برسا رہا تھا۔ خاندان کی بڑی بوڑھیوں کے ہاتھ ایک اچھا مشغلہ آ گیا تھا۔ اس پر ہر طرف سے طنز زنی ہو رہی تھی۔ خاندان کے لوگ یا پاس پڑوس والے جو کہتے' کم تھا' لیکن گھر میں فاخرہ کے سر پر ہاتھ رکھنے والا کوئی نہ تھا۔ بہنوں نے منہ موڑ لیے تھے۔ بھائیوں نے شکل دیکھنے سے انکار کر دیا تھا۔ ماں نے پوچھنا چھوڑ دیا تھا اور ابو ہسپتال میں تھے۔ انہوں نے کہلا بھیجا' ماکہ فاخرہ یہاں نہ آئے۔ فاخرہ کے سر پر اب کوئی چھت نہ رہی تھی اور یہ سب اپنے شوہر سے بے وفائی کا نتیجہ تھا۔ کوئی جائے مفر تھی' نہ کوئی جائے پناہ۔

تب فاخرہ نے اپنی زندگی کو ختم کرنے کا فیصلہ کیا۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ اس نے باتھ روم میں رکھی کیڑے مار دوا کی پوری شیشی اپنے حلق میں انڈیل لی۔ فوری طور پر اسے ہسپتال پہنچایا گیا' لیکن وہاں وہ چار پانچ گھنٹے جان کنی کے عالم میں رہ کر مر گئی۔

''مرتے وقت اس نے کسی سے کچھ کہا؟'' درخشاں نے سارے واقعات سن کر بابر بلال سے پوچھا۔

''مرتے وقت اس کے پاس کوئی نہ تھا' وہ کہتی کس سے۔'' بابر بلال نے بتایا۔

''مرنے سے پہلے؟''

''مرنے سے پہلے بھی وہ کچھ نہیں بولی' وہ اس قابل رہ کہاں گئی تھی۔ وہ کسی سے کیا کہتی' اس کی کون سنتا۔'' بابر بلال نے کہا۔

بابر بلال کی نیویارک واپسی کے بعد' وہ لوگ اپنے گھر میں شفٹ ہو گئے۔

اسی رات درخشاں نے اسے خواب میں دیکھا۔ وہ شعلوں میں گھری ہوئی تھی اور بہت غصے میں تھی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ''درخشاں' میں تجھے چھوڑوں گی نہیں۔ تو نے مجھے بہت ذلیل کروایا ہے۔ میں تجھ سے انتقام لے کر رہوں گی۔'' یہ کہہ کر وہ درخشاں کی طرف جھپٹی۔ درخشاں چیختی ہوئی بھاگی۔

تب ہی اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس کا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ خوف کے مارے وہ پسینے میں نہائی ہوئی تھی۔ یہ خواب اس قدر واضح' گہرا اور صاف تھا کہ اسے یہ محسوس ہو رہا تھا جیسے فاخرہ یہاں خود موجود تھی۔ کچھ حواس بحال ہوئے تو اس نے کمرے کی بتی جلائی' گھڑی پر نظر ڈالی۔ رات

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

کے دو بجے تھے۔

کچن میں جا کر اس نے ایک گلاس پانی پیا اور ٹی وی لاؤنج میں پڑے ایک صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس کا جی چاہا کہ بھیا کو اٹھا دے لیکن بھیا کہیں گے۔ ایک خواب سے ڈر کر خوامخواہ ان کی نیند خراب کر دی۔ پھر وہ انہیں اٹھانے کا ارادہ ملتوی کر کے اپنے کمرے میں آ گئی اور بیڈ پر لیٹ کر سونے کی کوشش کرنے لگی۔

جیسے ہی اسے نیند آنے لگتی' اس پر غنودگی چھاتی تو اسے فوراً وہ خواب یاد آ جاتا۔ خوف کے مارے اس کی آنکھیں کھل جاتیں۔ اسی طرح سوتے جاگتے صبح ہو گئی۔

اس وقت وہ گہری نیند سو رہی تھی۔ جب گھڑی کا الارم بجا۔ گھڑی کی چیخ' کسی عورت کی چیخ بن گئی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ گھڑی میں ساڑھے چھ بجے تھے۔ وہ الارم لگا کر اس لیے سوئی تھی تاکہ بابر بلال کو ٹھیک وقت پر ناشتا دے سکے۔

''بھیا' آج رات میں نے خواب میں فاخرہ کو دیکھا تھا۔'' درخشاں نے ناشتے کی میز پر بابر کو بتایا۔

''اچھا' کس طرح دکھائی دی تھی؟'' بابر نے پوچھا۔

''بھیا' وہ شعلوں میں لپٹی ہوئی تھی اور اس نے مجھ سے بڑے غصے میں کہا تھا' میں تجھے چھوڑوں گی نہیں۔ میں تجھ سے انتقام لے کر رہوں گی۔'' یہ بتاتے ہوئے درخشاں پر لرزہ طاری ہو گیا۔ ''بھیا رات کو مجھے بہت ڈر لگا' کئی بار آپ کو جگانے کا ارادہ کیا۔''

''ہاں تو اٹھا لیتی' ویسے ڈرنے کی کوئی بات نہیں' یہ محض خواب کی باتیں ہیں۔'' بابر نے تسلی دی۔

''لیکن بھیا' مجھے ایسا لگا جیسے یہ خواب نہ ہو' وہ مجسم ہو کر میرے سامنے آ گئی ہو۔'' درخشاں بولی۔

''اچھا اچھا' اب زیادہ سنجیدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ اپنے ذہن کو جھٹک کر صاف کر لو۔'' بابر بلال نے اٹھتے ہوئے کہا۔ اسے دفتر کے لیے دیر ہو رہی تھی۔

بابر کے جانے کے بعد اس نے دروازہ اندر سے لاک کر لیا اور اپنا کام لے کر بیٹھ گئی۔ ابھی یونیورسٹی جانے میں وقت تھا۔ اس نے سوچا' اتنی دیر میں کچھ نوٹس ہی مرتب کر لے' لیکن اس کا کام میں دل نہ لگا۔ رہ رہ کر اسے فاخرہ یاد آ جاتی۔ شعلوں میں گھری ہوئی' غصے میں چیختی ہوئی۔

پھر اس نے وقت مقررہ پر یونیورسٹی کا رخ کیا۔ درخشاں کے اعصاب پر بہت دباؤ تھا۔ دس پندرہ دن سے وہ مسلسل ذہنی دباؤ میں چلی آ رہی تھی۔ اس کا جی چاہتا کہ کسی سے اپنے دل کی بات کرے' لیکن کوئی ایسا نہ تھا جس سے وہ اپنے بارے میں بات کر سکتی۔ ایک پروفیسر ڈینی تھا جس سے بات کر کے وہ خوشی محسوس کرتی تھی۔ اب وہ بھی اس سے دور ہو گیا تھا اور ایسا اس نے خود ہی کیا تھا۔ وہ یونیورسٹی میں ہوتی تو پروفیسر ڈینی اسے یاد آتا رہتا اور جب گھر آ جاتی تو فاخرہ اس کا

پیچھا نہ چھوڑتی۔ زندگی عجیب' الجھنوں کا شکار ہو گئی تھی۔

اس رات وہ ایک خوفناک فلم دیکھتے ہوئے بری طرح چیخی تھی۔

اس کی چیخیں سن کر بابر بلال کی آنکھ کھل گئی۔ وہ دوڑتا ہوا درخشاں کے کمرے میں آیا۔ درخشاں بیڈ پر بیٹھی ہوئی بری طرح چیخ رہی تھی۔ اس نے بابر کو آتے ہوئے بھی نہ دیکھا۔

''درخشاں' ہوش میں آؤ۔'' اس نے درخشاں کو جھنجوڑ دیا۔ ''کیا ہوا' کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ رہی تھیں؟''

''نہیں تو۔'' اس نے اپنے گرد کمبل لپیٹتے ہوئے کہا۔

''پھر کیوں چیخ رہی تھیں؟'' بابر نے پوچھا۔

''میں فلم دیکھ کر ڈر گئی تھی۔'' اس نے بتایا۔

''خدا کے واسطے درخشاں' اپنے آپ پر رحم کرو۔ یہ خوفناک فلمیں دیکھنا چھوڑ دو۔''

''بھیا' کیا ٹی وی آپ نے بند کیا؟''

''ٹی وی یہاں کہاں ہے ٹی وی؟'' بابر نے حیرت سے کمرے میں چاروں طرف دیکھا۔

''آپ نے اسے لاؤنج میں پہنچا دیا؟'' درخشاں نے پوچھا۔

''درخشاں' کیا کہہ رہی ہو تم تمہیں کیا ہو گیا ہے؟''

''مجھے تو کچھ نہیں ہوا۔ میں تو بڑے آرام سے پڑھائی میں لگی ہوئی تھی۔ اچانک مجھے فلم کا خیال آیا۔ ارے' آج تو فلم کا دن ہے۔ پھر ایسے ہی بلا ارادہ میں نے اخبار اٹھا لیا۔ فلم اچھی معلوم ہو رہی تھی۔ میں نے سوچا چلو تھوڑی دیر دیکھ لیتی ہوں۔ جب ڈر لگنے لگے گا تو بند کر دوں گی۔ یہ سوچ کر میں ٹی وی ٹرالی لاؤنج سے کھینچ کر اپنے کمرے میں لائی اور ٹی وی آن کر کے بستر میں کمبل اوڑھ کر بیٹھ گئی۔ فلم شروع ہو چکی تھی۔ نائٹل چل رہے تھے۔ پھر جب فلم میں خوفناک مناظر شروع ہوئے تو میں نے ٹیلی ویژن بند کرنے کا ارادہ کیا' لیکن میں اس ارادے کو عملی شکل نہ دے سکی۔ سوچتی رہی کہ یہ منظر ختم ہو جائے تو پھر بند کرتی ہوں۔ منظر پر منظر بدلتے رہے اور میں ارادے کے باوجود ٹی وی بند نہ کر سکی۔ یہاں تک کہ ایک منظر دیکھ کر میری چیخیں نکل گئیں۔ اس کے بعد آپ آ گئے۔ آپ نے مجھے چیختا دیکھ کر ٹیلی ویژن بند کر کے اسے کمرے سے باہر دھکیل دیا۔ میرے ہوش بحال ہوئے تو میں نے کمرے میں آپ کو دیکھا' ٹیلی ویژن کہیں نظر نہ آیا۔''

''لیکن درخشاں' جب میں کمرے میں آیا تو یہاں کوئی ٹیلی ویژن نہیں تھا' بس تم بیڈ پر بیٹھی ہوئی چیخ رہی تھیں' البتہ تمہاری نظریں کسی نادیدہ چیز پر ضرور جمی ہوئی تھیں۔ ٹیلی ویژن تو لاؤنج میں اپنی جگہ رکھا ہے۔'' بابر بلال نے اسے بتایا۔

''آپ سچ کہہ رہے ہیں بھیا؟ لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے!'' درخشاں کو یقین نہ آیا۔

''تم نے شاید خواب میں ڈراؤنی فلم دیکھی ہے۔'' بابر بلال نے خیال ظاہر کیا۔

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

"نہیں' میں نے حقیقت میں فلم دیکھی ہے' یہ دیکھئے' یہ میرے کاغذات پھیلے ہوئے ہیں میں پڑھتے پڑھتے اٹھی تھی۔ وہ سامنے بیڈ پر اخبار پڑا ہے' اس میں' میں نے فلم کا پروگرام دیکھا تھا دیکھئے اب بھی وہی صفحہ کھلا ہوا ہے۔" پھر اس نے گھڑی دیکھی' اور بولی "اس وقت سوا بجا ہے' میں نے تقریباً ایک گھنٹا وہ فلم دیکھی ہے۔ وہ فلم اب بھی ٹیلی ویژن پر چل رہی ہوگی' آپ ٹی وی کھول کر دیکھیں۔"

بابر بلال کچھ سوچ کر کمرے سے باہر آیا۔ اگر ٹیلی ویژن ایک گھنٹے چلا ہے تو وہ گرم ہو رہا ہوگا اور اس کا چینل بھی بدلا ہوا ہوگا۔ درخشاں بھی اس کے ساتھ باہر آئی۔

ٹی وی ٹرالی اپنی جگہ پر تھی۔ دیکھنے سے یہ نہیں معلوم ہوا تھا کہ اسے ہلایا گیا ہے۔

بابر بلال نے ٹرالی ذرا سی آگے کر کے اس کی بیک چھو کر دیکھی۔ وہ گرم ہو رہی تھی۔ پھر اس نے ٹی وی آن کر دیا۔ چینل وہی روشن ہوا جس پر خوفناک فلمیں آتی تھیں جبکہ بابر نے ٹی وی بند کیا تھا تو وہ چینل نمبر نو تھا۔ اس نے ایک میوزک کا پروگرام دیکھا تھا اور دس بجے ٹی وی بند کر دیا تھا۔ درخشاں اس وقت اپنے کمرے میں تھی۔

وہ خوفناک فلم اب بھی ٹیلی ویژن پر آ رہی تھی۔

بابر نے اس فلم کو چند لمحے دیکھ کر ٹی وی بند کر دیا۔

"اب بتائیے بھیا' یہ خواب تھا یا حقیقت۔" درخشاں نے کہا۔

"اچھا' اس موضوع پر اب صبح بات کریں گے' اب تم سو جاؤ۔ میرے کمرے کا دروازہ کھلا ہے۔ تمہیں خوف محسوس ہو تو مجھے اٹھا لینا۔" یہ کہہ کر اس نے کمرے کا رخ کیا۔

بابر بیڈ پر لیٹا تو اسے نیند نہ آئی۔ وہ عجیب مخمصے میں پھنس گیا تھا۔ درخشاں کا بیان تھا کہ وہ ٹی وی دیکھتے ہوئے چیخی تھی حالانکہ جب وہ اس کے کمرے میں داخل ہوا تھا' وہاں ٹیلی ویژن نہ تھا۔ وہ تنہا بیٹھی چیخ رہی تھی۔ درخشاں کا خیال ہے کہ اس نے ٹیلی ویژن بند کر کے وہاں سے ہٹایا' لیکن اس نے کمرے میں ٹی وی پایا ہی نہیں تو ہٹاتا کیسے۔ اگر یہ بھی درخشاں کا واہمہ تھا۔ اس نے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا تھا تو ٹی وی اتنا گرم کیسے تھا' جیسے ابھی پانچ منٹ پہلے بند کیا گیا ہو' پھر چینل کس طرح تبدیل ہوا تھا۔

پھر یہی سوچتے سوچتے اسے نیند آ گئی۔ جبکہ خوف کے مارے درخشاں پوری رات جاگتی رہی۔ صبح کو دیر سے اس کی آنکھ کھلی اس وقت آٹھ بج رہے تھے۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھی۔ گھڑی کا الارم شاید بجا نہیں تھا یا وہ لگانا ہی بھول گئی۔ بابر بلال دفتر جا چکا تھا۔ اس نے خود ہی ناشتا بنا لیا تھا۔

درخشاں نے بھی پھر جلدی جلدی گھر سے نکلنے کی تیاری کی۔

سہ پہر کو جب وہ یونیورسٹی سے واپس لوٹی تو بہت تھکی ہوئی تھی۔ اسے بڑے زور کی نیند آ رہی تھی۔ وہ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ بس دروازہ کھولتے ہی سیدھی بستر پر جا گرے گی۔ لباس تبدیل کرنے کی بھی اس میں ہمت نہ تھی۔

جب وہ دروازہ کھول کر فلیٹ میں داخل ہوئی تو اس نے دیکھا کہ سامنے فاخرہ کھڑی ہے۔

وہی شعلوں میں لپٹی' غصے میں بھری۔

"یاد رکھ' میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔" اس نے کہا اور اس کی طرف جھپٹی۔

درخشاں چیخ مار کر دروازے سے باہر بھاگی۔ اس نے باہر نکل کر فوراً دروازہ بند کر دیا اور کھڑے ہو کر ہانپنے لگی۔ خوف کے مارے اس کا جسم تھر تھر کانپ رہا تھا۔ نیند کوسوں دور بھاگ گئی تھی۔

پہلے تو اس نے فاخرہ کو خواب میں دیکھا تھا' لیکن کیا اس وقت بھی یہ خواب تھا؟ اس پر نیند غالب ضرور تھی' لیکن اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ اس نے سوچا کیونکہ وہ فاخرہ کے بارے میں سوچتی ہوئی آ رہی تھی لہٰذا اس کے خیال نے یہ صورت اختیار کر لی۔ یہ محض اس کا واہمہ تھا۔

پھر اس نے ہمت کر کے دروازہ کھولا اور چند لمحے دروازہ کھول کر کھڑی رہی۔ اس کو کچھ نظر نہ آیا۔ پھر وہ دروازہ کھلا چھوڑ کر ہی آگے بڑھی۔ وہ ٹی وی لاؤنج تک پہنچ گئی۔ کچھ دکھائی نہ دیا اس نے پورے گھر میں ایک چکر لگایا۔ تب وہ ہنس پڑی' اپنی حماقت پر خواہ مخواہ ڈر کر باہر چلی گئی۔ وہ تو اچھا ہوا کہ اس وقت باہر کوئی نہ تھا' ورنہ کیا کہتا۔ وہ تو خیر بعد میں کچھ کہتا' وہ اسے کیا بتاتی کہ کس چیز سے ڈر کر وہ دروازے پر آئی ہے۔

پھر واپس دروازے کی طرف آئی۔ کھلے ہوئے دروازے کو بند کر کے اسے لاک کیا۔

اور جب وہ واپس پلٹی تو اس کا سانس اوپر کا اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔

فاخرہ شعلوں میں لپٹی' غصے میں بھری اس کے سامنے کھڑی تھی۔

"تو کب تک مجھ سے بھاگے گی' یاد رکھ' میں تجھے نہیں چھوڑوں گی۔"

اس نے بڑی تیزی سے دروازہ کھولا۔ اس سے پہلے کہ وہ اس کی طرف جھپٹتی۔ وہ دروازے سے باہر نکل چکی تھی۔ اس نے دروازہ بند کر کے تالا لگایا اور تیزی سے سیڑھیاں اترنے لگی۔

ابھی وہ دو تین سیڑھیاں اتری تھی کہ اسے نیچے سے مسز نکسن آتی ہوئی دکھائی دیں۔ ان کے ہاتھ میں بڑا سا بیگ تھا۔ شاید وہ خریداری کر کے آ رہی تھیں۔ انہیں دیکھ کر درخشاں رک گئی۔

مسز نکسن اس کی پڑوسن تھیں۔ سامنے والا فلیٹ انہی کا تھا۔ درخشاں کی ان سے جان پہچان تھی۔ آتے جاتے علیک سلیک ہو جاتی تھی۔ ایک دو مرتبہ فاخرہ کے سامنے وہ گھر بھی آ چکی تھیں۔ وہ ایک اچھی ملنسار اور اپنے کام سے کام رکھنے والی خاتون تھیں۔ قدرے موٹی تھیں' اس لیے شگفتگی ان کے مزاج کا خاصہ تھی۔ درخشاں نے ان کا دور ہی سے استقبال کیا۔

"آیئے' آیئے مسز نکسن' کہئے' کہاں سے آ رہی ہیں؟"

"شاپنگ' شاپنگ۔" انہوں نے سامان سے بھرے ہوئے تھیلے کی طرف اشارہ کیا۔

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

اسے اٹھانے کی وجہ سے ان کا سانس پھول رہا تھا۔

"لائیے میں آپ کی مدد کر دوں۔" درخشاں نے جلدی سے نیچے اتر کر ان کے ہاتھ سے بیگ لے لیا۔ وہ خاصا بھاری تھا۔ مسز نکسن نے اسے ممنونیت سے دیکھا۔ اس کا شکریہ ادا کیا' پھر بولیں۔

"یہ خوبصورت لڑکی کہاں جا رہی تھی؟"

"میں آپ کے گھر گئی تھی۔ اصل میں' میں اکیلی گھر میں بور ہو رہی تھی تو میں نے سوچا' آج آپ سے چل کر گپ شپ لگائی جائے۔ پھر آپ کا گھر بند دیکھ کر میں ابھی سوچ ہی رہی تھی کہ کیا کروں کہ اتنے میں آپ نظر آ گئیں۔"

"اچھا' یہ تو میری خوش قسمتی ہے' خوبصورت لڑکی' آؤ میرے ساتھ' میں تمہیں کافی پلاؤں۔"

"اوہ' بہت شکریہ آپ کا۔ مجھے بڑی خوشی ہو گی آپ کے ساتھ کافی پی کر۔"

"مسز بابر کا کیا حال ہے؟ کافی دن سے وہ نظر نہیں آئیں۔" مسز نکسن نے تالا کھول کر' گھر میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"وہ پاکستان گئی ہوئی ہیں۔" درخشاں نے صاف جھوٹ بولا۔

"اچھا۔ اور تمہاری ریسرچ کیسی چل رہی ہے؟" انہوں نے پوچھا۔

"بہت اچھی۔" درخشاں نے بتایا۔

وہ کافی دیر' وہاں بیٹھی ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی۔ کوئی اور وقت ہوتا تو وہ چار منٹ بیٹھ کر وہاں سے اٹھ آتی' لیکن اس وقت اس میں اپنے گھر جانے کی ہمت نہ تھی۔ اور سردی میں باہر نکلنے کی سکت نہ تھی۔ مسز نکسن ایک دلچسپ خاتون تھیں۔ ان سے باتیں کر کے اس کا دل بہل گیا۔ خوف کم ہو گیا۔ یہاں بیٹھے ہوئے اسے کافی دیر ہو گئی تھی۔ یہاں تک کہ مسز نکسن بھی پہلو بدلنے لگی تھیں۔ اس نے سوچا' اب اٹھ کر جانا چاہئے۔ پھر اس نے کافی اور مزے دار گفتگو کا شکریہ ادا کیا۔

مسز نکسن باتیں کرتی ہوئی' اس کے گھر کے دروازے تک آ گئیں۔ درخشاں نے ان کی دلچسپی کی بات چھیڑ دی تھی۔ اس نے تالا کھولا۔ مسز نکسن بھی اس کے ساتھ ہی اندر آ گئیں۔ وہ چاہ بھی یہی رہی تھی۔ بات ختم کر کے وہ واپس جانے لگیں تو درخشاں نے انہیں ایک کپ کافی کی پیشکش کر دی جسے مسز نکسن نے شکریے کے ساتھ قبول کر لیا اور صوفے پر اطمینان سے بیٹھ گئیں۔

درخشاں نے ڈرتے ڈرتے چاروں طرف نظریں دوڑائیں' لیکن اسے کہیں کچھ نظر نہ آیا۔ پھر اس نے پورے گھر کا چکر لگایا کہیں کچھ محسوس نہ ہوا' تب اس نے اسے اپنا واہمہ سمجھ کر اپنے دل کو مطمئن کر لیا۔

مسز نکسن کو وہ بڑی دیر تک شادی کی رسم و رواج بتاتی رہی۔ مسز نکسن بڑی دلچسپی سے اس کی باتیں سنتی رہیں اور سوالات کر کے بہت سی باتیں پوچھتی رہیں پھر وہ کافی پی کر رخصت ہو

گئیں۔ درخشاں انہیں دروازے تک چھوڑنے گئی۔

واپس آ کر اس نے لباس تبدیل کیا اور کچن میں گھس کر رات کا کھانا تیار کرنے لگی۔

ساڑھے سات بجے کے قریب بابر بلال دفتر سے آ گیا۔ دفتر سے آ کر اس نے کچھ دیر آرام کیا پھر منہ ہاتھ دھویا اور..... کھانے کی میز پر کھانے کا انتظار کرنے لگا۔

کھانے کے دوران' درخشاں نے آج شام کی ساری روداد اس کے گوش گزار کی۔ ساری باتیں سن کر بابر بلال' درخشاں کو اس طرح دیکھنے لگا جیسے اسے اس کی ذہنی حالت پر شبہ ہو۔

"بھیا' شاید آپ کو میری بات پر یقین نہیں آیا۔" درخشاں نے کہا۔

تمہاری باتیں ہی ایسی ہیں' ناقابل یقین۔" بابر بولا۔

"بھیا' میں آپ سے جھوٹ کیوں بولوں گی۔" درخشاں نے اداس ہو کر کہا۔

"نہیں' میں تمہیں جھوٹا نہیں سمجھ رہا' لیکن تمہاری باتوں پر یقین بھی نہیں کیا جا سکتا۔ کیا خیال ہے' اس سلسلے میں کسی ڈاکٹر سے بات کر لیں؟" بابر بلال نے پوچھا۔

"اس کا مطلب ہے کہ آپ کو میری ذہنی حالت پر شبہ ہے' مجھے نفسیاتی مریضہ سمجھ رہے ہیں۔"

درخشاں نے کھانا' کھانا چھوڑ دیا اور رونے بیٹھ گئی۔

بابر بلال نے بڑی مشکل سے اسے چپ کرایا اور کھانا کھلایا۔ درخشاں نے خاموشی سے کھانا کھا کر برتن سمیٹے اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔ پھر اپنی پڑھائی میں لگ گئی۔

تھوڑی دیر کے بعد بابر بلال دو مگوں میں کافی لیے درخشاں کے کمرے میں آیا اور بولا۔

"لو بھئی درخشاں' کافی پیو۔"

"ارے بھیا' آپ نے کیوں بنائی کافی۔" اس نے مگ تھامتے ہوئے کہا۔ "آپ مجھ سے کہہ دیتے۔"

"ذرا پی کر دیکھو' میں کتنی شاندار کافی بناتا ہوں۔" بابر نے شگفتگی سے کہا۔

"واہ' بہت مزے کی ہے۔" درخشاں نے خوش ہو کر کہا۔

"آج ٹی وی پر کوئی فلم تو نہیں؟" بابر نے پوچھا۔

"نہیں' کل آئے گی' ایک دن چھوڑ کر آتی ہے۔ اگر آپ کا اشارہ خوفناک فلم کی طرف ہے تو۔ ویسے تو روزانہ ہی فلمیں آتی ہیں۔"

"میرا اشارہ تم ٹھیک سمجھیں' اب تم میرا ایک اشارہ اور سمجھ لو۔"

"میں ہورر فلمیں دیکھنا چھوڑ دوں یہی نا؟" درخشاں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "میں نے اب توبہ کر لی ہے بھیا۔ اب کبھی نہیں دیکھوں گی۔ کل بھی میں نے کافی دنوں کے بعد دیکھی تھی۔ جانے کیوں میں بے اختیار ہو گئی تھی اور پڑھتے پڑھتے ٹیلی ویژن کھول کر بیٹھ گئی تھی۔"

کل کی بات ابھی تک معما بنی ہوئی ہے' تم کچھ کہتی ہو' میں نے کچھ اور دیکھا ہے۔

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

واقعات کچھ اور ہی کہانی سناتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ تم بھی صحیح ہو۔ میں بھی صحیح ہوں اور واقعات بھی صحیح ہیں۔" بابر بلال نے کہا۔

"مجھے تو اتنا یقین ہے کہ میں نے وہ فلم خواب میں نہیں دیکھی تھی' پورے ہوش و حواس میں ٹیلی ویژن پر دیکھی تھی اور آج شام کو بھی میں نے فاخرہ کو خواب میں نہیں بلکہ جاگتے ہوئے دیکھا تھا۔ اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ سب میرے ذہن کی اختراع ہے اور یہ کہ مجھے کوئی نفسیاتی مرض لاحق ہو گیا ہے تو ٹھیک ہے' میں ڈاکٹر کے پاس چلنے کے لیے تیار ہوں۔" درخشاں نے کہا۔

"اصل میں درخشاں' ان خوفناک فلموں نے تمہارے ذہن پر بہت برا اثر ڈالا ہے۔ آسیبی فلمیں دیکھ دیکھ کر تمہیں بھوت' پریت اور آسیب پر یقین ہو گیا ہے۔"

"یہ فلمیں تو میں بہت عرصے سے دیکھ رہی ہوں' پھر یہ یقین آج کیوں ہوا۔ اگر آپ یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ فاخرہ کا آسیب میرے ذہن کی پیداوار ہے تو اب تک تو میں جانے کتنے بھوت بنا چکی ہوتی۔"

"تم سائنس کی طالبہ ہو' ایک حقیقت پسند لڑکی ہو' تم یہ بات اچھی طرح جانتی ہو کہ اس طرح کی باتیں محض قصے کہانیوں اور فلموں تک محدود ہیں' حقیقت میں ان کا کوئی وجود نہیں۔"

"جی' جانتی ہوں' میں نے آپ سے یہ کب کہا کہ میں نے فاخرہ کا بھوت دیکھا ہے۔ میں نے تو جو واقعات پیش آئے ہیں' وہ بلا تبصرہ آپ کو سنا دیے ہیں۔ میری خود سمجھ میں نہیں آ رہا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔"

"کچھ نہیں ہو رہا' تم آرام سے پڑھو اور اب مجھ سے ایک پکا وعدہ کر لو کہ تم کسی قیمت پر یہ آسیبی فلمیں نہیں دیکھو گی۔" بابر بلال نے ایک مرتبہ اور یقین دہانی چاہی۔

"میں نے آپ سے کہا نا کہ میں نے توبہ کر لی ہے۔ اب آپ کے سامنے بھی قسم کھا لیتی ہوں۔ میں آئندہ کبھی ایسی فلمیں نہیں دیکھوں گی۔" درخشاں نے اسے یقین دلایا۔

"اچھا' اب میں چلتا ہوں۔ شب بخیر۔ ہاں تمہیں اگر ڈر محسوس ہو تو فوراً مجھے آ کر جگا لینا' اوکے۔"

بابر بلال کے جانے کے بعد وہ پورے اطمینان سے پڑھتی رہی۔

کوئی گیارہ بجے کے قریب اس کی آنکھوں میں نیند بھرنے لگی اور یہ نیند اتنی تیزی سے آئی کہ وہ کمرے کی لائٹ بجھا سکی اور نہ ہی اپنے کاغذات سمیٹ سکی۔ بس وہ پڑھتے پڑھتے سو گئی۔

وہ چیخ ہی تھی جسے سن کر بابر کی آنکھ کھلی تھی۔

وہ گہری نیند میں تھا' اس لیے پہلے تو اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ یہ کیسی آواز ہے۔ جب ذرا حواس بحال ہوئے تو اس نے محسوس کیا کہ یہ درخشاں کے چیخنے کی آواز ہے۔ وہ بری طرح چیخ رہی تھی اور بھیا' بھیا پکار رہی تھی۔

بابر بلال نے کمبل اٹھا کر دور پھینکا اور درخشاں کے کمرے کی طرف بھاگا۔

اس کے کمرے کی لائٹ روشن تھی اور وہ اپنا بازو پکڑے' آنکھیں بند کیے چیخے جا رہی تھی۔

"درخشاں' درخشاں' کیا ہوا؟" بابر نے اسے ہلایا۔

بابر کو اپنے سامنے پا کر' وہ اس سے لپٹ گئی اور سسک سسک کر رونے لگی۔

"بھیا' وہ مجھے مار ڈالے گی۔"

"کون مار ڈالے گی درخشاں' تم نے پھر کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا؟" بابر نے پوچھا۔

"نہیں' وہ خواب نہیں ہو سکتا۔ سوتے سوتے میری اچانک آنکھ کھلی تھی۔ میں نے گھڑی دیکھی تو بارہ بج رہے تھے۔ میں پڑھتے پڑھتے بے خبر سو گئی تھی۔ میرے کاغذات یوں ہی بکھرے پڑے تھے' لائٹ بھی جل رہی تھی۔ میں نے سوچا کہ اب آنکھ کھل گئی ہے تو کاغذات سمیٹ کر ٹیبل پر رکھ دوں اور پانی پی کر لائٹ بجھا کر سو جاؤں۔ ابھی میں کاغذات سمیٹ ہی رہی تھی بھیا کہ وہ اچانک کمرے میں داخل ہوئی۔" درخشاں لرز رہی تھی۔

"کون کمرے میں داخل ہوئی؟ یہاں تو کوئی نہیں ہے۔" بابر نے کہا۔

"بھیا' وہ فاخرہ تھی۔ شعلوں میں لپٹی اور غصے سے بھری۔ اس مرتبہ اس کے ایک ہاتھ میں چینی کا ایک بڑا سا سفید پیالہ تھا اور دوسرے ہاتھ میں ایک تیز دھار کا چمکدار چاقو۔ بھیا' پھر اس نے مجھے دبوچ لیا۔ میرے بازو پر چاقو سے خراشیں ڈالیں اور جب ان لکیروں سے خون بہنے لگا تو وہ خون اس نے پیالے میں جمع کر لیا اور پھر پیچھے ہٹتے ہوئے بولی۔ یاد رکھ' میں اسی طرح قطرہ قطرہ کر کے تیرا سارا خون نکال لوں گی۔

میں تجھے تڑپا تڑپا کر ماروں گی۔ یہ کہہ کر وہ دروازے سے باہر نکل گئی۔ بھیا' وہ ابھی گھر میں ہی ہو گی۔"

"اچھا' اٹھو۔" بابر بلال نے اسے سہارا دے کر اٹھایا۔ "ہم ابھی پورا گھر دیکھے لیتے ہیں۔ ہم سے بچ کر کہاں جائے گی۔"

پھر بابر بلال نے درخشاں کو گھر کا کونا کونا دکھا دیا' لیکن گھر میں کوئی ہوتا تو ملتا۔

"تم ذرا بیٹھو' میں تمہارے لیے کافی بناتا ہوں۔" بابر نے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔

"لائیں' بھیا میں بنا دیتی ہوں۔"

"نہیں' تم بیٹھو۔" بابر نے اسے زبردستی بٹھا دیا۔ "کافی میں بناؤں گا۔"

پھر اس نے کچن سے ایک گلاس پانی لا کر دیا۔ "لو' یہ پی لو۔"

سیدھے ہاتھ میں گلاس پکڑتے ہوئے اس کے بازو میں ٹیس سی ہوئی۔ وہ گلاس ہاتھ میں لے کر اپنا بازو سہلانے لگی۔ پھر اس نے گلاس بائیں ہاتھ میں لے کر جلدی جلدی پانی پیا جیسے جنم جنم کی پیاسی ہو۔

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

"اور؟" بابر بلال نے پوچھا۔

"نہیں بھیا۔" درخشاں نے جواب دیا۔

"بازو کیوں پکڑ رہی ہو؟" بابر بلال نے پوچھا۔

"بازو میں تکلیف ہو رہی ہے۔" اس نے کہا۔

"ذرا دکھاؤ مجھے۔"

درخشاں نے اپنا بازو اس کے آگے کر دیا۔

جب بابر بلال نے اس کی قمیص کی آستیں اوپر چڑھائی تو ایک لمحے کو وہ سکتے میں رہ گیا۔ اس کے بازو پر تازہ زخم بنے ہوئے تھے جیسے کسی نے بلیڈ سے اس کے بازو پر لکیریں بنائی ہوں۔

"دیکھیں بھیا' اب آپ خود دیکھ لیں۔ وہ مجھے مار ڈالے گی' اللہ میں کیا کروں۔"

پھر اسے چکر سا آیا اور وہ صوفے پر اوندھے منہ گری اور بے ہوش ہو گئی۔ بابر بلال نے اسے سیدھا لٹا دیا۔ اس کے ہاتھ پاؤں برف کی طرح ٹھنڈے ہو رہے تھے۔ بابر نے اس کے ہاتھ اور پاؤں کو زور زور سے رگڑا۔ کچھ دیر کے بعد اس کے ہاتھوں میں گرمی پیدا ہوئی پھر اس نے آنکھیں کھول دیں اور وحشت زدہ ہو کر اٹھ بیٹھی۔

"درخشاں' ڈرو مت' میں ہوں تمہارے پاس۔"

"اوہ' اس نے مجھے زخمی کر دیا ہے' وہ میرا سارا لہو نچوڑ لے گی۔"

ارے نہیں درخشاں' ایسا نہیں ہو سکتا۔ آؤ اٹھو' میرے کمرے میں چلو تم وہاں سوؤ' میں دیکھتا ہوں' اب کون تمہارے پاس آتا ہے۔"

بابر اسے اٹھا کر اپنے کمرے میں لے گیا۔ اسے سہارا دے کر بیڈ پر لٹا دیا۔ اس کے ہاتھ پیروں میں جان نہیں رہی تھی۔ ذرا سی دیر میں وہ برسوں کی مریض دکھائی دینے لگی تھی۔

پھر بابر نے اس کا بازو کھول کر ان باریک لکیروں پر جن پر خون جم سا گیا تھا۔ ایک ٹیوب سے مرہم لگا دیا۔ اس کے بازو پر یہ لکیریں اس کے بیان کی تائید کر رہی تھیں۔

"لیکن ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟" بابر نے سوچا۔

بابر نے اپنا بستر بیڈ کے نیچے قالین پر لگا لیا تھا۔ لائٹ جلی چھوڑ دی تھی اور درخشاں سے کہا تھا۔ "تم اطمینان سے سو جاؤ' میں جاگ رہا ہوں۔"

درخشاں آنکھیں بند کیے لیٹی رہی۔ کبھی کبھی اس کے ہونٹ ہلنے لگتے تھے' لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔

خدا خدا کر کے صبح ہوئی اور صبح ہوتے ہوئے درخشاں کی حالت خاصی خراب ہو گئی۔

اس پر نیم غشی سی طاری تھی۔

بابر نے اسے کسی طرح ہسپتال پہنچایا۔ ڈاکٹر نے وہاں معائنے کے بعد بتایا کہ یہ نروس

بریک ڈاؤن ہے۔ فوری طور پر اسے ڈرپ لگائی گئی۔ طاقتور انجکشن دیئے گئے اور ملاقات پر پابندی لگا دی گئی۔ بابر کے علاوہ اس سے فوری طور پر ملنے والا تھا ہی کون۔

وہ اسے ہسپتال چھوڑ کر امجد کے پاس چلا گیا۔ وہاں اس نے درخشاں کے ساتھ پیش آنے والے واقعات پر غور کیا' لیکن دونوں کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکے۔ تاہم اس بات پر دونوں متفق تھے کہ درخشاں کا تنہا گھر میں رہنا خطرے سے خالی نہیں۔ بابر بلال تو صبح کا گیا رات کو گھر لوٹتا تھا۔ جبکہ درخشاں سہ پہر تک گھر پہنچ جاتی تھی۔ پھر رات کو بھی وہ اپنے کمرے میں تنہا ہوتی تھی۔ ڈرتی تو وہ ہمیشہ سے تھی' لیکن ان پراسرار واقعات نے اس کے اعصاب کو بری طرح متاثر کیا تھا۔ یہاں تک کہ نروس بریک ڈاؤن ہو گیا تھا۔

اعصاب شکستگی کے یہ دورے اگر بار بار اس پر پڑتے تو وہ کسی بھی وقت موت سے ہمکنار ہو سکتی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ چوبیس گھنٹے اس کے ساتھ کوئی رہے اور نیویارک میں یہ سب ممکن نہ تھا۔ لہٰذا امجد نے اسے مشورہ دیا کہ کراچی اپنے والدین سے بات کرو' انہیں ساری صورتحال بتاؤ اور ان سے مشورہ طلب کرو۔

شام تک درخشاں کی حالت قدرے بہتر ہو گئی' لیکن کمزوری اسے بہت تھی۔ وہ خود سے اٹھنے بیٹھنے کے قابل بھی نہ تھی۔ شام کو بابر کو اس سے ملنے کی اجازت دی گئی۔ اس ہدایت کے ساتھ کہ وہ مریضہ سے کوئی ناخوش گوار بات نہ کریں۔

"آیئے بھیا' میں آپ کا انتظار کر رہی تھی۔" درخشاں اسے دیکھ کر مسکرائی۔ ایک پھیکی سی مسکراہٹ۔

"اب کیسی ہو؟" بابر نے پوچھا۔

"ٹھیک ہوں۔" درخشاں بولی۔

"میں ابھی یہاں سے جا کر ابو کو ٹیلی فون کروں گا۔ سوچ رہا ہوں' تمہیں واپس کراچی بھیج دوں۔"

"ہائے بھیا' میری ریسرچ کا کیا ہو گا۔ اتنا کام میں نے کر لیا ہے۔ میری ساری محنت ضائع ہو جائے گی۔" درخشاں نے افسردگی سے کہا۔

"اچھا اچھا' دیکھیں گے' تمہیں افسردہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ذرا ابو سے بات تو لوں' پھر جیسا وہ کہیں گے' کر لیں گے۔"

پھر جب بابر بلال نے کراچی بات کی تو وہاں سب سے پہلے امی سے بات ہوئی۔ وہ امی سے جیسے جیسے بات کرتا گیا' انہوں نے سب کو آوازیں دے کر اکٹھا کر لیا۔ سب پریشان ہو گئے۔ ہسپتال میں داخل ہونے کی خبر نے سب کو دہلا کر رکھ دیا۔

ابو خود پریشان ہو گئے۔ امی اور گل افشاں رونے لگیں۔

اس طرح کی صورتحال کے پیش نظر درخشاں کا امریکا میں رہنا کسی طور بھی مناسب

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

سمجھا گیا۔ ابو نے بابر بلال کو یہی ہدایت کی۔ ''بیٹا' تم درخشاں کو واپس بھیج دو۔ وہ وہاں تنہا رہ کر خوف سے مر جائے گی۔ وہ تو ڈرتی بھی بہت ہے۔ یہاں بھی وہ گل افشاں کے ساتھ سوتی تھی۔ ایسی صورت میں جبکہ وہ انتہائی ڈراؤنے خواب دیکھ رہی ہے' مجھے ڈر ہے کہیں وہ اپنے ہوش نہ گنوا بیٹھے۔ بس تم اسے واپس روانہ کر دو۔''

''لیکن' ابو' وہ آنے کے لیے تیار نہیں ہے' وہ اپنی ریسرچ ادھوری نہیں چھوڑنا چاہتی۔''

''ہاں' وہ ایسا ہی کہے گی۔ پڑھائی سے اسے بے حد لگاؤ ہے۔ ریسرچ ادھوری رہنے کا اسے دکھ تو ہوگا' لیکن اسے سمجھاؤ کہ وہ تنہا ان حالات میں وہاں کیسے رہے گی۔ تم کسی بھی طور اسے سمجھا بجھا کر روانہ کر دو۔'' ابو نے سختی سے تاکید کی۔

بابر بلال نے گھر والوں کا فیصلہ درخشاں کو سنا دیا۔

درخشاں کو ناچار اس فیصلے کو قبول کرنا پڑا۔ ویسے وہ خود بھی اندر سے اتنی خوفزدہ ہو گئی تھی کہ گھر میں تنہا رہنے کے خوف سے اس کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہونے لگتے تھے۔ دماغ سن ہو جاتا تھا۔ آنکھوں میں اندھیرا چھانے لگتا تھا۔

بابر نے جلدی جلدی اس کے جانے کے انتظامات مکمل کر دیے۔

تین دن وہ ہسپتال میں رہی۔ اطمینان سے رہی۔ وہاں اس کے ساتھ کوئی واقعہ پیش نہ آیا۔ کوئی ڈراؤنا خواب دکھائی دیا نہ فاخرہ جاگتے میں نظر آئی' لیکن بابر نے اسے احتیاطاً ہسپتال میں ہی رکھا۔ اگرچہ ہسپتال سے دوسرے دن ہی مکمل آرام کی ہدایت کے ساتھ چھٹی مل گئی تھی' لیکن بابر نے اسے گھر لانا مناسب نہ سمجھا۔ گھر آ کر خدشہ تھا کہ ویسی ہی نہ ہو جائے۔

جس دن درخشاں کی کراچی روانگی تھی۔ اسی دن وہ اسے ہسپتال سے گھر لایا تاکہ وہ اپنا سامان اکٹھا کر سکے۔

سامان اکٹھا کرتے ہوئے جب اس نے میز کی درازیں خالی کیں تو اس کے ہاتھ ڈینی کی بھجوائی ہوئی ڈائری اور کیسٹ لگ گئے۔

ایک لمحے کو اس کی آنکھوں میں اندھیرا سا چھا گیا۔ ڈینی کی یاد نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ پھر اسے وہ لپ اسٹک یاد آئی جو ڈینی کا پہلا اور آخری تحفہ تھی۔ وہ اس کے بیگ میں تھی۔ اس نے بیگ سے لپ اسٹک نکالی اور ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھ کر اپنے ہونٹوں پر لگانے لگی۔

اس کا جی چاہا کہ جانے سے پہلے پروفیسر ڈینی سے مل لے۔ اگر مل نہیں سکتی تو کم از کم فون پر ہی بات کر لے۔ اب یہ سب کرنے کا کیا فائدہ۔ ڈینی اپنی دنیا میں واپس چلا گیا تھا' اسے آواز دینا فضول تھا۔ ملاقات کرنے یا فون پر بات کرنے سے محض وہ زخم کھلتے جو اب مندمل ہو چکے تھے' اس کے علاوہ کوئی فائدہ نہ تھا۔ جو چنگاری راکھ تلے دب گئی تھی' اسے اب کریدنا بیکار تھا۔

''ارے درخشاں' تم کہاں ہو' جلدی کرو بھئی' میں نہانے جا رہا ہوں۔'' بابر بلال کی آواز

آئی تو وہ ایک دم چونک اٹھی۔ اس نے لپ اسٹک جلدی سے بیگ میں ڈالی اور باہر آ گئی۔

باتھ روم کا دروازہ بند ہو چکا تھا۔ بابر بلال نہانے جا چکا تھا۔

درخشاں جلدی جلدی اپنی چیزیں سمیٹنے لگی۔ سب سے پہلے اس نے سوٹ کیس میں ڈائری اور کیسٹ کو رکھا۔ اس کے اوپر اپنے کپڑے رکھنے لگی۔

کپڑے رکھتے رکھتے کمرے میں اسے سرسراہٹ کا سا احساس ہوا۔ جیسے دروازے پر آ کر کوئی رک گیا ہو۔ درخشاں نے ڈرتے ڈرتے نظریں اوپر اٹھائیں۔

وہ کھڑی تھی۔

شعلوں میں لپٹی اور غصے میں بھری۔

''کہاں جا رہی ہے کمینی۔ تو سمجھتی ہے کہ میں تیرا پیچھا چھوڑ دوں گی۔ چل تو کراچی چل' میں بھی تیرے ساتھ چل رہی ہوں۔''

اسے دیکھ کر درخشاں نے چیخ مارنا چاہی' لیکن چیخ جیسے گھٹ کر رہ گئی۔ کمرے سے باہر نکلنے کا راستہ بند تھا۔ دروازے پر وہ کھڑی تھی۔ اس نے بڑی مشکل سے اپنے حلق سے آواز نکالی۔ وہ بھیا' بھیا' کر کے چیخی تھی' لیکن آواز جیسے اس کے حلق میں پھنس رہی تھی۔ پھر اسے چکر سا آیا اور وہ اوندھے منہ بیڈ پر گر پڑی۔

کچھ دیر کے بعد اسے ہوش آیا۔ بابر باتھ روم سے نہا کر نکل آیا تھا۔ اس کے گنگنانے کی آواز آ رہی تھی' جب وہ یہ دیکھنے کے لیے کہ درخشاں نے کتنی تیاری مکمل کر لی ہے' کمرے میں آیا تو یہ دیکھ کر اس کے ہوش اڑ گئے کہ درخشاں آنکھیں پھاڑے چھت کو گھور رہی ہے۔

''بھیا' وہ پھر آئی تھی' جہاں آپ کھڑے ہیں' یہیں کھڑی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی کہ میں تیرا پیچھا نہیں چھوڑوں گی' تو کراچی جا رہی ہے تو میں بھی تیرے ساتھ چل رہی ہوں۔ بھیا' یہ میرے پیچھے کیوں پڑ گئی ہے؟''

''درخشاں' تم اس سے ڈرنا چھوڑ دو' اب تمہیں آئندہ دکھائی دے تو اس کے منہ پر کوئی چیز اٹھا کر کھینچ مارو۔ پھر وہ تمہیں دکھائی نہیں دے گی۔'' بابر نے یہ بات محض اس کی تسلی کے لیے کہہ دی تھی ورنہ وہ جانتا تھا کہ فاخرہ کا کوئی وجود نہیں' یہ محض اس کا واہمہ ہے۔

''بھیا' اتنی ہمت اپنے اندر کہاں سے لاؤں' میرے تو اسے دیکھتے ہی حواس معطل ہو جاتے ہیں۔''

''ہسپتال میں تو وہ نہیں دکھائی دی؟'' بابر نے پوچھا۔

''نہیں' بالکل نہیں۔ میں تو خوش ہو رہی تھی کہ اس سے نجات مل گئی۔ اب میں بیکار کراچی جا رہی ہوں' لیکن اس نے ظاہر ہو کر بتا دیا کہ ابھی اس نے میرا پیچھا نہیں چھوڑا ہے۔''

''وہ تمہیں تنہائی میں ہی دکھائی دیتی ہے۔ میں جیسے ہی باتھ روم میں گیا' وہ تمہارے پاس آ گئی۔''

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

"شاید۔" درخشاں بے یقینی سے بولی۔

"اچھا' اب تم میری نظروں کے سامنے رہو' میں دیکھتا ہوں کہ وہ کیسے تمہارے پاس آتی ہے۔"

پھر درخشاں اس کے سامنے رہی۔ وہ اپنا سامان تقریباً سمیٹ چکی تھی۔ پھر وہ اپنے دونوں سوٹ کیس بند کرکے' اپنا لباس تبدیل کرنے لگی۔ لباس تبدیل کرنے سے پہلے اس نے کمرے کا دروازہ بند کرلیا۔ اس نے بڑی تیزی سے لباس تبدیل کیا۔ وہ ڈرتی رہی کہ کہیں سے وہ منحوس برآمد نہ ہو جائے' لیکن وہ منحوس برآمد نہ ہوئی۔ کپڑے بدل کر درخشاں نے دروازہ کھول دیا۔

بابر بلال بھی تیار ہو چکا تھا۔ اس نے گھڑی دیکھی اور درخشاں سے پوچھا۔ "پھر چلیں؟"

"ایک منٹ' میں ذرا مسز نکسن کو گڈ بائی کہہ آؤں۔" بہت اچھی خاتون ہیں۔"

"اچھا ٹھیک ہے' لیکن اتنا یاد رکھو کہ وقت بہت کم ہے' وہاں کافی پینے نہ بیٹھ جانا۔" بابر نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اور یہ تو بتاؤ" کیا تمہاری ڈینی سے بات ہوگئی تھی؟"

"نہیں' ان سے تو نہیں ہوئی۔ میں نے ٹیلی فون پر ٹرائی کیا' لیکن فون نہ مل سکا۔ البتہ ڈاکٹر براؤن سے میں نے ہسپتال سے بات کرلی تھی۔ وہ بہت پریشان تھے کہ اچانک میرا نروس بریک ڈاؤن کیسے ہوگیا اور یہ کہ میں اتنے لمبے عرصے کے لیے کیوں پاکستان جا رہی ہوں۔ میں نے اس سے صرف اتنا ہی کہا کہ میری کچھ پرابلمز ہیں اگر وہ دو چار مہینے میں حل ہوگئیں تو میں لوٹ آؤں گی' ورنہ اپنی ریسرچ' اپنے ملک میں ہی مکمل کرلوں گی۔"

"اچھا ٹھیک ہے' تم مسز نکسن سے ہاتھ ملا کر آؤ' میں جب تک سامان نیچے پہنچا آتا ہوں۔ تم اپنا بیگ ساتھ لے لو' اب تم ادھر مت آنا' سیدھی نیچے آنا' ٹھیک ہے۔"

"جی ٹھیک ہے۔" یہ کہہ کر اس نے اپنا بیگ اٹھایا اور گھر پر ایک نظر ڈالتی باہر نکل گئی۔

مسز نکسن گھر پر موجود نہ تھیں' اس لیے ان سے ملاقات نہ ہوسکی۔ وہ تین بار گھنٹی بجا کر واپس آ گئی۔ بابر نے اتنے میں سامان نکال کر باہر رکھا۔ گھر کو مقفل کیا اور درخشاں سے پوچھا۔ "کیا ہوا؟"

"وہ گھر پر نہیں ہیں؟"

"چلو کوئی بات نہیں' میں بعد میں انہیں بتا دوں گا کہ تم ان سے ملنے گئی تھیں۔"

"ٹھیک ہے۔" درخشاں نے یہ کہہ کر ایک سوٹ کیس اٹھانا چاہتا' لیکن بابر نے منع کردیا۔

"تم ویسے ہی ہسپتال سے آ رہی ہو' پھر اتنا لمبا سفر کرنا ہے' لہٰذا مشقت سے بچو۔ بابر نے دونوں سوٹ کیس اٹھائے' بیگ کندھے پر رکھا اور وہ دونوں لفٹ میں داخل ہوگئے۔

ایئرپورٹ پہنچ کر بابر نے اپنی بہن کو گلے سے لگا کر رخصت کیا۔

"مجھے قوی امید ہے کہ پاکستان پہنچ کر تمہاری طبیعت فوراً سنبھل جائے گی۔ سب سے

بڑا مسئلہ تمہاری تنہائی کا ہے۔ تنہا نہیں رہو گی تو تمہارا خوف کم ہوگا۔ خوف کم ہوگا تو پھر تمہیں کچھ نہیں دکھائی دے گا۔"

درخشاں خاموشی سے اپنے بھیا کی بات سنتی رہی اور سوچتی رہی کہ بھیا کو اندازہ ہی نہیں کہ اس پر کیا بیت رہی ہے۔ یہ ابھی تک فاخرہ کو اس کے ذہن کا خوف سمجھ رہے ہیں۔

کیا واقعی فاخرہ اس کے ذہن کی پیداوار ہے؟ یہ ایسا سوال تھا جس کا جواب کسی کے پاس نہ تھا۔ کراچی پہنچ کر فوراً اسے کئی معالجین کو دکھایا گیا۔ ان معالجوں میں روحانی معالج بھی تھے اور نفسیاتی معالج بھی' ایک دو جھاڑ پھونک کرنے والوں کو بھی بلا لیا گیا۔

کسی کی رائے کسی سے نہ ملتی تھی۔ سب کی مختلف رائے تھی۔

نفسیاتی عالج نے سارے واقعات سن کر جو ابتدائی رائے پیش کی' وہ یہ تھی کہ اس لڑکی کے اعصاب پر خوف سوار ہے اور یہ سب خوف کے مظاہر ہیں۔ بازو پر جو لکیریں تھیں' وہ اصل میں خود درخشاں کے ناخنوں کے کھرونچے تھے جو اس نے سوتے میں لگائے۔ فاخرہ کی موت نے اس کے اعصاب کو بہت متاثر کیا ہے۔ ایک طرح سے لاشعوری طور پر یہ خود کو مجرم گردانتی ہے۔ ایک ہنستا بستا گھر اس کی وجہ سے اجڑ گیا۔ خوف کو دور کرنے اور لاشعور سے اس خیال کو نکالنے کے لیے طویل نشستوں کی ضرورت ہوگی۔ یہ سب تحلیل نفسی کے ذریعے ممکن ہوگا اور تحلیل نفسی ایک صبر آزما اور طویل مرحلہ ہے۔ کچھ وقت لگے گا' لیکن یہ ٹھیک ہو جائے گی۔

ایک روحانی معالج جو مختلف طریقہ ہائے علاج بتانے میں مشہور تھے' جب انہیں درخشاں کے بارے میں بتایا گیا اور مکمل تفصیلات سے آگاہ کیا گیا تو انہوں نے کہا۔ "یہ آسیب وغیرہ کا کوئی چکر نہیں ہے۔ لڑکی بہت حساس ہے یہ کسی ذہنی صدمے سے دوچار ہوئی ہے۔ کھانے میں نمک بالکل بند کردیں' میٹھی اشیاء بڑھا دیں۔ نیلا پانی پلائیں اور یہ میں ایک وظیفہ بتا رہا ہوں۔ سوتے وقت آہستہ آہستہ اس کے سرہانے کھڑے ہو کر پڑھیں۔ انشاء اللہ لڑکی ڈرنا چھوڑ دے گی اور اس کی صحت بھی بحال ہو جائے گی۔"

خاندان کی ایک خاتون ایک جھاڑ پھونک والے سے واقف تھیں۔ انہوں نے درخشاں کی امی سے ذکر کیا۔ "ارے' تم کہو تو اقبال بابا کو بلا لاؤں۔ کوئی تعویذ وغیرہ دے دیں گے تو وہ کمینی ہماری بچی کا پیچھا چھوڑ دے گی۔"

"ٹھیک ہے خالہ' چلو ان کو بھی دکھائے دیتے ہیں۔ تم لے آؤ کسی دن۔" وہ اگلے ہی دن اسے لے آئیں۔

اقبال بابا نے درخشاں کو اپنے سامنے بٹھا کر کچھ پڑھا۔ وہ خاموشی سے اس کے سامنے بیٹھی' خالی خالی نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔ گھر کے تمام افراد بھی کمرے میں موجود تھے۔

کچھ پڑھنے کے بعد اقبال بابا نے دور ہی سے اس کے منہ پر پھونک ماری اور کہا۔

"ایک گلاس پانی۔"

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

فوراً ایک گلاس پانی حاضر کیا گیا۔

"گھر میں سٹیل کا گلاس نہیں؟" اس نے پوچھا۔

"ہے۔" جواب ملا۔

"پانی اسی میں لائیے۔ شیشے کا گلاس نہیں چاہئے۔" فوراً حکم کی تعمیل کی گئی۔

سٹیل کا گلاس لے کر اقبال بابا نے اس پر کچھ پڑھ کر پھونکا اور درخشاں سے مخاطب ہو کر بولا "لو بی بی ذرا اس پانی کو پیو۔"

"بابا' کچھ ہوگا تو نہیں؟" درخشاں گلاس لیتے ہوئے ہچکچائی۔

اقبال بابا نے درخشاں کے ابو حنیف صاحب کی طرف دیکھا۔

"پی لو بیٹا' کچھ نہیں ہوگا۔ ہم جو یہاں موجود ہیں۔" انہوں نے یقین دلایا۔ پھر حنیف صاحب نے بابا سے گلاس لے کر اس کے منہ سے لگانا چاہا تو اقبال بابا نے گلاس فوراً پیچھے کر لیا اور بولا۔ "آپ ہاتھ نہ لگائیں۔"

"چلو بیٹا' گلاس لے لو۔" اس مرتبہ امی نے کہا۔

"درخشاں نے ڈرتے ڈرتے اقبال بابا کے ہاتھ سے گلاس لیا اور دو تین گھونٹ پانی پیا۔

"لاؤ' اب دے دو۔" اقبال بابا نے گلاس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

گلاس لے کر انہوں نے کچھ پڑھتے ہوئے گلاس میں جھانکا۔ پھر پھونک ماری۔ دو تین مرتبہ اس نے ایسا ہی کیا۔ پھونک مار کر وہ گلاس میں جھانکتا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ گلاس میں کچھ دیکھنے کی کوشش کر رہا ہو۔

پھر وہ دو تین منٹ تک گلاس میں ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ اس کے بعد اس نے گہرا سانس لیا۔ درخشاں کو دیکھا۔ وہاں موجود تمام حاضرین پر ایک ایک کر کے نظر ڈالی اور پھر گل افشاں سے مخاطب ہو کر بولا "بیٹا' ذرا یہ پانی کسی گملے میں ڈال دو۔"

"جی' اچھا۔" گل افشاں نے فوراً گلاس اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

"اچھا بیٹا' آپ جائیں آرام کریں۔" اس نے درخشاں سے کہا۔

درخشاں کے ساتھ ہی دوسرے بھائی بہن بھی کمرے سے نکل گئے۔ تب اقبال نے درخشاں کے ابو سے مخاطب ہو کر کہا۔ "اس لڑکی پر اثر ہے۔ آپ کی مرحومہ بہو اس کے پیچھے پڑ گئی ہے۔ وہ مر کر چین نہیں پا سکی ہے۔ اسی دنیا میں بھٹک رہی ہے۔ اس کے ہاتھ میں جو پیالہ ہے' جب تک وہ اسے اس لڑکی کے خون سے بھر نہیں لے گی' چین سے نہیں بیٹھے گی اور جس دن اس کا پیالہ بھر جائے گا۔ لڑکی کی موت واقع ہو جائے گی۔

"ہائے میرے اللہ۔" درخشاں کی امی اپنا دل پکڑ کر رہ گئیں۔ "بابا جی' آپ میری بچی کے لیے کچھ کریں نا۔"

"ہاں' ضرور کروں گا' میں اس بچی کو اس چڑیل سے نجات دلا کر رہوں گا۔ کل آ کر مجھ

سے تعویذ لے جائیں۔ پڑھا ہوا پانی دوں گا۔ وہ پلائیں۔ آگے دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔"

اس طرح درخشاں تین معالجوں کے درمیان پھنسی ہوئی تھی' لیکن فائدہ کسی سے بھی نہیں ہو رہا تھا۔ اس کی حالت روز بہ روز خراب ہوتی جا رہی تھی۔

ادھر نیویارک میں بابر بلال اپنی بہن کی وجہ سے پریشان تھا۔ اس نے فون پر مسلسل رابطہ قائم کیا ہوا تھا۔ ہر دوسرے تیسرے دن اس کا ٹیلی فون آ جاتا تھا' لیکن جب اسے یہ معلوم ہوتا کہ درخشاں کی حالت بہتر ہونے کے بجائے مزید خراب ہو رہی ہے تو اسے بہت افسوس ہوتا۔

درخشاں کو نیویارک سے آئے ہوئے تین چار ماہ ہو چکے تھے۔ وہ راتوں کو اسی طرح اٹھ کر چیخنے لگتی تھی۔ جیسے نیویارک میں چیخا کرتی تھی۔ گل افشاں اس کے ساتھ سوتی تھی۔ درخشاں کی چیخوں نے اب اسے بھی خوفزدہ کرنا شروع کر دیا تھا۔

جب درخشاں انتہائی خوف کے عالم میں اس سے لپٹ کر کہتی "وہ آئی تھی' شعلوں میں لپٹی اور غصے میں بھری۔" تو گل افشاں کے جسم میں کپکپی چھوٹ جاتی تھی۔ گل افشاں' درخشاں کے مقابلے میں مضبوط اعصاب کی لڑکی تھی' لیکن درخشاں نے اس کی حالت بھی خستہ کر دی تھی۔

پھر ان دونوں کے کمرے میں امی بھی سونے لگیں' لیکن درخشاں کا خوف کم نہ ہوا۔ فاخرہ اسی طرح پیالہ اور چاقو لیے اس کے پاس آتی رہی اور زخم ڈال کر اس کے جسم سے خون کے قطرے نکالتی رہی۔

اب زخم بازو پر ہی نہ پڑتے بلکہ جسم کے کسی بھی حصے پر نمودار ہو جاتے۔ چہرے پر' کلائی پر' پیٹھ پر' پیٹ پر' ٹانگوں پر' یہ زخم باریک لکیروں کی صورت ہوتے جیسے کسی نے بلیڈ چلایا ہو۔

جب رات کو اس کی دہشتناک چیخ پورے گھر میں گونجتی تو دلوں میں خوف بٹھا جاتی۔

درخشاں کی رنگت روز بہ روز زرد ہوتی جا رہی تھی۔ وہ برسوں کی بیمار دکھائی دیتی تھی۔ اس نے کھانا پینا بھی چھوڑ دیا تھا۔ بڑی مشکل سے کچھ کھاتی تھی' وہ بھی زبردستی کھلانے پر۔ اس نے بولنا بھی بہت کم کر دیا تھا۔ وہ سب کے درمیان بیٹھی ہوتی' لیکن خاموش۔ گل افشاں زبردستی اس سے سوال کر کے اسے گفتگو پر مجبور کرتی۔

بابر کا ٹیلی فون آتا تو بھی ہوں' ہاں کر کے ریسیور امی کو پکڑا دیتی۔ "امی آپ بات کریں' مجھے چکر آ رہا ہے۔"

ایک دن بابر کا ٹیلی فون آیا' اس نے درخشاں کو بتایا۔ ارے درخشاں' ایک افسوسناک خبر ہے۔"

"کیا بھیا؟ خیر تو ہے۔"

"ہاں' اپنی طرف سے تو خیریت ہے' لیکن وہ ڈینی' میرا مطلب ہے' پروفیسر ڈینی....."

"ہاں' کیا ہوا انہیں۔" درخشاں نے اپنا دل تھامتے ہوئے کہا۔

"بھئی' ان کی بیوی کا انتقال ہو گیا۔ اتنے دنوں کے بعد تو ان میں راضی نامہ ہوا تھا'

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

دونوں ہنسی خوشی ساتھ رہ رہے تھے کہ صبح ہی صبح اسے خون کی ایک قے ہوئی اور ہسپتال پہنچتے پہنچتے اس کا انتقال ہو گیا۔"

"ارے یہ تو بہت برا ہوا' آپ میری طرف سے تعزیت کر لیجئے گا۔" درخشاں نے کہا۔

"تم خط لکھ دینا' نا اسے۔ وہ اکثر تمہیں یاد کرتا رہتا ہے۔" بابر بلال نے تنبیہ کی۔

"بھیا' مجھ سے کچھ لکھا نہیں جاتا' میں کوشش کروں گی لکھنے کی۔" اس نے مجبوری ظاہر کی۔

پھر اس نے ڈینی کو خط لکھنے کی کوشش بھی کی' لیکن ذہن نے کام نہ کیا۔ کچھ ذہن نے کام نہیں کیا' کچھ اس کے دل نے انکار کر دیا۔ بیوی کے بارے میں اس کا تعزیت نامہ پا کر اس کے ذہن میں جانے کیا آئے وہ جانے کیا سوچے۔

جو یادیں دفن ہوتی جا رہی تھیں' انہیں پھر سے اکھاڑنا کیا۔

بابر کے فون آتے رہے۔ خط آتے رہے۔ ان سے معلوم ہوتا رہا کہ ڈینی کی اسلام میں دلچسپی بڑھتی جا رہی ہے۔ اس نے قرآن شریف کا مطالعہ شروع کر دیا ہے۔ اردو بھی باقاعدہ سیکھ رہا ہے اور اب بولنے بھی لگا ہے۔ اس کا مشرق سے لگاؤ بڑھتا جا رہا ہے۔

یہ سب باتیں درخشاں سنتی یا پڑھتی تو مسکرا کر رہ جاتی۔ کبھی وہ گل افشاں سے گھنٹوں ڈینی کی باتیں کرتی اور کبھی گل افشاں کے ذکر کرنے پر اجنبی بن جاتی' پوچھتی۔ "کون ڈینی؟ میں کسی ڈینی کو نہیں جانتی۔"

نیویارک سے آئے ہوئے درخشاں کو اب دس گیارہ مہینے ہو گئے تھے اور ان دس گیارہ مہینوں میں درخشاں کی حالت پاگلوں جیسی ہو گئی تھی۔ جن لوگوں نے اسے امریکا جانے سے پہلے دیکھا تھا' وہ اسے اب دیکھتے تو رو پڑتے۔ اس کی حالت ہی ایسی ہو گئی تھی۔

وہ ہڈیوں کا ڈھانچا بن گئی تھی۔ خون تو جیسے اس کے بدن میں کہیں تھا ہی نہیں۔ وہ بالکل گم صم ہو گئی تھی۔ جس چیز پر نظریں جما دیتی' گھنٹوں اسے دیکھے جاتی۔

اب وہ گھر سے خاموشی سے نکل جاتی۔ ادھر ادھر بھٹکتی پھرتی۔ ایک دن وہ کلفٹن والے مزار پر چلی گئی۔ وہاں دو تین گھنٹے رہی اور خود ہی رکشا میں بیٹھ کر واپس آ گئی۔

ایک انقلابی تبدیلی اس میں پیدا ہوئی تھی۔ وہ بڑا گہرا میک اپ کرنے لگی تھی۔ کہاں تو یہ حال تھا کہ ہونٹوں پر لپ اسٹک لگانا بھی گوارا نہ تھا اور اب یہ حال ہو گیا تھا کہ رات کو سوتے وقت بھی ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھ جاتی اور پورا میک اپ کر کے سوتی۔ کپڑوں کے بارے میں بھی اس کا رویہ کچھ اسی طرح کا تھا۔ اس نے زندگی بھر انتہائی سوبر کپڑے پہنے۔ اب اسے چمکیلے کپڑے زیادہ پسند آتے۔ گہرے رنگ من کو بھاتے۔

گھر والے سب پریشان ہوتے کہ اس لڑکی کو کیا ہو گیا' لیکن خاموش رہتے۔ اسے من مانی کرنے دیتے۔ ڈاکٹروں کی یہی ہدایت تھی کہ جو وہ کرنا چاہتی ہے' اسے کرنے دیں۔ جب تک

کہ اس کی حرکت ضرر رساں نہ ہو۔

کلفٹن والے مزار پر اب اس کی آمد و رفت بڑھ گئی تھی۔ ہفتے میں دو تین دفعہ وہ وہاں ضرور جاتی تھی۔ وہاں جا کر کبھی تو وہ مزار کے سامنے خاموشی سے بیٹھ جاتی' کبھی اپنا دوپٹہ اتار کر مزار کے فرش پر جھاڑو لگانے لگتی اور کبھی سیڑھیوں پر بیٹھ جاتی۔ اب گھر والوں کو معلوم ہو گیا تھا کہ وہ خاموشی سے کہاں جاتی ہے لہٰذا وہ خاموشی سے اس کے پیچھے لگ جاتے اور مزار سے اسے سمجھا بجھا کر واپس لے آتے۔ کبھی ایسا ہوتا کہ وہ سارا سارا دن بھوکی پیاسی وہاں گزار دیتی۔

اس مزار سے اسے دلچسپی کیوں تھی' یہ بات کوئی آج تک نہ جان سکا تھا۔ البتہ اتنا ضرور تھا کہ امریکا جانے سے پہلے وہ جب بھی کلفٹن کی سیر کو نکلتی اس مزار پر فاتحہ پڑھنے ضرور جاتی تھی۔

اور یہ بات گل افشاں کو اچھی طرح معلوم تھا۔

گل افشاں کو ڈینی کے بارے میں بھی سب کچھ معلوم تھا۔ درخشاں نے اس کے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا۔ لپ اسٹک' کیسٹ اور ڈائری کے متعلق بھی کچھ نہ چھپایا تھا اور جس انداز میں درخشاں نے اسے سب کچھ بتایا تھا' اس سے گل افشاں نے اندازہ کیا تھا کہ درخشاں کو ڈینی سے شدید قسم کی محبت ہو گئی تھی' لیکن اس جذبے کو اس نے اندر ہی اندر کہیں دبا لیا تھا یا دبانے کی کوشش کرتی رہی تھی۔

ایک طرف محبوب سے جدائی کا صدمہ' دوسری طرف فاخرہ کا ظہور۔ خوف اور محبت کے صدمے نے اس کے اعصاب کو توڑ مروڑ کر رکھ دیا۔ اس کی شخصیت کو پارہ پارہ کر دیا تھا۔

لپ اسٹک' کیسٹ اور ڈائری ہمیشہ اس کے بیگ میں اس کے ساتھ ہوتیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اب اسے اس بات کا ہوش نہ رہا تھا کہ یہ چیزیں اسے کس نے دی تھیں' کہاں سے آئی تھیں۔

پھر ایک دن بابر کا خط آیا۔ خط سے معلوم ہوا کہ پروفیسر ڈینی پاکستان آ رہے ہیں' اسلام آباد میں کوئی کانفرنس ہے' اس میں شرکت کے لیے۔ یہ کانفرنس یونیسکو کی طرف سے منعقد ہو رہی تھی۔ کانفرنس کے اختتام پر وہ کراچی آئیں گے اور گھر پر ہی ٹھہریں گے۔ وہ تو کسی ہوٹل میں ٹھہرنا چاہتے تھے' لیکن بابر نے انہیں سختی سے منع کر دیا تھا۔

اور جب یہ خوشخبری گل افشاں نے درخشاں کو سنائی تو وہ خاموشی سے ساری بات سنتی رہی۔ جواب میں ایک لفظ نہ بولی۔ جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہ ہو یا سنا ہو تو سمجھ میں نہ آیا ہو۔ پھر وہ اٹھ کر کمرے میں چلی گئی۔

جب پروفیسر ڈینی گھر آئے تو گل افشاں نے دروازہ کھولا۔

دروازے پر مشرق و مغرب کا امتزاج موجود تھا۔ سفید شلوار سوٹ پر سفید کوٹی' سفید جوتے اور گلابی چہرہ' لکتا ہوا قد۔ گل افشاں اسے دیکھتی رہ گئی۔

آپ ڈینی ہیں' پروفیسر ڈینی؟"

Free Urdu Books : www.iqbalkalmati.blogspot.com

گل افشاں نے انگریزی میں کہا۔

"آپ نے ٹھیک پہچانا' میں ڈینی ہوں۔" پروفیسر ڈینی نے اردو میں جواب دیا۔

"اوہ!" اردو میں جواب سن کر گل افشاں کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔

"درخشاں کہاں ہیں؟" اس نے سوال کیا۔

"آپ اندر آ جائیے' آپ کا سامان کہاں ہے؟" گل افشاں نے پوچھا۔

"بس یہ ہے۔" انہوں نے اپنے پیچھے رکھے سوٹ کیس کو اٹھایا اور گل افشاں کے ساتھ اندر آ گئے۔

"درخشاں گھر پر موجود نہیں تھی۔ گل افشاں کو معلوم تھا کہ وہ اس وقت کہاں ہو گی۔ پروفیسر ڈینی اس سے ملنے کے لیے بے قرار تھے۔ جب ان کا اصرار بڑھا تو درخشاں کے ابو نے کہا۔ "جاؤ بیٹی' انہیں ملا لاؤ۔"

امریکا سے آتے ہوئے کچھ باتیں تو بابر نے درخشاں کے بارے میں بتا دی تھیں۔ کچھ باتیں گل افشاں نے انہیں کلفٹن جاتے ہوئے بتا دیں اور وہ بڑے افسوس اور بڑی حسرت سے یہ باتیں سنتے رہے۔

مزار کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے' پروفیسر ڈینی سیڑھیوں پر بیٹھے ہوئے لوگوں کو بڑے غور سے دیکھ رہے تھے۔

تب اچانک وہ نظر آ گئی۔ وہ بڑا زرق برق لباس پہنے' دنیا سے بے نیاز ایک سیڑھی پر بیٹھی تھی۔ تھوڑے سے فاصلے پر درخشاں کا سب سے چھوٹا بھائی عدنان بیٹھا تھا۔ وہ اس کے ساتھ ہی آیا تھا۔ درخشاں بڑے گہرے میک اپ میں تھی۔ اس کے ہاتھ میں چھوٹا سا آئینہ تھا اور وہ لپ اسٹک سے اپنے ہونٹوں کو اور گہرا کیے جا رہی تھی۔ لوگ اس کے پاس سے ایک دوسرے کو اشارے کرتے ہوئے گزر رہے تھے۔ عورتیں اسے حیرت سے دیکھ رہی تھیں' لیکن اسے کسی کی پروا نہ تھی' وہ بڑے انہماک سے اپنے ہونٹوں پر سرخی چڑھا رہی تھی۔

یہ وہی لپ اسٹک تھی جو پروفیسر ڈینی نے اسے بطور تحفہ دی تھی۔

پروفیسر ڈینی' اسے نہیں پہچان سکا۔ جب گل افشاں نے درخشاں کی طرف اشارہ کیا۔ "وہ رہی باجی۔" تو وہ ایک لمحے کو ٹھٹک گیا۔

پھر وہ تیزی سے اس کی طرف بڑھا اور اس کے برابر سیڑھیوں پر بیٹھ گیا' لیکن درخشاں نے کوئی توجہ نہ دی۔ وہ پورے انہماک سے اپنے ہونٹ رنگتی رہی۔

"میں ڈینی ہوں' تمہارا ڈینی۔ کیا تم مجھے نہیں پہچانتیں۔" ڈینی نے اردو میں کہا۔

جواب میں درخشاں نے اسے اجنبیوں کی طرح دیکھا اور پھر لپ اسٹک اور آئینہ بیگ میں ڈالا۔ کھڑی ہوئی اور سیڑھیاں چڑھنے لگی۔

"سنو۔" ڈینی نے پکارا۔

وہ رک گئی۔ اس نے خالی خالی نظروں سے اسے دیکھا۔ "دیکھو' میں مسلمان ہو گیا ہوں' اب میرا نام شاہد اسلام ہے۔ میں نے تمہاری زبان سیکھ لی ہے۔ تمہاری معاشرت اپنا لی ہے۔ میں تمہارے سیارے میں آ گیا ہوں۔ تمہاری دنیا میں آ گیا ہوں۔"

یہ سب سن کر درخشاں نے اسے خاموش نگاہوں سے دیکھا جیسے وہ اس دنیا کی مخلوق نہ ہو' کسی اور دنیا کی ہو اور پھر سیڑھیاں چڑھنے لگی۔

اس مرتبہ ڈینی نے اسے آواز نہ دی' وہ اسے کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔

"پروفیسر ڈینی' آیئے' اب واپس چلیں۔" گل افشاں نے اسے روکا۔ ڈینی رک گیا اور درخشاں کو سیڑھیاں چڑھتے دیکھنے لگا۔

☆.....☆.....☆